دل گداز تحریریں، • زندگی کی تصویریں

ماہنامہ

کراچی

سچی کہانیاں

April
2015

"مسئلہ یہ ھے"

قرآنی آیات کی روشنی میں، آپ کے مسائل کا حل

اس شمارے میں:

☆16 دسمبر سانحہ پشاور کے "شیر" بچوں سے، اُس بلیک ڈے کی لہو رلاتی یادوں کا احوال

☆تاریک براعظم کے سب سے روشن ستارے، نیلسن منڈیلا کی زندگی کی کہانی

ماہنامہ
سچی کہانیاں
کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان/دانیال شمسی

MEMBER	
APNS	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
CPNE	رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

منیجر مارکیٹنگ
زین العابدین

منیجر ایڈمن اینڈ سرکولیشن
محمد اقبال زمان

انٹرنیشنل ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

فون نمبرز:
021-35893121
021-35893122

خط و کتابت کا پتا: C II-88 فرسٹ فلور خیابان جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ☼ جلد: 32 ☼ شمارہ: 04 ☼ اپریل: 2015ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔



پرنٹر: حسام محی الدین عباسی سٹی پریس OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر قانونی مشیر [illegible] ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

پرل پبلی کیشنز کی جانب سے دو عظیم کتابیں

"جاگتے رہنا"

بانی پرل پبلی کیشنز، سہام مرزا کے قلم سے

صحافت کی دنیا کا نیا باب

ماہنامہ "دوشیزہ" اور ماہنامہ "سچی کہانیاں" میں شائع ہونے والے، منتخب اداریے، جو آج بھی لمحۂ موجود کا عکس ہے۔

قیمت صرف =/200 روپے

معروف اخبارات میں شائع ہونے والے منزہ سہام مرزا کے کالمز پر مشتمل کتاب "اُجلے حروف" شائع ہو چکی ہے





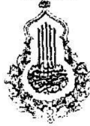


ملکی و سیاسی مسائل، معاشرتی ناہمواریوں سے نبرد آزما آج کے دگرگوں حالات سے پردہ اُٹھاتے منزہ سہام مرزا کے بے باک قلم سے چشم کشا تحریریں

قیمت =/500 روپے

کتابیں منگوانے کا پتا: پرل پبلی کیشنز C-88 II خیابانِ جامی، ڈیفنس فیز 7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121



بڑا دہشت گرد کون؟؟؟

حالات اور رویے ایسے دوراہے پر لے آئے ہیں کہ میں اپنے آپ سے یہ پوچھنے پر حق بجانب ہوں کہ آخر بڑا دہشت گرد کون ہے؟ وہ جنہوں نے آرمی پبلک اسکول کے معصوم بچوں کو شہید کیا یا وہ جنہوں نے نہتے نمازیوں کو خون میں نہلا ڈالا۔ یا وہ جو چھپ کر بازاروں میں، عبادت گاہوں میں داخل ہوتے ہیں اور لمحوں میں اللہ کے نائب کو چیتھڑوں میں تبدیل کر دیتے ہیں...... یا دہشت گرد وہ ہیں، جو وردی والوں کو چن چن کر نشانہ بناتے ہیں...... میرے رب کو ماننے والا ہر شخص یہ مانتا ہے کہ انسانیت سب سے بڑا مذہب ہے۔ زندگی اور موت کا مالک میرا رب ہے۔ وہ ظلم اور زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا...... تو پھر وہ کون لوگ تھے۔ جنہوں نے فقط شبہے میں دو جیتے جاگتے انسانوں کو زندہ جلا ڈالا۔ سرکاری املاک کو برباد کرنے، لوٹ مار کرنے اور لاشوں کی بے حرمتی کرنے والوں کو آپ کیا کہیں گے؟؟؟

بڑا دہشت گرد کون ہے۔ کیا وہ جس نے اپنے جسم سے بارود باندھ کر چرچ کو نشانہ بنایا یا وہ جنہوں نے غصے میں اپنے راستے میں آنے والی ہر شے کو برباد کر ڈالا، خاتون کے ساتھ غیر اخلاقی سلوک کیا اور فقط شبہے میں دو زندہ انسانوں کو ڈنڈے اور لاٹھیاں مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ اور اس پر بھی بس نہیں کیا' ان بدنصیبوں کو زندہ بھی جلا ڈالا۔

میں تو ایسے انسانی رویے پر انگشت بدنداں ہوں' آپ بتائیے کہ بڑا دہشت گرد کون ہے؟

منزہ سہام

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو!

انسان کیا ہے؟ کبھی سوچا ہے؟ کبھی غور کیا ہے؟ سوچیے کہ ہمیں خدا نے کیوں پیدا کیا۔ دس ہزار برس کی معلوم تاریخ میں جہاں جہاں نظر دوڑائیں تو انسان کی ایک خاصیت سب سے قوی معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہے حکم رانی۔ ہر شخص حکم ران بننا چاہتا ہے۔ پچھلے دنوں ہم نے اپنے پیاروں کو سوچ و فکر میں مبتلا کر دیا۔ لاتعداد فون کالز نے یہ احساس دلایا کہ ابھی کچھ شرم باقی ہے، احترام باقی ہے، کرنے والے اپنا کام کر گئے مگر...... وہ غریب یہ نہیں جانتے تھے کہ زمین پر اودھم مچانے والے، کبھی اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں تو ہمارا دعویٰ ہے کہ اپنے اندر کی برائی سے اُسی وقت دم گھٹ کر مر جائیں۔ سچ ہے عزت اور ذلت خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے ورنہ......

مجھ کو توفیق ہے راضی بہ رضا ہونے کی — فکر ہستی کی نہ ہستی کے فنا ہونے کی

اور کیا چاہیے جھرنوں سے بھری وادی میں — مجھ کو عادت تھی بہت نغمہ سرا ہونے کی

ساتھیو! خوش رہو...... میں تو خود کو اُس مسافر کی طرح جانتا ہوں جو بارش کی برستی بوندوں میں ریل کی پٹریوں پر بیٹھ کر اپنی ٹرین کا انتظار کرتا رہے۔ ٹرین کا وقت ہو جائے اور ٹرین نہ آئے۔ بارش برستی جائے، دھند بڑھتی جائے مگر انتظار ختم نہ ہو! اور پھر وہ مسافر دھند پر پاؤں رکھ کے چل دے۔ میں نے سب کو معاف کیا۔ امید ہے اب احتیاط کے بادبان ہمیشہ آگے کی جانب سفر کو رواں رکھیں گے۔

ساتھیو! آپ کے خطوط سے پہلے ہمیں ایم ارشد وفا سے تعزیت کرنی ہے اُن کے والد کی وفات پر ہمیں بہت دکھ ہوا اس موقع پر ہم مرحوم کے اعلیٰ درجات اور لواحقین کے لیے صبر کی دعا کرتے ہیں اور قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔ دیکھتے ہیں احوال میں سب سے پہلے کون ہمارا منتظر ہے۔

✉ لیجیے محترم سید شاہ عالم زمرد کا مختصر ترین نامہ ہمیں راولپنڈی سے موصول ہوا ہے۔ لکھتے ہیں، اسلام علیکم! دعائیں! اللہ سدا شاد باد رکھے۔ ہر ماہ یہ پرچہ لیتا تھا۔ **6** ماہ پہلے کوارٹر میں نالیوں اور گٹر کا پانی بھر آیا۔ سارا سامان پنشن کی کاپی، موبائل سب کچھ گندے پانی کی نذر ہو گیا۔ ادب سے والہانہ لگاؤ ہے، **80** سال عمر ہے، رسالوں کتابوں نے زندہ کر رکھا ہے اب پنشن لگ گئی ہے۔

☆ محترم سید شاہ عالم! خدا سے مدد کی امید رکھنا چاہیے۔ وہی ہے جو عالم کو نوازتا ہے۔ آپ کی صحت اور سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉ احوال میں یہ دبنگ انٹری ہے فیصل ندیم بھٹی کی فیصل آباد سے۔ عرض کرتے ہیں، ماہ مارچ کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ ٹائٹل میں لڑکی کی آنکھیں تو آنکھوں میں اتر گئیں اور ہونٹوں کے اوپر تل تو ایسے ہے جیسے نگینہ۔ اس کے بعد جب صفحہ نمبر **7** پلٹا تو منزہ سہام مرزا کا اداریہ 'مبارک ہو' پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کاشی بھیا کی کچھ اپنی باتیں، اس بار محروم رہا پڑھنے سے۔ احوال میں سب سے پہلے کنول عمران کا خط سامنے آیا کنول آپ ساری کہانیاں پڑھ کر تبصرہ کرتیں تو اور اچھا ہوتا۔ منشی عزیز مئے ممتاز احمد کے خطوط پسند آئے، سنایے کیسے ہیں آپ۔ احوال میں نئے آنے والے دوستوں کو خوش آمدید، جن میں کرن شہزادی، ندیم عباس میوانی، سیدہ دعا شاہ امید ہے آپ ہر ماہ احوال میں نظر آئیں گے۔ شازیہ گل آپ کے مانسہرہ شہر کا موسم کیسا ہے؟ سنا ہے بہت ٹھنڈا ہوتا ہے، علی حسنین تابش، اشفاق بٹ، مجید احمد جائی، مسز نوید ہاشمی، مور شاہد بھائی، اسامہ ندیم، عبدالعزیز جی آ کو سلام اور دعا السلام علیکم سدرہ انور علی صاحبہ شمارہ لیٹ ملا شاید اب تو ہیر رانجھا کا میلہ ختم ہو گیا ہو گا اگر آپ میلے پر گئی تھیں تو کچھ بتا دیں۔ عنقریب آپ کے جھنگ شہر میں آنے کا ارادہ تو ہے۔ کاشی بھیا اس بار صرف **28** خطوط شامل احوال تھے میرا خط بھی ردی کی ٹوکری کی نظر ہو گیا، اتنے کم خط کیوں؟ پچھلے ماہ راولپنڈی جانے سے شاید خط دیر سے پوسٹ کیا تھا ہو سکتا ہے بہت دیر سے ملا و چلو کوئی گل نہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو! دولت لے لے نیر شفقت کی، میٹھے پرندے شفیق شیکی کی بہت اچھی ہے۔ میں تیرا سایا ہوں مسز نوید ہاشمی کی کہانی پڑھتے پڑھتے خود مجھے خوف کا جھٹکا لگا دیا آپ نے۔ چلہ ٹوٹ گیا مبارک علی شمسی کی کہانی عبرت آموز کہانی ہے، امر پریم ملک صفدر کی اچھی تھی۔ سدرہ انور علی کی کہانی 'جینے نہیں دوں گی، انتقام سے لبریز کہانی ہوے، حیران ہوں کہ عورت بھی اس حد تک بدلہ لینے جا سکتی ہے۔ ایم اے راحت کا ہم شکل سنسنی خیز سلسلے میں داخل ہے، جمنا داسی، خوفناک سائے، وہ کہانی پازیب جھولا اور، گنگا کی سمادھی، برطانیہ میں خزاں، سے بھرپور رہیں۔ اور آخر کار ایک طویل انتظار کے بعد کاشی چوہان کا ناول 'زہر عشق' کی ابتدا ہوئی۔ پہلی قسط زہر عشق کی زبردست رہی۔ دوسری قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ سلیم اختر کی وہ سنہرے سانپ بہت اچھی تھے 'وفا ہے شرط، شعبان کھوسہ، موت کا پروانہ، موکل پیر خانے کا بہترین رہیں اور ممتاز احمد صاحب کی 'خونی پلیٹ فارم' تو خوفناک کہانیوں کی بہترین کہانی لگی۔ ناگن اعجاز احمد نواب کا سلسلہ بھی دلچسپ ہے۔ مسئلہ یہ ہے پڑھ کر دل بہت خوش ہوتا ہے کہ بابا جی کے فیض سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ بابا جی کا سایا تا دیر ہمارے سروں پر رہے۔ آمین۔ ہائیڈ پارک سلسلہ بہترین شروع کیا ہوا ہے جس میں بہت انمول باتیں پڑھنے کو ملیں جو کہ عمل کی راہ دکھاتی ہیں۔ سبایا کا تحفہ اسما اعوان کی واقعی خصوصی کہانی ہے۔ شمارے کا آخری اور نیا سلسلہ تیرِ نم کش بہتر ہے۔ ہمیں اپنے ادب سے لوگوں کو خوش آمدید کہنا چاہیے۔ انہی الفاظ کے ساتھ اجازت والسلام۔

☆ بھائی فیصل! یقین کر لو۔ ہمیں آپ کا کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ تبصرا اچھا کیا۔ جھنگ جانے کے

ارادے ہیں۔ خیریت سے جارہے ہویا......

☒ نوشین آرا کراچی سے، پہلی بار احوال میں حاضر ہیں۔ لکھتی ہیں، جناب ایڈیٹر صاحب السلام علیکم۔ اگست 2014ء میں کہانی خبیث روحیں شائع ہوئی، مجھے بہت خوشی ہوئی۔ امید تو بہت کم تھی کیونکہ کئی مہینے گزرنے کے بعد شائع ہوئی تھی اور تھوڑا سا حصہ بھی کاٹ دیا گیا تھا جو کہ میرے لیے تو اہم تھا۔ شاید آپ کے لیے اہم نہ ہو۔ کہانی سنانے والے کو ادھوری کہانی لگی تھی۔ بہرحال شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ جیسا ہم نے کہا تھا کہ کہانیاں تو بہت ہیں اگر اسی طرح شائع ہوتی رہیں تو مزید لکھتی رہوں گی۔ پلیز حوصلہ افزائی کرتے رہیے۔ اتنے دن گزرنے کے بعد لکھنے کی وجہ مصروفیت تھی، میرے تین بچوں کی شادیاں تھیں۔ اب فارغ ہونے کے بعد لکھنا شروع کر دیا ہے اور سارے ڈائجسٹ بھی اب پڑھنا شروع کر دیے ہیں جو کہ مصروفیت کی بنا پر پڑھ نہیں سکی تھی۔ میں سچی کہانیاں سہام مرزا صاحب کے زمانے سے پڑھ رہی ہوں اور میرے گھر کے لوگ بھی بہت عرصے سے پڑھ رہے ہیں۔ اب میری کہانیاں پڑھنے کے بعد مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ نئے پڑھنے والوں کو جگہ دی جارہی ہے۔ پہلے نسیم آرا کے نام سے شائع کی تھی اب اصل نام نوشین آرا کے نام سے لکھ رہی ہوں کیونکہ سب لوگوں نے کہا اصل نام سے لکھوں۔

☆ بہت عزیز نوشین آرا۔ آپ اتنے عرصے سے سچی کہانیاں پڑھ رہی ہیں خوشی ہوئی لیکن دکھ اس بات کا ہوا کہ کہانی لکھتے ہوئے آپ کا مطالعہ کیا ہوا؟؟ امید ہے اب کی بار آپ کی کہانی ہمیں خوشی سے ہمکنار کرے گی۔

☒ ایم یعقوب ڈیرہ غازی خان سے احوال میں شریک ہیں، لکھتے ہیں، مختصر سے تبصرے کے ساتھ احوال میں حاضری دے رہا ہوں۔ پہلی بار پُراسرار نمبر مارچ کا پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ سب دوستوں نے بہت اچھا اور خوب لکھا، وری گڈ دوستوں۔ جن میں شعبان کھوسہ، ممتاز احمد، جاوید راہی، نصرت سرفراز، محمد سلیم اختر، محمود شام، حنا بشریٰ، اسماء اعوان وغیرہ کی کہانیاں بہت ہی دلچسپ اور حیرت انگیز کہانیاں تھیں اور جب حال احوال میں آیا تو اپنے پرانے دوستوں کو پاکر بہت خوشی ہوئی جو سچی کہانیاں کی محفل میں براجمان تھے۔ جناب مجید احمد جائی سلام بھیجا جی اور ایم اشفاق بٹ اور ایم اے راحت صاحب اور کاشی بھائی کی قسط وار اسٹوری نے دھوم مچادی ہے۔ منعم اصغر میں بھی آپ کے شہر کا ہوں۔ اچھا جی اب میرا چھوٹا سا تبصرہ اختتام پذیر ہوا اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔

☆ پیارے یعقوب! آمد اتنی تاخیر سے کیوں ہوئی! اب آگئے ہو تو آتے رہنا۔

☒ سلیمان سنی، کشمیر سے مختصر سے احوال کے ساتھ پہلی بار احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ السلام علیکم پیارے دوستو! واہ وری گڈ بہت کمال کا ڈائجسٹ ہے سچی کہانیاں پڑھتے ہی دل کو بھا گیا۔ دل کی گہرائی سے سب لکھنے والے بہن بھائیوں کو سلام۔ آج میں پہلی مرتبہ احوال میں حاضر ہوں، مارچ کا پُراسرار شمارہ پڑھ کر سچ مچ بہت مزا آیا اور تمام لکھنے والوں کے لیے دعا گو ہوں۔ سب شاد و آباد اور سدا سلامت رہیں۔

☆ اچھے سنی! کشمیر میں رہ کر بھی اتنا مختصر تبصرہ...... سنا ہے جنت نظیر اس وادی میں جا کر تو لوگ ہزاروں صفحات کے ناول اور فلمیں لکھ ڈالتے ہیں۔

☒ خیرپور ناتھن شاہ سے ہماری بہت عزیز تحسین جونیجو حاضر ہیں۔ لکھتی ہیں، کاشی بھیا من کی نگری میں پھول کی پتیوں کی مانند دعاؤں کی بہار نچھاور ہو آپ پر (آمین ثمہ آمین) ایک بار پھر سے دل مسرور ہوا بہار جیسے لوٹ آئی آپ کی آمد ہے۔ بلاشبہ اپنا ساتھ سچی کہانیاں اور کاشی بھائی کے دم سے ہی قائم ہے۔ رواں زندگی کے سنگ چلتے رہیں گے، انشاء اللہ عزوجل، بھئی ہم منتظر ہیں کہ آخر وہ کون اشخاص ہیں جنہوں نے

ہمارے بھائی کی دل آزاری کی، ذرا کھل کے میدان میں تو آئیں جناب، ہوا میں تیر چلانے سے کیا ہوگا، یوں چھپ کے وار کرنے میں مزا کہاں...... اور پھر کہانیاں تو بہت سے رائٹرز کی مسترد ہوتی ہیں۔ ارے پھر سے ٹرائی ماریں کچھ نہ کچھ بن جائے گا۔ یوں انگلی اٹھانے سے کچھ نہیں ہوتا یہ لکھاریوں کو زیب نہیں دیتا۔ نہ ہی وہ لکھاری کہلوانے کے حق دار ٹھہرتے ہیں کہ بس ہانکتے رہتے ہیں کہ ہم رائٹر ہیں۔ وہ کبھی لکھاری بن ہی نہیں پاتے' جو الزام تراشی کرتے رہیں بس۔ اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک لڑائی ہے تو یہ لڑائی صرف کاشی بھائی کی نہیں ہم سب بھی اس لڑائی میں شامل ہوں گے۔ (خیال رہے اسے چاپلوسی کا نام نہ دیا جائے) کہ کاشی بھائی ایڈیٹر ہیں اس لیے ہم طرف داری کررہے ہیں بلکہ ہم سچائی کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ہم سب کا خلوص واحترام کا رشتہ ہے۔ بھائی ایسے کرنے والے نام نہاد رائٹرز کو ان کی جگہ (ردی کی ٹوکری) کی نذر کردیں۔ اگر شرافت کی زباں نہیں جانتے تو بھئی اگر سچ میں کچھ کر گزرنے کا جنون ہے تو ثابت بھی کردیں ناں؟ ہم سب ایک فیملی ممبر کی طرح ہی تو ہیں۔ اب کی بار اداریہ خوبصورت پیش کیا منزہ آپی نے۔ شائستہ جمال ڈیئر بڑی نوازش، کیسی ہیں آپ! زرینہ آپی اب بہتر ہیں، خوش رہیے۔ اشفاق شاہین بھائی نظر نہیں آرہے؟؟ عبدالعزیز جی آنکل اللہ سائیں آپ کے بیٹے کو جلدی صحت یاب کرے۔ (آمین)۔ شعبان کھوسہ بھائی آپ کہاں رہ گئے؟ مور شاہد حسین بھائی لگتا ہے آپ بھی الجھ گئے حالات سے کہ اتنی مختصر آمد؟ اب پھر سے رنگ بھرنا شروع کرتے ہیں محفل احوال میں، خوش رہیے۔ سدرہ انور چندا رانی کیسی ہو؟ میری کمی محسوس کی یہ آپ کی محبت ہے، غیر حاضری کی وجہ ایک تو دو تین ماہ سے شمارہ لیٹر ملا کہ تاریخ گزر جاتی تھی۔ دوسری وجہ اپنی محفل احوال میں بھی وہ رونق مزہ نہیں تھا ورنہ تحسین تو کسی بھی حال میں حاضری کے لیے زمین آسمان ایک کرکے بھی پہنچ جاتی ہے کہ کئی برس بیت گئے اپنا جنون دعشق ویسا ہی برقرار ہے۔ سچی کہانیاں کے سنگ بہت سی یادیں وابستہ ہیں جبکہ کچھ مصروفیات ایسی بھی ہیں کہ چاہنے کے باوجود ہم وقت نکال نہیں پاتے، وقت نکل جاتا ہے۔ ہر گزرتا ہوا پل یاد کی صورت بن جاتا ہے، اب کی بار شمارہ جلدی موصول ہوا اور پھر کاشی بھائی نے سیٹ بھی سنبھالی تو جذبہ جاگ اٹھا۔ آپ کا خلوص سرمایہ ہے سدرہ ڈیئر سلامت رہو۔ اسامہ ندیم صاحب خط کی پسندیدگی کے لیے مشکور ہوں۔ خوش رہیے۔ اب کہانیوں کی طرف آتی ہوں۔ 'میں تیرا سایا ہوں' مسز نوید ہاشمی، 'جینے نہیں دوگی' سدرہ انور علی، وفا ہے شرط شعبان کھوسہ بھائی، زہر عشق کاشی چوہان بھائی آغاز زبردست ہے ویلڈن۔ (جمنا داسی) صدف آصف آپی، (وہ سنہرے سانپ) محمد سلیم اختر انکل (امر پریم) صفدر عباس اعوان اور (وہ کہانی) صفدر علی حیدری سب نے شاندار کہانیاں پیش کی۔

☆ پیاری تحسین! آپ سب کی محبت اور خلوص نے ہی ہمیں مہمیز کیا ہے۔ میرے پیارے سلامت رہیں۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

✉ یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری ساتھی، ارم خان کی ڈی.جی خان سے، لکھتی ہیں۔ بھائی کاشی چوہان اور احوالیو! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے اور اپنے پاک رب سے دعا ہے کہ وہ آپ سب کو اور ہمارے اس پیارے وطن کو سدا سلامت رکھے۔ بھیا جی ایک بار پھر اس محفل کی سرداری سنبھالنے پر مبارک باد۔ اس محفل میں کافی بھائی ایسے ہیں جنہوں نے آپ کی کمی بڑی شدت سے محسوس کی اور مجھے یہ بات ان کے خطوط سے محسوس ہوئی۔ آپ کے لوٹ آنے پر ان سب کو بھی مبارک باد۔ بھیا جی ایک سچی سچی بات بتائیں آپ کو۔ پتا ہے ہم پچھلی بار آپ سے ناراض تھے کیونکہ آپ نے کافی بار ہمیں نظر انداز کیا تھا لیکن پھر اس ماہ اچانک آپ کی آمد نے اور بڑے ہی اچھے طریقے سے میرے خط کے جواب دینے پر ساری ناراضگی ختم

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

ہوگئی۔ اگر کہیں غلطی ہماری ہے تو سوری دل سے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ دولت لے لے، میٹھے پرندے، میں تیرا سایا ہوں، چلہ ٹوٹ گیا، امر پریم، جینے نہیں دوں گی، جمنا داسی، خوفناک سائے، وہ کہانی، پازیب جھولا اور وہ، گنگا کی سمادھی، وہ سنہرے سانپ، موت کا پروانہ، موکل پیر خانے کا، خونی پلیٹ فارم، سبایا کا تحفہ، ان سب کے عنوان پڑھے بہت اچھے تھے۔ کہانیاں نہیں پڑھیں آخر کیسے پڑھتی' ہر کہانی میں ایک جن بیٹھا تھا۔ خوف کی وجہ سے بس عنوان ہی پڑھ لیے۔ ہاہاہاہا۔ اس سے پہلے کہ خط کا دی اینڈ کروں بس دو باتیں اور پہلی مبارک علی شمسی (قائم پورض بھائی کا بہت شکریہ کہ انہوں نے میرا خط پسند کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ کاشی بھائی میں آپ کا نام لینے کے بجائے صرف آپ کو۔ بڑے بھیا کہہ سکتی ہوں؟ آخر میں ایک شعر آپ کے یعنی بڑے بھیا کے نام

ہوئی ہے کوئی خطا تو معاف فرمائیں ۔۔۔ پلیز میرے خط سے قینچی کو دور لے جائیں

☆ ارے ارے گڑیا! تم مجھے بڑا بھائی کہو! مجھے اچھا لگے گا۔ ایڈیٹر اور قینچی کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ پھر بھلا اسے دور کیسے لے جائیں...... اب ہمارے بارے میں دل میں کوئی بدگمانی نہ پالنا۔

✉ لاہور سے بتول خان نیازی کی احوال میں یہ اولین آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ میں بتول خان ہوں۔ میں لاہور میں رہتی ہوں مگر میرا تعلق پہاڑی علاقے سے ہے۔ میں میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی جب سے میں لکھ رہی ہوں میری بہت خواہش تھی کہ میں ڈائجیسٹ رائٹر بنوں مگر کوئی اچھا موقع نہ مل سکا۔ میرا کسی ڈائجسٹ رائٹر سے ساتھ کوئی رابطہ نہ ہو سکا۔ میں نے کبھی کوئی ڈائجسٹ وغیرہ پڑھتی تو نہیں مگر مجھے لکھنے کا بہت شوق تھا میری ڈائجسٹ تھی کہ میں جلد ہی کسی ڈائجسٹ سے رابطہ کر کے کم عمر اسٹوری نگار بن پاؤں گی مگر ایسا نہ ہوا۔ **18** سال میں میری شادی ہوگئی اور میں نے لکھنا ترک کر دیا مگر پھر بھی میں چاہتی تھی اور چاہتی ہوں کہ اپنی لائف میں کچھ کروں۔ یہ میرے لیے بہت ضروری ہے۔ میں نے ان خواتین کی **HELP** کے لیے یہ اقدام اٹھایا جن کا کوئی سہارا نہیں' جن کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں مگر کئی ضروریات زندگی سے محروم ہیں میں نے کئی ایسی خواتین لا تعداد دیکھی لاہور میں جو کہ بے سہارا ہیں' ضرورت مند ہیں بچوں کا باپ نہیں سر پر اور کوئی سہارا نہیں مگر پھر بھی وہ صبر تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی ہیں اپنی ضرورتوں کے لیے اپنی عزت نفس کو پامال نہیں کرتی۔ ایسی باصبر اور حوصلہ مند اور ایمان دار خواتین کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ ان کو دیکھ کر میں نے پھر سے اپنا شوق اپنایا اور لکھنا شروع کیا اور آپ سے رابطہ کیا۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کے ڈائجسٹ کی ممبر بن جاؤں۔ اپنے لیے نہیں کسی کی ضروریات پوری کرنے کے قابل بن جاؤں میں چاہتی ہوں میں کچھ بن کر ان خواتین کے لیے ٹرسٹ کا آغاز کروں اور پاکستان کی ایسی ہزاروں خواتین اپنی اور کئی صاحب استطاعت لوگوں کے ذریعے ان کا سہارا بنوں۔ سر میری درخواست ہے کہ آپ مجھے موقع دیں کہ مجھے اور میری نیک تمناؤں کو اپری شیٹ کریں گے۔

☆ بہت پیاری بتول! آپ کے حوصلے بلند اور پرواز آسمان کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بیٹا ملک خداداد کو آپ جیسی بلند حوصلہ، آہنی خواتین کی ضرورت ہے آپ ہمارے بابا جی کے ٹرسٹ میں شامل ہو جائیں۔ خواتین کی بھلائی کے لیے ہمارا ساتھ دیں۔

✉ لیجیے جناب اب پری زاد بھی ہم خاک نشینوں میں آ گئی ہیں۔ ارے ذرا صبر یہ آمد ہے ہماری نئی قاری ساتھی۔ پری زاد جہاں کی سیالکوٹ سے لکھتی ہیں السلام و علیکم میں احوال میں پہلی بار قدم رکھ رہی ہوں امید ہے آپ خوش آمدید کہہ کر استقبال کریں گے میں سچی کہانیاں کی خاموش قاری ہوں مجھے یہ پرچہ بے حد

پسند ہے اور میں اس میں موجود حقائق اکثر دل کو رلا جاتے ہیں احوال بہت خوبصورت سلسلہ ہے جس سے قارئین آپس میں ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرتے نظر آتے ہیں۔ جی آ جی کا خط بہت مختصر محسوس ہوا۔ سرورق بہت اچھا لگا اور پُر اسرار نمبر کی اطلاع پر اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی کہ سرورق پر پراسرار نمبر دیکھ کر ہوئی چہرہ تمتما اٹھا جوش سے، ہوش کھو بیٹھے ہم سب اور سب سے لڑ جھگڑ کر خود کو سب سے پہلے سچی کہانیاں پڑھنا شروع کر دیا۔ اب آ جاتے ہیں کہانیوں کی طرف شفق شیکی جی کے قلم سے لکھی گئی ''بیٹھے پرندے'' بہت خوب صورت تحریر محسوس ہوئی میں ان سے پوچھنا چاہتی ہوں کیا انہوں نے ان پرندوں کو دیکھا ہے؟ کیوں کہ ہمیں تو بہت خواہش پیدا ہوئی کہانی پڑھنے کے بعد ہم انہیں دیکھیں۔ مبارک علی کی ''چلہ ٹوٹ گیا''، خوفناک سائے اور پھر حنا بشری کی ''پازیب جھولا اور وہ'' بہت پسند آئیں۔ ''جینے نہیں دوں گی'' متاثر نہ کر سکی۔ ''ہم شکل'' بہت اچھا جا رہا ہے۔ ''ہائیڈ پارک'' سلسلہ بہت زبردست ہے۔ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ انعامی سلسلہ ہمیشہ سے ہمیں جھومنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ دعا میں یاد رکھیں۔ اللہ حافظ۔

☆ پری زاد! خوش آمدید۔ آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا کیا اگلے ماہ ہم آپ کی آمد کے منتظر رہیں؟

✉ شازیہ گل مانسہرہ سے کچھ اس طرح عرض کرتی ہیں سویٹ ڈیئر کاشی بھیا اس بار مارچ کا شمارہ 28 فروری کو ہی مل گیا اور ملتے ہی بے اختیار ہو کر بے تابی سے لفافہ چاک کیا اور سب سے پہلے اپنے پسندیدہ سلسلے احوال میں پہنچی اور ایک گڈ نیوز دیکھی کہ اپنے کاشی بھیا پھر سے احوال میں۔ ویلکم کاشی بھائی! پراسرار نمبر واقعی بہت پیارا ہو گا میں مشکور ہوں ان سب اپنوں کی جنہوں نے مجھے اس بار بھی احوال میں مجھے یاد رکھا بہت اچھا لگا جن میں جناب لنڈن وہاڑی سے منشی محمد عزیز مئے صاحب میرے والدین کی مغفرت کی دعا کے لیے تھینکس۔ مبارک علی بھائی شمسی کی کہانی پسندیدگی کے لیے شکریہ مسز نوید ہاشمی صاحبہ نارتھ کراچی سے آپ سب کا بہت شکریہ نفیسہ فضل جی کراچی خدا آپ کو آپ کے پیاروں کی موت پر صبر جمیل عطا فرمائے، عبدالعزیز جی! خدا آپ کے بیٹے کو جلد صحت یاب کرے۔ باقی اس شمارے میں کچھ تبدیلیاں بھی اچھی رہیں منزہ جی آپ کو بھی موسم بہار بہت بہت مبارک ہو سلسلہ ہائیڈ پارک ایک اچھی کاوش ہے۔ اور سلسلہ تیرنم کش بھی اچھا تھا مگر آپ نے بزم سخن آباد کیوں بند کر دیا؟ پیپر قریب ہیں اس لیے ابھی ساری کہانیاں نہیں پڑھ سکی صرف کاشی بھائی کی زہر عشق پڑھی۔ بہت لاجواب ہے۔ سچی کہانیاں میں شامل کوئی بری تحریر ہو ہی نہیں سکتی یقیناً سب ہی اچھی کہانیاں ہوں گی۔ کیوں کہ یہ ایک معیاری شمارہ ہے اور معیاری کہانیوں کا ہی انتخاب کرتا ہے۔ اب آخر میں احوال میں شامل تمام لوگوں کو سلام۔ اب دیجیے اجازت اس دعا کے ساتھ کہ جہاں رہیں خوش رہیں اور دعاؤں میں یاد رکھیں۔

☆ سویٹ بہن! شازیہ۔ بہت خوشی ہوئی کہ ملک کے دور دراز علاقوں میں رہنے والے بھائی بہن پرچے سے پیار کرتے ہیں اور اپنے احساسات کو تبصروں کی صورت زبان دیتے ہیں۔ سلامت رہو۔ تم سب ہمارا مان ہو۔

✉ چیچہ وطنی سے عبدالغفار عابد کا برقی نامہ ہمیں موصول ہوا ہے، لکھتے ہیں۔ قابلِ قدر کاشی چوہان، محترمہ منزہ سہام صاحبہ، جملہ قلم کار، قارئین خواتین و حضرات سلام عرض ہے۔ ماہ مارچ کا سچی کہانیاں بڑے جان لیوا انتظار کے بعد **11** مارچ کو ملا۔ اس میں سچی کہانیاں رائٹرز ایوارڈ کی سند بھی موجود تھی۔ یہ سند جولائی **2014**ء میں شائع ہونے والی میری کہانی 'سب جائز ہے' پر عطا کی گئی۔ حوصلہ افزائی پر میں ادارے کا بے حد مشکور و ممنون ہوں۔ کاشی بھیا سچی کہانیاں/ دوشیزہ کو آپ کی بہت ضرورت ہے۔ اپنا کام جاری رکھیں، حسد کرنے والوں کی بے جا تنقید اور منفی سوچ کو نظر انداز کر دیں۔ مسز سدرہ اور غزالہ کرن! انسانیت کا دوسرا نام

محبت ہے۔ اس لیے ہماری اولین کوشش محبت کا پرچار ہونی چاہیے۔ گلہ کرنے کی بجائے ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ محبتوں کی تقسیم ہی جذبات کو گرماتی ہے اور انسان آگے ہی آگے بڑھتا رہتا ہے۔ رشتوں میں دراڑیں اپنوں کو اپنوں سے دور کردیتی ہیں۔ آپ دونوں بہنیں بہت اچھی ہیں امید ہے کہ آپ اپنے گلے شکوے محبت کی نذر کردیں گی۔ کاشی بھیا سے بھی گزارش کروں گا کہ ایشو کا باعث بننے والے جملوں کو مسترد کردیا کریں۔ ان تمام ساتھیوں کا بے حد شکریہ جنھوں نے میری کہانی ''کرنی کی سزا'' کو پسند کیا۔ کاشی بھیا سمیت بہت سے دوست لکھنے کی تاکید کرتے رہتے ہیں۔ میں ان سبھی عزیز دوستوں کی محبت کو سلام پیش کرتا ہوں۔ آپ سبھی کو پرائیویٹ نوکری کی اونچ نیچ کا پتا ہے۔ اس کے باوجود بھی بہت جلد نئی تحریر بڑھنے کو ملے گی امید کرتا ہوں کہ آپ یونہی حوصلہ افزائی کرتے رہیں گے۔

☆ پیارے غفار! تمہاری پرچے سے محبت ہمارا دل خوش کردیتی ہے۔ خدا کا قانون ہے کہ محنت کرنے والوں کو جزا اور حاسدوں کو سزا ملتی ہے۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔

🖂 بلوچستان، کوئٹہ سے یہ آمد ہے، شعبان کھوسہ کی۔ لکھتے ہیں، مارچ کا سچی کہانیاں **26** مارچ کو موصول ہوگیا، خوش گوار حیرت ہوئی اور جب ٹائٹل پر نظر پڑی تو ایسا لگا کہ سچی کہانیاں نہیں بلکہ کوئی انٹرنیشنل میگزین دیکھ رہا ہوں۔ ٹائٹل بے مثال ہے اور آپ کے پچھلے تمام ٹائٹل سے بازی لے گیا۔ اللہ سچی کہانیاں کو نظر بد سے بچائے۔ حمزہ باجی کا اداریہ موسم بہار کی مبارک باد دے رہا تھا۔ کاشی بھائی کچھ اپنی باتیں سچی کہانیاں میں اِس ماہ کیوں نہیں آئیں۔ آپ کی باتیں پڑھ کر بہت کچھ قارئین کو سیکھنے کو ملتا ہے۔ کاشی بھائی یہ آپ نے احوال میں کیا لکھ دیا۔ آپ نے تو ہمیشہ رائٹر کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ سچی کہانیاں درسگاہ ہے۔ آپ اِس میں بہترین اُستاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر یہ سب کب اور کیسے ہوا۔ خیر آپ ہمت سے کام لیں، پورا بلوچستان آپ کے ساتھ ہے۔ مجھے حکم کیجیے میں ہر ماہ کتنی کاپیاں اپنی ذاتی خرچے پر خریدوں۔ کاشی بھائی قاری اور لکھاری کے گلے شکوے تو نئی زمانہ چلتے رہتے ہیں۔ اگر یہ گلے شکوے ختم ہوجائیں تو پرچے میں رہ کیا جاتا ہے۔ ہمیں آپ کی نیت پر شبہ نہیں۔ ہمیں بہت افسوس ہوا یہ پڑھ کر اب جب سچی کہانیاں کی باگ ڈور جوان خون کے ہاتھوں میں آئی تو سازشی ٹولہ اپنی تخریبی سرگرمی میں سرگرم ہوگیا۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ لوگ اتنے دن تک کس طرح صبر کیے بیٹھے رہے۔ مارچ کا پُراسرار نمبر آپ کو سچی کہانیاں سے دور کرنے والوں کے منہ پر طمانچہ ہے۔ پُراسرار نمبر کی ہر کہانی اپنی مثال آپ ہے۔ دولت کے لے لے، میٹھے پرندے، میں تیرا سایا ہوں، امر پریم، جینے نہیں دوں گی، جمنا داسی، خوفناک سائے، وہ کہانی، پازیب جھولا اور وہ، گنگا کی سمادھی، وہ سنہرے سانپ، موت کا پروانہ، موکل پیر خانے کا، خونی پلیٹ فارم اور خصوصی کہانی سایا کا تحفہ شاندار اور یادگار پُراسرار کہانیاں ثابت ہوئیں۔ سچی کہانیاں کا اِس ماہ ہر ہر صفحہ قابلِ دید ہے۔ اِس شمارے کی سب سے خاص سوغات زہرِ عشق ثابت ہوئی۔ ایک عرصے بعد کسی ناول نے اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے۔ ہم شکل ایم اے راحت کی بھی کمال تحریر ہے۔ چھٹی کرچی میں راحت صاحب کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے اِس بار ہم شکل کا اسکیچ بھی قابلِ دید ہے۔ ناگن بھی اچھا ناول ہے لیکن یہ پہلے بھی کسی اور ڈائجسٹ میں شائع ہوچکا ہے۔ اِس لیے اب اِس میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی (پتا نہیں آپ اِس شائع شدہ ناول کو کیوں دوبارہ شائع کررہے ہیں) نیا سلسلہ ہائیڈ پارک، تیرِ نم کش بھی دلچسپ سلسلے ہیں۔ کاشی بھائی اب اجازت دیں اور نام نہاد رائٹر کے نام ضرور شائع کریں، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

☆ پیارے شعبان! تمہاری محبت کی ہم قدر کرتے ہیں۔ ہمیں صرف تمہاری محبت چاہیے۔ ناگن کا

ہمارا عزم: یونیورسٹیوں۔ دینی مدارس۔ تحقیقی اداروں۔ تربیت گاہوں سے پھوٹنے والی روشنی؛ عوام تک پہنچانا

انتہاؤں میں رابطہ

ماہنامہ

اطراف

کراچی

جولائی 2014ء سے باقاعدہ شائع ہو رہا ہے

اُردو آگہی مضامین مقابلے

ہر ماہ 50 ہزار روپے کے انعامات

کالجوں، یونیورسٹیوں، اور دینی مدارس کے طلبہ حصّہ لے سکتے ہیں

پاکستان کے تمام علاقوں کے لیے الگ الگ انعامات

آخری تاریخ 20 مارچ

تفصیلات ماہنامہ 'اطراف' میں

ماہنامہ اطراف۔ سوئٹ نمبر 508 لینڈ مارک پلازہ، آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی

Ph:32274661 , Mob: 0300-8210636

اپریل 2015ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/ کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

نام: ....

مکمل پتا: ....

....

اپریل 2015ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/ بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کر لیں۔

عنوان کہانی: .... تعداد صفحات: ....

نام: ....

مکمل پتا: ....

....

فون/سیل نمبر: ....

اپریل 2015ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/ کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: .... مصنف: ....

دوم، عنوان: .... مصنف: ....

سوم، عنوان: .... مصنف: ....

نام: .... شہر: ....

اختتام ہوا۔اب خوش ہو۔

✉ لاہور سے حنا بشریٰ تحریر کرتی ہیں، سب سے پہلے اتنا زبردست رسالہ نکالنے پر بہت مبارکباد جو آپ کی اور تمام اسٹاف کی دن رات محنت کا ثبوت ہے۔کاشی بھیا آپ نے اللہ کے کرم سے رسالے کو چار نہیں بلکہ آٹھ چاند لگا دیے ہیں۔خوش رہیں یونہی کامیاب رہیں سدا۔رسالے پر تبصرہ کرنے سے پہلے دو باتیں ضرور کرنا چاہوں گی، پلیز آپ احوال سے غیر حاضر نہ ہوا کریں۔ بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ محفل بے رونق لگتی ہے۔دوسری بات لڑائی جھگڑے پر مبنی خطوط شامل نہ کیے جائیں۔اس سے نہ صرف احوال کا بلکہ سچی کہانیاں کا معیار متاثر ہوتا ہے۔آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ الفاظ جو نا مناسب ہوں وہ شامل نہ کیے جائیں۔اور پلیز ایک دوسرے پر تبصرہ کرنے کی بجائے تحریروں پر تبصرہ کیا کریں۔ جلنے کڑھنے کی بجائے محنت کریں تا کہ ہم بھی ادب میں کوئی اچھا کام کر جائیں۔اب آتے ہیں تحریروں کی جانب۔زہرِ عشق واقعی لاجواب ثابت ہوئی ۔کاشی بھیا تسی گریٹ او، خصوصی کہانی واقعی خاص تھی۔اسماء اعوان ہمیشہ کی طرح بہترین تحریر لائیں، بہت خوب۔میں تیرا سایا ہوں، جمنا داسی، گنگا کی سمادھی، وہ سنہرے سانپ، خونی پلیٹ فارم، امر پریم کمال کی تحریریں تھیں۔دولت لے لے، میٹھے پرندے، چلہ ٹوٹ گیا، جینے نہیں دوں گی، وہ کہانی، خوفناک سائے، وفا ہے شرط، موت کا پروانہ، موکل پیر خانے کا یہ سب تحریریں بے حد سبق آموز تھیں۔سب نے بہت محنت کی، سب لکھنے والوں اور پڑھنے والوں سمیت تمام احوالیوں کو بہت سی دعائیں، اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کا بھی خیال رکھیں۔آخر میں اپنی کہانی شائع کرنے پر بے حد مشکور ہوں اور اپنی بات اس اہم نکتے پر ختم کروں گی کہ محبت کا انداز اپنا اپنا ہوتا ہے۔کسی کے ملکہ یا شہزادہ ہونے سے کوئی فرق نہیں آئے گا۔آئیے پچھلی تمام تلخ باتوں کو بھول کر پھر سے دوستی کر لیں۔ کیونکہ یہ ادب کی دنیا ہے یہاں بے ادبی نہیں چلے گی۔عبدالعزیز جی آ صاحب اللہ آپ پر رحم فرمائے۔اس مشکل گھڑی میں ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔اُم جلال بخاری صاحبہ کو کاشی بھیا کا جواب مزہ دے گیا۔اب اجازت۔

☆ بہت عزیز بشریٰ! آپ کے خط نے سچ مچ بہت محظوظ کیا۔اور آپ کا پورا خط لگا رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ کا خط پڑھ کر لکھنے والے خط کا جامع ہونا اور اختصار کو سمجھ سکیں۔

✉ جہانیاں سے ملک صفدر عباس اعوان کا نامہ احوالیوں کی نذر کرتے ہیں۔فروری کے آخری دنوں کی ایک سہانی شام کو سچی کہانیاں طلوع ہوا۔ٹھنڈے یخ بستہ موسم میں گرما گرم چکن پکوڑا اور ساتھ کشمیری چائے نوش کرتے ہوئے رسالہ پڑھنے کی ابتداء کی۔آگے بڑھے اور کہانیوں کی لسٹ پر جا پہنچے۔اپنی کہانی کو دیکھ کر کاشی بھائی آپ کو گلے لگانے کو جی چاہا۔اشتہارات کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک لمبی جمپ لگائی اور میڈم منزہ صاحبہ کے اداریے پر جا پہنچے۔میڈم واقعی حقیقت کے قریب تر لکھتی ہیں۔ایک اور جمپ لگائی آگے بڑھے مگر کچھ اپنی باتوں میں کاشی بھائی آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ارے بابا کیوں......؟؟ ویسے کبھی کبھی مجھے آپ کے اسٹیمنا پر حیرت ہوتی ہے۔میں تو ایک کہانی لکھ کر ہی اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہوں۔ تھکن محسوس کرنے لگتا ہوں۔آپ تو ایک ساتھ پرچے کا اتنا ڈھیروں کام کر لیتے ہیں۔جلدی سے اب ایک لونگ جمپ لگا کر احوال کی محفل میں آن پہنچے۔سب احوالی تو مجھے بالکل اپنے دوست جیسے لگتے ہیں۔آپ کو بتاتا جاؤں صبح سویرے جب میں واک کی غرض سے اپنی زمینوں پر جاتا ہوں تو اپنے محبوب رسالے کو بھی ساتھ لے جاتا ہوں۔میں اگرچہ تنہا ہوتا ہوں، مگر رسالہ ساتھ ہونے کی وجہ سے بالکل یوں لگتا ہے کہ جیسے تمام احوالی میرے ساتھ چل رہے ہوں۔مختلف پھلوں کے باغات میں سے گزرتے وقت پھل کھانا اور ساتھ رسالہ کا مطالعہ بہت

مزہ دیتا ہے۔ احوال میں خطوط کے ساتھ تصویر والا سلسلہ ختم کر کے ایک طرح سے اچھا ہی کیا۔ کاشی بھائی آپ یقین کریں۔ مجھے تو نظر لگنا شروع ہوگئی تھی۔ اب کیا کروں، بندے کو اتنا ہینڈسم بھی نہیں ہونا چاہیے ناں...... ہا ہاہاہا...... اچھا احوال میں کچھ احوالی خواہ مخواہ کی غیر معیاری، بے جا، فضول کی تنقید کر کے احوال کی محفل کو بے رنگ خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں مس سدرہ انور علی صاحبہ نے بالکل ٹھیک بات کی کہ ہمارے پاس اپنے لیے وقت نہیں ہے لوگ جانے دوسروں پر تنقید کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ تنقید کرنے والوں سے اتنا ہی کہوں گا کہ وہ ایسی باتوں سے اجتناب کریں اور ان پیارے قارئین کے دلوں کو ٹھیس مت پہنچائیں۔ ویسے تو سب احوالی ہی قابل احترام ہیں، نانی فائزہ شہزاد آپ میری نانی بننے کے لیے تیار نہیں ہیں ناں، بس میں آپ سے ناراض ہوں پکا۔ آپ نے جواب کیوں نہیں دیا؟ ابھی کہانیاں کچھ خاص نہیں پڑھ پایا۔ ایم اے راحت کی کہانی ہم شکل جب سے پڑھنا شروع کی ہے، دل و دماغ پر چھا گئی ہے ٹھا کر کے۔ انعامی اشعار کا سلسلہ جو شروع ہوا یہ بیسٹ دی بیسٹ ہے۔ انعام کے طور پر تین ماہ کے لیے مفت رسالہ نے پر سہاگہ والی بات ہوگی۔ لو جی...... خط کا بھی اختتام ہوا اور اس کے ساتھ ہمارے چکن پکوڑے اور چائے کا مگ بھی خالی ہوا۔ کاغذ بھی فل اور ماہدولت کا پیٹ بھی فل......!!

☆☆ ملک صفدر! چکن پکوڑے کھاتے، چائے کا مگ پکڑتے، سچی کہانیاں پکڑتے، پھل کھاتے...... خدا معاف کرے تم انسان ہی ہو نا تمہیں مدید ہمت دے جان ہے تو جہان ہے...... اب تو ہمیں یہ حیرت ہوتی ہے کہ تم جیسا مصروف آدمی ہمیں دن میں پچاس Msg کیسے کر لیتا ہے۔ سلامت رہو۔ لگے رہو بھائی!!

☒ سدرہ انور علی جھنگ صدر سے احوال کا حصہ بن رہی ہیں، عزیز از جان بھیا کاشی چوہان، ڈیئر سسٹرز، برادرز اینڈ آل اسٹاف، اسلام علیکم! حاضر محفل ہوں اس امید کے ساتھ کہ تمام پڑھنے والے انشاء اللہ سلامت ہوں گے۔ جب بھی آتا ہے پُراسرار نمبر تو یوں ملتی ہے خوشی جیسے عید ہو میرے بچپن کی۔ سچی کہانیاں کی 35 سالہ تاریخ میں پہلی بار پُراسرار نمبر کا ایسا خوبصورت ٹائٹل دیکھنے کو ملا۔ ویلڈن۔ کچھ اپنی باتیں نہ پا کر بہت اداس ہوئی۔ اداریہ میں منزہ آنٹی نے بہت خوبصورت انداز میں موسم بہار کی مبارک باد دی۔ احوال میں سب خطوط پسند آئے۔ شائستہ جمال، ثمینہ بھٹی، ندیم فیصل بھٹی، اشفاق شاہین، ملکہ احوال تحسین جونیجو، زرینہ جونیجو، مسز نوید ہاشمی، مقصود احمد بھیا غیر حاضر تھے۔ ذرا مزہ نہیں آیا قسم سے۔ سیدہ دعا شاہ، محمد ندیم عباس، کو احوال میں خوش آمدید۔ ڈیئر کنول خان، سعید گلاب احمد بھیا، فریدہ جاوید آپ کا شکریہ۔ آپ نے ٹھیک کہا یقین کیجیے غزالہ کرن کا خط پڑھ کر میری ایک بوتل خون کی جل گئی تھی، یوں کھلے عام سب کے سامنے کسی پر تنقید کرنا، اس کی انسلٹ کرنا۔ نہ میں نے آج تک کسی پر اس طرح تنقید کی ہے نہ کسی کی خود پر برداشت کر سکتی ہوں۔ خاموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا، ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں۔ منشی محمد عزیز بھیا یہ آپ نے 'طنز' کیا ہے یا مشورہ دیا ہے؟ خیر ابھی تو میں خود اسٹوڈنٹ ہوں۔ ڈیئر سسٹر ارم خان، آپ مجھے سسٹر بھی کہتی ہیں اور تھینکس بھی؟ خیر آپ کا تھینکس میں دل سے قبول کرتی ہوں۔ مور شاہد حسین بھیا کیسے ہو آپ آج کل آپ کی دلچسپی احوال میں ذرا کم لگ رہی ہے خیر تو ہے سب؟ عبدالعزیز انکل آپ کے بیٹے کا سن کر افسوس ہوا، اللہ انہیں جلد صحت یاب کرے گا انشاء اللہ۔ نیئر شفقت کی دولت لے لے، شفیق تنکیکی کی میٹھے پرندے، میز نوید ہاشمی کی میں تیرا سایا ہوں، ملک صفدر عباس اعوان کی امر پریم، صدف آصف کی جمنا داسی، محمد خالد شاہان کی خوفناک سائے، صفدر علی کی وہ کہانی، حنا بشریٰ کی پازیب جھولا، سکندر حبیب گنگا کی سادھی، بہت پُراسرار رونگٹے کھڑے کر دینے والی تحریریں تھیں۔ زہر بھری دنیا سے سلیم اختر کی وہ سنہرے سانپ، شعبان

ہم آپ کے منتظر ہیں

بہت عزیز قارئین!

ہمارا آپ کا ساتھ برسہا برس سے ہے

وقت بدلا، حکومتیں بدلیں، موسم بھی وہ نہ رہے

لیکن

جو چیز پاس رہ گئی

وہ ہے آپ کا اور ہمارا ساتھ

ہماری دُعا ہے کہ

محبتوں اور رابطوں کے یہ بندھن ہمیشہ قائم رہیں

ساتھیو!

ہمارے اور آپ کے رابطے کی منزل تبدیل ہوگئی ہے

ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں

پتا: 88-C II فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121-35893122

اُمید ہے آئندہ آپ کی نگارشات اور محبت سے بھیجے گئے خطوط ہمیں اسی پتے پر موصول ہوں گے

کھوسہ کی وفا ہے شرط، موت کا پروانہ نصرت سرفراز کی، جاوید راہی کی مؤکل پیر خانے، ممتاز احمد کی خونی پلیٹ فارم بہت خوفناک دل کو لرزا دینے والی تحریریں تھیں۔ زہر عشق کی پہلی قسط پسند آئی۔ سچی کہانیاں کا نیا سلسلہ ہائیڈ پارک پسند آیا مگر سخن آباد کو ہٹا دینا اچھا نہیں لگا۔ جولائی میں شائع ہونے والی تحریر میں کون ہوں؟ پر ادارے کی جانب سے ایوارڈ سرٹیفکیٹ پرچے کے ساتھ موصول ہوا اس حوصلہ افزائی اور عزت افزائی پر میں ادارہ سچی کہانیاں کی مشکور ہوں۔ یقین کیجیے میں اس قابل نہیں تھی، پر اللہ پاک کا شکر ہے۔ سچی کہانیاں سے وابستہ تمام لوگ اپنا ڈھیر سارا خیال رکھیے گا، سانسوں نے کی وفا تو پھر ہوگی ملاقات تب تک کے لیے اللہ نگہبان۔

☆ اچھی سدرہ! اب غصہ تھوک دو...... اسی طرح پیارے پیارے تبصرے بھیجو۔ یقین جانو سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔

✉ مسز نوید ہاشمی نارتھ ناظم آباد کراچی سے شریک احوال ہیں، لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے میں شکر گزار ہوں اپنی کہانی اکلوتی کی اشاعت پر اور لوگوں نے پسند کی۔ ابھی میں تیرا سایا ہوں کا انتظار ہے کہ پسند آئی ہے یا نہیں یہ آپ لوگ بتائیں گے۔ فروری احوال میں صفدر علی حیدری اور ممتاز احمد دونوں بھائیوں کا شکریہ یہ سچی کہانیوں سے محبت کو آپ نے محسوس کیا، پیر نوید شاہ اور عبدالعزیز جی دونوں بھائیوں کو جنم دن کی بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔ مور شاہد حسین آپ کی بہن اللہ کے فضل سے ٹھیک ہے، فیصل ندیم السلام علیکم میرے بھائی آپ کیسے ہیں، منشی محمد عزیز میرے بھائی آپ بہت بہت مبارک باد قبول فرمایئے چھوٹے بھائی بہن اور کزن کی شادی کو خوب انجوائے کریں، یاسمین اقبال آپ کے بیٹے کی صحت یابی کے لیے سچے دل سے دعا کرتی ہوں۔ خدا سے امید کرتی ہوں آپ کے بیٹے کی طبیعت ٹھیک ہوگی۔ ہمارے چھوٹے سے قاری اسامہ ندیم کا خط پسند آیا جو بغیر بریک کے اپنی منزل تک پہنچ گیا۔ ممتاز احمد کی کہانی قسمت والے، چمن اعوان کی کیسا یہ میر النصیب پسند آئی۔ عائشہ نورارم نازکی تحریر بھی اچھی تھی، لڑکیوں کے لیے ایک سبق کہ خدایا اپنا جنت جیسا ماں باپ کا گھر کسی کے جھوٹے پیار میں چھوڑ کر مت جاؤ، آگے طوفان ہی طوفان ہے جس کا سامنا ہمارے بچے نہیں ماں باپ کرتے ہیں۔ فرح انیس کی روایات کے قیدی، خطا میری ہے (اب ج) **Sorry** میرے بھائی منشی محمد عزیز ے کی تحریر بے پسند آئی، روبینہ شاہین کی ادھورا پن، ارشد علی کی اسیر محبت اچھی تحریریں تھیں۔ سفرنامے مجھے ہمیشہ سے پسند ہیں، یہ سفرنامہ بھی پسند آیا۔ شمع حفیظ نے ایسا شعلہ تحریر لکھی تھی جو واقعی دل ہلا دیا۔ آنکھیں کھول دیں۔ گدھ بھی عائشہ سلیم گابا کی اچھی لگی۔ جاوید راہی کی تحریر کی تعریف کیے بغیر میرا احوال مکمل نہیں ہوسکتا، آپ لکھتے ہیں اور کیا خوب لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ایم صغیر احمد کی دھوپ چھاؤں بھی ٹھیک تھی، محمد شعیب مجبور اور بشریٰ خان کی حساس تحریریں تھیں۔ چیونٹی تحسین انجم انصاری نے بہت خطرناک لکھی۔ مارچ میں منزہ سہام موسم بہار کے خوبصورت پھول لے کر آئیں جس میں محبت احترام دعاؤں نیک تمناؤں کا تحفہ تھا۔ ہم نے وہ پھول چن لیے ہیں آپ لوگ بھی یہ انمول تحفہ قبول کرلیں۔ اور کاشی چوہان میرے بھائی احوال میں آپ کی موجودگی ہمیں حوصلہ دیتی ہے، اعتماد دیتی ہے۔ آپ کی واپسی پر ہم آپ کو ویلکم کہتے ہیں۔ جو آپ کو اپنا نہیں سمجھتا وہ ہمارا بھی نہیں ہے۔ خط بے حد لمبا ہوگیا ہے۔ اب اجازت چاہوں گی۔

☆ پیاری آپا! سلامت رہیے۔ لیجیے آپ کا پیارا سا تبصرہ بھی شامل احوال ہوا۔

✉ لڈن ضلع وہاڑی سے ہمارے منشی جی...... ہاں ہاں منشی محمد عزیز مئے لکھتے ہیں، اس بار خلاف توقع **26** فروری کو پوسٹ مین کی کال آئی کہ بھائی آپ کا رسالہ آچکا ہے، فوراً ڈاک خانے گیا، جہاں سچی کہانیاں کے عوض ڈاکیے نے نو صد چالیس روپے زر سالانہ کی مد میں طلب کیے، مجھ شدید حیرت ہوئی، ڈاکیا کہنے لگا "بھائی! اگر

آپ واپس بھیجنا چاہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے کہا 'بھیا! پھر تو سارے عاشقوں کے سامنے مجھے گھٹیا اور کم ظرف ثابت کرنا چاہتے ہو۔' ڈاکیے نے حیرت سے پوچھا 'بھائی! وہ کیسے؟' میں نے کہا 'وہ ایسے کہ دوسو روپے کی خاطر اپنے محبوب...... کو واپس بھیج دوں۔' آفرین ہے کاشی بھیا! آپ کی اس مستعدی پر، یونہی ثابت قدم رہیے گا۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ سرورق پر بلی کی آنکھوں والی محترمہ اچھی لگ رہی تھی۔ دوسرے نمبر پر آپ نے خاکسار کا خط رکھا اور جو 'بہت محبت والے' کا خطاب آپ نے دیا ہے تو بس اتنا عرض ہے کہ

اپنا کام ہے صرف محبت باقی اُس کا کام   جب چاہے وہ روٹھے ہم سے، جب چاہے من جائے

ممتاز بھائی! یہ صرف آپ کی محبت اور حسنِ ظن ہے۔ عادل حسین! شادی کی مبارک باد۔ عظمیٰ شکور جی میں نے کب کہا کہ وہ کہانی آپ کے دادا جانی کی ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ سوال گھوم اور جواب گونگلو۔ (نوٹ! یہ محاورہ میرا اپنا ایجاد کردہ ہے) ہم نام جیا جی! جیو ہزاروں سال، بہت مزیدار تھا مختصر سا خط آپ کا۔ ماشاءاللہ جی! تلمبہ سے سیّدہ دعا شاہ! وعلیکم، بہت خوبصورت نام ہے آپ کا۔ کاشی بھیا! ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش کا سلسلہ شروع کر کے بہت سوں کی دعائیں لی ہیں اور احوال کے صفحات کم کر کے آہیں۔ (منشی جی خط بھیجیں، صفحات بڑھ جائیں گے) نیر شفقت کی دولت لے لے، چاہ کن را، چاہ درپیش کی واضح مثال ہے۔ شفق فشکی کی میٹھے پرندے بھی بہت خوبصورت تحریر تھی۔ مسز نوید ہاشمی کی میں تیرا سایا ہوں میں بالآخر قرآن مجید کی آیات مقدسہ کے طفیل آسیب سے جان چھوٹ گئی۔ مبارک علی شمسی کی چلہ ٹوٹ گیا میں کتابت کی غلطی ہے۔ ملک صفدر عباس اعوان امر پریم کے نام سے ہندوؤں کے سات جنم کے عقیدے سے متعلق تحریر لائے ہیں۔ سدرہ انور علی کی جینے نہیں دوں گی میں تو قتل و غارت گری بہت زیادہ ہوگئی۔ **36** پُراسرار اموات! استغفار۔ وہ سنہرے سانپ، محمد سلیم اختر کی اس تحریر سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک سانپ کی بد دعا بھی انسان کی زندگی پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ وفا ہے شرط شعبان کھوسہ بھی سانپوں سے متعلق ایک اچھی تحریر لائے تھے۔ نصرت سرفراز صاحبہ موت کا پروانہ کے عنوان سے تیسری سانپ تھا لائی تھیں، جس میں ایک سانپ نے **22** سال دیوار تلے دبے رہنے کے باوجود بھی سات سمندر پار اپنے شکار کو ختم کر کے دم لیا۔ جاوید راہی حسب معمول ایک بہترین قسم کی تحریر لائے ہیں۔ اسی قسم کا ایک واقعہ ملتان کے قریب پیش آیا، جہاں ایک درگاہ کے جانشین کو قتل کر دیا گیا، وجہ قتل ابھی تک نامعلوم ہے۔ بھائی ممتاز احمد خونی پلیٹ فارم کے عنوان سے پُراسرار کہانی کے ساتھ تھے۔ سایا کا تحفہ اس ماہ کی خاص تحریر تھی، جسے اسماء اعوان صاحبہ نے مصر کے پس منظر میں بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے، خصوصاً اس شاطر چور کا ہار چوری کرنے کا طریقہ بہت زبردست اور منفرد تھا لیکن افسوس کہ بے چارے کی ساری محنت رائیگاں گئی اور سایا اُس سے اپنی محبت کی نشانی لے کر چلتی بنی۔

بے حجابا ہو اگر حسن تو وہ بات کہاں   چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی

☆ بھائی منشی عزیز! آپ کی تجویز پر عمل کر لیا۔ اب خوش۔ آپ کی محبت سر آنکھوں پر۔ اپنا بہت خیال رکھیے۔ یہ تبصرہ نہیں آپ کی سچی کہانیاں سے محبت ہے۔

✉ کنول عمران خان کراچی سے لکھتی ہیں، السلام علیکم! جی سب بہن بھائی، بزرگ، کیسے ہیں آپ سب۔ امید ہے کہ سب خیر خیریت سے ہوں گے اور خوش حال ہوں گے۔ مارچ کا شمارہ ملا بہت زبردست تھا۔ سرورق اتنا خوفناک نہیں تھا خیر ماڈل بڑی پُراسرار تھی۔ احوال میں سب کے خط اچھے لگے۔ سب کی اپنی اپنی رائے اور تجزیات ہیں زبردست۔ اب کہانیوں کی طرف چلتے ہیں۔ جو کہانیاں سب سے اچھی لگیں اُن میں جمنا داسی، وہ کہانی، وہ سنہرے سانپ، وفا ہے شرط، موت کا پروانہ، مؤکل پیر خانے کا زبردست تحریریں

تھیں اور باقی بھی سب نے بہت محنت کی اور اچھا کام کیا۔ سلسلہ وار میں ہم شکل اور ناگن تو ہے ہی زبردست، مگر کاشی بھائی نے تو اس بار کہانی جو لکھی ہے 'زہرِ عشق' وہ تو بڑی خوبصورت انداز کی کہانی ہے۔ لاجواب زبردست۔ اب آگے دیکھیے! کاشی بھائی **Welldone**۔ چلیں خط اتنا لمبا نہیں کرتی۔ سب کو سلام اور دعائیں، زندگی رہی تو پھر احوال میں ملیں گے۔

☆ پیاری سی بہن کنول! تمہارا تبصرہ طویل نہیں بلکہ مختصر اور جامع تھا۔ تمہاری کہانی جلد سچی کہانیاں کا حصہ ہوگی۔

✉ جیجل میتلو کراچی سے کچھ اس طرح عرض گزار ہیں، سچی کہانیاں کے سب ممبران و اسٹاف کو اللہ تعالیٰ اپنی امان میں رکھے، آمین۔ سب سے پہلے شکریہ شکریہ مجھے سچی کہانیاں کی طرف سے بہترین لکھاری کی سند دینے کا۔ واقعی مجھے اور میری فیملی کو بہت خوشی ہوئی۔ میرے سائیں نے کہا مبارک ہو، اور کہا اب یہ فریم کروا کر دیوار پر سجا دو، اب تم بھی کام کرنے لگی ہو۔ واقعی بہت خوشی ہوئی۔ سوچا آپ کو فون کروں لیکن آپ بہت مصروف ہوتے ہیں اس لیے خط لکھ کر شکریہ کہہ رہی ہوں، اب رسالے کا احوال۔ 'پُراسرار نمبر مارچ پڑھا' ہے تو پُراسرار لیکن سرورق کی ماڈل بہت پیاری ہے، نیرَ شفقت کی دولت لے لے، میٹھے پرندے، شفق شیخی، مسز نوید ہاشمی کی میں تیرا سایا ہوں، جاوید راہی کی مؤکل بیر خانے کا، نصرت سرفراز کی موت کا پروانہ، آپ کی زہرِ عشق کی پہلی قسط اچھی لگیں، ہائیڈ پارک نیا سلسلہ اچھا لگا۔ تیر نیم کش بھی اچھا سلسلہ شروع کیا ہے، آخر میں سب کو سلام، منزہ جی کو بہت سلام مبارک ہو سب کو موسم بہاراں، میں نے کہانی بھاگوں والی بھیجی تھی کب تک آئے گی۔

☆ اچھی جیجل! اَڈّی بھاگوں والی ابھی پڑھی نہیں۔ انشاء اللہ جلد پڑھ کر بتائیں گے۔ سند پاکر آپ خوش ہوئیں، ہمارا مقصد پورا ہوگیا۔ ہمیشہ خوش رہیں۔

✉ دیپال پور، اوکاڑہ سے یہ آمد ہے یاسر دکی، کی۔ اپنی پہلی حاضری میں یوں مخاطب ہیں۔ السلام علیکم جناب منزہ سہام صاحب اور جناب مدیر کاشی چوہان صاحب کیسے ہیں امید ہیں کہ آپ ٹھیک ٹھاک خیر و عافیت سے ہوں گے۔ جناب مدیر صاحب میں پہلی مرتبہ احوال میں شریک ہوا ہوں۔ جب میں نے سچی کہانیاں ندیم عباس ڈھکو کے ہاتھ میں اوکاڑہ کے حسین پارک میں، حسین شام کو دیکھا تو فوراً پڑھنے لگا۔ پڑھنے کے بعد سچی کہانیاں دل میں اتر گیا۔ رائٹرز نے تو بہت ہی کمال کر دکھایا۔ اتنا اچھا پیارا سچا میگزین ہے۔ جو ہم نے پہلے نہیں دیکھا۔ میری جناب مدیر کاشی چوہان سے درخواست ہے کہ اس ایک لیٹر کے ساتھ محفل میں میری حاضری قبول فرمائیں اور اسے اپنی محفل میں ضرور جگہ دیں۔ سر میں بھی لکھنا چاہتا ہوں۔ سچی کہانیاں میں مجھے بھی ایک موقع دیں۔

☆ پیارے یاسر، خوش آمدید۔ تم لکھنا چاہتے تو، جم جم لکھو۔ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے اس میں۔ لو تم شامل بھی ہوگئے ہمارے اس احوال میں اپنے تبصرے کے ساتھ۔ اب تو خوش ہونا......

✉ مقصود احمد بلوچ، میاں چنوں سے ہمارے ساتھ ہیں، لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! جناب کاشی چوہان صاحب، سدا خوش رہو۔ ماہنامہ سچی کہانیاں فروری **2015**ء مجھے یکم فروری کو ملا۔ اس دفعہ ٹائٹل بہت ہی خوب صورت تھا۔ بڑے ہی خوب صورت انداز سے لڑکی مسکرا رہی تھی۔ اس دفعہ احوال میں جو لوگ شامل تھے۔ اُن میں سب سے پہلے صفدر علی حیدری، نازیہ بتول رضا، روبینہ شاہین، مختصر تبصرے کے ساتھ۔ اُم جلال بخاری، نازیہ جہانگیر، محمد یوسف لغاری لیہ سے بھائی (سوری) آپ نے واقعی ٹھیک لکھا تھا۔ وہ مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔

مطلب غلطی سے آپ کا نام لکھا گیا تھا۔ پلیز مائنڈ نہیں کرنا۔ مجید احمد جائی ملتان سے، عبدالعزیز جی آ چکوال سے، عائشہ محمد گابا کراچی سے، مور شاہد حسین، شائستہ جمال، سدرہ انور علی جھنگ، ممتاز احمد سرگودھا سے، فیصل ندیم بھٹی، پیاری آپی فریدہ جاوید فری، منشی محمد عزیز، محترمہ عشرت بانو، پیارے دوست شاہد رفیق سہو صاحب اس کے بعد ہمارے پیارے دوست ایم ارشد وفا کے والد محترم جو کہ اس دنیا فانی سے رخصت فرما گئے ہیں جس کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ کراچی سے اسامہ ندیم، اگر آپ کو کسی کی لکھی کوئی بھی تحریر پسند نہیں آئی تو آپ تنقید کریں۔ آپ کا حق بنتا ہے۔ اس طرح نہ ہو کہ آپ کی تنقید سے کسی کی دل آزاری ہو۔ میرا خیال ہے آپ میری بات کو سمجھ گئے ہوں گے۔ ساحرہ ناز خانیوال سے آپ کا لیٹر پڑھا، بہت اچھا لگا آپ کے بارے میں جان کر اور آپ کی باتیں بھی اچھی لگیں جو آپ نے جو آپ نے لکھی تھیں، اللہ پاک آپ کو خوش رکھے۔ جن لوگوں نے مجھے اپنے لیٹر کے ذریعے یاد کیا میں اُن کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں، جن میں ایم اشفاق بٹ صاحب، شاہد رفیق سہو، ایم ارشد وفا، ڈاکٹر طارق محمود آ کاش، فریدہ جاوید فری، بہت شکریہ آپ سب کا۔ آپ کی مہربانی ہوگی کاشی بھائی آپ سے یہ ریکوسٹ کر رہا ہوں، اس دفعہ اسٹوریاں ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ ابھی میں کس کی تعریف کروں اور کس کی نہ کروں۔ مطلب سب بہت اچھی تھیں۔ سخن آباد میں پرنس بابر علی بلوچ اور آخر فریدہ جاوید فری یہ سب سخن آباد میں چھائے رہے۔ آخر پھر اجازت چاہتا ہوں۔ اگر کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔

☆ پیارے مقصود! تبصرہ بہت محنت سے کیا مگر بس یہ کیا کہ اپنی بات کی اور اللہ اللہ خیر صلا...... کچھ تو کہانیوں پہ لکھتے۔

✉ کراچی سے عصمت پروین عظیمی لکھتی ہیں، کاشی! آپ لوگوں نے میری آپ بیتی مرشد کے نام سے چھاپی خوشی ہوئی، کچھ مصروفیت کی وجہ پھر بیٹی سعدیہ حمید کی شادی سترہ جنوری کو ہوئی۔ جس کی وجہ سے دو چار ماہ بعد احوال میں شامل ہوئی ہوں۔ اب تک تمام کہانی اپنی مثال آپ ہیں۔ ہم شکل سلسلہ وار اچھی جا رہی، ایم اے راحت کی۔ باقی بھی اچھی ہیں۔ میں سالانہ خریدار بننا چاہ رہی ہوں۔ امید ہے مایوس نہیں کریں گے۔ اب تک تو میری کہانی کے بدلے میں رسالہ آتا تھا۔ کاشی آپ کو سعدیہ بیٹی کی شادی کی دعوت دی آپ آئے نہیں۔ اچھا نہیں لگا۔ آپ بالکل میرے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہو اور لگتے بھی ہو۔ خوش رہو۔ سچی کہانیاں مارچ میں دولت لے لے نیئر شفقت، میٹھے پرندے، شفق شیکی، ہم شکل ایم اے راحت، زہر عشق کاشی چوہان، سنہرے سانپ، محمد سلیم، موت کا پروانہ نصرت سرفراز سب اچھی تھیں اور دیگر کہانیاں بھی بہت اچھی لگیں۔ 5 ماہ سے ساری کہانیاں پڑی ہیں۔

☆ پیاری آپا! آپ کی سعدیہ یعنی میری بہن کی شادی کے دنوں میں میں سچی کہانیاں کی **Pasting** میں مصروف تھا، میری دعائیں میری بہن کے ساتھ ہیں۔ اپنا بہت خیال رکھیں۔ سالانہ خریداری کے سلسلے میں فوری طور پر آفس فون کر کے سرکولیشن منیجر سے بات کیجیے۔ وہ آپ کا مسئلہ حل کر دیں گے۔

✉ مجید احمد جائی، برقی نامے کے ساتھ احوال میں شامل ہیں، لکھتے ہیں۔ ماہ مارچ کا سچی کہانیاں 28 فروری کو ہمارے دسترس میں آیا۔ سب سے بڑی خوشی یہ ہوئی کہ پرچہ جلدی مل گیا۔ یہی بڑی تبدیلی کی نوید بھی تھی۔ سرورق پر پُر اسراریت پھیلائے دوشیزہ بھلی لگ رہی تھی۔ منزہ سہام کا اداریہ ”مبارک ہو“ پڑھا۔ منزہ سہام صاحبہ بہار آنے کی مبارک باد دے رہی تھیں۔ پیارے کاشی بھائی! یہ کیا آپ آئے اور کچھ اپنی باتیں غائب کر دیا۔ کیوں جی؟ اسی نے تو ہمیں دیوانہ کر دیا تھا۔ ہم پر کرم کیجیے ” کچھ اپنی باتیں“ جاری رکھیں۔ احوال میں آپ کا پیغام غمگین کر گیا۔ میرے بھائی جہاں اچھے نیک دل انسان بستے ہیں وہی بُرے لوگ بھی آ بستے ہیں جو آنے میں

خواتین کی محبوب قلم کار

کئی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ یافتہ **'رفعت سراج'**

رفعت سراج، جن کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

رفعت سراج، وہ قلم کار، جن کو قلم کی حرمت کا پاس، زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔

رفعت سراج، وہ قلم کار جنھیں اپنی تحریر سے دھڑکنیں بے ترتیب کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔

گلابی کاغذ اور زرد پھول کے بعد......

دامِ دل

نئے شاہکار ناول کے ساتھ، آپ کے روبرو

ماہنامہ ''دوشیزہ'' ڈائجسٹ میں ملاحظہ کیجیے۔

نمک برابر ہیں۔ آپ ان کو چھوڑیں، وہ صرف آدھے تیتر، آدھے بیٹر ہیں۔ کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ بس۔ کنول عمران خان، احوال میں صدارت کی کرسی پر براجمان تھیں۔ منشی محمد عزیز مئے، بھائی تبصرہ مختصر تھا آپ خوب جانتے ہیں۔ فرح انیس، شازیہ گل، عادل حسین، عظمیٰ شکور، ایم اشفاق بٹ، سیدہ دعا، اُم جلال، فریدہ جاوید فری، ضرغام محمود، منعم اصغر، سعید گلاب، جمال زیدی، بشیر احمد بھٹی، امام بخش ابڑو، نفیسہ فضل، ارم خان، محمد ندیم عباس، مسز نوید ہاشمی، مور شاہد حسین احوال میں بھلے لگ رہے تھے۔ عزیزم ممتاز احمد سرگودھا آپ جیسے دوست کا ملنا، رب تعالیٰ کی طرف سے عظیم نعمت ہے۔ اور اس کا سہرا سچی کہانیاں کو جاتا ہے۔ جس نے آپ جیسے بہت سے دوستوں سے نوازہ ہے۔ سدا سلامت رہے سچی کہانیاں۔ پیارے تابش دوسری کہانی کا انتظار ہے، کب آرہے ہو کہانی کے ساتھ۔ شاہد رفیق سہو، صاحب ناراض نہیں ہوتے۔ پل دو پل کی زندگی ہے ہنس کر جیو۔ سچی کہانیاں کی جان، ہمارے بزرگ محترم عبدالعزیز جی آ، آپ کا احوال سب سے اعلیٰ اور نمبر ون تھا۔ پیارے احداب کیسے ہیں؟ آپ کی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ محترم رانا شاہد صاحب آپ کی والدہ کا سن کر دلی افسوس ہوا، اب سچی کہانیاں کی طرف لوٹ آئے ناں پلیز۔ مبارک علی شمسی، صفدر علی حیدری، محمد سلیم اختر صاحب احوال میں آپ کی کمی شدت سے رہتی ہے۔ لوٹ آؤ، حاضری یقینی بناؤ۔ پیاری سسٹر سدرہ انور اس دفعہ آپ کا احوال پھیکا پھیکا سا تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ”خونی پلیٹ فارم“ ممتاز احمد کی لکھی تحریر پڑھی۔ مزہ آگیا۔ وفا ہے شرط ”شعبان کھوسہ، عجیب واقعہ تھا سو سال بعد سانپ انسانی روپ میں آگیا اور اس نے نواز کے ساتھ خوب وفا نبھائی۔ گریٹ تحریر۔ میں تیرا سایا ہوں۔ آپ کی تحریر سچ پر مبنی تھی۔ چلہ ٹوٹ گیا“ مبارک علی شمسی، ویلڈن، بُرائی کا انجام ہمیشہ بُرا ہی ہوتا۔ وہ سنہرے سانپ ”محمد سلیم اختر“ کمال کی داستان تھی۔ ایک ایک لفظ تجسس بھرا تھا۔ وہ کہانی ”صفدر علی حیدری“ آپ نے تو کمال کر دیا۔ واقعی آپ میں تمام گر سمائے ہوئے ہیں۔ میٹھے پرندے ”شفق شیکی۔ دولت لے لے“ نیئر شفقت، جینے نہیں دوں گی، سدرہ انور علی، جمنا داسی۔ صدف آصف، پازیب، جھولا اور حنا بشریٰ، گنگا کی سمادھی، سکندر حبیب، اور موت کا پروانہ خوبصورت تحریریں تھیں۔ برطانیہ میں خزاں، محمود شام زبردست۔ زہر عشق ”کاشی چوہان“ آتے ہی چھا گئے۔ پہلی قسط نے ہی رونگٹے کھڑے کر دیے۔ جب تک قسط اختتام پذیر نہیں ہوئی، میری نظریں جمی رہی اور لمحہ لمحہ ڈرتا رہا۔ اپنی زندگی میں پہلی بار میں کسی کہانی سے ڈرا ہوں۔ یہ مکھن والی بات نہیں حقیقت ہے۔ سبایا کا تحفہ، اسما اعوان، اچھی تھی۔ ارے واہ نئے سلسلے بھی شروع کیے گئے ہیں۔ تیر نیم کش، ہائیڈ پارک خوب رہے۔ اب اجازت چاہوں گا، کہیں کاشی بھائی فتح پتی سنبھال ہی نہ لیں۔ سب کو سلام و دعا، اور سچی کہانیاں کے بلندیوں کے بدست دعا ہوں۔

☆ پیارے مجید! تبصرہ شاندار رہا۔ ٹک ٹک پڑھ کر ذرا مزا نہ آیا۔ پلیز اپنی فارم میں واپس آجاؤ۔

✉ ایم ایوب ڈیرہ غازی خان سے لکھتے ہیں، کیسے ہیں آپ مزاج گرامی کیسے ہیں امید ہے فٹ ہوں گے۔ کاشی بھائی میں عبدالغفار عابد چیچہ وطنی کا دوست اور چھوٹا بھائی ہوں جو ڈیرہ غازی خان میں رہتا ہوں۔ میری ملاقات عبدالغفار عابد سے لاہور میں ہوئی۔ ایک دوست کی معرفت سے انہوں نے مجھے سچی کہانیاں ڈائجسٹ پڑھنے اور خریدنے کا جس محبت سے کہا تو میں بھی پڑھنے لگا۔ بہت ہی اچھا اور سچا رسالہ ہے اور میں اس میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں، امید ہے کہ کاشی بھائی آپ مجھے ناامید نہیں کریں گے۔

☆ پیارے بھائی۔ غفار عابد کی محبت کے تو ہم قائل ہیں۔ تم لکھنا چاہتے ہو۔ ضرور لکھو لیکن معیار کا خیال ضرور رکھنا۔

✉ فرح انیس کی آمد کراچی سے ہے۔ لکھی ہیں، مارچ کا خوبصورت شمارہ پہلی تاریخ کو ملا۔ احوال میں

احوال میں شامل ہونے والے نئے احوالی



ارم ناز، کراچی | احسان سحر، میانوالی | سلمان، آزاد کشمیر | یاسر علی، دیپال پور | حسنین کاظمی، منڈی بہاؤالدین | ایم یعقوب، ڈی جی خان

سب خطوط ہمیشہ کی طرح زبردست تھے۔ شکریہ ان تمام قارئین کا جنھوں نے میری تحریر کو پسند کیا۔ ممتاز احمد، شزیہ گل، عادل حسین، ایم اشفاق بٹ، سدرہ انور علی، منعم اصغر بہت شکریہ جناب پسندیدگی کا۔ پُراسرار نمبر تو ہوتا ہی ہمیشہ کی طرح شاندار ہے۔ اس بار بھی زبردست رہا۔ شفق شیخی کی میٹھے پرندے، بہت ہی میٹھا انداز تحریر لیے ہوئے تھی۔ ویلڈن جی! صفدر علی حیدر کی وہ کہانی منفرد تحریر تھی۔ کاشی چوہان کا ناول زہرِ عشق زبردست تھی، چھا گئے ہو آپ ماشاء اللہ۔ سدرہ انور علی کی جینے نہیں دوں گی، مبارک علی شمسی کی چلہ ٹوٹ گیا، نیرّ شفقت کی دولت لے لے، صدف آصف کی جمنا داسی، خالد شاہان کی خوفناک سائے، سکندر حبیب کی گنگا کی سمادھی، ممتاز احمد کی خونی پلیٹ فارم سب ہی زبردست تحریریں رہیں۔ تینوں ناگ بیتیاں دلچسپ تھیں۔ ترِنیم کش میں سب ہی کے اشعار اچھے رہے۔ فرح عالم کا اور فہد نسیم کا شعر بہت پسند آیا۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔

☆ پیاری فرح! سلامت رہو۔ اگلے پُراسرار نمبر کے لیے تمہاری کہانی کے بارے میں جلد مطلع کریں گے۔ تبصرہ شاندار رہا۔

✉ حسنین کاظمی منڈی بہاؤالدین سے پہلی بار احوال کے مہمان ہیں۔ لکھتے ہیں، السلام علیکم سب دوستوں کو میرا اسلام جی۔ کیسے ہیں آپ کاشی بھائی جی۔ سچی کہانیاں تو کمال کا ڈائجسٹ ہے، پڑھتے ہی دل میں اتر گیا۔ 2015ء کا شمارہ مارچ پُراسرار نمبر پڑھا بہت مزا آیا اور سب دوستوں نے اچھا لکھا، سب سے پہلے ایم اے راحت صاحب کی ہم شکل قسط وار اسٹوری بہت شاندار ہے۔ شعبان کھوسہ، ممتاز احمد، نصرت سرفراز، محمد سلیم اختر، محمود شام، حنا بشریٰ بہت ہی حیرت انگیز تحریریں لگیں۔ ان سب کو پڑھ کر ہی میں احوال میں حاضری دینے آیا ہوں۔ سب اپنا خیال رکھیے مجھے اجازت دیں۔

☆ پیارے حسنین کاظمی، اب آئے ہو تو آتے رہنا۔ سچی کہانیاں میں اس بار مہمان ہو مگر اگلے ماہ سے پورے استحقاق کے ساتھ فرد بن جاؤ گے۔

✉ منعم اصغر ڈیرہ غازی خان سے احوال میں شامل ہیں۔ مارچ کا شمارہ دیکھا کاشی چوہان واپس آ گئے ہیں۔ واہ دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا مارچ کا شمارہ حیرت انگیز طور پر دو کو مل گیا شاید مارکیٹ میں ایک کو آیا ہو مگر یقین نہیں تھا کہ دو کو ملے گا خیر بڑی بے تابی سے رسالہ لیا اور عجلت میں گھر پہنچ کر رسالہ کھولا ٹائٹل بہت حسین تھا خیر آگے بڑھے اپنی تحریر نہیں تھی جس سے کچھ افسوس ہوا خطوط میں آئے تو یہاں بھی بہار آئی ہوئی تھی اپنا خط بھی تھا جس سے میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں شاید یہ میرا پہلا خط ہوگا جو آپ کے ہاتھوں میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کہانیوں کے عنوان پر نظر ڈالی تو رونگٹے کھڑے ہو گئے اور احساس ہوا کے ان کہانیوں کے برعکس میری تحریر بہت حقیر تھی خیر محنت کا لفظ موجود تو ہے نا بڑی بیتابی کے بعد آپ کی کہانی منظر عام پر آ گئی مگر مجھے بہت

افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ میں نے نہیں پڑھی وہ ہی کیا اس بار کوئی کہانی نہیں پڑھی جس کے لیے میں آپ سب سے معذرت چاہوں گا تو جناب بات کوئی پریشانی والی بالکل نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ میرے سالانہ امتحان پانچ سے شروع ہو رہے تھے تو وقت بالکل بھی نہیں تھا ہم اپنی کتابوں میں کھوئے ہوئے تھے تو ہم نے رسالہ پڑھا نہیں مگر مارکیٹ سے خرید ضرور لائے اس بار خط لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر آپ کی محبت اور حوصلہ افزائی نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا خیر ایک بار پھر سب سے معذرت اپریل کے شمارے میں انشاء اللہ مارچ اور اپریل دونوں پر تبصرے لکھ کر بھرپور خط ارسال کروں گا اور اللہ مجھے بھی کامیابی عطا کرے آمین۔

☆ پیارے منعم! تمہارا جذبہ محبت بہت پسند آیا ہم اس کی قدر کرتے ہیں قدرت کا انصاف فی الحال ہمارے پاس نہیں آئی اپنی کہانی کے بارے میں تمہارا تجزیہ ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو تم سے سبق سیکھنا چاہیے۔ سیکھنے کے عمل میں عمر کا نہیں حوصلے کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ خوش رہو۔

☒ احوال میں یہ ہمیں بہت پیار اور محبت سے پکارنے والی ہیں، ہماری نگہت غفار صاحبہ! لکھتی ہیں، پیارے بیٹے کاشی، جیتے رہو۔ سلامت رہو۔ شاد و آباد رہو۔ دین و دنیا کی ہر خوشی نیکی اور کامیابی نصیب ہو (آمین ثم آمین) بیٹا جی آج **28-02-15** کو ایک عدد ماہِ مارچ کی سچی کہانیاں اور ساتھ میں (دسمبر **2013**ء) میں میری کہانی 'میں ایک بیٹی ہوں' پر آپ کے ادارے نے مجھے ایک سند سے نوازا ہے۔ میں آپ سب کی اور پیارے قارئین کی دل سے ممنون و مشکور ہوں کہ آپ لوگوں نے مجھے اس قابل سمجھا۔ اللہ اور اُس کا رسول آپ سب پر اپنی رحمتیں نچھاور فرمائے۔ (آمین ثم آمین) رسالہ ہاتھ میں لیتے ہی من موہنی پیاری سی دوشیزہ نے خوبصورت آنکھوں سے ہمیں دیکھا ہم نے مسکرا کر اُن کا خیر مقدم کیا پھر منزہ جی کی 'مبارک باد' وصول کی اور دل کی تمام تر گہرائیوں سے لبوں سے دعاؤں کے پنچھی اڑائے کہ اے مالک دو جہاں اس موسم بہار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر کر دے اس کا اک اک لمحہ امر ہو جائے آپ کی ہماری سب کی زندگیوں میں ایسے ہی بہار کے لمحات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آ جائیں۔ بہاروں کا چمکتا سویرا کبھی خزاں کی اندھیری شب میں نہ بدلے (آمین ثم آمین) پھر ہونہار بیٹے کاشی کا شعبہ نظر آیا 'احوال' واقعی ہمارے پیارے ساتھیوں بزرگوں اور بچوں سب کی خوبصورت محفل لگتی ہے۔ ایک خاندان لگتے ہیں سب۔ اپنی اپنی باتیں ایک دوسرے سے شیئر کرتے ہیں۔ کوئی کس انداز میں تو کوئی کس انداز میں مگر یہ آپ کی نگہت آنٹی، یا نگہت باجی یا نگہت آپ جو بھی سمجھیں ان کا شعبہ ہے۔ 'دعا میں' دل کی گہرائیوں سے نکلیں پر خلوص بے لوث بے غرض دعائیں دینا، سچ آپ لوگ یقین کریں اگر آپ سب صبح سے رات تک مجھے یہ ہی کام دے دیں کہ بس آپ دعائیں دیں...... میں تھکوں گی نہیں، مسلسل دعائیں دیتی رہوں گی، بس اللہ تعالیٰ سے نہایت عجز و انکساری سے دست بدعا ہوں کہ میرا مالک اس گناہ گار کی دعائیں قبول فرمالے۔ (آمین ثم آمین) 'احوال' میں بیشتر خطوط میں کچھ نصیحت اور بہتری کی باتیں پڑھیں جس سے اندازہ لگایا کہ پچھلے دنوں کچھ 'ہلکی پھلکی' سی گڑبڑ ہوئی تھی مگر پیارے پیارے اپنے اپنے سے ایک دوسرے سے محبت کرنے والوں نے بڑی خوبصورتی سے محفل کو پھر سے خوبصورت جگمگاتی گنگناتی مہکتی محفل بنا دیا۔ اللہ کرے ہماری یہ محفل اور محفل سجانے والے ہمیشہ صحت مند سلامت خوش اور مطمئن رہیں، ایک دوسرے کے ہمدرد مونس، غم خوار رہیں۔ (آمین ثم آمین) بھئی میں نے 'احوال' کی ساری محفل چھان ماری مگر فصیحہ، سیاس گل، شمیم ناز، فریدہ جاوید، رضوانہ کوثر، کوثر سعید، شاہ روم اور دیگر اس وقت نام نہیں یاد آ رہے آپ سب بھی اس محفل میں شامل رہیں، اچھا لگے گا۔ بیٹا جی۔ میں 'ہائیڈ پارک' کے لیے ایک نظم اور ایک تحریر بھیج رہی ہوں میری تخلیق ہے۔

☆ عزیز ترین نگہت جی! آپ کی دعائیں اور محبت کے پنچھی ہم تک پہنچ گئے ہیں۔ آپ کی آمد نے بہت

لطف دیا اور لگا احوال میں سب اپنے پھر سے اپنی اپنی سیٹ سنبھالنے کے لیے تیار ہیں۔

☒ ارم ناز کی کراچی سے مختصر تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں، لکھتی ہیں۔ پُر اسرار نمبر ہاتھ میں ہے۔ میری کہانی پر جن لوگوں نے تنقید کی ان سے عرض ہے کہ آئندہ اس سے بہتر لکھنے کی کوشش کروں گی۔ جن لوگوں نے تعریف کی ان کا شکریہ۔ زہرِ عشق زبردست رہی۔ اب آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ مؤکل پیر خانے کا، جاوید راہی اپنے منفرد انداز کے ساتھ تھے، بہت خوب۔ اسماء اعوان، صفدر علی حیدری، شفق شکی، مسز نوید ہاشمی، حنا بشریٰ، سدرہ انور، محمد سلیم اختر، سکندر حبیب، شعبان کھوسہ، نصرت سرفراز۔ تمام لوگوں کی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ نئے سلسلے تیرِ نیم کش، ہائیڈ پارک بہتر رہے بہار کی مبارک باد مل گئی۔ احوال میں نئی بات بھی سامنے آئی، میں پوری طرح بات تو نہیں سمجھ سکی مگر جتنا بھی سمجھ آیا میں تو یہی کہوں گی کہ ایڈیٹر کو یہ حق ہے کہ وہ قابل اشاعت تحریر شائع کرے اور نا قابل اشاعت تحریر رد کردے اس میں چاہے میں ہی کیوں نہ شامل ہوں۔

☆ اچھی ارم! آپ کا مختصر مگر جامع تبصرہ بہت اچھا لگا۔ کہانیاں جلد شاملِ اشاعت ہوں گی۔

☒ احسان سحر، میانوالی سے پہلی بار شاملِ احوال ہو رہے ہیں، لکھتے ہیں۔ 4 مارچ کا دن تھا، ترستی اور پیاسی زمین کو بارش سیراب کر رہی تھی اور ایک عجیب سا سحر طاری تھا۔ بارش سے پیدا ہونے والی آواز سے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ کبھی تو ساری عمر برستی ہیں پھر بھی ہمارے اندر تک کو بھگو نہیں پاتی اور کبھی ایک ہی پل میں جل تھل کر دیتی ہیں۔ سچی کہانیوں سے ہماری خاموش محبت پر دل سے ملامت کی اور کہا کہ توڑ دو اپنی اس خاموش محبت کو اور اظہار کر ہی دو، آخر کب تک خاموش محبت کیے جاؤ گے۔ پر ہم ڈرتے رہے کہ اگر اظہار لفظوں میں کر دیا تو پتا نہیں محبت کا جواب محبت سے ملے گا بھی کہ نہیں۔ اور آخر ہم نے اپنی خاموشی کو توڑ ہی ڈالا اور لفظوں کا سہارا لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ یہ ساکت اور خاموش سے لفظ جن میں پہاڑوں جیسی بلندی، تلوار سے زیادہ طاقت اور سمندروں جیسی گہرائی ہوتی ہے۔ بہار کا موسم ہے اور آہ ایک ہمارے وجود سے خارج ہوئی۔ کبھی ہماری زندگی میں بھی بہار ہوا کرتی تھی اور پھول کھلا کرتے تھے۔ شبنمی پھول جن کی خوشبو سے نا صرف ہمیں تر و تازہ رکھتی تھی بلکہ ہمارے چار سو اپنی مہکار چھوڑتی تھی۔ اب تو صحرا ہے اور صحراؤں میں نہ بہاریں آتی ہیں اور نہ پھول کھلتے ہیں۔ بات لمبی ہوگئی، ہمارا محبت نامہ حاضر ہے اور کوشش یہی ہوگی کہ آتے رہا کریں اگر زندگی نے وفا کی تو۔

☆ ارے ارے...... احسان! ذرا سنبھل کے قدم رکھو۔ پہلے تو خوش آمدید دوسرا یہ کہنا ہے کہ محبت نامے میں سب کچھ تھا مگر تبصرہ کہاں گیا۔ بہار کی خوشبو میں اتنا مت کھونا اب کہ مدار سے ہٹ جاؤ۔ تمہارا اسلوب بہت اچھا لگا۔ سلامت رہو۔ یہ پرچہ آپ ہی کا ہے۔

پیارے احوالیو! لیجیے اس ماہ تک کی ہماری ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی۔

مشکل یہ آپڑی ہے کہ جائیں کدھر میاں
ہم چاہتے ہیں چھوڑ دیا جائے اپنا ساتھ

دل تو چاہتا ہے اب بہت آرام کریں مگر آپ کو پرچہ بھی تو دینا ہے۔ آپ سے آج ایک وعدہ لینا ہے۔ کیجیے وعدہ...... وعدہ کریں کہ آپ اپنی کہانیوں کے ناقد خود بن جائیں اور کہانی کو بار بار پڑھ کر دیکھیے کہ جو کہانی آپ نے لکھی ہے وہ کیا پڑھنے والوں کو یاد رہے گی؟؟ جب آپ اطمینان کر لیں، کہانی ہمیں پوسٹ کر دیں۔

اس ماہ تک کے لیے آپ سے اجازت چاہتے ہیں، اس لیے تاکہ اگلے ماہ آپ سے پھر ملاقات ہو جائے۔ اللہ نگہبان

آپ کا اپنا

کاشی چوہان

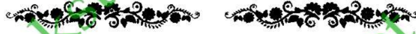


نیلسن منڈیلا



احمد سجاد بابر

تاریک براعظم کا سب سے روشن ستارہ، جس نے آخری وقت تک اپنی قوم کے لیے جدو جہد کی



وہ ایک قانون دان تھا مگر جزیرہ روبن کے قید خانے میں اس کے ساتھ عام قیدیوں کا سلوک کیا گیا۔ اس نے مزدوروں کی طرح بوجھ اٹھایا، جوانی کے سنہرے ستائیس سال صرف اپنی قوم کی آزادی کی خاطر جیل میں گزارے۔ آخر کار وہ جیت گیا، اس کی قوم جیت گئی، انسانیت جیت گئی۔ لاتھر میسٹر کے گیت جیت گئے بلکہ پنجرے میں قید بلبل جیت گئے، امن کی فاختہ اور زیتون کی شاخ جیت گئے...... وہ دنیا میں جہاں بھی گیا، اس کے راستے میں دل اور آنکھیں بچھائی گئیں۔ اسے دیوتا کی طرح پوجا گیا، اس کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ اس نے عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا، اس کی بے مثال جدو جہد رنگ لائی اور 27 اپریل 1994 کو سیاہ فام باشندوں نے پہلی دفعہ ووٹ ڈالے، پھر وہ جیت گئے، جن کو دھرتی کا بوجھ کہا گیا۔ جنہیں غلام بنایا گیا، جنہیں کتوں سے بھی کم تر گردانا جاتا تھا، جن پر جینا تنگ کر دیا گیا، جیت کے بعد اس نے کہا

''آئندہ کبھی نہیں، کبھی نہیں اور کبھی نہیں یہ ہوگا کہ یہ خوبصورت سرزمین کسی طرح کے ظلم و ستم سے دوچار ہو۔ اس قدر شاندار کامیابی پر سورج کبھی غروب نہیں ہوگا۔''

برسرِ اقتدار آ کر امن کے اس پیمبر نے جو کہا وہ تاریخ کا حصہ بن گیا۔

''ہم نے اپنے سفر کا آخری قدم نہیں بلکہ ایک طویل تر اور مشکل شاہراہ پر پہلا قدم اُٹھایا ہے۔ ہماری وابستگی کا حقیقی امتحان اب شروع ہو رہا ہے''

اس عظیم نے انسان اپنے عروج کے دنوں میں اقتدار چھوڑ کر خود کو فلاحی کاموں تک محدود کر لیا۔ اسے امن کا نوبل پرائز دیا گیا۔ دنیا اس عظیم رہنما کو نیلسن منڈیلا کے نام سے جانتی ہے۔

جانے وہ کون سا لمحہ تھا جب اس کے اندر بغاوت کا شعلہ پھوٹا!!!

شاید افریقی پیدا ہونا ہی بغاوت کی بڑی وجہ تھا۔ ایک افریقی بچہ جس ہسپتال میں پیدا ہوتا ہے اس کے گیٹ پر لکھا ہوتا ہے ''صرف افریقیوں کے لیے۔'' وہ جس بس میں گھر جاتا ہے، وہ جس اسکول میں پڑھتا ہے، ان سب پر لکھا جملہ ''صرف افریقیوں کے لیے'' ہی کافی ہوتا ہے جو ان کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ بغاوت ان پر فرض ہے اور یہی کچھ اس عظیم رہنما کے ساتھ ہوا۔

☆☆☆☆

18 جولائی 1918 کو جنوبی افریقہ کے شہر کیپ ٹاؤن سے 800 میل مشرق میں اور جوہانسبرگ سے

550 میل جنوب میں ٹرانسکائی کے دارلحکومت امتاتا کے ایک گاؤں مویزو میں نیلسن منڈیلا نے جنم لیا، ٹرانسکائی جنوبی افریقہ کا وہ علاقائی ڈویژن تھا جس کا رقبہ سوئٹزرلینڈ کے برابر تھا، یہ دریائی اور ندیوں کا علاقہ تھا، اس بچے کا نام "رولہلا ہلا" تھا۔ مقامی زبان میں اس کا مطلب تھا "مصیبت کھڑی کرنے والا" بچے کا قبیلہ تھیمبو تھا، ان کے والد کا نام " گادلا ہنری نیسوا" تھا جو مویزو گاؤں کے چیف تھے۔ وہ ایک سخت مزاج شخص تھے اور اپنے بچوں کو نظم و ضبط سکھانے کے لیے ڈنڈے کا استعمال بھی کرتے تھے۔



نیلسن منڈیلا.....لڑکپن سے جوانی تک کے مختلف انداز

وہ بلا شبہ ایک عمدہ مقرر تھے، نیلسن کے والد نے چار شادیاں کیں، نیلسن کی والدہ کا نام "نوسے کینی فینی" تھا جو نیلسن کے والد کی تیسری بیوی تھی۔ نیلسن کی تین بہنیں تھیں جن کے نام بالوی، نوتنکو اور ماکھوتسوانا تھے۔

ابھی نیلسن منڈیلا بچپن میں ہی تھے کہ ایک معاملے کی تفتیش کے لیے مجسٹریٹ، جو سفید فام تھا، نے نیلسن کے والد کو طلب کیا۔ نیلسن کے والد نے پیش ہونے سے انکار کر دیا۔ اس دور میں یہ بہت بڑی جسارت خیال کی جاتی تھی، مجسٹریٹ نے بغیر کسی تفتیش کے نیلسن کے والد کو قبیلے کی سرداری سے محروم کر دیا۔ یہ بات بھی دلچسپ تھی کہ اس زمانے میں تفتیش کر کے سزا صرف سفید فاموں کو دی جاتی تھی، سیاہ فاموں کو یہ حق حاصل نہ تھا۔

زندگی کی اس کروٹ نے نیلسن کے خاندان کے مالی حالات کو متاثر کیا، وہ اپنی زمینوں کی آمدنی اور مویشیوں سے محروم ہو گئے۔ تنگ حالات کے باعث نیلسن کی والدہ اسے لے کر قونو چلی گئی جو ایک بڑا گاؤں تھا اور جہاں ان کے عزیز و اقارب رہتے تھے۔ نیلسن کے والد مہینے میں ایک مرتبہ ہفتہ بھر کے لیے وہاں، ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ قونو میں ہی نیلسن کے لڑکپن کا آغاز ہوا۔

☆☆☆☆

قونو گھاس سے اٹی ایک تنگ وادی میں واقع تھا۔ جس میں شفاف ندیاں بل کھاتی تھیں۔ یہ جھونپڑوں پر مشتمل گاؤں تھا۔ جس کی آبادی چند سو تھی، جھونپڑے مٹی کی دیواروں پر گھاس ڈال کر بنائے گئے تھے، فرش چیونٹیوں کے بل سے نکلی مٹی سے بنایا جاتا تھا جس پر گائے کا تازہ گوبر لیپ کر دیا جاتا تھا۔ بند جھونپڑے میں صرف ایک دروازہ ہوتا جس سے جھک کر اندر آیا جا سکتا تھا، سڑکیں نہیں تھیں، عورتیں اور بچے درخت کی چھال سے رنگے کمبل اوڑھے رکھتے، گاؤں کے پاس مکئی کے کھیت تھے، گاؤں کے مویشی مشترکہ چراہ گاہوں میں چرتے تھے۔ یہ تمام افریقی نجی زمین کے مالک نہ تھے بلکہ یہ مزارعے تھے جو حکومت کو سالانہ لگان ادا کرتے تھے، علاقے میں دو پرائمری سکول، ایک جنرل سٹور اور دو نہانے کے تالاب تھے، گاؤں کے اکثر لوگوں کا گزارہ مکئی اور کدو پر تھا۔ عورتیں تالاب اور چشموں سے پانی بھر کر لاتیں، مرد اکثر سال کا بیشتر حصہ دور دراز کے فارم ہاؤسز پر گزارتے تھے اور سال میں دو بار گھر آتے۔ افریقی ثقافت محبتوں سے لبریز تھی، وہاں کزن کا تصور نہیں تھا بلکہ چچا، خالہ، ماموں، پھوپھی کے بچے سگے بہن بھائی تصور ہوتے تھے۔ ایسے ماحول میں نیلسن کی تربیت ہوئی، اسے زندگی اور فطرت نے اپنی گود میں پالا، ایسا ماحول جو انتہائی سخت جانی مانگتا تھا اور جس میں کم

خواہشات اور محبتوں کا بسیرا تھا۔ زمین پر چٹائی بچھا کر سونا معمول تھا، مکئی کا آٹا ان کی زندگی کا لازمی اور اہم جز و تھا، جس کو مختلف انداز میں استعمال کیا جاتا تھا، گائے بکریوں کا دودھ اہم چیز تھی جس کے بنا گزارہ نہ تھا۔ ہر چیز اپنے کھیتوں میں تیار کی جاتی تھی۔

نیلسن کو پانچ سال کی عمر میں ہی بھیڑوں اور بکریوں کی دیکھ بھال پر لگا دیا گیا، نیلسن سارا دن جنگلوں اور کھیتوں میں گھوما پھرا کرتا تھا۔ غلیل سے پرندے شکار کرنا، چکنی مٹی کے کھلونے بنا کر کھیلنا، شاخوں سے بیل گاڑی تیار کرنا، بچھڑوں کی پشت پر سواری کرنا، جنگلی شہد اور پھل جمع کرنا، گائے کے تھنوں سے براہِ راست گرم دودھ پینا، شفاف ندیوں میں تیرنا اور ڈوری اور تار کی مدد سے مچھلی پکڑنا...... یہ تھے نیلسن کے مشاغل، جنہوں نے اسے لڑنا سکھا دیا، اس کی قوت برداشت بڑھ گئی۔ تمام بچے ایک ہموار پتھر پر بیٹھ کر پہاڑوں کی ڈھلانوں سے نیچے لڑھکا کرتے تھے، گدھے کی سواری بھی ان کا من پسند مشغلہ تھا۔ لڑکے لڑکیاں مل کر آنکھ مچولی کھیلتے، دن بھر کھیلنا اور رات کو اپنی والدہ سے دیو مالائی کہانیاں یا والد سے اپنے بزرگوں کی تاریخی کہانیاں سن کو خوابوں کی دنیا میں گم ہو جانا، نیلسن کے شب و روز کی داستان تھی۔ نیلسن کے لیے خوف اور ڈر، بھوک اور پیاس بے معنی اشیا تھیں!!

☆☆☆☆

قونو گاؤں میں کچھ ایسے باشندے بھی مقیم تھے جو وہاں کے مقامی نہیں تھے بلکہ وہ مہاجر تھے، جو اپنے علاقے سے لڑائیوں کے نتیجے میں جان بچا کر آئے تھے۔ انہیں "ایمافینگو" کہتے تھے، یہ ترقی یافتہ اور مہذب لوگ تھے، انہوں سے سب سے پہلے عیسائیت قبول کی، بہتر مکانات بنائے اور زراعت کے لیے جدید طریقے اختیار کیے۔ قونو کے مقامی لوگ ان سے حسد کرتے تھے۔ نیلسن کے والد نے عیسائیت قبول نہ کی مگر اس کی والدہ نے عیسائیت قبول کر لی اور ان کا مسیحی نام "فینی" رکھا گیا۔ نیلسن منڈیلا نے بھی عیسائیت قبول کر لی۔ سات سال کی عمر میں نیلسن کو اسکول بھیجے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس وقت تک نیلسن صرف ایک کمبل میں گھوما کرتا تھا جو کندھے کے گرد لپٹا ہوتا اور کمر کے پاس پن سے مضبوط کیا ہوتا تھا۔ نیلسن کے والد نے اپنا ایک پاجامہ کاٹ کر گھٹنوں تک چھوٹا کیا اور نیلسن کو پہنا دیا، ایک رسی اس کی کمر کے گرد لپیٹ کر پاجامہ باندھا گیا۔ نیلسن اس میں مضحکہ خیز نظر آتا تھا مگر گاؤں کے عسرت زدہ ماحول میں اسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھا گیا۔

ایک کمرے پر مشتمل اسکول میں نیلسن نے اپنی تعلیم کا آغاز کر دیا، اسکول میں پہلے دن ٹیچر "اڈنگین" نے تمام بچوں کو انگریزی نام دیا، جو اسکول میں استعمال ہوتا تھا کیونکہ سفید فام یا تو افریقی نام ادا کرنے کے قابل نہیں تھے یا پھر ادا کرنا نہیں چاہتے تھے یا پھر وہ افریقی نام کو غیر مہذب خیال کرتے تھے۔ مس اڈنگین نے ہی رولہلاہلا کو نیلسن کا نام دیا اور پھر یہی نام عمر بھر کے لیے نیلسن کی شناخت بن گیا، جب نیلسن نو سال کا تھا تو اس کے والد کا پھیپھڑوں کی بیماری سے انتقال ہو گیا۔ ننھے نیلسن پر اپنے والد کی وفات کا گہرا صدمہ طاری رہا، اسے اپنی دنیا بدلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اپنے والد کی شخصیت میں وہ خود کو دیکھا کرتا تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد نیلسن کی والدہ نے اسے ناظم "جونگن تابا" کی سرپرستی میں دے دیا جو نیلسن کے والد کا احسان مند تھا۔ وہ نیلسن کو جونگن تابا کے شہر اخی کیزوینی چھوڑ آئی۔ جدا ہوتے وقت اس نے نہ نیلسن کا ماتھا چوما، نہ دعائیں دیں، وہ جانتی تھی کہ اس کی جذباتیت نیلسن کو کمزور کر دے گی، جاتے وقت اس نے نیلسن کو صرف ایک جملہ کہا

''میرے بیٹے، کمر کس لو!!''

اور یہ کہہ کر وہ آنکھوں کی نمی چھپاتی ہوئی چلی گئی، اور نیلسن اپنی پیاری ماں، اپنے پہلے دوست کو فقط دیکھتا رہ گیا۔ زندگی ایک نیا جنم لینے والی تھی!!

☆☆☆☆

نیلسن، اخی کیزوینی کی زندگی میں کھو گیا۔ یہاں زندگی قدرے آسان تھی۔ یہ ایک ترقی یافتہ شہر تھا، لوگ مغربی لباس پہنتے تھے،، اسے قونو کی فضائیں اور اپنی والدہ یاد آتے مگر وہ نئی دنیا میں خود کو مگن کر لیتا، یہاں بھی وہ ایک کمرے کے اسکول جانے لگا جو محل کے قریب تھا۔ وہاں وہ تاریخ، ژہوسا زبان اور انگریزی پڑھتا اور کالی سلیٹ پر اپنے سبق لکھتا، اس کی دوستی ناظم کے بیٹے "

جسٹس "اور بیٹی "نومافو" سے ہوگئی۔ اسے ناظم کے بچوں کی سی عزت ملتی، انہی جیسی غذا اور لباس دیا جاتا۔ ناظم اور اس کی بیوی نے نیلسن کو اپنے بچوں کی طرح پالا۔ جسٹس، نیلسن سے چار سال بڑا تھا، نیلسن اسے اپنا آئیڈیل سمجھتا تھا۔ جسٹس ایک باصلاحیت اور ہر دلعزیز نوجوان تھا، اگرچہ اس کی عادات نیلسن سے متضاد تھیں لیکن نیلسن پھر بھی اسے پسند کرتا تھا۔ ناظم اور اس کی بیوی نیلسن کو ایک کامیاب اور اچھا انسان بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی غلطیوں پر اسے ٹوکتے اور اسے مذہب سے قریب کرنے کے لیے اس پر سختی بھی کی جاتی۔ نیلسن ہر اتوار ناظم کے ساتھ چرچ جاتا، غرضیکہ نیلسن کی تراش خراش جاری تھی!!

نیلسن کے اندر آزادی کا پہلا شعلہ کب بھڑکا، کب اسے احساس ہوا کہ وہ غلام ہیں، اس کے بارے میں حتمی کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا، البتہ ایک تقریب میں قبیلے کے چیف کے میلگ کیلی کی تقریر شاید اس کے اندر رچ بس گئی مگر چپ کا بنگل مار کے کہیں اندر کنڈلی مار کے بیٹھ گئی، چیف کے بیٹے نے کہا

''ہم سارے جنوبی افریقی ایک مفتوح قوم ہیں، ہم اپنے ہی ملک میں غلام ہیں، ہم اپنی ہی سرزمین پر مزارعے ہیں، ہمارے پاس کوئی قوت نہیں، کوئی طاقت نہیں، اپنی ہی جنم بھومی میں ہمیں اپنی ہی قسمت پر کوئی اختیار نہیں، میں جانتا ہوں کہ خدا حاضر و ناظر ہے اور بھی نہیں سوتا لیکن مجھے شک ہے کہ خدا اونگھ رہا ہے (نعوذ باللہ)، اگر یہی معاملہ ہے تو جتنا جلد میں مر جاؤں، بہتر ہے، کیونکہ پھر میں اس سے مل سکتا ہوں اور اسے جھنجھوڑ کر بتا سکتا ہوں کہ ژہوسا قوم کے پھول مر رہے ہیں۔''

چیف کی باتوں پر جوش میں آنے کی بجائے اس وقت نیلسن نے دل میں چیف سے ناراضی محسوس کی، اس کے خیال میں سفید فام ان کے محسن ہیں اور چیف ناشکرا ہے اور بے خبر ہے۔ چیف کے الفاظ نے نیلسن کے اندر چپکے چپکے جڑ پکڑ لی اور ایک دن اسے احساس ہوا کہ اس دن غافل اور بے خبر چیف نہیں بلکہ وہ خود تھا۔

پانچویں کلاس پاس کرنے کے بعد ناظم نے اسے نئے بوٹوں کا تحفہ دیا، نیلسن کی اگلی منزل ٹرانسکائی میں کلارک بری انسٹی ٹیوٹ تھا جو افریقیوں کی تعلیم کا سب سے اعلیٰ ادارہ تھا۔ اس ادارے میں ٹیکنیکل کورسز بھی کرائے جاتے تھے، ناظم کود اور اس کا بیٹا جسٹس بھی یہاں کے فارغ التحصیل تھے۔ نیلسن کو اسکول کے گورنر ہیرس کے سامنے پیش کیا گیا، ناظم اسے ہیرس کے حوالے کر کے رخصت ہو گیا، اس کالج میں آکر اسے سب سے پہلا احساس یہ ہوا کہ یہاں صرف قابلیت کی بنیاد پر آگے نکلا جا سکتا ہے اور عزت پائی جا سکتی ہے، یہاں حسب نسب نہیں چلتا، کلاس میں اپنے پہلے دن کو نیلسن یوں بیان کرتا ہے۔

''اپنے ساتھی طل کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر میں پہلی منزل پر گیا جہاں کلاس روم واقع تھے۔ ہمارے کمرے کا چوبی فرش خوبصورتی سے پالش کیا گیا تھا، کلاس کے اس پہلے دن میں نئے بوٹ پہن کر گیا۔ اسے پہلے میں نے کبھی اس قسم کے بوٹ نہیں پہنے تھے، اس روز کلاس میں اس گھوڑے کی طرح قدم اٹھاتا تھا جسے نئے نئے نعل لگے ہوں۔ مجھے سیڑھیاں چڑھنے میں کئی بار دقت ہوئی اور میں گرتے گرتے بچا۔ جب میں کلاس روم میں داخل ہوا، میرے چمکیلے بوٹ چوبی فرش پر بجتے تھے، ایک لڑکی نے با آواز بلند کہا۔

''دیہاتی لڑکا بوٹ پہننے کا عادی نہیں ہے۔''

ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا اور میں غصے اور گھبراہٹ سے کھول اٹھا۔

☆☆☆☆

نیلسن انیس سال کا تھا جب اس نے ہیلڈ ٹاون میں ''ویزلیان کالج'' میں داخلہ لے لیا۔ یہ ایک بہت بڑا افریقی تعلیمی ادارہ تھا جس میں ایک ہزار سے زائد طلباء تھے۔ یہاں کی زندگی بہت سخت تھی۔ صبح سویرے خشک ڈبل روٹی اور چینی کے شربت سے ناشتا کرنا، دوپہر تک کلاس روم، اس کے بعد مکئی کے دلیے، کھٹے دودھ اور پھلیوں پر مشتمل لنچ کا وقفہ، شام کو سات سے نو بجے تک دوبارہ پڑھائی اور کلاس کا سلسلہ، یہی کل حیات تھی جس کے دائرے میں نیلسن گھوم رہا تھا۔ کالج کی زندگی کا سب سے مشکل مرحلہ وہ تھا جب انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ سنڈے لنچ لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے کریں گے اور اس میں

باقاعدہ چھری کانٹے کا استعمال کیا جائے گا۔ نیلسن چھری کانٹا استعمال کرنا نہیں جانتا تھا۔ وہ لڑکیوں کی نظر میں مضحکہ خیز دکھائی دینے سے بچنے کے لیے ہر سنڈے کو بھوکا ہی ڈائننگ ہال سے باہر آجایا کرتا تھا۔ اسی کالج میں نیلسن نے طویل فاصلے کی دوڑ میں حصہ لینا شروع کیا، اس کے علاوہ باکسنگ بھی شروع کردی۔ جلد ہی نیلسن ''پری فیکٹ'' منتخب کرلیا گیا اور ان کے ذمہ اہم امور لگا دیئے گئے۔ انہوں نے کئی چور طلبا کو پکڑنے میں مدد کی۔ اسی ادارے میں وہ اہم دن بھی آیا جب عظیم افریقی شاعر اور داستان گو ''کرونی امخائی'' یہاں آیا، اس دن کالج میں چھٹی کا اعلان کردیا گیا تھا۔ کرونی امخائی کا خطاب سننا کئی لحاظ سے اس کے لیے الجھن اور مایوسی کا سبب بنا کیونکہ وہ اپنی شخصیت اور نظریات میں متضاد ثابت ہوا۔ 1960 میں نیلسن کو یونیورسٹی کالج آف فورٹ ہیر میں داخلہ مل گیا۔ یہ کالج بلدیہ ایلس میں تھا اور افریقی طلبا کے لیے اعلیٰ تعلیم کا واحد اقامتی مرکز تھا۔ یہ افریقی طلبا کے لیے آکسفورڈ اور کیمبرج کا مقام رکھتا تھا۔ اکیس سالہ نیلسن یونیورسٹی ڈگری کی منزل کے قریب تھا۔ یہاں نیلسن نے نہ صرف تعلیمی بلکہ کھیل کے میدان میں بھی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا، وہ فٹ بال اور دوڑ کا اچھا کھلاڑی ثابت ہوا، یہیں نیلسن نے زندگی کا سب سے بڑا سبق سیکھا کہ صلاحیت سے زیادہ تربیت کی اہمیت ہے، صلاحیت موجود ہے مگر مناسب تربیت نہیں ہے تو کامیابی کوسوں دور کھڑی نظر آتی ہے۔ نیلسن نے اس کلیے کو تھام لیا اور کامیابیاں سمیٹتا چلا گیا۔ فورٹ ہیر میں نیلسن نے ڈرامہ سوسائٹی میں بھی فعال شرکت کی اور خود کو منوایا۔ اس کے علاوہ وہ طلبا کے ہمراہ اتوار کو قریبی دیہاتوں میں جا کر بائبل کے درس بھی دینے لگا۔ یہ وہ دور تھا جب کوئی افریقی کسی سفید فام کے ہوٹل میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ غلامی کی زنجیریں بدن کی رگ رگ کو جکڑے ہوئے تھیں۔ فورٹ ہیر ہی میں نیلسن نے پہلی مرتبہ پتلون پہننا شروع کی جو شروع میں تو اسے غیر آرام دہ لگی مگر پھر وہ اس کا عادی ہوتا چلا گیا۔ اسی جگہ نیلسن نے پہلی مرتبہ ٹوتھ پیسٹ اور برش استعمال کیا ورنہ اس پہلے وہ راکھ سے دانت صاف کرتا چلا آیا تھا۔ باقاعدہ واش روم میں شاور سے نہانے کا پہلا اتفاق بھی یونیورسٹی لائف میں ہی ہوا۔ ان دنوں دوسری جنگ عظیم جاری تھی اور نیلسن برطانیہ کا حامی تھا۔ نیلسن کی زندگی جاری تھی، وقت اور زمانہ اس کی تربیت کررہا تھا اور یہی اس کے بڑے استاد تھے۔

☆☆☆☆

فورٹ ہیر میں ہی نیلسن نے اپنی پہلی سیاسی سرگرمی میں حصہ لیا۔ طلباء کی سب سے بڑی تنظیم ''ایس آر سی'' نے نیلسن کو اپنے نمائندے کے طور پر نامزد کردیا۔ ایس آر سی کے الیکشن امتحانات کے دوران منعقد ہوئے، طلبا کی اکثریت نے انتخابات کا بائیکاٹ کردیا کیونکہ طلبا پہلے ایس آر سی کے اختیارات بڑھوانے کے لیے مہم چلانے کے حق میں تھے۔ نیلسن بھی بائیکاٹ کے حق میں تھا۔ صرف پچیس طلبا نے ووٹنگ میں حصہ لیا، نیلسن بھی منتخب ہوگیا لیکن اس نے استعفیٰ دینے پر غور شروع کردیا۔ باہمی مشاورت سے نئے منتخب کردہ چھے اراکین نے اپنے استعفے انتظامیہ کو پیش کردیے جو منظور کرلیے گئے اور نئے الیکشن اگلے روز ڈنر کے بعد کروانے کا اعلان کردیا گیا۔ نئے الیکشن میں بھی وہی چھے اراکین منتخب ہوگئے جنہوں نے استعفے دیے تھے، جن میں نیلسن بھی شامل تھا۔ نیلسن نے دوسری مرتبہ بھی استعفیٰ دے دیا مگر اس کے بقیہ پانچ ساتھیوں نے استعفیٰ نہ دیا۔ نیلسن کا اصولی موقف یہ تھا کہ ہمیں تمام طلبا نے ووٹ نہیں دیا بلکہ صرف پچیس طلبا نے ووٹنگ میں حصہ لیا ہے، لہٰذا ہم متفقہ منتخب کہلوانے کا حق نہیں رکھتے، اس لیے ہمیں سیٹ چھوڑ دینی چاہیے۔ اصولوں کی اس جنگ میں نیلسن تنہا رہ گیا۔ اگلے روز پرنسپل کے سامنے نیلسن کی پیشی ہوئی اور اسے استعفیٰ واپس لینے کا کہا گیا بصورتِ دیگر اسے کالج سے نکال دینے کی دھمکی دی گئی۔ اسے ایک رات کی مہلت دی گئی۔

وہ رات انتہائی بھاری گزری۔ اگلے روز دوبارہ اسے پرنسپل آفس طلب کیا گیا تو نیلسن اپنے اصولی موقف پر اڑا ہوا تھا، اس نے فیصلہ اپنے ضمیر کی روشنی میں کیا تھا۔ پرنسپل نے گرمیوں کی تعطیلات کے بعد اس کے کالج آنے کو اس شرط سے مشروط کردیا کہ اسے یہ عہدہ

قبول ہو تو تعطیلات کے بعد خزاں سمسٹر میں کالج کے دروازے کھلے ہیں، ورنہ وہ آنے کی زحمت نہ کرے۔ زندگی نئی کشمکش اختیار کر رہی تھی۔

☆☆☆☆

''احمی کیزونی'' پہنچنے پر ناظم کی طرف سے ایک نیا حکم شاہی اس کا منتظر تھا۔ نیلسن کی شادی ہو رہی تھی، اس کے لیے لڑکی انتخاب بھی کیا جا چکا تھا اور دلہن کی قیمت بھی ادا کی جا چکی تھی (جسے مقامی زبان میں لوبولا کہتے تھے)، نیلسن کی بیوی کے لیے مقامی پادری کی بیٹی کو چنا گیا تھا۔ یہ ایک اعلیٰ خاندان تھا، نیلسن دل و جان سے اس شادی کے لیے تیار ہو گیا۔ مگر اسے شبہ تھا کہ اس کی ہونے والی بیوی کسی اور کو چاہتی ہے، نیلسن نے اس شادی کو رکوانے کے لیے دل و جان کا زور لگایا مگر ناظم ماننے کو تیار نہ تھا۔ لہٰذا نیلسن نے اپنے دوست جسٹس کے ساتھ جوہانسبرگ بھاگنے کا منصوبہ بنایا۔ چند کپڑے اور جمع پونجی ایک سوٹ کیس میں ٹھونس کر ناظم کے قصبے سے باہر جانے کا انتظار کیا جانے لگا۔ یہ موقع اس وقت ملا جب ناظم ایک صبح قانون ساز اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے ''بنگھا'' روانہ ہو گیا۔ جب نیلسن اور جسٹس فرار ہو رہے تھے تو عین اسی لمحے ناظم واپس آ گیا اور انہیں دوڑ کر مکئی کے گٹھوں میں چھپنا پڑا۔ ناظم کے جانے کے بعد انہوں نے اپنا سفر شروع کیا، رقم کا انتظام وہ ناظم کے دو بیل بیچ کر پہلے ہی کر چکے تھے۔ ایک ٹیکسی کرائے پر لے کر وہ ریلوے اسٹیشن پہنچے جہاں سے جوہانسبرگ کی ٹرین ملنا تھی۔ وہاں جا کر ان پر انکشاف ہوا کہ ناظم پہلے ہی اسٹیشن ماسٹر کو ان کے حلیے بتا کر جوہانسبرگ کے ٹکٹ دینے سے منع کر چکا تھا، وہ ٹیکسی کے ذریعے پچاس میل دور اگلے اسٹیشن پر پہنچے جہاں سے وہ کوئنز ٹاؤن کی ٹرین پکڑنے میں کامیاب ہوئے۔ 1940 کا عشرہ افریقیوں کے لیے سفر کے لحاظ سے مشکل دور تھا۔ ہر افریقی کو اپنے ساتھ ایک پاس رکھنا پڑتا تھا، جو کسی بھی پولیس مین، سول ملازم کو دکھانا پڑ جاتا تھا۔ اس کے پاس میں اس کی تمام تفصیلات درج ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ پول ٹیکس کی ادائیگی کی تفصیل بھی درج ہوتی تھی۔ یہ وہ ٹیکس تھا جو صرف افریقیوں پر لاگو تھا۔ اس کے علاوہ ان کو اپنے ضلع سے باہر جانے کے لیے بھی اجازت نامہ درکار ہوتا تھا۔ نیلسن اور جسٹس کے پاس نہ تو اجازت نامہ تھا، نہ ہی 'مقامی پاس' تھا۔ ان کا منصوبہ کوئنز ٹاؤن اتر کر وہ کاغذات تیار کروانے کا تھا۔ جہاں ناظم کا بھائی 'امپونڈؤ' رہائش پذیر تھا، جو نیلسن سے بہت محبت کرتا تھا۔ نیلسن نے اسے اصل بات تو نہ بتائی بلکہ یہی کہا کہ وہ ناظم کے ایک کام سے جا رہے ہیں، چیف امپونڈو انہیں مجسٹریٹ کے پاس لے گیا، جس نے انہیں کاغذات تو بنا دیے مگر ساتھ ہی تصدیق کے لیے امتاتا کے چیف مجسٹریٹ کو فون کر دیا جہاں ناظم خود بھی موجود تھا، اس طرح ان کا بھانڈا پھوٹ گیا اور مجسٹریٹ نے بے عزت کر کے ان کو بھگا دیا۔ ان کے مسئلے کا حل کچھ یہ نکلا کہ ایک سفید فام بڑھیا اپنی گاڑی پر جوہانسبرگ جا رہی تھی، وہ پندرہ پونڈ کے بدلے ان کو ساتھ لے جانے پر تیار ہو گئی۔ اس طرح دونوں دوست جوہانسبرگ پہنچ گئے۔ جوہانسبرگ سونے کی کان کا سب سے بڑا مرکز، بازو کشادہ کیے ان کا منتظر تھا۔ وہ شہر جس میں روشنیاں رقص کرتی تھیں اور جو ہمیشہ سے نیلسن کا خواب رہا تھا

☆☆☆☆

جوہانسبرگ پہنچ کر نیلسن کو ایک سفارش کے باعث سونے کی کان میں ''پولیس مین'' لگا دیا گیا۔ اس کا کام ڈیوٹی کے اوقات میں مزدوروں کے کاغذات چیک کرنا تھا۔ دن اچھے گزر رہے تھے لیکن ایک دن وہ ایک دوست کے سامنے شیخی مار بیٹھا کہ کس طرح انہوں نے ناظم کو چکمہ دیا، اس دوست نے ان کا بھانڈا پھوڑ دیا، ان کے پاس کوئی اجازت نامہ تو تھا نہیں، اس وجہ سے انتظامیہ نے ناظم کو خط لکھا، ناظم نے جواب میں انہیں واپس بھیجنے کو کہا۔ انہیں کان کی نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔ اب نیلسن اور اس کا دوست جسٹس در بدر ہو چکے تھے۔ آخر کار نیلسن کو ایک قانونی فرم میں کلرک کی نوکری مل گئی اور اس نے ساتھ ساتھ یونیورسٹی آف ساؤتھ افریقہ سے بی اے کرنا بھی جاری رکھا۔ فرم کا مالک ''سائڈل سکائی'' ایک ہمدرد اور نیک انسان تھا۔ وہ ساتھ ساتھ نیلسن کی قانونی تربیت بھی کر رہا تھا۔ قانونی معاملات میں نیلسن کو ساتھ رکھا جاتا اور اکثر کام اس کے ہاتھ سے ہی کروائے جاتے

تا کہ اس کی اچھی ٹریننگ ہو سکے۔ مالی مشکلات ابھی بھی نیلسن کے سر پر اپنے پر پھیلائے رکھتی تھیں۔ بس کا کرایہ بچانے کے لیے وہ صبح شام چھ میل پیدل چلتا، کئی کئی دن چند لقمے خوراک کے سوا کچھ نہ ملتا۔ اکثر بھوک اپنے پنجے پھیلائے رکھتی۔ مسٹر سائڈل سکائی نے اسے اپنا ایک پرانا سوٹ دے دیا جسے رفو کروانے کے بعد نیلسن پانچ سال تک روزانہ پہنتا رہا۔ آخر میں سوٹ تو نظر نہ آتا البتہ پیوند ہی پیوند نظر آنے لگے۔ زندگی اس طرح چڑھائی کا سفر طے کر رہی تھی۔ لڑکھڑاتی اور گرتی پڑتی!!

یہیں نیلسن کو ایلن نامی اسکول ٹیچر سے محبت ہوگئی۔ وہ ایک ساتھ نظر آنے لگے۔ نیلسن کے جاننے والوں نے محض اس وجہ اس ناک بھوں چڑھائے کہ وہ لڑکی نسلاً ''شانگان'' قبیلے سے تھی جو کم تر سمجھا جاتا تھا۔ نیلسن کے جاننے والے اسے کسی ''ژہوسا'' قبیلے کی لڑکی سے تعلقات کا مشورہ دیتے تھے جو ایک اعلیٰ قبیلہ شمار کیا جاتا تھا۔ ایلن نیلسن کے لیے امید اور حوصلے کا ذریعہ تھی۔ اس میں بیک وقت ایک ماں، ایک نگہبان، ایک رومانی دوست کے روپ پوشیدہ تھے۔ لیکن چند ماہ بعد ایلن خود ہی پیچھے ہٹ گئی جس کا نیلسن کو بہت افسوس ہوا۔ زندگی اپنی ڈھب سے چلے جا رہی تھی۔ ناظم کی اچانک وفات کی اطلاع نیلسن کے لیے زندگی کا ایک اندوہناک واقعہ ثابت ہوئی، کتنی جلدی وقت نے کروٹ بدل لی تھی کہ مناظر پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔

☆☆☆☆☆

1942 میں نیلسن نے بی اے کرلیا۔ یہ ایک اہم کامیابی تھی۔ قانونی فرم میں جہاں سائڈل سکائی علم کی اہمیت پر زور دیتے تھے اور اسے تمام مسائل کا حل سمجھتے تھے، وہیں گاؤر جیسا فرد بھی موجود تھا جو مسائل کا حل افریقن نیشنل کانگریس میں شمولیت کو سمجھتا تھا۔ وہ نیلسن کو سمجھاتا رہتا کہ آزادی کے لیے تعلیم کی بجائے عملی اقدامات زیادہ ضروری ہیں۔ گاؤر کے اندر آزادی کی تڑپ تھی اور یہی اس کی زندگی کا اولین مقصد تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ انقلاب کے سوا کسی چیز کا نہیں سوچتا۔

نیلسن نے افریقن نیشنل کانگریس کے اجلاس میں شرکت شروع کر دی۔ شروع میں وہ صرف مشاہدے کی غرض سے شرکت کا ارادہ رکھتا تھا۔ زیر بحث معاملات کو سمجھنا اور کارکنوں کی سرگرمی دیکھنا اس کا مقصد تھا۔ اسی دوران ایک موقع ایسا آیا کہ نیلسن محض خاموش تماشائی بن کر نہ رہ سکا، بسوں کے کرائے چار پنس سے پانچ پنس کر دینے کے خلاف مارچ کیا گیا جس میں نیلسن نے بھی حصہ لیا۔ وہ تحریک کا حصہ بن چکا تھا۔ یہ ہڑتال کامیاب رہی۔ بسیں خالی دوڑتی رہیں اور آخر کار کرایہ دوبارہ چار پنس کر دیا گیا۔ مسٹر سائڈل سکائی نیلسن کو سیاست میں آنے سے منع کرتے تھے اور صرف ایک اچھا قانون دان بننے کو کہتے تھے۔

''تم اپنے مؤکل کھو بیٹھو گے، تم دیوالیہ ہو جاؤ گے، تمہارا خاندان ٹوٹ پھوٹ جائے گا اور تمہارا خاتمہ جیل ہوگا۔ یہ حشر ہوگا اگر تم سیاست میں پڑ گئے تو......''

مسٹر سائڈل کے الفاظ اس کا پیچھا کرتے تھے۔

نیلسن نے قانون کی تعلیم کے لئے ''یونیورسٹی آف ود واٹر سرانڈ'' میں داخلہ لے لیا جس کا مختصر نام ''وٹس'' تھا۔ لاء فیکلٹی میں وہ واحد سیاہ فام طالب علم تھا۔ اسی یونیورسٹی میں اسے احساس ہوا کہ سفید فام انہیں انسان نہیں سمجھتے۔ نیلسن سے کئی بار تعصب بھرا سلوک ہوا، اس کے کئی سفید فام کلاس فیلو اس کے پاس بیٹھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ سفید فام افریقیوں کو ''کافر'' کہتے تھے کیونکہ وہ عیسائی نہیں تھے۔ نیلسن کے ایک لاء پروفیسر برملا کہتے تھے کہ افریقی قانون پڑھنے کے لیے پیدا نہیں کیے گئے کیونکہ وہ نظم وضبط کے پابند نہیں ہیں۔

نیلسن نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو اسے احساس ہوا کہ کالوں کو انسان نہیں سمجھا جاتا، ان کی آبادیاں الگ، ہسپتال الگ، اسکول بہت کم اور وہ بھی الگ، سفر کے لیے گاڑیاں الگ، پاس نہ ہو تو ایک لمحے میں جیل کا عذاب، راہ چلتے ذلیل کرنا آسان...... یہ کوئی غیبی اشارہ نہیں تھا، نہ ہی الہام تھا جو نیلسن پر وارد ہوا بلکہ یہ تو چاروں طرف بکھرا سچ تھا، جس نے اس کے اندر تلخی بھر دی۔

1943 میں ''انٹون لمیڈی'' سے ملاقات ایک نئے سفر کا نقطہ آغاز تھا۔ لمیڈی ایک افریقی وکیل تھا اور افریقن کانگریس کے بانی ڈاکٹر پکسلے کا شریک کار تھا۔ وہ

کہتا تھا کہ افریقہ سیاہ آدمی کا براعظم ہے۔ اسے سیاہ فاموں کے احساسِ کمتری سے نفرت تھی اور وہ اسے آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا۔ لمیڈی کے خیالات نے نیلسن کو اندر سے بدل دیا، وہ بھی سفید فاموں کو مہذب سمجھتا تھا اور ان میں کشش محسوس کیا کرتا تھا، لمیڈی سے ملنے کے بعد نیلسن کو آزادی کا واحد راستہ عسکریت پسندی اور بندوق اٹھانے میں نظر آنے لگا۔



نیلسن منڈیلا اپنی فیملی کے ساتھ خوشگوار موڈ میں، ایک یادگار تصویر

☆☆☆

اسی دوران نیلسن نے "ایولین" نامی لڑکی سے سول کورٹ میں شادی کر لی۔ وہ نرسنگ کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ 1946ء، کان کنوں نے ہڑتال کر دی، ہزار افریقی کان کن ہڑتال پر چلے گئے، ان کا مطالبہ تھا کہ ان کی اجرت دو شلنگ روزانہ سے بڑھا کر دس شلنگ مقرر کی جائے، خاندان کے لیے رہائش اور سال میں دو ہفتے کی با اجرت رخصت دی جائے، ان کے مطالبات نا منظور کر دیے گئے۔ حکومت نے بے رحم کارروائی کی، لیڈر گرفتار کر لیے گئے، کئی کارکن تشدد سے ہلاک ہو گئے، حکومت کے بہیمانہ تشدد سے ہڑتال ناکام بنا دی گئی۔ کان کن یونین کچل دی گئی۔ اسی دوران نیلسن اور ایولین آرلینڈو ویسٹ میں کرائے کے گھر منتقل ہو چکے تھے۔ چھوٹا سا بیڈ روم، ٹین کی چھت، سیمنٹ کا فرش، ایک تنگ باورچی خانہ اور ایک مشکیزے جتنا واش روم...... یہ تھا گھر کا کل اثاثہ، مگر یہ بھی غنیمت تھا کیونکہ یہ نیلسن کا پہلا گھر تھا۔ روشنی کے لیے پیرافین لیمپ جلایا جاتا تھا۔ اسی گھر میں نیلسن کا پہلا بیٹا "مادیبا تھیمبی" پیدا ہوا۔ نیلسن اپنے بیٹے کے ساتھ باتیں کرتا، کھیلتا، نہلاتا اور سوتے وقت کہانی سناتا، اسے بچوں کے ساتھ کھیلنا اور گپ شپ لگانا بھاتا تھا مگر اس کے پاس وقت کی شدید قلت تھی۔

جولائی 1947 میں لمیڈی کی محض 33 سال کی عمر میں اچانک وفات نیلسن کے لیے بہت بڑا دھچکا ثابت ہوئی۔ وہ ان کے لیے امید کی علامت تھا مگر یہ شمع اماوس



نیلسن منڈیلا اپنا ووٹ کاسٹ کرتے ہوئے

کی تاریک شب میں بجھی تو یوں لگا بینائی کھوگئی ہے۔اسی سال نیلسن کو افریقن کانگریس میں ایگزیکٹیو کمیٹی میں منتخب کرلیا گیا، یہ اس کا پہلا باضابطہ عہدہ تھا۔نیلسن اور محب وطن نوجوانوں نے مل کر یوتھ لیگ کی تشکیل بھی دی تھی جس کا مقصد عوامی بیداری پیدا کرنا اور جس کا نعرہ ''افریقہ، افریقیوں کے لئے'' تھا۔اسی دوران انتخابات میں نیشنل پارٹی اقتدار میں آگئی جس کی پالیسیاں اور سوچ انتہائی تعصبانہ اور ظالمانہ تھی اور جس کا نعرہ ''کافر کو اوقات میں رکھو'' تھا،اسی دوران ''گروپ ایریاز ایکٹ'' بنادیا گیا، جس کے تحت مخصوص شکل وصورت اور مخصوص نسل کے لوگ الگ الگ علاقوں میں قیام کریں۔اس قانون کے تحت اگر سفید فام کسی علاقے پر قابض ہونا چاہیں تو انہیں بس ایک کام کرنا ہوگا کہ اس علاقے کو سفید فام کہہ کر اس کی تمام پراپرٹی پر غاصبانہ قبضہ کرلیں۔اسی قانون کے تحت جبری علاقے بھی خالی کروائے گئے۔ ایسے ظالمانہ قوانین نے اضطراب کی ایک لہر پیدا کردی اور عدم تحفظ کو اور زیادہ بڑھادیا۔

انہی دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے نیلسن کے دماغ کو ماوف کردیا، ایک دن وہ اپنی گاڑی میں جارہا تھا تو ایک سفید فام بچہ اپنی سائیکل پر اس سے ٹکرا گیا، نیلسن گاڑی سے اتر کر اسے اٹھانے کے لیے لپکا تو دور سے ایک سفید فام نے چلا کر کہا کہ بچے کو مت چھونا۔'' نیلسن رک گیا، اسے پولیس اسٹیشن لے جایا گیا۔سفید سارجنٹ نے اس پر نظر ڈال کر نفرت سے کہا

''کافر آج تم پاخانہ کروگے''

نیلسن کا دماغ جھنجھلا اٹھا، اس نے انگریزی میں ہی جواب دیا

''اپنا منہ بند رکھو''

سفید فام پولیس والا ایک کالے کے منہ سے انگریزی سن کر اور پلٹ کر جواب دینے سے بہت مرعوب ہوا۔

اس کی گاڑی کی تلاشی لی گئی اور گاڑی کی سیٹ کے نیچے سے اخبار ''دی گارڈین'' کی کاپی ان کے ہاتھ لگ گئی۔نیلسن کو کمیونسٹ قرار دے دیا گیا۔اس تمام واقعے سے نیلسن کی جان بڑی مشکل سے چھوٹ پائی مگر اس واقعہ نے اس پر واضح کردیا کہ آزادی کے بغیر کوئی دوسرا راستہ نہیں بچتا۔

☆☆☆☆

افریقن نیشنل کانگریس نے کوئی اور راستہ نہ پاتے ہوئے ''سول نافرمانی'' کی تحریک چلانے کا فیصلہ کرلیا۔سب سے پہلے رضا کار بھرتی کیے گئے، ان کی تربیت اور ذہنی مضبوطی کا انتظام کیا گیا۔انہیں آنے والے حالات کی درست تصویر دکھائی گئی تاکہ وہ اندھیرے میں نہ رہیں۔پہلے مرحلے میں تربیت یافتہ رضا کاروں کو اجازت ناموں کے بغیر ان علاقوں میں داخل ہونا تھا جہاں کالوں کا داخلہ منع تھا۔انہیں گوروں کے لیے مخصوص ٹوائلٹس، ریل کے ڈبے، انتظار گاہیں اور پوسٹ آفس میں داخلے کے دروازے استعمال کرنے تھے۔ہر پارٹی کا ایک لیڈر تھا جسے گرفتاریاں دینی تھیں۔دوسرے مرحلے میں اس سلسلے کو ملک بھر میں پھیلانا تھا۔

خلاف ورزی کی مہم میں سب سے پہلے ایک ریلی نکالی گئی جس سے بڑے رہنماؤں نے خطاب کیا۔نیلسن نے بھی دس ہزار کے اجتماع سے خطاب کیا۔خلاف ورزی مہم پورٹ الزبتھ میں طلوع فجر کے ساتھ شروع کردی گئی۔رضا کاروں کا ایک گروہ ریلوے اسٹیشن میں ان راستوں سے داخل ہوا جن پر whites only (صرف سفید فاموں کے لئے) لکھا ہوا تھا۔وہ گروہ گرفتار کرلیا گیا۔وہ آزادی کے گیت گاتے تالیوں کی گونج میں آگے بڑھے۔ان کے ہونٹوں پر ایک ہی گیت تھا، ایک ہی نعرہ تھا۔

''مائی بوئے افریقہ''......(میرا افریقہ واپس آجائے)

اگلا مظاہرہ ٹاؤن شپ میں کیا گیا۔باون رضا کاروں نے یہاں مظاہرہ کیا، پولیس نے انہیں گرفتار کر کے ان پر فرد جرم عائد کردی۔اسی رات نیلسن اور اس کے ایک اور ساتھی راہنما کو گرفتار کرلیا گیا، یوں نیلسن جیل میں اپنے ساتھیوں سے جا ملا، ان کے ہونٹوں پر افریقی ترانے کا ایک ہی بول تھا۔

''انکوسی سکنے لیل ایا افریقہ''...... خدا افریقہ کو شادمان رکھے!!

نافرمانی تحریک کے پہلے ہی روز 250 سے زائد رضا کاروں کو گرفتار کیا گیا، یہ ایک شاندار آغاز

تھا۔ قانون شکنی کی یہ مہم چھوٹے چھوٹے قصبوں تک پھیلتی چلی گئی۔ افریقن نیشنل کانگریس (اے این سی) کی رکنیت بیس ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ کئی اراکین معمولی جرمانہ ادا کر کے جیل سے رہائی پا چکے تھے جن میں نیلسن بھی شامل تھا۔ اس کے ملک گیر دورے شروع ہو چکے تھے۔ وہ افریقی بستیوں میں گھر گھر گیا، ہزاروں میل کا سفر طے کیا۔ اسی دوران حکومت نے ایک نیا قانون پاس کروالیا جس کے تحت لوگوں کو جسمانی سزا دی جا سکتی تھی۔ مقدمے کے بغیر نظر بند کیا جا سکتا تھا اور حکومت مارشل لاء لگا سکتی تھی۔ اسی دوران حکومت نے مہم میں اپنے جاسوس داخل کر دیے، رضا کاروں میں بھی سرنگ لگائی گئی۔ مہم کے رہنماؤں کے خلاف پروپیگنڈہ کیا گیا کہ وہ خود تو آرام کر رہے ہیں مگر عام کارکن جیل میں ہیں، اس الزام میں کوئی صداقت نہ تھی مگر اس نے رائے عامہ کو متاثر کیا۔ اسی طرح کچھ سیاہ فام پولیس والے بھی تھے جو نافرمانی تحریک کے لیے جاسوسی کرتے تھے۔ نیلسن اور دیگر رہنماؤں پر مقدمہ چلایا گیا۔ اے این سی کے صدر ''ڈاکٹر موروکا'' نے عدالت میں نیلسن اور اس کے ساتھیوں کے خلاف بیان دیا، اس غداری نے نیلسن کو مایوسی کے اتھاہ سمندر میں دھکیل دیا۔ جج جو کہ ایک معتدل مزاج گورا تھا، نے نیلسن اور اس کے ساتھیوں کو نو ماہ قید بامشقت کی سزا سنائی کیونکہ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو تشدد کا راستہ اختیار کرنے سے روکا تھا۔

نیلسن کے ساتھی ایک بڑی غلطی کر گئے کہ انہوں نے مہم کو اپنے عروج پر ختم کرنے کی بجائے جاری رکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مہم آہستہ آہستہ ماند پڑتی چلی گئی۔ اس میں وہ جوش و خروش نہ رہا جو شروع میں تھا۔ لیکن اس کا ایک بہت بڑا فائدہ عوامی بیداری کی صورت میں نکلا، اس کے علاوہ اپنی ذات پر اعتماد اجاگر ہوا، اپنی اہمیت کا پتا چلا، احساس کمتری سے نجات ملی، یہ بہت بڑی کامیابیاں تھیں۔

☆☆☆☆

حکومت کی طرف سے نیلسن پر چھ ماہ کی پابندی لگا دی گئی کہ وہ جوہانسبرگ سے باہر نہیں نکل سکتا، کسی قسم کے اجتماع میں شرکت نہیں کر سکتا، چاہے وہ اس کے بیٹے کی سالگرہ کی تقریب ہو، اسی دوران نیلسن نے وکالت کا کوالیفیکشن امتحان پاس کر لیا اور ایک فرم کے ساتھ پریکٹس شروع کر دی۔ 1952 میں اپنا لاء آفس کھولنے کے بعد نیلسن کی آمدنی بڑھی اور گھر چلانا ذرا سہل ہوا، بعض عدالتوں میں کالے وکلا سے احترام کا سلوک کیا جاتا لیکن کچھ عدالتوں میں ان کی توہین بھی کی جاتی تھی۔ ان کے سرکاری وکیل یا مجسٹریٹ بننے پر پابندی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ سفید فام گواہ ایک کالے اٹارنی کے سوالوں کے جواب دینے سے انکار کر دیتے تھے۔ ایک کیس کے شروع میں مجسٹریٹ نے نیلسن سے اس کا سرٹیفکیٹ مانگا، نیلسن نے درخواست کی کہ آپ کیس چلنے دیں، میں سرٹیفکیٹ بعد میں پیش کر دوں گا، مگر مجسٹریٹ نے اسے کورٹ سے باہر نکلوا دیا، یہ عدالتی پریکٹس کی خلاف ورزی تھی، معاملہ سپریم کورٹ تک جا پہنچا، آخر کار فیصلہ نیلسن کے حق میں ہوا اور جج کو تبدیل کر دیا گیا۔ غرض زندگی انہی انتہاؤں میں گزر رہی تھی۔

ایک صبح نیلسن کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا، یہ سیکورٹی کے اہلکار تھے جن کے پاس گھر کی تلاشی کا وارنٹ تھا۔ گھر سے تو کوئی ممنوعہ شے نہیں ملی مگر نیلسن کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ اسے جوہانسبرگ جیل میں ڈال دیا گیا، بعد میں پتا چلا کہ یہ پکڑ دھکڑ ملک گیر پیمانے پر ہوئی ہے، نیلسن کے ساتھیوں کو بھی اسی کے ساتھ جیل میں ڈال دیا گیا۔ کانگریس کے تمام بڑے بڑے لیڈر غداری اور حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں گرفتار کر لیے گئے تھے۔

اگلے دن 144 افراد کو عدالت میں پیش کر کے فردِ جرم عائد کر دی گئی۔ انہیں قلعہ نما جوہانسبرگ جیل میں دیوار کے ساتھ کپڑے اتروا کر ایک گھنٹے تک کھڑا کر دیا گیا، سرد ہوا کے نیزے ان کے جسم میں پیوست ہو رہے تھے۔ بعد میں انہیں جیل منتقل کر دیا گیا۔ ہر کسی کو تین پتلے کمبل اور گھاس پھونس کی چٹائی دی گئی۔ ہر کوٹھڑی میں ایک لیٹرین تھی جو بنا کسی آڑ کے تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی بھی قوم کو اس وقت تک نہیں جانا جا سکتا جب تک اس کی جیل میں جانے کا تجربہ نہ ہو۔ ایک قوم کو اس سے نہیں پرکھا جاتا کہ وہ اپنے اعلیٰ شہریوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے بلکہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ وہ اپنے ادنیٰ شہریوں

کے ساتھ کیا برتاؤ کرتی ہے۔ جنوبی افریقہ کی گوراحکومت تو جیلوں میں بند افریقیوں سے جانوروں کا سا سلوک کرتی تھی۔

پورے جنوبی افریقہ میں احتجاجی جلوس نکالے جا رہے تھے بلکہ دنیا بھر میں اس بات پر احتجاج ہو رہا تھا۔ دو ہفتے بعد ان سب کی فوجی عدالت میں پیشی ہوئی۔ حامیوں کا ایک ہجوم سڑکوں پر جمع تھا جو ٹریفک بلاک کر رہا تھا۔ وہ نعرے لگا رہے تھے جس کا جواب حریت پسند قیدی گاڑیوں کے اندر سے دے رہے تھے۔ جیل کی گاڑیاں فاتحانہ جلوس کے انداز میں رینگتی عدالت کی جانب رواں تھیں۔ ایک وسیع و عریض پنجرے میں بنچ رکھ کر قیدی بٹھا دیے گئے۔ ان کے حامیوں نے صفائی کے وکلا کی پوری ٹیم تیار کی ہوئی تھی جس نے ان کے ساتھ جانوروں والے سلوک پر احتجاج کیا، چنانچہ ان کو پنجرے سے نکال لیا گیا۔ ان پر فردِ جرم عائد کی گئی جو پڑھ کر سنائی گئی۔ بحث و جرح کے بعد ان کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا، ہر ہفتے عدالت میں پیش ہونا لازم قرار دیا گیا۔

☆☆☆☆

اے این سی اور اپنے مقصدِ حیات سے وابستگی نے نیلسن کی گھریلو زندگی کو بہت متاثر کیا۔ ایولین اس پر زور دیتی تھی کہ وہ اپنی قانونی پریکٹس پر توجہ دے اور امتاتا واپس چلے۔ نیلسن اسے سمجھاتا کہ اب جوہانسبرگ ہی ہمارا گھر ہے، اس بات پر ان کی تکرار ہو جاتی، ان کی گھریلو زندگی کا بندھن کمزور پڑ رہا تھا۔ ایولین یہ سب کچھ قبول نہیں کر پا رہی تھی۔ نقطۂ نظر کا فرق ان دور کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ بچوں کی تربیت پر بھی ان کا جھگڑا ہو جاتا تھا، ایولین انہیں مذہبی جبکہ نیلسن سیاسی بنانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ ایولین کے نزدیک سب سے بڑھ کر اس کے اپنے خاندان والے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ نیلسن دنیا میں اس کے گھر والوں کے علاوہ کسی سے اخلاص نہ رکھے۔ اس میں بہت خوبیاں تھیں مگر فاصلے اتنے بڑھے کہ ان کی شادی ٹوٹ گئی۔ یہ ایک تکلیف دہ دن تھا، بچے بکھر کر گئے۔ لیکن نیلسن کے لیے اس کی قوم کی آزادی ہر شے پر مقدم تھی۔ زندگی ہر زخم کا مداوا ہوتی ہے۔ اسی دوران اس کی ملاقات ''ونی'' سے ہوئی جو ایک قانونی مشاورت کے لیے اس کے پاس آئی تھی۔ ان کی ملاقاتیں بڑھتی چلی گئیں۔ اسے سیاست سے بھی دلچسپی تھی۔ نیلسن نے اسے اس راستے کے نشیب و فراز بتائے جس پر وہ چل رہا تھا، بغاوت کا مقدمہ دوسرے سال میں داخل ہو چکا تھا اور جاری تھا۔ آخر کار 14 جون 1958 کو ان کی شادی ہو گئی، جس کے لیے اسے جوہانسبرگ سے باہر جانے کی چھ روزہ اجازت ملی۔ اس کی بیوی نے بھی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا، اُس نے ویمنز لیگ کی ''آرلینڈو برانچ'' میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔

اسی دوران سیاسی منظرنامے پر ایک بڑی تبدیلی ''پان افریکنسٹ کانگریس'' یعنی PAC کی تشکیل تھی، یہ نئی پارٹی اے این سی کی صلح جو سوچ کے خلاف تھی۔ اس کے علاوہ وہ کانگریس پر غیر افریقیوں کے تسلط کے بھی خلاف تھی۔ نیلسن کو پی اے سی کے نظریات سے اختلاف تھا۔ پی اے سی کا بننا آزادی کی تحریک کے لیے تباہ کن ثابت ہوا، عوام کو سمجھ نہیں آتی کہ کون درست ہے اور کون غلط، جب اے این سی ہڑتال کال کرتی تو پی اے سی لوگوں کو کام پر جانے کی ہدایت کرتی، اسی دوران PAC نے بغیر پاس کے کام پر جانے اور ہڑتال کرنے کی کال دی، اس نئی تنظیم کا زیادہ اثر و رسوخ شارپ ویل میں تھا جو جوہانسبرگ سے 35 میل دور ایک قصبہ تھا۔ وہاں مظاہرین پر پولیس نے براہِ راست فائرنگ کر دی، حتیٰ کہ بھاگتے ہوئے لوگوں پر بھی فائرنگ کی۔ ذرا سی دیر میں 69 بے گناہ معصوم افریقیوں کی لاشیں سڑک پر پڑی تھیں۔ ان میں سے اکثریت کی پشت پر گولیاں لگی تھیں، ہجوم پر سات سو سے زائد گولیاں چلائی گئیں، چار سو سے زائد افراد زخمی تھے۔ اگلے روز دنیا بھر کے اخبارات نے اس درندگی کی خبریں شائع کیں، پوری دنیا سے احتجاجی مراسلات کا تانتا بندھ گیا۔ پہلی بار سلامتی کونسل نے جنوبی افریقہ کے معاملات میں مداخلت کی اور حکومت کو وارننگ دی اور معاملات درست کرنے کو کہا۔ اس بہیمانہ قتل کو ''شارپویلے قتل'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

30 مارچ 1960 کو نیلسن کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا، اس بار اس کی منزل ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی تھی

جس میں اجابت کے لیے ایک سوراخ تھا، نہ تو کمبل دیئے گئے نہ خوراک، نہ چٹائیاں نہ ٹائلٹ پیپر۔ یہ نئی قید پانچ ماہ جاری رہی جس کے بعد انہیں رہا کر دیا گیا۔

29 مارچ 1961 کو انہیں بغاوت کے مقدمے سے بھی بری کر دیا گیا، یہ ایک منصفانہ فیصلہ تھا، چار سال کی کاروائی کے بعد بھی حکومت ناکام رہی اور جیت سچ کی ہوئی۔ اس مقدمے میں تینوں ججوں نے تعصب سے بالا تر ہو کر فیصلہ دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے حکومت نے اپنے مقرر کردہ ججوں پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا۔

☆☆☆☆

اے این سی نے اپنی پالیسی تبدیل کر دی کیونکہ ان کی اب تک کی پُرامن جدوجہد کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا، الزبتھ کے فیکٹری مزدوروں کے ساتھ اس نے ملاقاتیں کی۔ وہ مختلف اخبارات کو فون کر کے اپنی کامیابی کی داستان سناتا جو اگلے روز اخبارات کے پہلے صفحہ پر شائع ہوتیں۔ کئی بار نیلسن بال بال بچا، پی اے سی ابھی تک کانگریس کے اقدامات کو سبوتاژ کر رہی تھی، کانگریس کے اجلاس میں مسلح ونگ بنانے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔

''جنگلی بھینسے کے وار کو خالی ہاتھوں نہیں روکا جاسکتا۔''

یہ نیلسن کا نیا ماٹو تھا۔ حکومت نے ان کے پاس کوئی اور راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ نئی عسکری تنظیم کا نام ''MK'' رکھا گیا اور اس کا نشان ''نیزہ'' چنا گیا۔ نیلسن اس تنظیم کا چیئرمین قرار پایا۔ اس نے گوریلا جنگ پر دستیاب لٹریچ



نیلسن منڈیلا، ملکہ الزبتھ، مارگریٹ تھیچر اور لیڈی ڈیانا کے ساتھ

نیلسن زیرِ زمین چلا گیا۔ وہ دن بھر اپنے خفیہ ٹھکانوں پر چھپا رہتا اور رات کو سفر کرتا، وہ اکثر ڈرائیور یا مالی کا روپ بدلے رکھتا، نہ وہ حجامت کرواتا اور نہ ہی بال کٹواتا۔ اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے اور پولیس اس کے تعاقب میں تھی۔ ملک بھر میں سڑکوں پر چیک پوسٹیں قائم کر دی گئی تھیں، اسے تحقیر سے ''کالے جنگلی'' کا نام دیا گیا تھا۔ نیلسن نے ملک بھر کا خفیہ دورہ کیا۔ کیپ ٹاؤن کے مسلمانوں سے لے کر نٹال کے شوگر ورکرز اور پورٹ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ چن چن کر ایسے وفادار تلاش کیے گئے جو مسلح کاروائیوں میں ماہر تھے۔ دھماکے کرنے کے لیے انہوں نے ''نائٹروگلیسرین'' حاصل کر لی تھی، جس کی وہ ریہرسل کر چکے تھے۔ ان کی پلاننگ یہ تھی کہ فوجی تنصیبات، پاور پلانٹس، ٹیلی فون لائنز، سرکاری املاک پر حملے کیے جائیں۔ اس سے انہیں امید تھی کہ ایک دن حکومت ''لو اور دو'' کی سٹیج پر آ جائے گی، پہلے مرحلے کے وہ نتائج نہ نکلے جن کی امید تھی، لہٰذا انہوں نے دوسرے

مرحلے یعنی دہشت گردی اور گوریلا جنگ کے آغاز کا فیصلہ کیا۔

16 دسمبر کو ہونے والے دھماکے افریقی حکومت کے لیے ایک نئے دور کا پیغام تھے، انہیں احساس ہوا کہ وہ آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہیں۔

اسی دوران نیلسن منڈیلا نے افریقہ کے مختلف ممالک کے دورے کیے تاکہ امداد اور اخلاقی مدد حاصل کی جائے۔ ان ممالک میں برونائی، تیونس، مراکش، مصر، مالی، سوڈان، یوگنڈا جیسے ممالک شامل تھے جبکہ ایتھوپیا اور الجزائر میں اس نے گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کی۔

آخر کار وہ ایک طویل سفر کے بعد واپس جوہانسبرگ کے لیے روانہ ہوا۔ وطن واپسی کے سفر کے دوران ہی اسے ڈربن میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے اپنا فرضی نام "ڈیوڈ" ہی بتایا مگر اسے پہچانا جا چکا تھا۔ کہیں سے حتمی مخبری ہوئی تھی۔ اسے جوہانسبرگ منتقل کر دیا گیا، ریڈیو پر اس کی گرفتاری کی خبر نشر کر دی گئی۔ اسے جیل سے فرار کروانے کے کئی منصوبے بنائے گئے جو نیلسن نے رد کر دیے۔ جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا تو وہ چیتے کی کھال پہنے ہوئے تھا۔ ایک ہفتے بعد اسے دوبارہ عدالت پیش کیا گیا تو اس نے عدالت میں اپنا تاریخی خطاب کیا جس کے آخری الفاظ یادگار تھے۔

"میں اس سیٹ اپ سے شدید نفرت کرتا ہوں جو میرے اردگرد پھیلا ہوا ہے۔ اس سے مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں ایک کالا آدمی ہوں جو ایک گورے آدمی کی عدالت میں پیش ہوا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

ایک طویل جرح، گواہوں کے بیانات کے بعد نیلسن کو پانچ سال کی سزا سنا دی گئی، جس میں ہڑتال پر اکسانے کی سزا تین سال اور بغیر پاسپورٹ سفر کی سزا دو سال تھی، یہ جنوبی افریقہ میں اب تک کی سب سے سخت سیاسی سزا تھی۔ بعدازاں اسے "روبن آئی لینڈ" منتقل کر دیا گیا جہاں ایک طویل قید اس کی منتظر تھی۔ ڈچ زبان میں "روبن" سے مراد مچھلی تھا، اس جزیرے کے ساحل پر مچھلیاں کثرت سے ملتی تھیں، اس وجہ سے اسے یہ نام دیا گیا۔ جب نیلسن اس جزیرے پر پہنچا تو "تم یہیں مرو گے" کے نعروں نے اس کا استقبال کیا۔ زندگی کا ان دیکھا موڑ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆☆

جیل میں منڈیلا کا نمبر 46664 تھا۔ اسے 6 فٹ چوڑی اور 9 فٹ لمبی کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا۔ قید خانے میں وہ رات بھی آئی جب اسے کھانا نہیں دیا گیا، کھانے کے لیے شرط عائد کی گئی کہ نیلسن قید خانے کے سپاہی کو "باس" کہہ کر مخاطب کرے لیکن نیلسن نے بھوکا سونا قبول کر لیا۔ جزیرہ روبن میں ہر طرح کی گھڑی رکھنا منع تھا لہٰذا وقت کا اندازہ نہ ہو پاتا۔ یہاں کبھی تو اس نے قیدِ تنہائی کاٹی کبھی چار چار روز کے لیے کھانا بند کر دیا گیا۔ یہاں باتیں کرنا بھی جرم قرار پایا، اسے جیل سے فرار کروانے اور فرار ہوتے ہوئے مار دینے کا ڈرامہ بھی رچایا گیا مگر نیلسن لالچ میں نہ آیا اور فرار ہونے سے انکار کر دیا۔ کبھی وہ برہنہ تلاشی سے گزرا تو کبھی اپنی بیٹی سے بارہ سال بعد مل پایا، کئی بار اس کی بیوی کو بھی گرفتار کیا گیا تاکہ اس کے اعصاب توڑے جا سکیں۔ مگر وہ نہ جھکا نہ ٹوٹا نہ ہارا۔

1968 اور 1969 کے ایک سال کے عرصہ میں نیلسن منڈیلا کی والدہ اور بیٹا فوت ہو گئے۔ انہیں اپنے بیٹے اور والدہ کی آخری رسومات میں شرکت کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ جنوبی افریقہ میں سیاہ فام قصبوں میں مخالفانہ تحریک شروع ہو گئی۔ دنیا بھر میں نسل پرستی مخالف تحریک کے لیے حمایت بڑھتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی منڈیلا کی رہائی کے لیے بھی دباؤ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جیل سے منڈیلا نے واضح کر دیا کہ وہ ایسے جنوبی افریقہ پر یقین رکھتے ہیں جس میں مختلف نسلوں کے لوگ مل کر رہ سکیں۔ ساتھ ہی انہوں نے سیاسی نظم و ضبط کی اہمیت پر بھی زور دیا۔ آہستہ آہستہ جنوبی افریقہ کی حکومت الگ تھلگ ہوتی چلی گئی، تاجروں اور بینکوں نے اس ملک کاروبار کرنے سے انکار کر دیا اور تبدیلی کے لیے شور بڑھنے لگا۔ 18 سال انہیں "رابن آئی لینڈ" کی جیل میں قید رکھنے کے بعد 1982 میں "پولز موز" کی جیل بھیج دیا گیا جہاں وہ اپنی رہائی تک مقید رہے۔ نیلسن منڈیلا اور افریقن نیشنل کانگریس کے دیگر رہنماؤں کی قید کے دوران سیاہ فام نوجوان نسل نے ان کی تحریک کو زندہ



نیلسن منڈیلا اپنے مختلف اعزازات کے ساتھ

رکھا۔ اس دوران سیکڑوں اسکول اور کالج کے طلبہ ہلاک اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ فروری 1990ء میں نیلسن منڈیلا کو جنوبی افریقہ کی حکومت نے ستائیس سال بعد جیل سے رہا کر دیا۔

1993 میں منڈیلا کو امن کے لیے نوبل انعام ملا اور اس کے پانچ ماہ بعد نیلسن منڈیلا بھاری اکثریت سے جنوبی افریقہ کے صدر منتخب ہوگئے۔ صدر بننے کے بعد ان کے پاس دو آپشن تھے یہ کہ گوروں سے اپنے اور قوم کے ساتھ زیادتیوں کا بدلہ لیں یا انہیں معاف کر دیں۔ نیلسن منڈیلا نے دوسرا آپشن قبول کیا اور یوں جنوبی افریقہ کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا۔ صدارت سے فارغ ہونے کے بعد بھی انہوں نے دنیا بھر کے دورے جاری رکھے اور مختلف عالمی رہنماؤں سے ملاقاتوں کے علاوہ کانفرنسز میں شرکت کی۔ صدارت کے عہدے سے فارغ ہونے کے بعد ان کی زیادہ تر پبلک میٹنگز کا محور منڈیلا فاؤنڈیشن تھی جو کہ فلاحی ادارہ ہے اور اس کے لیے فنڈز اکٹھا کرنے پر ان کی توجہ مرکوز رہی۔ اپنی 89 ویں سالگرہ کے موقع پر نیلسن منڈیلا نے دنیا کے بزرگوں کی تنظیم قائم کی جس کا مقصد دنیا کو درپیش مشکلات اور مسائل کے حل کے لیے ان کی رہنمائی کرنا تھا۔

آج قانون کی نظر میں جنوبی افریقہ کے تمام لوگ برابر ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے ووٹ دے سکتے ہیں اور اپنی مرضی سے زندگی گزار سکتے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے نیلسن منڈیلا کو جیل میں قید رکھا، انہیں اذیتیں دیں، انہوں نے ان کے لیے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ وہ ہمیشہ خوش مزاج نظر آئے اور ان کی شخصیت اور زندگی کی داستان نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ پانچ سال صدر کے عہدے پر فائز رہنے کے بعد 1999ء میں انہوں نے اقتدار چھوڑ دیا اور جنوبی افریقہ کے سب سے زیادہ بااثر سفارتکار ثابت ہوئے۔ انہوں نے ایچ آئی وی اور ایڈز کے خلاف مہم شروع کی اور 2010 میں فٹ بال عالمی کپ کی جنوبی افریقہ کے لیے میزبانی حاصل کرنے میں بھی ان کی کردار شامل رہا۔

آج ساری دنیا جس عظیم انسان کو خراجِ تحسین پیش کر رہی ہے، ایک زمانہ وہ بھی گزرا ہے، جب امریکہ اور برطانیہ سمیت کئی مغربی طاقتیں اور سیاستدان اسے ایک خطرناک شخصیت قرار دیتے تھے۔ مارگریٹ تھیچر کی کنزرویٹو حکومت کے نزدیک منڈیلا اور ان کی سیاسی جماعت افریقن نیشنل کانگریس دہشت گرد تھے۔ یہی لوگ ان کی پھانسی کا مطالبہ کیا کرتے تھے۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب لندن میں پارلیمنٹ اور ویسٹ منسٹر ایبے کے قریب نیلسن منڈیلا مجسمہ نصب کیا گیا۔ یاد رہے کہ اس

میدان میں سرونسٹن چرچل کا بت بھی نصب ہے، گوکہ نیلسن منڈیلا کا مجسمہ چرچل کے مجسمے کے مقابلے میں چھوٹا ہے، لیکن اگر ان کی جدوجہد کے حوالے سے دیکھا جائے تو پھر منڈیلا کی ایک ایسی انفرادیت نظر آئے گی، جو انہیں ہر ایک سے ممتاز کرتی ہے۔ امریکہ نے 1991ء میں جا کر اپنی سرکاری فہرست سے نیلسن منڈیلا کا نام دہشت گردوں کی فہرست سے خارج کیا تھا۔

سال 2001ء میں معلوم ہوا انہیں پروسٹیٹ کینسر ہے اور 2004 میں انہوں نے عوامی سرگرمیوں سے یہ کہہ کر ریٹائرمنٹ لے لی کہ وہ اپنے خاندان اور دوستوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا چاہتے ہیں۔

منڈیلا نے دنیا کے تمام کالے اور گورے انسانوں، عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق اور انصاف کے لیے جس استقامت سے لڑائی لڑی اس پر انہیں بے اندازہ اور بے شمار داد ملی۔ منڈیلا نے اوائل عمر میں ہی حقوق انسانی کے وکیل کے طور پر اپنے حلقے میں شہرت پائی، انھوں نے شہری خدمات انجام دیں۔ سیاست میں آئے تو بدترین نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد میں زندگی کی ہر خوشی اور آسائش تیاگ دی۔ جیل گئے تو وہاں ضمیر کے قیدی ٹھہرے، ظلم اور جبر کے جبڑے سے اپنے لوگوں کے لیے جمہوری آزادیاں چھینیں، آزاد جمہوری افریقا کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ جس روز صدارت کی مدت ختم ہوئی اس روز مستعفی ہو کر گھر چلے گئے اور پھر جب تک دم میں دم رہا دنیا کے مختلف تنازعات میں ثالث کا کردار ادا کرتے رہے۔ جنوبی افریقا وہ کم نصیب ملک ہے جس میں نوجوان نسل پر ایڈز ایسی الم ناک اور اندوہناک بیماری نے اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ منڈیلا کے قریبی نوجوان رشتے دار اس بیماری کا شکار ہوئے تو انھوں نے یہ بات پوشیدہ نہیں رکھی اور اس بیماری کے خاتمے کے لیے لڑتے رہے۔

جنوبی افریقا کا وہی شہر پریٹوریا جہاں کے ایک اسپتال میں وہ موت سے لڑ رہے تھے۔ اسی شہر کی عدالت میں انھوں نے 20 اپریل 1964ء کے دن ایک سفید فام جج کے سامنے اپنے دفاع میں ایک طویل بیان دیا تھا۔ ان پر سبوتاژ کا الزام تھا اور انھوں نے اس سے متعلق تمام الزامات کی نفی ایک مدلل اور پُر اثر عدالتی بیان میں کی تھی۔ یہ بیان گھنٹوں پر محیط تھا۔ یہی وہ بیان تھا جس نے سننے اور پڑھنے والوں کو چونکا دیا تھا۔ بڑائی کے طویل سفر کی طرف ایک سیاہ فام نوجوان کا پہلا قدم۔ یہ تقریر بیسویں صدی کی اہم تقریروں میں سے ایک کہی جاتی ہے۔

جب ہم منڈیلا کی زندگی اور وژن کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے برطانوی شاعر ولیم ارنیسٹ ہینلے کی کہی گئی نیلسن منڈیلا کی پسندیدہ نظم اور اس کی ان سطور پر بھی غور کر سکتے ہیں جن کے بارے میں انہوں نے کہا کہ ان سطور نے جیل کے 27 برسوں میں ان کو استقامت بخشی۔ اور یہ دو سطریں درج ذیل ہیں:

میں اپنی تقدیر کا مالک ہوں
میں اپنی روح کا ناخدا ہوں

منڈیلا جانتے تھے کہ زندگی ہمیں بہت سے نشیب و فراز دکھائے گی اور یہ ہمارا کام ہوگا کہ ہم ان کا سامنا کیسے کرتے ہیں۔ وہ عفو و درگزر کی قوت سے آگاہ تھے اور انہوں نے نسلی عصبیت کا آغاز کرنے والے ''ہینڈرک ویرو ورڈ'' کی بیوہ ''بیٹسی ویرو ورڈ'' کے ساتھ چائے پی۔ انہوں نے یہ سیکھا کہ محبت کائنات کی سب سے عظیم طاقت ہے اور جنوبی افریقہ کے پہلے جمہوری صدر کے طور پر اپنی افتتاحی تقریب میں اس جیل کے محافظوں کو مدعو کیا جہاں وہ قید رہے۔ انہوں نے ہمیں سکھایا کہ اپنی مشترکہ انسانیت کو گلے سے لگاتے ہوئے اپنے آپ کے ساتھ اور ایک دوسرے کے ساتھ کیسے زندگی بسر کرتے ہیں۔

نیلسن منڈیلا کا دنیائے انسانیت پر احسان ہے، جس کا اعتراف انہیں 1993 میں ''نوبل پرائز برائے امن'' 1990 میں حکومت ہند کے ''بھارت رتن''، حکومت پاکستان کے ''نشان پاکستان''، ترکی کے ''اتاترک پیس ایوارڈ''، برطانیہ کے ''آرڈر آف سینٹ جان''، امریکہ کے ''میڈل آف فریڈم''، کناڈا کے ''آرڈر آف کناڈا''، سوویت یونین کے آخری بار ''لینن پیس پرائز''، لیبیا کے اولین ''قذافی انٹرنیشنل پرائز فار ہیومن رائٹس'' کو عطا کر کے کیا گیا۔ نیز نومبر

2009 میں اقوام متحدہ جنرل اسمبلی نے 18 جولائی کو ان کی یوم پیدائش کے طور پر ''یوم منڈیلا'' قرار دیا اور بنی نوع انسان سے کہا کہ ان کی اس وقت 67 سالہ نسلی تعصب مخالف جدوجہد کے اعتراف میں 67 منٹ خدمت خلق میں لگائے۔

نیلسن منڈیلا اپنی حیات ہی میں اندرون و بیرون ملک ایک تاریخ ساز شخصیت کے طور پر تسلیم کر لیے گئے تھے۔ تبھی تو جہاں جنوبی افریقہ کے اندر ان کے بے شمار مجسمے نصب کیے گئے تھے، وہیں مختلف شہروں میں عمارات، سڑکیں، گلیاں اور چوک ان کے نام سے منسوب کر دیے گئے تھے۔ یہی صورتحال بیرونی ممالک میں بھی تھی۔ خود ہندوستان کی قومی راجدھانی نئی دہلی میں



نیلسن منڈیلا صدر جارج ڈبلیو بش، صدر کلنٹن، محمد علی کلے اور مائیکل جیکسن کے ہمراہ

سینٹرل یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منڈیلا ہاؤس اور منڈیلا روڈ اس کے مظہر ہیں۔

5 دسمبر 2013 کو دنیا ایک چمکتے ستارے سے محروم ہوگئی، یہ افریقہ کا نہیں بلکہ نسلِ انسانی کا بڑا نقصان تھا، وہ چلا گیا جس نے محبت بوئی اور محبت کاٹی، یوں لگتا ہے آج بھی اس کے الفاظ فضاؤں میں سرسرا رہے ہیں!!

''مَیں نے سفید فام تسلط کے خلاف جدوجہد کی ہے، اگر کوئی ایسا وقت آیا تو مَیں سیاہ فام تسلط کے خلاف بھی لڑوں گا۔ مَیں صرف ایسا معاشرہ چاہتا ہوں، جہاں جمہوریت اور آزادی ہو۔ یہ میرا آئیڈیل ہے اور مَیں اس آئیڈیل کے حصول کے لیے زندہ رہوں گا، بلکہ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اس آئیڈیل کے لیے جان دینے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔''

میں اپنی تقدیر کا مالک ہوں
میں اپنی روح کا ناخدا ہوں

جوہانسبرگ اسٹیڈیم میں نیلسن منڈیلا کی میموریل تقریب میں 90 سے زائد عالمی رہنماؤں نے شرکت کی اور یہ تقریب پرانے حریفوں کو بھی ملا گئی۔ امریکی صدر اوباما نے اپنے پرانے حریف کیوبا کے صدر راہول کاسترو سے ہاتھ ملایا اور خیریت دریافت کی۔ تدفین سے قبل نیلسن منڈیلا کے تابوت کو دارالحکومت پریٹوریا کی سرکاری عمارت میں تین دن رکھا گیا تاکہ عام لوگ منڈیلا کا آخری دیدار کر سکیں۔ اس دوران ملک بھر سے شہری اپنے ہیرو کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے جوق در جوق آتے رہے، لوگوں کی بڑی تعداد کے سبب صرف ایک لاکھ افراد ہی ان کا آخری دیدار کر سکے اور بہت سے لوگ ان کے آخری دیدار سے محروم رہ گئے۔

☆☆☆

قیامت سے پہلے قیامت

رضوانہ پرنس

دنیا کی تاریخ میں 'بلیک ڈے' کہلانے والے، اُس دن کا سورج
ہماری ہی سرزمین پر روشن ہو کر ہر طرف اندھیرا کر گیا تھا

ساتھیو 16 دسمبر پاکستان کی تاریخ کا وہ سیاہ ترین دن ہے جس کے متعلق ابھی بھی سوچ کر کلیجہ پھٹتا ہے۔ دل بیٹھ سا جاتا ہے۔ جب یہ خیال آتا ہے کہ آرمی پبلک اسکول کے اُن معصوم بچوں پر اُس وقت کیا گزری ہوگی جب اُن ظالموں نے اچانک اسکول میں گھس کر شدید فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اُن پیارے پیارے سے بچوں کے معصوم دل کیسے خوف سے لرزے ہوں گے۔ گھبرا گھبرا کر کیسے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی ہوگی۔ سوچتے ہیں تو روح کانپ جاتی ہے۔ کون تھے وہ ظالم، وہ بے رحم لوگ جنہیں اِن معصوم چھوٹے چھوٹے بچوں کو خون میں نہلاتے ہوئے ذرا بھی ترس نہیں آیا۔ ہمیں نہ جانے کیوں پورا یقین ہے کہ اگر اُن ظالموں کو جنم دینے والی ماؤں کو اُس وقت یہ علم ہو جاتا کہ یہ بڑے ہو کر کیا قیامت ڈھانے والے ہیں تو وہ یقیناً پیدا ہوتے ہی اُن کا گلا گھونٹ دیتیں۔ قارئین، ہم سب لوگ اُس دل خراش واقعے کا آپس میں ذکر کرتے ہیں، افسوس کا اظہار ہوتا ہے، ڈپریشن سا محسوس ہوتا ہے اور پھر سب اپنی اپنی مصروفیات میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک نیچرل بات ہے۔ بس جس پر قیامت ٹوٹتی ہے اُس کو پتا ہوتا ہے کہ غم کی شدت کیا ہوتی ہے۔

ایسی راتیں بھی ہم نے دیکھی ہیں
جن کی صدیوں سحر نہیں ہوتی

یہ کرب، یہ دُکھ شاید اُن والدین کی زندگی کی آخری سانس تک اُن کے ساتھ رہے گا جنہوں نے اپنے ہنستے کھیلتے، پیارے پیارے سے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے اسکول بھیجا اور پھر چند گھنٹوں میں انہیں خون میں نہائے ہوئے موت کی گہری نیند سوتے ہوئے دیکھا۔ ساتھیو! یہ دل خراش باتیں لکھتے ہوئے اِس وقت بھی ہمارا چہرہ آنسوؤں سے تر ہے کہ آج آغا خان ہاسپٹل میں ہم اُن معصوم بچوں سے مل کر آئے ہیں جو پشاور سے علاج کے سلسلے میں کراچی پہنچے ہیں۔ اُن معصوم بچوں کو پٹیوں میں جکڑے ہوئے تکلیف اور اذیت اُٹھاتے ہوئے دیکھ کر دل کو جو تکلیف پہنچی ہے، کاش ہم انہیں الفاظ میں بتا سکتے۔ کسی بچے کو تین گولیاں لگی تھیں اور کسی نے چار چار گولیوں کے زخم بھی کھائے تھے۔ دل تو چاہ رہا ہے کہ آپ لوگوں کو آج جو کچھ ہم نے، منزہ نے، اقبال صاحب اور کاشی نے دیکھا ہے وہ سب تفصیل سے بتائیں لیکن فی الحال آج ہم آپ کو ایک ایسے باپ کی کہانی سنانے جا رہے ہیں جس نے اُس خونی دن اپنے لاڈلے بیٹے کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا

تھا۔ ہم نے اِس سے پہلے بے شمار انٹرویوز کیے ہیں لیکن آج پہلی بار کوئی بھی سوال کرتے ہوئے ہماری آواز آنسوؤں میں ڈوب جاتی تھی۔

یہ کہانی ہے آرمی میں صوبیدار رانا اورنگ زیب کی جنہوں نے اپنے تین بیٹوں میں سے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو شہادت کا رتبہ پاتے ہوئے دیکھا۔ اِس وقت ہم ہاسپٹل کے اُس کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں رانا صاحب کا دوسرا بیٹا زیرِعلاج ہے۔ ہمت تو نہیں پڑ رہی تھی لیکن پھر بھی کچھ جھجکتے ہوئے ہم نے اُن سے اُن کی زندگی کے اُس بدترین دن کے متعلق پوچھ ہی لیا۔ رانا صاحب کے چہرے پر اُس وقت جو کرب نظر آرہا تھا، وہ

دوست کے ساتھ ہاسپٹل کے مین ڈور پر کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ ساڑھے دس کا ٹائم تھا، میں نے دیکھا کہ آرمی کی ایک ایمبولینس تیزی سے ایمرجنسی وارڈ کے سامنے آکر رکی جس میں سے چند اسٹوڈنٹ اترے، جن کے چہرے اور ہاتھ دونوں خون آلود تھے۔ میں اُن لوگوں سے تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں سمجھا شاید اِن بچوں کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے، میں بھاگ کر اُن کے پاس گیا اور ایک سترہ سالہ جوان سے پوچھا کہ بیٹا آپ کے ہاتھ پر یہ کیا ہوا ہے تو اُس نے جواب دیا کہ انکل ہمارے اسکول پر دہشت گردوں نے حملہ کردیا ہے۔ میں نے پوچھا کس اسکول پر؟ تو اُس کے جواب نے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا بکھیر



مبشر سجان، عبید ساجد اور معاذ عرفان، دہشت گردوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے والے شیر

ہمارا قلم لکھنے سے قاصر ہے۔ پھر وہ جیسے مکمل طور پر اُس دن میں لوٹ گئے اور ہم بنا کوئی سوال کیے بس اپنے خاموش آنسوؤں کے ساتھ اُن کو سن رہے تھے۔

”وہ دن میری زندگی میں ایسے آنسو لے کر آیا تھا جو ساری زندگی میری آنکھوں سے بہتے رہیں گے۔ مجھے زندگی میں کبھی بھی چین نہیں آئے گا۔ جس دن یہ جان لیوا واقعہ پیش آیا، میں C.M.H ہاسپٹل میں ہی تھا۔ اصل میں کچھ دن پہلے ہی میری بائی آپسوی ہوئی تھی اور ایک چھوٹا سا آپریشن ہوا تھا جس کی وجہ سے میں وہاں ایڈمٹ تھا اور اُس دن مجھے ڈسچارج کیا جانا تھا۔ میں اپنا سب سامان وغیرہ سمیٹ کر ڈسچارج سلپ اور میڈیسن کے انتظار میں اپنے

دیا۔ ”انکل APC وار سک پر انہوں نے حملہ کیا ہے اور پتا نہیں کون زندہ بچا ہے اور کون شہید ہوا ہے، 8th, 9th, 10th کلاسز جوائیڈی ٹوریل ہال میں تھیں، وہاں پر حملہ ہوا ہے۔“ اُس کے یہ الفاظ بم کی طرح میرے آس پاس پھٹے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ جب یہ لوگ وہاں سے بھاگے ہیں تو چاروں طرف خون اور لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں اُس باپ کا حال، جس کے تینوں بیٹے جو اُسی اسکول میں تھے اور 8th-9th میں ہی پڑھ رہے تھے۔ میں نے دیوانوں کی طرح اپنی بیوی کو کال کی اور روتے ہوئے کہا ”اللہ سے دعا مانگو“ وہ بھی یہ خبر سن کر بے حال ہوگئی۔ ہاسپٹل سے اسکول ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ پتا

نہیں کس نے مجھے اپنی سائیکل دی، مجھے کچھ ہوش نہیں تھا، میں بدحواسی کے عالم میں تیزی سے سائیکل چلاتا ہوا اسکول کے قریب پہنچا تو سیکورٹی نے آگے نہیں جانے دیا۔ میں سیکورٹی گارڈ پر چلاّنے لگا۔ ”خدا کے لیے مجھے آگے جانے دو۔ میرے بچے اندر ہیں۔تم لوگ مجھے نہیں روک سکتے۔“ وہ بولا۔

”آپ لوگوں کے بچوں کی سیکورٹی کے لیے ہی ہمیں یہ آرڈر ملا ہے۔“ میری بے بسی انتہا پر تھی۔ میرے بچوں پر کیا گزر رہی تھی، وہ سلامت بھی تھے یا نہیں، میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ تبھی میری بیوی کا فون آیا کے وہ C.M.H پہنچ گئی ہے۔ میں حواس باختہ سا واپس ہاسپٹل پہنچا۔ میری مسز اپنی ہمسائی کے ساتھ انتہائی پریشانی کے عالم میں کھڑی ہوئی تھیں۔ ہمسائی کا بیٹا بھی اُس اسکول میں تھا۔ اُن دونوں ماؤں کے چہرے پر جو پریشانی، کرب اور اذیت نظر آ رہی تھی، اللہ کبھی کسی ماں کو ایسی سچویشن سے دوچار نہ کرے۔ میری بیٹی بھی اُن لوگوں کے ساتھ تھی۔ اپنے بھائیوں کے لیے اُس کی پریشانی اور بے قراری دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ دن میں بھی ہمیں ہر طرف اندھیرا سا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے جگر کے ٹکڑوں کا کہیں پتا نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے کے اندر ہاسپٹل میں ایمبولینسوں کی جیسے قطاریں لگ گئیں۔ ہر ایمبولینس کے آنے پر ہم لوگ دیوانہ وار اُس کی طرف دوڑتے۔ اُس میں سے خون میں لت پت بچوں کو جب اتارا جاتا تو یقین جانیے حواس اتنے گم ہو چکے تھے کہ ہر بچے پر اپنے بیٹوں کا گمان ہوتا تھا۔ ارے کوئی ایسی ویسی قیامت تھی۔ لہولہان بچوں کو تیزی سے اندر لے جایا جاتا اور پھر جان کی بازی ہار جانے والے معصوم بچوں کی لاشوں کو باہر قطاروں میں زمین پر رکھنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اُن کی لاشیں رکھنے کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا، بس اندر سے لا لا کر انہیں زمین پر رکھتے جا رہے تھے۔ ہم لوگ روتے جاتے تھے اور ہر آنے والی ایمبولینس میں سے نکلنے والے بچوں میں ڈوبتے دل سے اپنے بیٹوں کو ڈھونڈتے تھے۔

دو بجے کے قریب لیڈی ریڈنگ ہاسپٹل سے فون آیا کہ آپ صوبیدار رانا اورنگ زیب بول رہے ہیں اور محمد آفتاب آپ کے بیٹے کا نام ہے۔“

میرا دل اس کال پر بالکل ڈوب گیا، ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ کچھ بھی پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میں بے اختیار چیخنے لگا کیونکہ دوسری طرف کوئی مجھے بتا رہا تھا کہ آپ کے بیٹے کو گولی لگی ہے، آپ لیڈی ریڈنگ ہاسپٹل آ جائیں۔ میرے چیخنے پر اُس نے مجھے تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے وہ خطرے سے باہر ہے۔ ہم فوراً اُس ہاسپٹل پہنچے۔ اِسی اثنا میں میرے دوسرے بیٹے کا بھی پتا چل گیا، وہ معمولی زخمی ہوا تھا اُس کا نام محمد مہتاب زیب عطاری ہے۔ رانا صاحب ایک لمحے کو خاموش ہوئے۔ ہم نے سامنے بیڈ پر لیٹے ہوئے معصوم سے محمد آفتاب کی جانب دیکھا، جس کے پانچ آپریشن کر کے چھ گولیاں نکال لی گئی تھیں جبکہ اِس وقت اُس کے جسم کے اندر پچیس، تیس شیل موجود تھے۔ وہ بھی بالکل خاموش اپنے پاپا کو سن رہا تھا۔

رانا صاحب بھرائی ہوئی آواز میں مزید بتانے لگے۔

”پھر مہتاب اور آفتاب نے مجھ سے کہا کہ ہم کو چھوڑیں اور محمد خوشنود کو ڈھونڈیں۔“ پتا نہیں کیوں اپنے دونوں بیٹوں کے مل جانے کے بعد دل کو تسلی سی ہو گئی تھی کہ بس اب خوشنود بھی مل جائے گا لیکن یقین کریں کہ کوئی غائبانہ آواز مجھے یہ کہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی کہ تمہارا بیٹا شہید ہو گیا ہے۔ میں، میری بیوی اور بیٹی پاگلوں کی طرح ہر آنے والی ایمبولینس کے پاس دوڑتے ہوئے جاتے۔ اچانک ہی سامنے زمین پر رکھی ہوئی لاشوں پر میری بیٹی کی نظر پڑی اور وہ چلاّ کر بولی۔

”پاپا وہ ہمارا شانی ہے“ میں کانپتا ہوا آگے بڑھا تو آرمی کے صوبیدار نے روکا، میں نے رو کر کہا۔ ”یہ جو سامنے شیروں کی طرح سینا تانے سو رہا ہے، یہ میرا بیٹا ہے۔“ یقین جانیے وہ شیروں کی طرح سے ہی سینہ تانے سو رہا تھا۔ میں نے چلاّ چلاّ کر رونا شروع کر دیا اور بیوی کو پکار کر کہا۔ ”آؤ دیکھو ہمارا شیر یہاں لیٹا ہے۔ ہم لوگوں کا تو دل پھٹ گیا تھا۔ خون میں نہائے ہوئے اپنے بچے کو یوں لیٹا ہوا کس دل سے ہم نے دیکھا، یہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ بیٹی جس نے اپنے شانی کو پہچان لیا تھا اب یقین ہی نہیں کر رہی تھی کہ اُس کا بھائی اب کبھی اُس کو نہیں ملے گا۔ ہماری ہمسائی کا بچہ بھی شہید ہوا تھا لیکن اُس وقت تک اُسے اپنے بیٹے کی خبر نہیں ملی تھی۔

میرے شانی کو چوبیس گھنٹے بعد غسل دیا گیا لیکن اُس



میاں احمد اور کاشان ظہیر، آج بھی دہشت گردوں کو للکار رہے ہیں

وقت بھی اُسے اتنی Bleeding ہو رہی تھی جیسے کوئی دریا بہہ رہا ہو۔ اُس کے سینے کے رائٹ سائیڈ پر بہت ہی بڑا سوراخ ہو گیا تھا جس میں سے لگاتار چوبیس گھنٹوں سے خون شدت کے ساتھ بہے جا رہا تھا۔ میں نے چیخ کر کہا ''جس نے شہید کا خون دیکھنا ہے آ کر میرے شانی کو دیکھ لو۔'' وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ بتا رہے تھے اور اشکوں نے ہمارے پورے چہرے کو بھگویا ہوا تھا۔

''اُس کے جنازے میں بے شمار لوگ تھے۔ آرمی نے سلامی دی۔ گارڈ آف آنر پیش کیا گیا۔ اُس کی قبر گلاب کے پھولوں سے ڈھک گئی اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ چودہ پندرہ دن تک گلاب کی پتیاں بالکل تر و تازہ رہیں۔ میں سب سے کہتا ہوں کہ

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے
شہید کا جو لہو ہے وہ قوم کی زکوٰۃ ہے

ہمارا دل بُری طرح سے بھر آ رہا تھا۔ لیکن اپنی کہانی کے اِس معصوم شہید کے بارے میں کچھ جاننے کی بھی جستجو تھی۔ ''خوشنود آپ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا، ہمیں اُس کے بارے میں کچھ بتائیں گے۔'' ہم نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کچھ ہچکچا کر پوچھا تو اُن کی آنکھوں میں جیسے اُس کی شبیہہ اُتر آئی۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میرا بس چلے تو میں ہر وقت صرف اُسی کی باتیں کرتا رہوں۔'' کتنی اُداسی تھی، اُن کے لہجے میں۔

''میرا وہ بچہ بہت شرارتی ہوا کرتا تھا لیکن بڑی عجیب سی بات ہے کہ شہادت سے دو دن پہلے وہ کافی خاموش سا ہو گیا تھا اور اتنا زیادہ تمیز دار اور باادب بھی ہو گیا کہ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ میرا اتنا شرارتی بیٹا اتنا باادب کیوں ہو رہا ہے۔ دو دن پہلے اُس نے مجھ سے کہا کہ پاپا میں آپ کو دبا دوں، میں نے کہا ہاں دبا دو، اُس نے اتنا اچھا دبایا کہ مجھے سرور آ گیا۔ میں نے کہا بیٹا اِس سے پہلے کبھی کسی نے اتنا اچھا نہیں دبایا۔ میں کچھ روز سے ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھا لیکن اِس قصے سے پہلے میں ڈاکٹر کی پرمیشن لے کر ایک دو دن کے لیے گھر گیا ہوا تھا۔ مجھے اُس کی زندگی کی وہ آخری رات کبھی بھول ہی نہیں سکتی۔ میں آپ کو بتاؤں میرا بیٹا ننھیال اور ددھیال دونوں میں سب سے خوبصورت بچہ تھا۔ اُس رات میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور میری ساتھ والی چارپائی پر وہ بھی بہت خاموشی سے لیٹا ہوا تھا۔ میں بہت محبت سے اُس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اُس نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا۔

''پاپا جان آپ میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''بیٹا میں آپ کی ناک دیکھ رہا ہوں کتنی خوبصورت ہے، لگتا ہے اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہے۔'' پھر میں نے اُٹھ کر بے اختیار اُس کو پیار کر لیا۔ اور نہ جانے کیوں دوبارہ پھر سے پیار کیا پھر سوچا کہ کہیں یہ تنگ نہ ہو جائے اِس لیے ہنستے ہوئے ایسے ہی



صوبیدار رانا اورنگ زیب اُس لہو دن کی بپتا سناتے ہوئے

اُسے چھیڑا۔ ''بیٹا میں تیرے لیے، تیری طرح کی خوبصورت دُلہن لاؤں گا'' تب اُس نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''میں نے شادی نہیں کرنی۔'' میں نے اُسے ڈانٹا ''آپ یہ کیسی منحوس بات کررہے ہو۔'' لیکن وہ اُسی لہجے میں بولا تھا۔ ''مجھے پتا ہے میری شادی نہیں ہوگی۔'' میں نے ذرا غصّے سے اُسے گھورا۔ ''ایسی بات آئندہ زبان پرمت لانا۔'' تب بھی جیسے وہ اپنی بات پر قائم رہا تھا۔ ''پاپا مجھے پتا ہے میری شادی نہیں ہونی ہے۔'' میرا وہ شرارتی شوخ سا بچہ دو دن سے ایسا ہی سنجیدہ سنجیدہ سا ہوگیا تھا پھر وہ مجھ سے کہنے لگا۔ ''پاپا مجھے پروجیکٹ کے لیے 140 روپے چاہیے ہیں۔ یہ ایک Competition ہے، انشاءاللہ پرائز لے کر آؤں گا۔'' میں نے فوراً جیب سے اُسے پیسے نکال کر دیے تو ایک لمحے رُک کر بولا۔

''میں ایک بات کہوں مجھے 50 روپے اور دے دیں، میں نے کمیٹی ڈالی ہے۔ ہم چار دوست ہیں۔ 500 کا ایک برگر فری میں دیں گے ڈرنک کے ساتھ۔'' میں نے 50 روپے اور دے دیے تو وہ پھر بولا۔ ''میں ایک بات اور کروں آپ ناراض تو نہیں ہوں گے نا۔ میری نوٹ بک ختم ہوگئی ہے اُس کے لیے مجھے 50 روپے اور چاہئیں۔ میں نے ہنستے ہوئے اُسے مزید 50 روپے دیے تو میری بیوی بھی مسکراتے ہوئے بولی۔

''آج کیا بات ہے۔ بیٹا لاڈ کیے جارہا ہے اور باپ پیسے دیے جارہا ہے۔'' میں نے اپنے شانی کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اِن ہی لوگوں کے لیے تو کماتا ہوں۔'' رانا صاحب کا ہر لفظ اپنے بچے کے پیارے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُن کا ہر جملہ آنسوؤں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا۔

''پھر اُس رات میرے بیٹے نے آخری بار چنے پلاؤ کی اپنی ماں سے فرمائش کی تھی۔ سردی کا موسم تھا، میں رضائی اوڑھے لیٹا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ پروجیکٹ کا سامان لے کر آگیا۔ اور میری پائینتی بیٹھتے ہوئے ہنستے ہوئے بولا۔ ''پاپا جان دیکھیے میں کتنی جلدی آگیا۔'' میں اُس کی وہ ہنسی اور وہ جملہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ ہنسی ہر وقت میرے کانوں میں گونجا کرتی ہے۔ اُس دن میرے دونوں بیٹے موٹر سائیکل پر کہیں گئے ہوئے تھے، مجھے ہاسپٹل واپس جانا تھا۔ میں نے جانے کا ارادہ کیا تو وہ جیسے پریشان ہوگیا ''پاپا پیدل مت جانا۔ سائیکل پر چلے جاؤ۔ امی جلدی سے پاپا کو سائیکل کی چابی لاکردو۔'' وہ میری ایسی فکر کررہا تھا جیسے باپ اولاد کے لیے کرتا ہے۔ ہم سیکنڈ فلور پر تھے وہ میرے ساتھ نیچے تک آیا۔ میں نے منع بھی کیا کہ سردی ہے، نیچے مت آؤ لیکن وہ نہیں مانا۔ نیچے آکر اُس نے خود سائیکل کا تالا کھولا۔ میں سائیکل پر بیٹھا تو وہ مجھے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ میں نے اُسے خدا حافظ کہا اور سائیکل چلانے لگا۔ لیکن وہ بدستور وہیں کھڑا بس مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر اُسے ہاتھ ہلایا۔ وہ تب بھی اُسی جگہ پر کھڑا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ یہ میری اُس سے آخری ملاقات ہے، ورنہ میں اُسے اپنے سینے میں چھپا لیتا۔ وہ جس طرح مجھے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا کاش میں سمجھ جاتا کہ اُس کا ایسے دیکھنا کچھ معنی رکھتا ہے۔ ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے بچھڑ رہے ہیں۔ میرا بچہ مجھ سے بہت دُور جانے والا ہے، اب میں کبھی بھی اُسے نہیں دیکھوں گا۔''

ضبط کا دامن جیسے اُن کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ وہ ایک دم زور زور سے رونے لگے۔ اُن کی آنکھ سے نکلنے والا ہر آنسو جیسے ہم لوگوں کے دل پر گر رہا تھا۔ ہاسپٹل کے اُس کمرے کے در و دیوار بھی ہمیں گریہ کرتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔ دل جیسے بیٹھا جارہا تھا اور وہ روتے ہوئے بس یہ ہی کہے جارہے تھے۔

''میرا بیٹا روز میرے خواب میں آتا ہے۔ وہ جیسے مجھے سمجھاتا ہے کہ پاپا میں شہید ہوا ہوں۔ مرا نہیں ہوں۔''

قارئین ہم اور کاشی چوہان آنسو پونچھتے ہوئے جب کمرے سے باہر نکلے تو دل بے حد بوجھل سا ہورہا تھا۔ دوستو 16 دسمبر اور بے گناہ معصوم بچوں کی شہادت کو ایک یاد بنا کر ہمیشہ اپنے دل میں چھپا کر رکھیے گا کہ یہ کوئی معمولی سانحہ نہیں ہے، جسے اتنی جلدی بھلا دیا جائے۔ اِس کا درد، اِس کی اذیت اُن غم زدہ ماں باپ سے پوچھیے جن کے لختِ جگر اُن سے چھن گئے اور دعا کیجیے کہ اسلام کی روح کو مسخ کرنے والے اِن سفاک دہشت گردوں کے شر سے ہم سب خاص طور پر ہمارے معصوم بچے محفوظ رہیں۔

☆☆☆

دوسری سچ بیانی

کون مانے گا میری

م ص ایمن

کراچی کے اُس بیوپاری کا قصہ، جس پہ سچ مچ خدا مہربان ہوگیا تھا مگر......

میں اس وقت ہری پور میں تھا، جب کراچی کی مصروف ترین گنجان دکانوں، پتھاروں سے پٹی بولٹن مارکیٹ میں عاشورہ محرم کے روز آگ لگی تھی اور کروڑوں نہیں بلکہ اربوں روپے کا قیمتی، غیر استعمال شدہ اور بالکل نیا سامان جل کر خاکستر ہوگیا تھا۔

اسی واقعے سے متعلق ایک لرزا دینے والا سچ آپ کی نظر نواز کرتا ہوں، یقیناً اس واقعے سے اہل ایمان کا ایمان بھی تازہ ہوگا اور قدرت کی مصلحت پر ان کا یقین



بھی پختہ ہوگا۔

☆☆☆

شوکت ابھی اسکول کا طالب علم تھا اور وہ دوپہر کے اسکول میں پڑھتا تھا، لیکن وہ اپنی فرصت، یعنی اپنی صبح وشام، دیگر لڑکوں کی طرح کھیل کود یا آوارہ گردی میں ہرگز ضائع نہیں کرتا تھا۔

اس نے فارغ وقت میں اپنے گھر کے سامنے ایک چھوٹی سی میز لے کر اس پر مختلف پتنگیں، ڈور اور لئی رکھ کر ان کی فروخت شروع کر دی۔ صبح سے دوپہر تک گھر کے باہر اس کی دکانداری چلتی اور اسکول جانے کے وقت یہ چھوٹی سی دکان میز سمیت گھر کے اندر چلی جاتی، اس دوران کسی کو اگر پتنگ کی ضرورت پڑ گئی تو وہ شوکت کے گھر کے اندر جا کر لے لیا کرتا تھا۔ شوکت کی والدہ ان گاہکوں سے نمٹ لیا کرتی تھیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شوکت نے اپنی میز پر ٹافیاں، بسکٹ وغیرہ کا بھی اضافہ کر دیا تھا، جب کہ قریبی دیوار پر کیلیں ٹھونک کر اس نے رسیاں تان کر پتنگیں ٹانگ دی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ ماچس، موم بتی، صابن وغیرہ کا اضافہ بھی ہوتا گیا۔ معمول یہی رہا کہ اسکول جانے سے پہلے شوکت، گھر کے سامنے میز پر چیزیں رکھ کر بیٹھتا اور اس کے اسکول جانے کے بعد بھی چیزیں گھر سے بکتی رہتی تھیں۔

اس کا مکان سڑک کنارے واقع تھا۔ اس کے کام میں اللہ کی مدد شامل حال تھی۔ جب اس میز کی سطح سے سامان بلند ہوا تو اس کی والدہ نے اسے گھر کے اندر سے ایک کھڑکی کھول دی، اب گاہک گھر کے اندر جانے کے بجائے کھڑکی سے حسبِ ضرورت چیزیں حاصل کرتے تھے، پھر اللہ نے برکت عطا فرمائی اور شوکت کی دکانداری بڑھتی گئی۔ مال میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اہلِ محلہ جس چیز کا پوچھتے اول تو ہوتی ہی تھی، اگر نہ ہوتی تو دوسرے دن مہیا کر دی جاتی تھی۔

''شوکت پتنگ گھر'' سے شروع ہونے والی یہ دکانداری دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتی گئی۔ ''شوکت کریانہ اسٹور'' سے ''شوکت جنرل اسٹور'' تک کا سفر برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اہالیانِ محلہ کو 19 گھنٹے خدمات مہیا کرنے والی، عید، بقرعید، محرم کے دنوں میں، حتیٰ کہ ہڑتال کے دوران بھی، رات گئے تک کھلنے والی دکان فقید المثال بن گئی۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ اللہ کی مہربانی سے شوکت جنرل اسٹور پر ضرورت کی ہر چیز دستیاب ہوتی ہے۔

شوکت نے اپنے کاروبار کو وسعت دیتے ہوئے جوڑیا بازار میں بھی ایک دکان حاصل کر لی تھی اور سارا دن خود بھی وہ وہاں موجود رہتا تھا، جبکہ اس کے چھوٹے بھائی اس دوران دکان سنبھالتے۔ شوکت، رات کے وقت آ کر دکان کا حساب کتاب دیکھتا اور بھائیوں کا ہاتھ بھی بٹاتا۔

شوکت کا ایک ہی بیٹا تھا اور اس کی کوشش یہ تھی کہ عدنان اپنی پوری اپنی تعلیم پر ہی مرکوز رکھے اور بزنس کی جانب فی الحال نہ آئے، تاہم عدنان گاہے گاہے مارکیٹ کا چکر لگاتا رہتا، کبھی صبح اپنے والد کے ساتھ جاتا اور اکیلا واپس آتا تو کبھی وہ پچھلے ٹائم مارکیٹ جاتا اور والد کے ساتھ واپس آتا تھا۔ شوکت یہی سمجھتا کہ وہ وقت پاس کرنے کے لیے مارکیٹ جاتا ہے۔ اس کی باقاعدہ مصروفیات کیا ہیں؟ یہ تو شوکت کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔

ایک دن اچانک ہی بچوں سے ان کی ماما بچھڑ گئی یعنی شوکت کی بیوی چل بسی۔ شوکت کی بیٹیوں کے دل و دماغ پر اس حادثۂ جانکاہ کا اثر تو تھا ہی، لیکن عدنان نے اس کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا تھا۔ اب وہ زیادہ تر گم صم ہی رہتا اور ہنسنا بولنا تو درکنار اس نے تو بات چیت کرنا بھی بند کر دی تھی۔

غم اگر نیا نیا ہو تو دھاڑیں مار مار کر اپنے غم کا اظہار کیا جاتا ہے اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کے اظہار یے میں بھی کمی آ جاتی ہے۔

وقت پر لگا کر اُڑتا گیا اور دو سال گزر گئے۔ ماں کے بغیر بچوں کا تیسرا رمضان تھا۔ سحر وافطار میں بچے بلا ناغہ اپنی ماں کو یاد کرتے اور پھر ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلتے۔ وہ بھی تو رمضان کے ہی دن تھے، جب ان کی ماں انہیں روتا دھوتا چھوڑ کر منوں مٹی تلے ابدی نیند جا سوئی تھی۔ قدرت کے کاموں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ کسی بچے نے ماں کی یاد میں اس عید پر

بھی نیا لباس، جو تایا کوئی اور چیز نہیں بنائی تھی۔

☆☆

چاند رات ہوئی تو عدنان گھر سے باہر نکلا، اس کا رخ ماں کی آخری آرام گاہ کی جانب تھا۔ اس نے صرف اپنی بہن کو بتایا تھا کہ میں ماں کی قبر پر جا رہا ہوں اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ یہ بات کسی کو بتائے نہیں، ورنہ کوئی اسے اس وقت قبرستان جانے نہیں دے گا۔

شوکت کی دکان، جو اہالیان محلّہ کی بے شمار ضروریات پوری کرتی ہے، چاند رات کو آدھی رات گزر جانے کے باوجود بھی رش لے رہی تھی۔ تین بھائی دکان میں موجود تھے اور خاصے مصروف تھے، جس بھائی کی ڈیوٹی صبح دکان کھولنے کی تھی، وہ سونے کے لیے جا چکا تھا۔ اچانک شوکت کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ شوکت نے مصروفیت کے سبب اسے اہمیت نہ دی کہ کوئی مبارک سلامت کرنے والا ہی ہوگا اور اپنے پانچ روپے کے پیکیج کی خاطر میرا قیمتی وقت اور مغز برباد کرے گا۔ گھنٹی بج بج کر خود ہی چپ ہوگئی، لیکن پھر دوبارہ بھی جلد ہی بج اٹھی۔ شوکت نے جب ایک نظر موبائل پر توجہ کی تو اسے اسکرین پر عدنان کا نمبر دکھائی دیا۔ اس نے موبائل آن کیا تو دوسری جانب عدنان کی بجائے ایک اجنبی آواز نے پوچھا ”یہ نمبر کس کا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ شوکت کی حیرت بجا تھی۔

”مطلب یہ کہ یہ نمبر جو آپ کے پاس آیا ہے، یہ کس کا ہے، آپ کو کیا لگتا ہے؟“

”یہ میرا بیٹا ہے..... لیکن آپ کون بول رہے ہیں۔ آپ کے پاس کیسے آیا اس کا موبائل؟“ شوکت نے سوالات کر دیے۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ اجنبی آواز نے پوچھا۔

”آپ اپنا بتائیں۔ آپ کون ہیں اور میرا بیٹا کہاں ہے۔“

”مجھے افسوس ہے، لیکن میرے پاس آپ کے لیے اچھی خبر نہیں ہے! آپ جناح اسپتال کے ایمرجنسی میں آجائیں، آپ کا بیٹا یہاں ہے۔“

”لیکن آپ.....؟“ شوکت نے پوچھنا چاہا۔

”میں ڈاکٹر ہوں.....“ اور پھر فون بند ہوگیا۔

شوکت فوراً گھر گیا اور دروازے سے ہی بولا۔

”یہ عدنان کہاں ہے؟“ سب خاموش رہے، کسی کو کچھ پتا ہی نہ تھا اور جسے پتا تھا وہ بتانا نہیں چاہ رہی تھی۔

”بتاؤ نا عدنان کب سے گیا ہے؟ کہاں گیا ہے؟ کس کے ساتھ گیا ہے؟ کسے بتا کر گیا ہے؟“ شوکت نے تیز لہجے میں کہا تو بیٹی بولی۔

”ابو! بھائی..... امی کی قبر پر جانے کا کہہ رہے تھے۔“

”اس وقت؟ آدھی رات کو اسے کیا ضرورت پڑ گئی تھی، اسے اگر جانا ہی تھا تو صبح چلا جاتا۔“ شوکت کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں، اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ دکان پر خریداروں کا ہجوم! چاند رات۔ وہ بھی آدھی سے زائد بیت چکی تھی، دن بھر کی تھکن الگ تھی۔ جی چاہتا تھا کہ بس نرم گرم بستر ہو اور ڈسٹرب کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ایسے میں اکلوتے بیٹے کی ادھوری سی خبر جناح اسپتال سے آئی تھی کہ بیٹا اسپتال میں پڑا ہے..... جانے کس حال میں ہوگا؟

شوکت نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کہ فوراً گاڑی نکالے، دیر نہ کرے۔ گاڑی کے نکلتے ہی اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور کچھ رقم جیب میں رکھی کہ اسپتال میں ضرورت پڑ سکتی ہے۔

گاڑی اپنی رفتار سے ہی چل رہی تھی، لیکن شوکت کا دماغ گاڑی سے کئی گنا زیادہ رفتار سے چل رہا تھا۔ عدنان کو پتا نہیں کیا ہوا ہوگا؟ کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے، کہیں گرا ہے، کسی سے جھگڑا ہوا ہے، چاند رات ہے، کہیں برے دوستوں کی صحبت میں پڑ کر کچھ پینے تو نہیں لگ گیا تھا اور یہ خیال آتے ہی اسے جھرجھری آگئی۔

”نہیں میرا بیٹا ایسا نہیں ہوسکتا۔“

پھر وہ ”گھر خیر اور جگ خیر“ قلبی اطمینان حاصل کرنے کے لیے درود شریف کا ورد کرتا رہا۔

اسپتال پہنچے تو اسٹریچر پر سفید چادر میں لپٹی عدنان کی لاش ان کی منتظر تھی۔

کچھ پتا نہیں چل سکا تھا کہ کس گاڑی نے مارا ہے اسے، کب مارا ہے؟ وہ تو بھلا ہو کسی نے سڑک کنارے جھاڑی میں بے تکے پن سے پڑے ہوئے جوان لڑکے

کو دیکھا تو ازراہِ ہمدردی اسے اپنی گاڑی میں ڈال کر جناح اسپتال پہنچا دیا۔ اسے بھی شک اس لیے گزرا کہ اگر کوئی سوتا تو کسی طریقے سے سوتا۔ یہ تو جھاڑیوں میں الجھا پڑا تھا اور لباس سے بھی کسی کھاتے پیتے گھرانے کا دکھائی دیتا تھا۔ بظاہر سمجھ یہ آ رہی تھی کہ سڑک کے کنارے چلتے ہوئے کسی گاڑی کی ٹکر سے وہ ٹکرایا ہوگا اور جھاڑیوں میں جا پڑا۔ رپورٹ بتاتی تھی کہ سر کی چوٹ جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔

کہاں کی عید؟ کیسی مبارک؟ کیسی سلامت؟ بیٹیوں کے لیے ماں کا غم ابھی ماند نہیں پڑا تھا کہ بھائی کی جدائی بھی دیکھنا پڑ گئی۔ وقت ایک مرہم ہے جس سے بے صبروں کو بھی صبر آ جاتا ہے۔ وقت کا پھاہا سارے زخم مندمل کرتا گیا، شوکت بھی پہاڑ جیسا غم برداشت کر گیا۔

☆☆

سال ابھی نصف گزرا تھا، شوکت کے شب و روز میں ایسا دن کم ہی آیا تھا کہ اسے اپنے اکلوتے بیٹے عدنان کی یاد نہ آئی ہو، تاہم ایسے دن شروع ہو گئے تھے کہ عدنان کا ذکر بھی نہ ہو اور کسی بہانے اس کی یاد بھی نہ آئے۔

شوکت حسبِ معمول جوڑیا بازار سے اپنی تھوک کی دکان بند کر کے گھر آ گیا تھا۔ کھانا وغیرہ کھا کر اپنے جنرل اسٹور پر حساب کتاب کی پڑتال کر رہا تھا کہ دو افراد آئے۔ دونوں ہی اس کے لیے اجنبی تھے، ایک جوان سا تھا اور دوسرا ادھیڑ عمر، بادی النظر میں دونوں باپ بیٹا معلوم ہو رہے تھے۔ وہ شاید شوکت کو جانتے تھے، اسی لیے انہوں نے سلام کرتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

شوکت نے بھی مصافحہ کیا...... اور ذہن پر زور دے کر سوچنے لگا کہ انہیں کہاں دیکھا ہے؟ شعور، تحت الشعور حتیٰ کہ لاشعوری کی ساری منزلوں پر اس نے دستک دے ڈالی، لیکن وہ اسے اجنبی ہی معلوم ہوئے، جبکہ ان کا انداز ایسا ہی تھا گویا ان سے برسوں کی شناسائی ہو۔

شوکت سے ہاتھ ملا کر بیٹا تو ذرا پیچھے کی طرف ہو گیا، جب کہ باپ نے رازدارانہ انداز اختیار کرتے ہوئے تقریباً سرگوشی میں کہا۔ ''ہمیں آپ سے کچھ بات کرنا ہے۔''

''کیجیے؟'' شوکت نے کہا۔

''نہیں ایسے نہیں! کچھ خاص بات ہے...... یوں نہیں ہو سکے گی۔'' وہ بولے۔

''اچھا! میں ذرا فارغ ہو لوں تو بات کرتا ہوں...... ایک منٹ...... ذرا سا......'' شوکت بولا۔ چند منٹ بعد ہی شوکت ان کے سامنے پہنچ گیا۔ ''جی فرمائیے۔''

''شوکت صاحب! ہم بہت ہی اہم اور خاص بات کرنے کے لیے آپ کے پاس آئے ہیں بولٹن مارکیٹ سے۔ اگر یہ بات اتنی اہم نہ ہوتی تو ہم آپ کی جوڑیا بازار والی دکان پر پہنچ کر ہی کر لیتے، آپ کے گھر تک نہ آتے۔'' بڑے صاحب نے کہا ''کہیں بٹھائیے ہمیں، جس جگہ کوئی دوسرا شخص دخل دینے والا نہ ہو۔''

شوکت نے انٹرکام پر بیٹی سے کہا کہ ''ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دے، دو مہمان آئے ہیں۔''

بیٹی سگھڑ تھی، اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولنے سے پہلے پانی کی بوتل، تین گلاس اور کولڈ ڈرنک رکھ کر باپ کو انٹرکام پر بتا دیا۔ شوکت نے انہیں ڈرائنگ روم میں عزت سے بٹھایا، پھر انہوں نے اپنا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ شوکت کو اچھی طرح جانتے ہیں اور بولٹن مارکیٹ میں ہمارا ابھی بزنس ہے۔ پھر بڑے صاحب نے کہا کہ ہم آپ کا زیادہ وقت نہیں لیں گے، کیوں کہ آپ بھی مصروف ہیں اور ہمیں بھی دور جانا ہے۔ آپ سے، آپ کے گھر میں ملاقات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کوئی تیسرا شخص مخل نہ ہو اور ہم اطمینان سے بات کر سکیں۔ اگر آپ کو ہم پر غصہ آئے تو بے شک آپ ہمیں ڈانٹ بھی سکتے ہیں اور اگر آپ ہم پر ہاتھ اٹھانا چاہیں، تو ہم اُف بھی نہ کریں گے، بلکہ سر جھکا لیں گے، کیوں کہ ہم خود کو آپ کا مجرم سمجھتے ہیں۔''

''یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔'' شوکت ان کے اس انوکھے مذاق پر ہنستے ہوئے بولا۔

''آپ نہیں جانتے شوکت صاحب! ہم کتنی ہمت و جرأت کر کے آپ سے ملنے آئے ہیں...... ہم اس قدر مجبور ہو گئے ہیں کہ آپ سے ملے بغیر ہمارا مسئلہ

حل نہیں ہوسکتا...... بلکہ ہم تو صبر کر کے بیٹھ ہی گئے تھے کہ جو ہوا سو ہوا، ہم اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر بھول جائیں، لیکن ہمارا ضمیر برداشت نہ کر سکا۔'' ان کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔ شوکت اب بھی کچھ بھی نہیں سمجھتے ہوئے خاموش تھا۔

انہوں نے خود ہی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنا شروع کیا...... ''ہم...... ہم ہی کیا ہر اچھا بیوپاری بنیادی طور پر اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ جو مال اس کے پاس ہے وہ اسے اللہ نے دیا ہے اور اگر اس مال میں نقصان ہوتا ہے تو بیوپاری صبر ہی کرتا ہے، یہ سوچ کر کہ نفع دینے والا بھی وہی ہے اور نقصان بھی اسی کی طرف سے ہے۔ جس طرح نفع حاصل ہونے میں اپنی محنت شامل ہوتی ہے، اسی طرح نقصان میں بھی اپنی ہی کوتاہی حاصل ہوتی ہے، جسے ہم خاطر میں نہیں لاتے۔''

''میری بدقسمتی ہے کہ میں آپ کی بات اور آپ کی آنے کا مقصد ذرا بھی نہیں سمجھ سکا۔'' شوکت نے سچائی سے کہا۔

''شوکت صاحب ہمیں یہ سب کہنے دیجیے۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارا جرم سن کر آپ ہماری کچھ بھی نہ سن سکیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ہمیں پولیس کے حوالے کر دیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہمیں دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیں۔ آپ جو کچھ بھی ہمارے ساتھ کریں گے، ہم ذہنی طور پر اس کے لیے قطعی تیار ہیں۔ ہم آپ کے ہر سلوک کے لیے حاضر ہیں...... یقین کیجیے! آپ جو بھی سلوک ہمارے ساتھ کریں، آپ کر سکتے ہیں، ہمیں آپ سے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔ بلاشبہ ہم آپ کے مجرم ہیں۔''

''بندۂ خدا کچھ پتا بھی تو چلے کہ آپ کیوں مجرم ہیں؟ میں نے تو آج سے پہلے آپ کو دیکھا تک بھی نہیں ہے۔ آج پہلی بار ملاقات ہو رہی ہے۔ آپ کھل کر کہیں مسئلہ کیا ہے؟''

''مسئلہ یہ ہے۔'' بیٹے نے پہلی بار لبوں کو جنبش دی۔

'اچھا یہ بھی بولنے والی کوئی چیز ہے۔' شوکت دل میں کہتے ہوئے اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ''شوکت صاحب عدنان آپ کا بیٹا میرا دوست تھا۔ آپ نے اسے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ وہ صرف اور صرف اپنی تعلیم پر توجہ دے۔ آپ نے اسے بزنس کی جانب آنے کے لیے منع کر رکھا تھا، لیکن اس کی رگوں میں ایک بیوپاری باپ کا خون گردش کر رہا تھا۔ اس نے اپنی جیب خرچ سے اچھی خاصی بچت کر رکھی تھی۔ اس نے مارکیٹ میں ایک دکان بک رہی تھی مال سمیت۔ اس نے اپنی ماں سے اس کا ذکر کیا تھا کہ وہ کوئی بزنس کرنا چاہتا ہے، لیکن ابو اجازت نہیں دیں گے۔ مختصر یہ کہ اس کی امی یعنی آپ کی بیگم اور عدنان نے وہ دکان خرید لی تھی۔ پہلے پہل تو خود ہی دکان پر بیٹھتا رہا، لیکن آپ کو اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ دکان اس کے کسی دوست کی ہے اور وہ یونہی اس سے ملنے آتا ہے، لیکن آپ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ بلاناغہ مارکیٹ آتا ہے۔ جب اس کے امتحانات شروع ہوئے تو اس نے وہ دکان ہمیں کرائے پر دے دی۔ اس کا خیال تھا کہ تعلیم سے فارغ ہو کر وہ دھماکہ کرے گا اور آپ کے لیے یہ ایک سرپرائز ہوگا کہ اس نے تعلیم کے ساتھ ساتھ بزنس بھی کیا ہے، جب کہ آپ نے اسے بزنس پر توجہ دینے سے منع کر رکھا تھا۔ اس کی دکان اور اس کے بزنس کے گواہ اس وقت صرف ہم ہیں اور ایک آپ کی بیگم تھیں۔ اتفاق یہ ہوا کہ آپ کی بیگم اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ماں کے مرنے کا دکھ تو بچوں کو ہوتا ہی ہے، لیکن عدنان کو اس بات کی بھی فکر تھی کہ اگر آپ کو عدنان کی اس حرکت کی خبر ہوئی تو وہ اکیلا ہی ہوگا آپ کی ڈانٹ کھانے والا، کیوں کہ اس کی حمایت کرنے والے لب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے تھے۔ عدنان تو یہ سوچ سوچ کر ہی پریشان ہوتا رہتا تھا کہ وہ آپ کو ان تمام معاملات کے بارے میں کس طرح بتائے؟ یقیناً اس وقت آپ کے سوال یہ ہی ہوتے کہ اتنی رقم کہاں سے لائے ہو، دکان کیوں خریدی، اگر خرید ہی لی تھی تو کرائے پر کیوں دی، مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا وغیرہ وغیرہ۔ یہ ساری باتیں ہمیں معلوم تھیں اور ہم یہ بھی جانتے تھے کہ یہ ساری باتیں آپ کو نہیں معلوم ہیں، کیوں کہ عدنان نے یہ کام آپ کے مشورے یا آپ کے علم میں لائے بغیر کیا تھا۔''

شوکت خاموشی سے ان کی سنتا رہا، اس کے پاس بولنے کو کچھ بھی نہ تھا۔ اس سارے واقعے میں وہ یہ بات تلاش کر رہا تھا کہ اس میں ان کی کیا غلطی ہے، جس سے وہ خود کو مجرم قرار دے رہے ہیں۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ عدنان نے مارکیٹ جانا شروع کیا تھا۔ اس کے جاننے والے افراد، جو اس کے بیٹے عدنان کو بھی جانتے تھے، اسے اطلاع دیتے تھے کہ عدنان فلاں دکان پر بیٹھا ہوا ہے، لیکن شوکت کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس کی خرید کردہ دکان ہے اور وہ اس کا ذاتی کاروبار ہے۔ عدنان نے کہہ رکھا تھا کہ وہ اس کے کسی دوست کی دکان ہے اور یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی کہ شوکت اسے اس سے منع کرتا۔ گھر میں فارغ بیٹھنے سے مارکیٹ میں کسی دوست کے پاس بیٹھنا تجربے اور مشاہدے میں اضافہ ہی کرتا ہے۔

''یہ سارا قصور تو میرے بیٹے عدنان کا بتا رہے ہیں آپ، اس میں آپ نے کیا جرم کیا ہے؟'' شوکت حیرت سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم یہ بھی بتاتے ہیں آپ کو۔ ابھی تو ہم اس طرف آنے سے پہلے بنیاد تیار کر رہے ہیں۔'' بڑے صاحب نے متانت سے کہا اور جیب سے کچھ نوٹ نکال کر شوکت کو دیتے ہوئے بولے۔ ''اس بات کو سات مہینے ہو گئے ہیں، یہ پینتیس ہزار روپیہ ہے، چھ ہزار روپے کرایہ ہے دکان کا، بیالیس ہزار روپیہ بنتے ہیں، ہم یہ کرایہ آپ کو نہیں دے سکے ہماری ہمت ہی نہیں تھی، گو کہ دکان بند ہے، لیکن ہم کرایہ دینے کے تو پابند ہیں، سات ہزار روپے ہماری جانب واجب الادا ہیں ہم بہت جلد وہ بھی آپ کو دے دیں گے۔''

''محترم! میں اب بھی یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس میں آپ کا جرم کون سا ہے جو آپ نے اتنی لمبی تمہید باندھی ہے۔'' شوکت نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

باپ نے بیٹے کی طرف اور بیٹے نے باپ کی جانب دیکھا اور پھر باپ نے ہی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ہم جرم کر رہے ہیں، لیکن اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ دراصل ہم نے اس دکان کے ملکیتی کاغذات بنوا لیے تھے اور ہم نے اپنے لوگوں سے کہہ بھی دیا تھا کہ ہم نے یہ دکان خرید لی ہے، لیکن قدرت کے کاموں میں کسے دخل ہے؟ ہوا یوں کہ مارکیٹ میں آگ لگ گئی اور اس دکان سمیت کئی دکانیں تباہ ہو گئیں، اب حکومت اس نقصان کی تلافی کر رہی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ دکان عدنان کے نام پر ہے، اور اس کے وارث آپ ہیں، گو کہ مال ہمارا ہے، لیکن ہم مال کا کلیم نہیں کر سکتے۔ اب آپ ہماری غلطی معاف کریں اور سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کے دفتر جا کر اپنی دکان کا کلیم داخل کریں۔ آپ کو دکان کے بدلے دکان مل جائے گی اور ہمیں مال کا معاوضہ مل جائے گا۔''

''اگر مارکیٹ میں آگ نہ لگتی تو......؟'' شوکت نے پوچھا۔

''بتایا تو ہے کہ ہم نے اس دکان کے جعلی ملکیتی کاغذات بنوا لیے تھے، یہی ہمارا جرم ہے اور آپ کو نہ بتا سکنے کی وجوہات بھی بتا دی ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں دکان کا کلیم داخل کر دیتا ہوں، پھر؟'' شوکت نے پوچھا۔

''دکان مل جائے تو آپ اسے کرائے پر ہی دینا چاہیں گے؟ اگر بیچنا چاہیں تو بھی ہم آپ سے درخواست کریں گے کہ آپ ہمیں ہی دے دیں، تاکہ مارکیٹ میں ہماری ساکھ برقرار رہے!''

''اگر آپ مخلص رہیں گے تو مجھے کیا اعتراض ہے آپ کو دکان دینے پر۔ میں کاغذات تلاش کرتا ہوں عدنان کے کمرے میں۔ آپ اپنا فون نمبر دے جائیں، جیسے ہی ملیں گے تو میں آپ کو اطلاع کر دوں گا۔''

میں جانتا ہوں شوکت جنرل اسٹور سے کئی افراد کی ضروریات پوری ہوتی ہیں، جو چیز کسی دکان سے نہ ملے وہ شوکت کی دکان سے مل جائے گی۔ جو لوگ شوکت کی دکان پر آتے ہیں، اسی یقین کے تحت آتے ہیں کہ انہیں کہیں اور نہیں جانا پڑے گا اور جب ان کا یقین انہیں کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے تو ان کے دل سے دعا ہی نکلتی ہے اور بلاشبہ دعا پتھر میں سوراخ کر ڈالتی ہے۔

ایک بار شوکت کی دکان میں آگ لگ گئی۔ رات

کا وقت تھا۔ شوکت کی ماں کو اچانک ہی احساس ہوا کہ کچھ جل رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ دکان میں آگ لگ گئی ہے۔ انہوں نے شوکت سمیت سب کو جگایا، آگ ابھی زیادہ بھڑکی نہ تھی، صرف سلگ رہی تھی۔ آگ بجھانے کے لیے پانی ہی استعمال کیا جاتا ہے، سو گھر کے سب افراد نے مل کر ایک دوسرے کی مدد کی، ڈبے، بالٹیاں، دیگچے، ٹب وغیرہ جس کے جو ہاتھ لگا، پانی ڈال ڈال کر دکان میں لگی آگ بجھانے کی کوشش کی۔ ایک بھائی نے حواس بحال رکھے اور پائپ دکان تک پہنچا کر موٹر چلا دی، اوور ہیڈ اور زیر زمین ٹینک، دونوں خالی ہوئے تو ہاتھ روک لیے گئے۔ دکان میں دھواں بھرا ہوا تھا، آگ کا شائبہ ختم ہوا تو ایک نئے اندیشے نے سر ابھارا۔

یہ اتنا سارا پانی، جو سب گھر والوں نے مل کر دو ٹینک خالی کر دیے تھے۔ اس پانی نے دکان یک اندر تباہی مچا دی ہوگی۔ فرش پہ آٹا، دال، چاول، چینی کی بوریاں جو رکھی ہوئی سب پانی کی نذر ہوئی ہوں گی۔ چینی گھل گئی ہوگی، آٹا لئی بن گیا ہوگا، چاول اور دالیں بھیگ کر پھول گئی ہوں گی، جو بھی ہو، اب صبح کی روشنی میں ہی دیکھیں گے۔

انہوں نے عبادت کے لیے ایک کمرہ مخصوص کر رکھا ہے جس میں صرف اور صرف عبادت ہی ہوتی ہے۔ اس کمرے میں چپل سمیت، حتیٰ کہ ننگے سر بھی کوئی نہیں جاتا۔ فجر کے وقت شوکت کی والدہ نے وضو کیا اور نماز کی ادائیگی کے لیے اسی مخصوص کمرے میں گئیں، دیکھا تو کمرے کی دیواروں سے پانی ٹپک رہا ہے اور فرش پر پانی ہی پانی ہے۔ وہ سمجھیں کہ دکان میں آگ بجھانے کے لیے اتنا پانی پھینکا گیا ہے کہ اس کمرے کی دیوار سے رسنا شروع ہو گیا ہے۔

صبح ہوئی تو سب گھر والے ذہنی طور پہ تیار تھے کہ دکان کا سامان گھر میں لا کر پھیلانا پڑے گا، چھت پر لے جا کر سکھانا ہوگا۔ دکان بھی سارا دن بند رکھنا ہوگی اور جب دکان میں جا کر دیکھا تو پانی کا نام و نشان تک نہ تھا، سارا مال جوں کا توں اپنی اصل حالت میں دکھائی دیا۔ یہ دیکھ کر سب کے سب حیرت زدہ رہ گئے کہ رات کو زمین دوز ٹینک اور اوور ہیڈ ٹینک خالی کر دیا تھا تو پھر وہ سارا پانی کہاں چلا گیا؟

وہ سارا پانی عبادت کے لیے مخصوص اسی کمرے نے اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔

یہ اس قدر نا قابل یقین واقعہ تھا کہ کوئی بھی اس پر یقین نہ کرتا، لیکن جو کچھ شوکت کے بیٹے کی دکان کے سلسلے میں ہوا، اسے دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ جو شخص زکوٰۃ کی ادائیگی میں ڈنڈی نہیں مارتا، اللہ اس کے مالک کو ایسے نقصانات سے محفوظ رکھتا ہے۔

بولٹن مارکیٹ میں ہونے والے واقعے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ایسی دکان، جس کے متعلق شوکت کو قطعی علم نہ تھا، اس کے دو اہم گواہ، جنہوں نے مصلحتاً ہی سہی، شوکت کو لاعلم رکھنے کی کوشش کی تھی، دنیا سے اچانک چلے گئے۔ ان کے بعد جن کی تحویل میں یہ دکان تھی، انہوں نے بھی جعلی کاغذات بنوا کر عملاً قبضہ پختہ کر لیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ یہ دکان اب ان کی ہو گئی ہے، لیکن اللہ رب قدوس کسی کی محنت اور کسی کی نیکی کو ہرگز ضائع نہیں کرتا۔

اس واقعے کے تجزیے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ

''بولٹن مارکیٹ میں لگنے والی آگ کا اہم سبب یہی ہے۔'' اور اس دکان کو حقیقی مالک تک پہنچانے کے لیے مسبب الاسباب نے یہ سبب پیدا فرمایا ہے۔

☆......☆......☆......☆

آپ بھی نا......

وہ مجھ کو اب میرے احباب میں رسوا کریں گے
وہ چاہیں گے مجھے اور شہر میں چرچا کریں گے
یہ منصوبہ بنایا ہے میرے یاروں نے مل کر
بنا کر دوست میری ذات پر حملہ کریں گے
ان کو ڈر لگتا ہے زمانے سے بہت
وہ میرے خواب میں آیا کریں گے
وہ سب کے سامنے کہہ دیں گے مجھے بے مہر
خدا کے سامنے اس گناہ کی توبہ کریں گے

اِرم ناز۔ کراچی

دنیا اِک بگلا بھگت

اقراء آصف

اپنوں کی نارسائی کا شکار ہونے والی ایک دوشیزہ کی سچ بیانی، فیصل آباد سے

اسپتال کے کوریڈور میں چلتے نفوسوں کو انتظار تھا۔ تو صرف نرس کی آمد کا جو آ کر انہیں یہ خوش خبری دیتی کہ ان کے خاندان کو وارث مل گیا ہے، یعنی رابعہ نے اس خاندان کو پہلا بیٹا دے دیا ہے ساس نے یہ بات کہ انہیں پہلا بیٹا چاہیے تو تب ہی رابعہ کے کانوں میں ڈال دی تھی جب وہ امید سے تھی۔ جن دنوں اس کے اندر پلتی جان ہی اس کی خوشی کا باعث تھی وہ چاہے 'رحمت ہوتی یا نعمت' وہ اس ذات کا شکر ادا کر رہی تھی جس نے اسے ماں کے رتبے پر فائز کرنا چاہا تھا۔

☆......☆......☆

وہ بھی اپنی جیٹھانی کو دیکھتی جو سات سال میں ماں نہ بن سکی تھی تو یہ شکر مزید گہرائیوں سے ادا ہوتا۔ کبھی کبھار تو وہ گھنٹوں مصلّے سے نہ اٹھتی تھی۔ رو رو کر رب سے اس مرحلے کی آسانی کی دعا مانگتی

جب ساس نے دبے دبے لفظوں میں اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اس دعاؤں میں اولین دعا یہی رہنے لگی کہ رب تعالیٰ اس گھر کو وارث عطا کر دے۔ یہ مانگتے ہوئے بند آنکھوں میں اکثر اس کی جیٹھانی کا حلیہ گھوم جاتا تھا۔ نیل زدہ جسم اور سوجا ہوا منہ۔ رہی سہی کسر ساس اور نندوں کے طعنے پوری کر دیتے تھے۔ اور آج جب درد کی ایک ٹیس اٹھی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا اور دل نہ جانے کس خوف سے لرز رہا تھا۔ بند ہوتی آنکھوں سے اس نے اپنے قریب اپنی ساس اور بڑی نند کو دیکھا۔ وہ کیسے اور کب اسپتال پہنچائی گئی اسے کچھ خبر نہ تھی۔

ساس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تسبیح میں دانے پر دانہ گر رہا تھا اور ہونٹ ہل رہے تھے۔ بڑی اور منجھلی نند کی انگلیاں بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ بشیر کی باپ بننے کی خوشی میں گھنٹے بھر سے لیبر روم کے دروازے پر نظریں ٹکائے بیٹھا تھا۔ جیسے ہی نرس باہر آئی' گویا سب کی سرگرمیاں ترک ہو گئیں اور کان کھڑے ہو گئے۔ سب سے پہلے دادای آگے بڑھی' دادی کے قدموں کی تیزی ہی ان کی خوشی کا پتا دے رہی تھی۔

''مبارک ہو بیٹی ہوئی ہے۔''

نرس نے مسکرا کر خوشخبری دی لیکن وہاں شاید موجود افراد کے لیے اس سے بری خبر کوئی نہ تھی۔ سب کے چہرے لمحوں میں لٹک گئے۔ دادی کے قدموں میں کچھ دیر پہلے کی تیزی یک دم معدوم ہو گئی۔

بشیر نے اندر جھانکنے کی زحمت گوارہ نہیں کی اور ہارے ہوئے جواری کی طرح گھر لوٹ آیا۔ البتہ دادی اور پھوپیاں رابعہ کے پاس آ گئیں لیکن کسی نے بھی اس نو

مولود کلی کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ اس نے تو گویا اپنی قسمت کو خراب قرار دے دیا۔

کہ اس کی قسمت ہی پھوٹی ہوئی ہے۔ پہلے بڑی بہو بے اولاد رہی اور اب چھوٹی نے بیٹی پیدا کر کے کون سا تیر مار لیا۔"

ساس اور نندیں اسے اٹھتے بیٹھتے طعنے تشنے دینے لگی تھیں بشیر بھی اکثر اوقات اس کی اچھی خاصی دھنائی کر دیتا اور رابعہ نے تو جیسے اس معاملے میں چپ اختیار کر لی تھی۔ اس نے ننھے وجود کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا سنبھالنا تو دور کی بات۔

ثریا جو سدا کی پیاسی تھی اس نے ننھی جان کو اپنے وجود کی گرمی دی۔ وہ اسے نہلاتی دھلاتی، سنوارتی اس کے لیے اپنے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے فراک سیتی۔

وہ دن بدن بڑھنے لگی۔ وہ ثریا کو ہی اپنی ماں سمجھتی تھی۔ اسے ہی ماما کہتی تھی البتہ باپ کہنا اسے کسی نے سکھایا ہی نہیں اور نہ ہی اس نے کہنا چاہا۔ ثریا نے ہی اسے نام دیا تھا 'ستارہ' اب وہ روشن ستارہ تھا یا بجھتا ہوا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆......☆......☆

گذرتے ماہ و سال میں رابعہ نے پے در پے تین بیٹوں کو جنم دیا جو کہ اس کے لیے خوش بختی کی علامت بنے۔ بشیر ہر وقت اسے رانیوں کی طرح رکھتا۔ اس کے ناز نخرے اٹھاتا۔ ساس نندیں بھی رابعہ کے آگے پیچھے پھرنے لگی۔ اس کے تینوں بیٹے باپ اور دادی کی



آنکھوں کا تارا تھے۔ جب بشیر اپنے بیٹوں کو پیار کرتا تو ستارہ یہ سب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہتی اس نے اس گھر کے دونوں مردوں میں سے کسی ایک کو بھی اپنے لیے یوں کچھ لاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ گزرتے وقت میں ستارہ کو یہ حقیقت بھی معلوم ہوگئی کہ وہ رابعہ اور بشیر کی بیٹی ہے لیکن وہ ماں ثریا کو کہتی ہے۔

☆......☆......☆

اس کے تینوں بھائی اسکول جانے لگے۔ ایک دن اس نے ثریا سے بھی اسکول جانے کی بات کی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی اس نے جواب کی طلب کی کیوں کہ جواب تو وہاں طلب کیے جاتے ہیں جہاں کوئی اختیار ہو، مان ہو حق ہو اور اس کے پاس ان میں سے کچھ بھی نہیں تھا اور یوں وہ پڑھنے کے بجائے گھر داری سیکھنے لگی۔ مگر پھر بھی اس نے گھر کے ہر فرد کی آنکھوں میں اپنے لیے ناپسندیدگی ہی دیکھی تھی ماسوا ثریا کے۔ جنم دینے والی ماں نے بھی کبھی اسے آغوش میں نہیں لیا تھا اور نہ ہی اس نے ماں کا پلو پکڑنے کی کوشش کی۔

☆......☆......☆

ستارہ نے سولہویں سال میں قدم کیا رکھا ہر ایک کو اس کی شادی کی فکر ہونے لگی کیوں کہ وہ انہیں گلے کا طوق لگتی۔ دادی نے تو لوگوں سے رشتے کی باتیں بھی شروع کر دی تھیں ساتھ یہ بھی کہلوا دیا کہ اگر کوئی رشتہ نظر میں ہو تو بتا دیں۔

ثریا نے بیٹی کے لیے جوڑے بنانا شروع کر دیے تھے۔ وہ کبھی دھاگے کا کام کرتی نظر آتی تو کبھی گوٹہ ستارے ٹانک رہی ہوتی، جبکہ رابعہ ان سب کاموں سے غافل، بے نیاز پھرتی رہتی جیسے اسے کوئی غرض ہی نہ ہو۔

ستارہ کے لیے رشتہ منتخب کر لیا گیا۔ اب شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے جس کو اس کے لیے قبولیت کی سند دی گئی تھی، اس کے بارے میں عتارہ کو کچھ خبر نہ تھی یہاں تک کہ وہ اس کا نام بھی نہیں جانتی تھی۔ اور نہ ہی اس میں پوچھنے کی ہمت تھی۔ گاؤں میں بہت سے ایسے رسم و رواج تھے۔ جو ان کے خود ساختہ بنائے ہوئے تھے اور ان نام نہاد اصولوں کی پابندی بھی لازمی قرار دی جاتی۔ اور اسی رسم رواج کے مطابق ستارہ کی شادی ایک ادھیڑ عمر کے شخص سے ہوگئی جو کہ ایک بیوی کو طلاق دے چکا تھا اور دوسری اس کے ساتھ تھی۔ ستارہ اس کی تیسری بیوی کی حیثیت سے اس کے گھر میں گئی۔

ابتداء کے کچھ دنوں میں تو حمید ازدواجی زندگی میں گم رہا، گزرتے وقت کے ساتھ یہ نشہ چھٹنے لگا۔ اور پھر وہ آہستہ آہستہ ستارہ سے غافل رہنے لگا۔ اور اگر رات گئے نشے میں دھت لوٹتا بھی تو اسے دلشاد بیگم کے ہی کمرے کا راستہ سجھائی دیتا۔ اور دلشاد بیگم کی رات بھر کانوں میں ڈالی گئی باتوں کے زیر اثر وہ صبح ہوتے ہی ستارہ کو مارنے لگتا، بنا کوئی قصور بتائے ...... اور بے چاری مار کھاتی رہتی اور پھر سارا دن دکھتے بدن کے ساتھ کولہو کا بیل بن کام کرتی۔ دلشاد بیگم پان منہ میں ڈالے تخت پر بیٹھی حکم چلاتی اور آنے جانے والوں کو اس کی حڈ حرامی اور بدزبانی کے قصے سناتی۔

صبر تو شروع ہی سے ستارہ کی گھٹی میں تھا۔ اس نے چپ چاپ صبر کی چادر تان لی اور اپنا مقدمہ خدا کی عدالت میں دائر کر دیا۔ جہاں اس کی گواہی دینے والی اس کے بدن سے اٹھتی درد کی ٹیسیں اور آنسوں گواہیوں کے سچا ہونے کی قسم کھاتے دکھائی دیتے تھے۔

اللہ نے ستارہ کو ماں کے رتبے پر فائز ہونے کا اشارہ کیا اور اس کی کوکھ میں ایک وجود پلنے لگا۔ جب دلشا بیگم تک خبر پہنچی تو اسے خطرہ لاحق ہوا کہ اگر ستارہ ماں بن گئی تو حمید پھر سے ستارہ کی طرف ہو جائے گا اور جائیداد بھی اسی کے کھاتے میں جائے گی۔ وہ حسد کی آگ میں جلتی اس ننھے وجود کو ختم کرنے کا سوچتی اور ستارہ سے ہمدردیاں جتاتی۔ ستارہ اس سب سے بے خبر سب کچھ ٹھیک ہونے کی دعائیں مانگتی۔

وہ رب سے دعا مانگتی کہ رب اس کی گود میں کوئی بجھتا ہوا ستارہ جنم نہ لے بلکہ ہر خاندان کی خواہش پر اسے دیا (بیٹا) عطا کر دے جو اس کے گھر کا اجالا بنے۔

☆......☆......☆

وہ ایک عام سا دن تھا مگر اس دن گرمی قہر کی پڑ رہی تھی۔ درخت بھی خاموشی کی چادر تانے سو رہے تھے۔ ہوا جیسے روٹھ کر کہیں اور کوچ کر گئی تھی، اور سورج سوا نیزے پر گرمی برسا رہا تھا۔ چوہدری حمید نے زمین سے مزارعے

پالک سے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں

مشہور کارٹون کردار "پوپائے دی سیلر" کو غالباً پالک کی خوبیوں کے بارے میں سب سے زیادہ علم ہے لیکن اب سائنسدان بھی جان گئے ہیں کہ پاک میں پٹھوں کو طاقتور کرنے کی اتنی زیادہ صلاحیت کیوں ہوتی ہے؟ ایک طبی جائزے میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ پالک کس طرح ہمارے بازو کی مچھلی کو پھلا دیتا ہے۔ جانوروں پر کیے گئے تجربات میں یہ دیکھا گیا ہے کہ پالک میں بہت زیادہ مقدار میں پایا جانے والا ایک مرکب نائٹریٹ دوایسے پروٹینز کی پیداوار بڑھا دیتا ہے جو پٹھوں کی توانائی کے لیے اہم سمجھے جاتے ہیں۔ سوئیڈن کی کارولنسکا انسٹیٹیوٹ کے ریسرچرز نے کہا ہے کہ فی الحال یہ ممکن نہیں ہے کہ نائٹریٹ سپلی منٹس خرید کر دواؤں کی صورت میں یہ ضرورت پوری کی جا سکے۔ پٹھوں کو مناسب توانائی فراہم کرنے کے لیے پالک سے بھری چھوٹی تھیلی کافی ہوگی۔ نائٹریٹ کی یہ سطح دو یا تین چقندر سے بھی حاصل ہوسکتی ہے۔ نائٹریٹ سلاد کے پتوں اور Chard کے پتوں میں بھی ہوتا ہے۔ سابقہ جائزوں سے معلوم ہوا تھا کہ پالک کے استعمال سے ہارٹ اٹیک کے مریضوں کی صحت یابی کی رفتار تیز ہوجاتی ہے۔ پالک کھانے سے بازوؤں اور ٹانگوں کے عضلات زیادہ توانائی محسوس کرتے ہیں اور اس کی وجہ وہ پروٹینز ہوتے ہیں جو وہاں دریافت کئے گئے تھے۔

کو گھر بھیجا کہ آج دوپہر میں تندور کی روٹی ہونی چاہیے اور ستارہ نے اتنی گری میں بھی تندور دہکا لیا تھا۔ وہ پسینے میں ڈوبی روٹیاں لگا رہی تھی جب اسے پیچھے سے کسی کے رکنے کی آہٹ سنائی دی، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ منظر ناقابلِ یقین تھا، وہاں اس کا بڑا بھائی دلاور کھڑا تھا۔ جس کی آنکھوں میں بہن کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ جانے کس جذبے سے مغلوب ہو کر اس نے ستارہ کے لیے باہیں کھول دیں اور ستارہ جو سدا پیار کی پیاسی ہاتھ میں پکڑا آٹے کا پیڑا دہیں پھینک کر بھائی کی بانہوں میں سما گئی، اور زارو قطار رونے لگی۔ دلاور نے بھی اسے رونے دیا اسے پتا تھا کہ اٹھارہ سالوں کا غبار اتنی جلدی نہیں نکلے گا۔

لیکن شاید تب تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

چوہدری حمید نے جب صحن کے وسط میں اس منظر کو دیکھا تو غصے سے آگ بگولہ ہو گیا اور رہی سہی کسر دلشاد بیگم کے بہکاوے نے پوری کر دی۔

''چوہدری صاحب میں تو عزت لٹنے کے ڈر سے آپ کو نہیں بتاتی تھی پر یہ کام تو روز ہوتا ہے۔

چوہدری حمید نے نا آؤ دیکھا نا تاؤ۔ آگے بڑھا اور ستارہ کو بازو سے پکڑ کر دلاور سے الگ کیا اور سامنے دے مارا پھر حساب نہیں کتنی لاتیں کتنے پتھر، کتنے گھونسے اس نے اپنے جسم پر کھائے۔

"بتا کتنے عاشق ہیں تیرے۔ کون کون تجھے ملنے آتا ہے۔ بتا ورنہ میں تیری جان لے لوں گا۔''

دلاور دور ہی کھڑا سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟

''بتا میں کہتا ہوں جلدی بتا۔'' چوہدری حمید نے غصے سے پاگل ہو کر ایک لات ستارہ کے پیٹ میں دے ماری۔ ستارہ کی دل سوز چیخ فضا میں گونجی۔ دلاور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا مگر تب بہت دیر ہو چکی تھی۔

ستارہ نے درد سے کراہتے ہوئے خود پر جھکے حمید کا گریبان تھام لیا۔

''یہ میرا عاشق نہیں میرا ماں جایا بھائی ہے۔'' یہ کہتے ہی ستارہ کا وجود لڑھک گیا۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر گرے اور مٹی میں جذب ہونے کے بجائے ماتم کرنے لگے۔

آج بھی زمانہ جاہلیت کی طرح لوگ بیٹیوں کی چاہ کرتے ہیں، جبکہ بیٹیاں تو بجھتا ہوا ستارہ نہیں بلکہ آسمان پر چمکتا سب سے روشن ستارہ ہوتی ہیں۔ اور ستاروں کی جگہ زمین پر نہیں آسمان پر ہوتی ہے۔''

بہت کم لوگ اس روئے زمین پر بسنے والے ان ستاروں کی قدر جانتے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ بیٹیاں رحمت بنا کر بھیجی گئی ہیں۔

☆.....☆.....☆.....☆

فرض نبھاتا ہوں

مجید احمد جائی

ملتان کے اُس شخص کی کہانی، جس کی لحد پر آج بھی ضوفشانی جاری ہے

جاڑے کے دن تھے۔ میں آفس جانے کو تیار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ماحول میں خنکی پیدا کر رہی تھیں۔ ستمبر رخت سفر باندھ چکا تھا اور نومبر بانہیں پھیلائے منتظر تھا۔ ہوا بادلوں کے ساتھ شرارتیں کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ سورج کی کرنیں آنکھ مچولی کا کھیل کھیل رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا ابھی بارش شروع ہو جائے گی۔ میں جلدی آفس پہنچنا چاہتا تھا۔ گھر سے نکلتے ہی بائیک تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ مجھے دس کلومیٹر کا سفر کرنا ہوتا تھا۔ گھر سے نکلتے ہی کچی سڑک کا سفر شروع ہوتا پھر نہر کنارے ہوتے ہوئے پکی سڑک پر جا چڑھتا تھا۔ گھر سے آفس تک کا راستہ بڑا دلچسپ تھا۔ نظارے ہی نظارے تھے۔ قدرت کے کرشمے تھے۔ بہتی ندیاں نالے تھے۔ گھر سے تھوڑی دُور نہر بہتی تھی، جو پورے علاقے کے کھیتوں کو سیراب کرتے گزرتی تھی۔ نہر کے دو کناروں پر شیشم، کیکر، ٹالی کے گھنے درخت تھے، کہیں کہیں ٹنڈ منڈ یہ درخت عملے کی نااہلی کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ گھنے درختوں میں رنگ برنگے پرندوں کے گھونسلے تھے، جن میں پرندوں کے بچوں کی سُریلی آوازیں کانوں میں رس گھولتی تھیں۔ کہیں فاختہ بولتی تھی تو کہیں جنگلی طوطے ٹائیں ٹائیں کرتے تھے۔ کہیں چڑیاں بچوں کو لوریاں سناتی تھیں تو کہیں کوے اپنے بچوں کو چوغیں دیتے نظر آتے تھے۔ نہر کراس کرتے پکی سڑک شروع ہوتی تھی۔ پکی سڑک کی دونوں سائیڈوں پر دکانوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ یہاں سے محلے کا مین بازار شروع ہوتا ہے۔ کہیں حلوائی گلاب جامن سجائے بیٹھا ہے تو کہیں جلیبیاں کڑھائی میں بن رہی ہیں۔ کہیں فالودے والا کرسیاں ترتیب سے لگائے گاہکوں کا منتظر ہے۔ کہیں پکوڑے سموسوں کی خوشبوئیں اپنی طرف متوجہ کر رہی ہوتی۔ کہیں سوہن حلوے کی کڑھائیاں چڑھی ہیں۔

بازار سے گزرتے ہوئے کونے پر سبزی کی دکانیں ہیں۔ دکاندار آلو، گوبھی، کدوں توریاں، بھنڈیاں، پیاز، ٹماٹروں پر پانی کا چھڑکاؤ کر رہا ہے تاکہ سبزیاں تازی نظر آئیں اور گاہک دوڑے چلے آئیں۔ کوئی موبائل شاپ بنائے ایزی لوڈ کر رہا ہے۔ کوئی ویڈیو گیم کی شاپ بنائے بچوں کو اسکول سے چھٹی ہونے کا منتظر ہے۔ مارکیٹ کے آخری کونے پر گنے والا جوس کی مشین لگائے ہوئے ہے۔ مگر یہاں اب رش قدرے کم ہوتا ہے۔ لوڈشیدنگ کی وجہ ہے یا پھر سیزن آؤٹ ہو رہا ہے۔ میری اس جوس والے سے علیک سلیک رہتی ہے۔ جب کبھی ستانے کا ارادہ ہوتا ہے تو اسی کے پاس آ کر رُکتا ہوں۔ پیاس بجھانے کی غرض سے جوس پیتا ہوں، گپ شپ کرتا، منزل کی طرف رواں

ہو جاتا ہوں۔

یہ محلے کا واحد بازار ہے۔ یہاں بنیادی ضروریات زندگی کی ہر شئے دستیاب ہے۔ محلے والوں کو شہر کا رُخ کم ہی کرنا پڑتا ہے۔لڑکی،لڑکوں کے الگ الگ اسکول،ہسپتال،فری ڈسپنسری موجود ہے۔کپڑے کی دکانیں ہیں۔بازار کے مغربی کونے پر علاقے کے یونین کونسل کا آفس ہے۔بازار ختم ہوتے ہی دوکلو میٹر کا سفر سنسان،ویران ہے۔کہیں کہیں فصلیں لہلہاتی ہیں ورنہ بنجر زمینیں کسانوں کو کوس رہی ہیں۔تھوڑا آگے جائیں تو محلے کا قبرستان ہے۔جو بہت پرانا ہے۔یہی قبرستان تو تھا، جو میری توجہ کا مرکز تھا۔پکی سڑک قبرستان کے ساتھ سے گزر کر شہر سے ملاتی تھی۔باقی کوئی راستہ نہیں تھا۔میرا روز یہاں سے گزر ہونا ہوتا تھا۔قبرستان سے پانچ کلومیٹر آگے میرا آفس تھا۔آفس آنے سے تھوڑا پہلے شہر کی حدود شروع ہو جاتی ہے۔

☆☆☆☆

جہاں میری جاب تھی یہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی ہے۔اس کی برانچیں ملک کے ہر شہر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ابھی چند دن پہلے میری لاہور پوسٹنگ تھی مگر میرا گھر ملتان ہے۔اسی لیے میں نے اپنا ٹرانسفر لاہور سے ملتان کروالیا تھا۔ملتان قدیم ترین شہر ہے اور ملتان کی مٹی میں وفا بھی ہے۔بہت سے اللہ والوں کے یہاں مزارات ہیں۔اسی لیے تو ملتان کو مدینۃ اولیاء بھی کہتے ہیں۔ یہاں کی مشہور سوغات میں سے ایک سوغات سوہن حلوہ ہے۔میں ملتان کا باسی ہوں اسی پر مجھے فخر بھی ہے۔اس برانچ میں میرے باس قدرت اللہ تھے۔جاذب نظر،ہینڈسم،اسمارٹ،خوش اخلاق،خوب صورت نین نقش کے مالک تھے۔ان کے لبوں پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی تھی۔یہی مسکراہٹ تو ان کی سب سے عظیم دولت تھی۔یہی مسکراہٹ ہی تھی جس کے دشمن بھی گن گاتے نہیں تھکتے تھے۔میں قدرت کے نیچے کام کرتا تھا اور میرے نیچے بائیس لوگ کام کرتے تھے۔صاف ستھرا کام تھا۔سارا دن فائلوں سے مغز ماری ہوتی تھی، فون کالز سماعتوں سے ٹکراتی رہتی تھیں۔

قدرت اللہ صاحب میرے باس کم، دوست زیادہ بن گئے تھے۔میری طرح کم گو،حساس دل کے مالک تھے۔ان کے دم سے ہی آفس میں رونق لگی رہتی تھی۔کوئی آرہا ہے



کوئی جا رہا ہے۔ میں یہاں آ کر بہت خوش تھا، خوش کیسے نہ ہوتا، خوش اخلاق لوگ جو ملے تھے ورنہ ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ اعلیٰ افسروں سے نیچے والا عملہ ہمیشہ خفا خفا رہتا ہے۔ سامنے آ گئے تو لیس سر لیس کے نعرے ہوتے ہیں اور پیٹھ پیچھے گلے شکووں سے زمین آسمان ملاتے نظر آتے ہیں۔

☆☆☆☆

قبرستان سے میں روز گزرتا تھا۔ ایک قبر ایسی تھی جو روز تازہ پھولوں سے مہکتی تھی۔ کچی قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کیا ہوتا، گلابوں کی پتیاں خوشبو پھیلا رہی ہوتی۔ گم نام قبر تھی، نہ کوئی کتبہ لگا تھا نہ مجھے کوئی خبر تھی کہ اس مٹی کی ڈھیری کے نیچے کون خوش نصیب سو رہا ہے۔ مجھے یہاں سے گزرتے ہوئے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ قبرستان سے گزرتے ہی گلابوں کی خوشبو مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی۔ میں بے اختیار بائیک روکتا، اس قبر پر جاتا، فاتحہ خوانی کرتا۔ چند لمحے بیٹھ کر آفس کی طرف روانہ ہو جاتا۔

میرے اندر ایک تجسس تھا۔ آخر یہ کس کی قبر؟ کون شخص ہے جو اسے روز پھولوں سے سجاتا ہے؟ پانی کا چھڑکاؤ کرتا ہے؟ ایک راز تھا جو ابھی تک پوشیدہ تھا۔ میں اس راز کو جاننا چاہتا تھا۔ اس کی تہہ میں جانا چاہتا تھا، نجانے یہ راز کس دن عیاں ہوگا؟ میرے دل و دماغ میں سوالات کی جنگ جاری رہتی تھی۔

پھر ایک دن میں نے آفس سے واپسی پر ناکہ لگانے کی ٹھان لی۔

گھر فون کر دیا تھا کہ میں کسی دوست کے ہاں جا رہا ہوں، ہو سکتا ہے دیر ہو جائے۔ میرا انتظار نہ کرنا، یہ بھی ہو سکتا ہے ادھر ہی ٹھہرنا پڑ جائے۔

قبرستان کے مغربی کنارے پر کیکر کا گھنا درخت تھا، جو اس قبر کے نزدیک ترین تھا۔ میں نے موٹر سائیکل دوست کے ہاں کھڑی کی اور مغرب سے پہلے ہی اس درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ دھیرے دھیرے اندھیرا اپنی چادر پھیلانے لگا اور ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں چاند اپنی رعایا لے کر جلوہ گر ہوا، چاند کی چاندنی اندھیرے کو کم کرنے میں مصروف عمل تھی۔ ستارے جگمگانے لگے۔ یہ رات دوسری راتوں سے روشن تھی۔ چودھویں کا چاند تھا۔ اسی لیے رات کی چاندنی جوبن پر تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دن نکلا ہوا ہے۔ رات، دن کی طرح روشن تھی۔ رات دھیرے دھیرے سرکتی جا رہی تھی۔

ساری رات میں نے وحشی کیکر پر کیسے گزاری میں جانتا ہوں۔ جنون کے آگے سب کچھ کمزور پڑ جاتا ہے۔ راز کو پا لینا میرا جنون تھا۔ اگر راز عیاں ہو جاتا تو میرا تجسس ختم ہو جاتا تھا۔ میں جو کئی مہینوں سے عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ نجات ملنے کو تھی۔ اُمید تھی کہ دن چڑھنے سے پہلے پہلے راز فاش ہو جائے گا اور میری محنت رنگ لائے گی۔

☆☆☆☆

قدرت اللہ نے آفس کا سبھی کام مجھے سونپ دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا ان کا دل کام سے اچاٹ گیا ہے۔ بیٹھے بیٹھے کہیں گم ہو جاتے۔ کبھی آفس کی چھت کو گھورنے لگتے تو کبھی دانتوں میں قلم لے کر سوچوں میں گم ہو جاتے۔ میں نے کئی بار وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی، مگر بے سود، مجھے ہر بار ٹال دیا جاتا۔

ایک دن معمول کے مطابق فائلوں سے مغز ماری کر رہا تھا کہ اچانک دھماکہ سا ہوا۔ گردن گھما کر دیکھا تو قدرت اللہ صاحب کرسی سے نیچے گرے ہوئے ہیں۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے قدرت اللہ صاحب کو اٹھانا چاہا۔ مگر وہ تو گرتے ہی بے ہوش ہو گئے تھے۔ فوراً ایمبولینس منگوائی گئی۔

چند منٹوں میں ہارن بجاتی ایمبولینس گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ ہم قدرت اللہ صاحب کو لے کر شہر کے بڑے ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہسپتال پہنچتے ہی انہیں ایمرجنسی میں داخل کر دیا گیا۔ میں ویٹنگ روم میں خیالوں سے لڑ رہا تھا۔ قدرت اللہ صاحب نے کبھی اپنے بارے بتایا ہی نہیں ہے۔ میں بھی کتنا پاگل ہوں۔ ایک سال ہو چلا ہے کبھی پوچھ ہی پایا۔ جب بھی پوچھنا چاہا، ٹال دیا جاتا تھا۔ میں کیا کرتا، دوسرے لمحے اندر سے آواز آتی۔

میں سوچوں کے نگر اسی طرح آباد کیے ہوا تھا کہ ڈاکٹر میرے پاس آ ٹھہرا۔

"ایکسوزمی! ابھی جو مریض داخل کروا گیا ہے، اس کے ساتھ آپ آئے ہیں؟"

"ج۔۔۔جی۔۔۔جی ہاں میں ہی آیا ہوں۔" میں

نے جواب دیا۔

''وہ آپ کے کیا لگتے ہیں؟''

''جی میرے باس ہیں۔ میں ان کے ساتھ کام کرتا ہوں۔'' میں نے بمشکل جواب دیا۔

''کیا میں ان سے مل سکتا ہوں، اب وہ کیسے ہیں؟''

گھبرانے کی بات نہیں ہے، آپ ان کے گھر والوں کو بلوالیں، انھیں گہرا صدمہ پہنچا ہے جس کی وجہ سے بے ہوش ہوئے ہیں۔ ان کے چند ٹیسٹ کرنے ہوں گے اس کے بعد ہی بتا سکتے ہیں۔ فی الحال آپ ان سے مل سکتے ہیں۔''

''شکریہ'' میں نے ڈاکٹر کو جواب دیا۔ میرے ذہن میں اب بھی وہی جنگ جاری تھی کہ قدرت اللہ صاحب کا گھر کہاں ہے؟ ان کے گھر میں کون کون ہیں؟ انہوں نے کبھی بتانا پسند ہی نہیں کیا تھا۔

لمحہ بھر سوچنے کے بعد میں ایک جذبے کے ساتھ اٹھا اور ایمرجنسی میں قدرت اللہ صاحب کے پاس چلا گیا۔ میرے پہنچتے ہی انھیں وارڈ میں شفٹ کر ادیا گیا۔ قدرت اللہ صاحب کو ہوش آ گیا تھا۔

''سر کیسی طبیعت ہے؟'' میں نے خیریت دریافت کی

''جی، بہتر ہوں۔'' قدرت اللہ صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''سر مائنڈ نہ کریں تو اپنے گھر کے کسی فرد کا نمبر بتا دیں تا کہ میں رابطہ کر کے اطلاع کرسکوں۔''

میرے پوچھنے پر باس کا چہرہ اداسی کا لبادہ اوڑھ گیا۔ میرا اس طرح پوچھنا شاید باس کو ناگوار گزرا ہے، یہ سوچتے ہوئے، میں نے معذرت چاہی۔

''نہیں دل شیر! ایسی بات نہیں۔ تمہارا پوچھنا جائز ہے۔'' لمحہ بھر کے لیے باس خاموش ہوئے جیسے ماضی کے نگر میں غوطہ زن ہو گئے ہوں۔

☆☆☆☆

ساری رات قبرستان والے کیکر پر ہی گزر گئی لیکن راز، راز ہی رہا۔ قبرستان کئی لوگ آئے لیکن اس قبر کی طرف کوئی نہ آیا۔ دن چڑھنے لگا تو مایوس ہو کر کیکر سے نیچے اُتر آیا۔ نیند سے آنکھیں لال ہو گئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے برسوں سے جاگی ہوئی ہیں۔ کپڑے جھاڑ کر دوست کے پاس چلا گیا۔

میرا اجڑا چہرہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ وجہ دریافت کی؟

''خیر تو ہے دل شیر، صبح سویرے ہارے ہوئے جواری کی طرح چہرے سے طوطے اڑے ہوئے ہیں۔''

ایسی کوئی بات نہیں دوست۔ بس رات بھر سو نہیں سکا۔ رات شہر گیا تھا تو ادھر علی مل گیا۔ اس نے اپنے پاس روک لیا اور رات بھر گپ شب کرتے رہے، اس نے سونے ہی نہیں دیا۔'' میں نے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا، دوست نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا، یوں جان بخشی ہو گئی۔

دوست ناشتے کا کہتا رہ گیا لیکن میں نے انکار کیا اور بائیک لے کر گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچ کر نہایا، ناشتا کیا اور پھر آفس کی طرف چل پڑا۔

نیند کی خماری اپنی جگہ، لیکن ڈیوٹی اپنی جگہ، آفس پہنچا تو لیٹ ہو گیا۔ باس آئے ہوئے تھے۔ سلام دعا ہوئی اور معمول کے کام سرانجام دینے لگا۔

دن کے گیارہ بجے تھے کہ کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ میں نے گردن گھمائی تو ششدر رہ گیا۔ باس کرسی سے نیچے گرے ہوئے تھے۔ میں فوراً کام چھوڑ کر باس کی طرف لپکا اور باس کو سہارا دیتے ہوئے اٹھانے کی کوشش کی لیکن باس تو گرتے ہی بے ہوش ہو گئے تھے۔ میں نے حیرانگی کے عالم میں ایمولینس کو بلوایا اور باس کو لے کر ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

میرا مشن التواء کا شکار ہو گیا۔ مجھے کئی دن ہسپتال رہنا پڑ سکتا تھا۔ میں نے گھر میں اطلاع کر دی تھی کہ باس کو ہسپتال گیا ہوا ہوں۔ آفس کا کام میں نے ذمہ دار لڑکے کو سونپ دیا تھا پھر نہیں معلوم کہ آفس میں کیا ہو رہا ہے، کیا نہیں، مجھے فکر تھی تو صرف اور صرف قدرت اللہ صاحب کی۔

ایک طرف باس کی تیمارداری تھی تو دوسری طرف ذہن میں قبرستان کی اس قبر کا راز جاننے کا ولولہ تھا۔ جس نے میری نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ میرا چین وسکون چھین لیا تھا۔ آخر یہ راز کب عیاں ہوگا؟ کون ہے جو اس قبر پر روز پھولوں کی پتیاں ڈال جاتا ہے؟ پانی کا چھڑکاؤ کرتا ہے۔ اُس کا اس قبر میں سوئے ہوئے وجود کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ قدرت کا کرشمہ ہی تھا کہ ایک دن راز عیاں ہو ہی گیا۔ میری مشکل آسان ہو گئی۔ میں نے راز پالیا تھا۔

☆☆☆☆

میرے پاس کچھ دیر تو وارڈ کے درودیوار کو گھورتے رہے پھر بولنے لگے۔

''دل شیر! ایک راز میرے سینے میں ہے۔لیکن آج آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔تمھارے میرے اوپر بہت سے احسانات ہیں۔تم نے ہر پل میرا ساتھ دیا۔مجھے لگتا ہے اب زندگی اختتام چاہتی ہے۔''

''نہیں سر! مجھے شرمندہ نہ کریں اور مایوسی کی باتیں اچھی نہیں ہوتی ہیں۔اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے۔'' میں نے جواباً کہا۔

''دل شیر! میں مہاجر ہوں۔پاکستان کو بنتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں نے اپنی زمینیں، جائیدادیں، خاندان، بہن، بھائی، ماں باپ، دوست و احباب قربان کیے ہیں۔مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ ایک بھیانک رات تھی۔اُس رات اندھیرے نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔میرا خاندان ایک قافلے کے ساتھ ہندوستان سے پاکستان کی سرزمین کی طرف ہجرت کر رہا تھا۔سبھی اپنی جائیدادیں، ساز وسامان چھوڑ کر تن کے کپڑوں کے ساتھ، آزادی کی زندگی جینے کا جذبہ لیے اسلامی وطن کی طرف روانہ ہوئے۔

ابھی پاکستان کی حدود کافی دور تھی کہ ہندوؤں، سکھوں نے قافلے پر حملہ کر دیا۔میری آنکھوں کے سامنے، میرے ماں باپ، بہن بھائی تڑپ تڑپ کر جان دے گئے۔ان کے ساتھ ہی قافلے کے بہت سے لوگ شہید ہو گئے۔میں ان لاشوں کے درمیان سانسیں روکے پڑا تھا۔میرے کپڑے خون سے لت پت تھے۔

ہندو ہر ایک وجود کو پاؤں سے ٹھوکریں لگا لگا کر دیکھ رہے تھے کہ کوئی زندہ تو نہیں رہ گیا۔میرے پاس آئے تو میں نے سانس روکے رکھی۔اللہ تعالیٰ نے مجھے زندہ رکھا تھا۔میں ان دشمنوں سے محفوظ رہ گیا تھا۔وہ رات قہر کی رات تھی۔زندگی نے بہت سے غم درد سہے تھے۔اپنوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھا تھا۔چیخیں سی تھیں۔آہ وپکار سی تھیں۔خوف دیکھا تھا۔قیامت سے پہلے قیامت کا منظر تھا۔حملہ آور سب کچھ ختم کر کے کب کے جا چکے تھے۔

رات ابھی باقی تھی۔میں ڈرتے ڈرتے، سہما سہما، گرتا پھسلتا، منزل کی طرف روانہ ہوا۔میری طرح اجڑی لٹی لڑکی ایمان بھی تھی۔وہ بھی اسی قافلے میں تھی۔ایمان بھی دشمنوں کی نظروں سے بچ گئی تھی۔رات کالی سیاہ تھی، وہ جھاڑی کی اوٹ لے گئی تھی۔

ایمان اور میں ایک دوسرے کا سہارا بنے منزل کی طرف گامزن تھے۔صبح کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں جب ہم نے پاکستان کی سرزمین پر پاؤں رکھے۔غلامی کا سورج غروب ہو چکا تھا اور نئی صبح آزادی کا سورج پاک سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے دیکھا۔آزاد وطن پر قدم رکھتے ہی شکرانے کے نفل ادا کیے۔

میری طرح ایمان بھی لٹ چکی تھی۔اس نے بھی اپنوں کی قربانی دی تھی۔تب سے ایمان اور میں ایک ساتھ رہنے لگے۔ہم جیون ساتھی بن گئے اور نئی زندگی کی شروعات کر دی۔

ہمیں پاکستان میں سر چھپانے کو چھت مل گئی تھی اور حکومت کی طرف سے زمین بھی۔ہم ماضی کو دل میں دفن کر کے زندگی جینے لگے۔شادی کے چند سالوں بعد اللہ تعالیٰ نے چاند سا بیٹا عطا فرمایا۔اس کی آمد سے خوشیاں بڑھنے لگیں۔زندگی غموں، دکھوں، آہوں سے نکل کر خوشیوں کی طرف رواں دواں تھی۔

پھر ایک کرب ناک حادثہ پیش آیا۔میرا ننھا لخت جگر روڈ کراس کرتے ہوئے تیز رفتار کار کی زد میں آ کر موقع پر ہی دم توڑ گیا۔اس کے کندھوں پر بیگ لٹکے کا لٹکا رہ گیا۔وہ دن کرب ناک تھا۔میری کائنات کا ستون چل دیا گیا تھا۔رب کی رضا مان کر میں نے صبر کا دامن تھام لیا۔لیکن میری بیوی ایمان اپنے بیٹے کو نہ بھول سکی۔میں نے ہر ممکن اسے خوش رکھنے کی کوشش کی۔لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔میری ایمان بیمار پڑ گئی۔لیکن وقت بے رحم تھا۔اس نے ناتواں کاندھوں پر غموں کے پہاڑ گرا دیے اور میرا جیون ساتھی بھی چھین لیا۔ہسپتال لے جاتے ہوئے میری ایمان میری بانہوں میں جھول گئی۔میں تنہا رہ گیا۔

میری ایمان زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی۔اُس نے مجھ سے بہتی آنکھوں کے ساتھ عہد لیا۔قدرت! اپنا خیال رکھنا۔مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے۔مجھے بھولنا نہیں۔''

یہی وہ عہد تھا۔جو مجھے سب سے عزیز تھا۔میں سوتے، جاگتے، چلتے پھرتے اپنی ایمان سے باتیں کرتا رہتا

تھا۔ یہ میری محبت ہی تو ہے جو میں گھر سے دس کلومیٹر دور قبرستان میں جا کر اپنی ایمان سے ڈھیروں باتیں کرتا تھا۔ دُنیا خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہوتی اور میں محبوب سے ملنے کو جا رہا ہوتا۔ ایمان پر گلاب کی پتیاں نچھاور کرتا۔ اس کے مکان کو سجاتا اور پانی کا چھڑکاؤ کرتا تھا۔ دس سال سے یہی معمول تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں تھا، جس دن میں ایمان سے نہ ملا ہوں۔ بارش آئے، طوفان ہو، کچھ ہو جائے، ایک عہد تھا، جسے نبھاتا تھا اور نبھاتا آ رہا تھا۔ افسوس!''

یہ کہتے ہوئے قدرت اللہ صاحب نے ٹھنڈی آہ بھری، لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئے۔ خود کو سنبھالتے ہوئے بیڈ کا سہارا لیا اور پھر سے بولنے لگے۔

''دل شیر! جب سے ایمان اس جہان سے اُس جہان گئی ہے صرف ایک رات میں اس سے نہیں مل پایا۔ اس کے مکان پر نہیں جا سکا۔ جانتے ہو، کیوں؟ اُس رات میری ہمت جواب دے گئی تھی۔ جسم کانپ رہا تھا۔ یہ وہی رات تھی جس کی صبح تھکا ہارا میں آفس پہنچا اور مجھے چکر آئے اور میں بے ہوش ہو گیا۔ اُس رات نجانے کیسے عہد ٹوٹ گیا تھا۔ تبھی تو ایمان خواب میں ملنے چلی آئی تھی۔ کہنے لگی۔

قدرت! آخر تم نے عہد توڑ دیا ناں۔'' بڑے پیار سے باتیں کر رہی تھی، کہنے لگی، میں جانتی ہوں، تم بے قصور ہو۔ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میرے سر کو دبانے لگی۔ میرے قدرت! تم فکر مت کرو۔ جلد ہی یہ دُوریاں ختم ہو جائیں گی۔ پھر......

پھر میری ایمان الوداع کہتی چلی گئی۔ مجھے باور کرانے آئی تھی کہ دُنیاوی زندگی کا خاتمہ ہونے والا۔ تم میرے پاس ہمیشہ کے لیے آ جاؤ گے۔ ہمیشہ کی زندگی جینے کے لئے۔ بس تھوڑا انتظار اور...... تھوڑا سا انتظار......

ایمان کے جاتے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھیں کھلتے ہی سب کچھ بکھر گیا۔ میری ایمان کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

صبح ہوئی تو آفس جانے کو دل نہیں کر رہا تھا لیکن گھر میں اکیلا چار دیواری میں کیا کرتا۔ در و دیوار کاٹنے کو آتے تھے۔ دل کو بہلانے کے لیے، من کو تسلی دینے کے لیے آفس چلا گیا۔ آفس میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے ماضی میں غوطہ زن ہوا اور پھر خبر نہیں رہی۔ جب آنکھ کھلی تو ہسپتال تھا۔ میں تھا اور میری بے بسی تھی۔ ڈاکٹر پاس کھڑا تھا اور...... اور پھر تم آئے۔

دل شیر! میں اپنی زندگی جی چکا ہوں، بس چند لمحوں یا پھر چند دنوں کا مہمان ہوں۔ مجھے لوٹنا ہے، اپنی ایمان کے پاس۔ مجھے واپس جانا ہے۔ میرے اپنے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے پکار رہے ہیں۔ میرے لیے بے قرار ہیں۔ میں اپنی جائیداد، اپنا کاروبار تمھیں سونپ رہا ہوں۔ آج سے تم ہی باس ہو۔ اب تم آفس جانا تو باس بن کر جانا۔

☆☆☆☆

اسی روز شام کو قدرت اللہ صاحب کو یہ کہہ کر ڈسچارج کر دیا گیا کہ اب بس دعا کریں۔ آج پہلی بار میں ان کے گھر گیا تھا۔ در و دیوار میں خاموشی ہی خاموشی تھی۔ صحن کے کونے میں بھی کیاریوں میں گلابوں کے پھول آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ یہی وہ گلاب تھے جو ایمان اور قدرت اللہ صاحب نے مل کر لگائے تھے۔ یہی گلاب تو تھے جن کو قدرت اللہ صاحب ایمان کے آخری مکان پر ڈال آتے تھے۔

اُس رات میں ادھر ہی ٹھہرا رہا۔ ساری رات قدرت اللہ صاحب سو نہ سکے، صبح کا سورج اپنی کرنیں روئے زمین پر بکھیر رہا تھا، پرندوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ گلاب کے پھول سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ قدرت اللہ صاحب کا سر میری گود میں تھا۔ میری نظریں ان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے آخری ہچکی لی اور دُنیائے فانی چھوڑ کر اپنوں کے پاس چلے گئے۔

وہی تو آخری ٹھکانہ ہے۔ یہ دُنیا تو عارضی ہے۔ ہر فنکار آتا اور اپنا کردار ادا کرتے ہی رخصت ہو جاتا ہے۔ قدرت اللہ صاحب بھی اپنی زندگی جی کر واپس لوٹ گئے تھے۔

اب وہ گھر میرے پاس ہے۔ ان پھولوں کی نگہداشت، میں اور میری بیوی مسکان کرتے ہیں۔ میں، قدرت اللہ صاحب اور ایمان کے پاس جانا نہیں بھولتا۔ ایمان کے ساتھ ہی قدرت اللہ صاحب کی آخری آرام گاہ ہے۔ جن پر روز گلاب کے پھول نچھاور کرتا ہوں اور فاتحہ خوانی کرتے ہوئے آفس روانہ ہو جاتا ہوں۔ یہی میری ڈیوٹی ہے اور اپنی ڈیوٹی نبھائے جا رہا ہوں۔

☆☆☆

ٹکے کی ہانڈی

ایم یعقوب

ڈیرہ غازی خان سے، ایک احسان فراموش نوجوان کی سچ بیانی

میں ڈیرہ خان خان سے کراچی آیا۔ میرے ابو کو بہت پرانے اچھے دوست پرائیویٹ کمپنی میں جاب کرتے تھے۔ میں بھی کام کی غرض سے ان کے پاس آ گیا تھا۔ اس کمپنی میں میرے لیے سب کچھ نیا نیا تھا۔ کمپنی کا ماحول اچھا لگنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ کچھ آدمیوں سے علیک سلیک ہونے لگی۔ میں ابو کے دوست کو انکل کہتا تھا وہ بہت اچھے، پرخلوص اور بہت ہی شریف انسان ہیں۔

پھر تقریباً چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ میں ایک دفعہ گھر سے ہو آیا جب واپس آیا تو کچھ نئے لوگ آئے ہوئے انکل کے پاس تھے ان سے علیک سلیک کی۔ کچھ دنوں بعد ان نئے لوگوں میں سے ایک آدمی جس کا نام فیروز علی تھا۔ وہ میرے ساتھ گپ شپ کرنے لگا اور بہت زیادہ گھل مل گیا۔ ہم ڈیوٹی بھی ایک ساتھ کرتے کھانا پینا، اٹھنا بیٹھا بھی ایک ساتھ ہوتا تھا۔ ہماری اتنی گہری ودستی کو دیکھ کر کمپنی کے باقی ملازم حیران ہوتے کہ یہ کیسے دوست ہیں جو اتنی جلدی گہرے دوست بن گئے ہیں۔ پوری کمپنی میں ہر شخص کی زبان پر صرف ہماری ودستی کا چرچہ تھا۔

ہم ڈیوٹی کے بعد اکٹھے ہوتے اور ایک دوسرے کی پسند کی چیزیں خریدتے اور یوں ایک دوسرے کا احساس کرتے جیسے ہم سگے بھائی ہوں۔ اور کوئی خونی رشتہ ہمارے درمیان ہو۔ ہر ہفتے ہم باہر گھومنے جاتے۔

میرے ماموں کلفٹن میں رہتے تھے۔ ایک دن ہم وہاں چلے گئے۔ وہاں کی بریانی بہت مزے کی ہوتی تھی، جو میرے ماموں لوگ خود بناتے تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ماموں اور میرے پیارے بھائی جیسے دوست کے علاوہ ماموں کے بیٹے نادر اور شاہد بھی ماموں کے پاس تھے۔ ان کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ان سے ملے اور فیروز علی کا تعارف کروایا۔ وہ بھی بہت خوش ہوا۔ دن آہستہ آہستہ ختم ہو چکا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سورج سمندر میں ڈوب گیا۔

پھر مغرب ہو گئی۔ نماز پڑھی اور پھر بعد میں ماموں بھی سب آ گئے حال احوال خیر خیریت معلوم کی پھر بعد میں کھانا آ گیا اور سب نے مل کر کھانا کھایا۔ پھر شاہد اور نادر ہمیں گھمانے لے گئے۔ ذمزمہ پارک کی سیر کی بہت ہی دلکش تھی جس نے ہمارے اور دل کو مسرت بخشی تھی اور پھر رات کے دس بجے ہم ابن قاسم پارک گئے۔ وہاں کا ماحول دیکھ کر دل مچلنے لگا چھوٹے بچے جھولوں میں جھولا جھول رہے تھے۔

رات کے تین بجے تک ہم بہت ہلا گلا کرتے رہے۔ موسم بہت پیارا تھا اور سمندر کی لہروں کا شور...... مجھے تو بہت مزا آ رہا تھا۔ مگر شاہد اور نادر کا نیند سے بہت

براحال تھا کیوں کہ وہ تو سارا دن کام کرتے رہے تھے اور بہت تھکے ہوئے تھے۔

شاہد نے کہا۔،، یار ٹائم بہت ہو چکا ہے۔ کراچی کے حالات کا پتا نہیں کبھی بھی گڑ بڑ ہو سکتی ہے لہٰذا ہمیں چلنا چاہیے۔ ہم نے واپسی کا راستہ پکڑا اور واپس آ گئے۔

شاہد اور نادر تو لیٹتے ہی نیند کی وادی میں گم ہو گئے اور خراٹے لینے لگے۔ مجھے اور فیروز کو تو نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔

ہم باتیں کرنے لگے بقیا یوں گپ شپ کرتے رات کا بقیہ حصہ بھی اختتام کو پہنچا اور صبح ہو گئی۔ نماز ادا کی اور ناشتہ کیا شاہد اور نادر تو معمول کی طرح بزی ہو گئے تھے اور ہم نے بھی اجازت لی اور کمپنی آ گئے۔

☆......☆......☆

وقت پر لگا کر اڑتا جا رہا تھا۔ تین ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ ایک دن فیروز علی نے کہا کہ یار میرے چھوٹے بھائی اور بہن کی شادی طے پا گئی ہے۔ مجھے گھر جانا ہے تو۔،، میں نے کہا۔ ’’بھائی پھر ٹینشن کی کیا بات ہے‘ چلے جاؤ۔،، یہ سن کر اس نے کہا۔

’’ٹینشن کی بات تو ہے۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور گھر میں دو شادیاں ہیں ان کا سارا خرچہ میرے سر پر ہے۔ ابو امی بوڑھے ہیں۔ وہ اکیلے سارا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ اس وقت میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ تم پریشان مت ہو۔ میں کچھ کرتا ہوں۔،،

اس وقت میری عمر 16 سال تھی اس کی 26۔

دوستی میں عمر کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ تنخواہ ملنے والی تھی۔ میری سوچ نے کام کیا کہ اس کی تنخواہ اور میری تنخواہ ملا کر اٹھارہ ہزار ہوتی ہے اور پھر اپنے ایک دوست کو فون کیا جو کہ سعودی عرب میں ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ اس کو اپنی مجبوری بتائی کہ مجھے بیس ہزار روپے کی اشد ضرورت ہے۔ دو ماہ بعد واپس کر دوں گا اس نے تھوڑی دیر بعد میرے اکاؤنٹ میں بیس ہزار روپے ٹرانسفر کر دیے۔

میں نے اپنی ذاتی گھریلو مجبوری کی وجہ سے کسی سے سوال نہیں کیا تھا مگر فیروز علی کے لیے کسی اور دوست کے آگے ہاتھ پھیلایا تھا۔ میری مجبوری سن کر اس نے نجانے کیسے انتظام کیا اور وہ مجھے انکار بھی کر سکتا تھا مگر پھر میری کیا عزت رہ جاتی۔ اس کے دیے ہوئے بیس ہزار اور نو ہزار میری تنخواہ والی رقم فیروز علی کو گن کر اس کی جیب



میں ڈال دیے۔ اس وقت میری گھریلو ذمہ داریاں کچھ بڑھ گئی تھیں۔ مگر وہ سات ہزار روپے گھر دینے کے بجائے فیروز علی کو دے دیے تھے۔

گھر میں جھوٹ بولا کہ کراچی پرائیویٹ کمپنی میں ہڑتال ہے اس لیے تنخواہ اگلے ماہ ملے گی۔ اس دوست کے لیے اپنے ماں باپ سے جھوٹ بولا جنہوں نے مجھے پالا پوسا۔ بڑا کیا پڑھایا لکھایا، مگر اس جھوٹ کی وجہ سے پریشان ہونے لگا تھا اور پھر فیروز علی بھی گھر چلا گیا۔ اپنے بہن بھائی کی شادی کی اور ٹھیک ایک ماہ بعد فون کیا جب اس کا نمبر اسکرین پر دیکھا موبائل اور میں نے کال پک کی اور حال احوال پوچھا۔ اس کو بھائی کی شادی کی مبارک باد دی۔ اور پھر تھوڑی دیر باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ پھر فیروز علی نے کہا۔ ''یار تنخواہ ملی ہے۔،، میں نے کہا ہاں تو اس نے کہا یار میرے سارے پیسے شادی میں خرچ ہو گئے ہیں۔ اب مہربانی کر دو اور دو ہزار مجھے ایزی پیسہ کرا دو۔،، میں نے کہا ٹھیک ہے۔ اب کی بار دل میں ہلچل ہونے لگی کہ یہ کیسا شخص ہے میری اپنی مجبوری بھی تھی جو ہر انسان کو مجبور کر دیتی ہے مگر میں نے پھر بھی اس کے کہنے پر دو ہزار روپے ایزی پیسہ کروا دیے۔

دوستی کے لیے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے مگر میں نے فیروز کے لیے کچھ نہ سمجھا کچھ نہ دیکھا، اس کی دوستی کو اولین ترجیح دی کہ دوست دوست ہوتا ہے، دوست کی مشکل گھڑی میں کام آنا دوست کا فرض ہوتا ہے۔ میں نے ایک گھنٹے بعد فیروز علی کو ایزی پیسہ سے دو ہزار بھیج دیے۔ پھر دو دن بعد وہ گھر سے واپس کمپنی آ گیا۔ شادی کی مبارکباد دی اور حال احوال دریافت کیا۔ پھر اسی طرح کرتے کرتے تین ماہ گزر گئے۔ میں نے کبھی پیسوں کی بات نہیں کی جب جتنے ہوتے واپس کر دیتا کیوں کہ میں اس کی بھی مجبوری جانتا تھا۔ ہر چیز تو دولت نہیں ہوتی' پیار خلوص' دوستی بھی زندگی کا حصہ ہوتی ہے۔

اسی طرح فیروز علی نے آہستہ آہستہ پیسے واپس کر دیے اور وقت محو سفر رہا دن راتوں میں بدلتے رہے۔ اور ساتھ ساتھ انسان کی سوچ، عادت، فطرت میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔

☆......☆......☆

ایک دن میں ڈیوٹی پر کھڑا تھا کہ ایک دوست کا فون آ گیا کہ یار میں دوبئ سے کل آ رہا ہوں۔ آپ کراچی ایئر پورٹ پر مجھے لینے آ سکتے ہو۔،،

میں نے کہا ''ہاں جناب! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، کتنے بجے کی فلائٹ سے آ رہے ہو۔،،

کل رات دس بجے۔ ٹھیک ہے بھائی میں ضرور آ جاؤں گا'

وہ کال تو میرے لیے بہت بھاری پڑ گئی کیوں کہ جیب میں دیکھا تو جیب خالی تھی۔ میرے بٹوے میں اتنے روپے نہ تھے کہ میں اسے ایئر پورٹ پک کرنے جا سکتا۔ پریشانی کا پہاڑ میرے سر پر ٹوٹنے لگا اور میں سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبتا گیا۔ پھر خیال آیا کہ میرا اس پرائیویٹ کمپنی میں تو صرف ایک ہی اچھا بھائی جیسا دوست ''فیروز علی'' اس سے ہی اپنی پریشانی شیئر کر لیتا ہوں وہ ہی اس وقت میری میری ہیلپ کرے گا کیوں کہ آج تک اس سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔

میں فوراً فیروز علی کے پاس چلا آیا اور اسے تمام بات بتائی جب اس نے میری بات سنی تو اس کے چہرے کا رنگ عجیب ہونے لگا۔ اس نے اس وقت تو کوئی جواب نہیں دیا اور صرف اتنا کہا کہ مکان پر چل کچھ سوچتے ہیں۔ مجھے اس کے تیور دیکھ کر اس کی اندرونی کیفیت سمجھ آ گئی تھی کہ یہ میری اس مشکل گھڑی میں فیروز علی کام نہیں آ سکتا۔ اس ماہ تنخواہ بھی لیٹ تھی۔ پورے دس دن اور کوئی ایسا بھی نہ تھا جو میری ہیلپ کرتا اور پھر بھی اس کو ہاں کر دی تھی کہ میں آ جاؤں گا۔ میں اسے ایئر پورٹ پر پک کرنے نہ جاتا تو وہ کیا سوچتا۔ حالانکہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ ایئر پورٹ پر صرف ملنے کے لیے ہی مدعو کیا تھا۔ اس کا نام ارباب سلیم تھا۔ ارباب بہت ہی پرخلوص اور اچھا لڑکا تھا۔ ہماری فیس بک پر دوستی ہوئی اور آہستہ آہستہ گھل مل گئے تھے وہ میرے کزن سلیم کا کلاس فیلو تھا۔ خیر گیارہ بجے ڈیوٹی ختم ہوئی اور پوری شفٹ کے ساتھ میں نے اور فیروز علی نے بھی ساتھ کھانا کھایا اور چائے پی کر مکان پر آ گئے۔ مگر میں بار بار فیروز علی کو دیکھتا۔ اس کا موڈ آف ہی لگ رہا تھا۔

میں نے پوچھا کہ یار کیا بات ہے۔ کیوں پریشان ہو۔ کیا ہوا ہے؟''

''تو اس نے جواب دیا کہ یار میں پریشان اس لیے ہوں کہ آپ نے مجھ سے پہلی مرتبہ پیسے مانگے ہیں اور میں کسی وجہ سے آپ کی ہیلپ نہیں کر سکتا۔ یہ بات نہیں کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ کسی کو دینے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ اس کو دینے ہیں پرسوں۔'' تو میں نے اس سے کہا کہ کوئی بات نہیں یار! میں کسی اور سے انتظام کر لیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی پریشانی تو ختم کر دی لیکن اس کی بات نے میرے دل کے سو ٹکڑے کر دیے تھے۔ جس کے لیے میں نے اپنے ماں باپ سے جھوٹ بولا اور اس دوست سلیم سے بیس ہزار روپے لے کر دیے اور اپنی ایک ماہ کی سیلری دے دی۔ مگر اس نے ایسا جواب دیا جو میرے دل کو چکنا چور کر گیا۔

اس کو تو پیسے دینے تھے مجھے تو اگلی صبح ضرورت تھی۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس کی مجبوری میں کتنا کام آیا۔ اس کی برے وقت میں ہیلپ کی اور اس پر بہت بڑا احسان کیا مگر وہ نیچ ثابت ہوا۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔

پھر میں نے اپنے ماموں کو کال کی انہوں نے میری ہیلپ کر کے مجھ پر احسان کیا۔ میرا کام تو نہیں رکا۔ میں نے ارباب سلیم کو ایئر پورٹ سے پک کیا اور چائے پی۔ اسی طرح گپ شپ کرتے ہم بس اسٹاپ تک پہنچ گئے۔ بس کی ٹکٹ پہلے سے ہی بک تھی۔ سلیم کو بس میں بٹھا دیا اور میں واپس کمپنی آ گیا۔ رات گئے بارہ بجے واپس آیا تو فیروز علی بھی میرے کوارٹر میں موجود تھا۔ مجھے دیکھا تو میں نے سر جھکا لیا اور بہت شرمندہ ہوا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا ۔ میرے دل میں اس کی طرف سے بال ہی نہیں آیا تھا بلکہ اس کا اندر صاف شفاف ہو کر سامنے آ گیا تھا۔

اس واقعے کے بعد میں نے اس سے دور ہونا شروع کر دیا۔ الحمد اللہ آج میں اس جیسے دوستوں کی پہچان رکھتا ہوں۔ خوش رہتا ہوں لیکن اکثر میرے دل میں فیروز علی کی احسان فراموشی اپنا سر اٹھانا شروع کر دیتی ہے اور دل دکھ سے بوجھل ہو جاتا ہے۔ آخر ایسا کیا تھا کہ وہ اپنے بھائی جیسے دوست کے کام نہ آ سکا۔ مگر وہ محاورہ بھی سچ ثابت ہو گیا تھا۔ ٹکے کی ہانڈی گئی کتے کی اوقات پتا چل گئی۔

☆......☆......☆......☆

کل کس نے دیکھا

عنبر معاویہ وٹو

ہر پہ سٹی سے، محبتوں کی سچائی لیے، آنکھیں نم کرتی ایک حقیقت

''اماں مجھے ہر صورت اسی کالج میں ایڈمیشن چاہیے۔ میری ساری فرینڈز اسی کالج میں پڑھتی ہیں اور وہ کالج بہت اچھا ہے۔'' یہ جملہ نہ جانے میں کتنے دنوں سے اماں کہ گوش گزار کر رہی تھی مگر اماں کا ایک ہی جواب تھا۔

''تم نے یہ کیا فضول بحث لگا رکھی ہے۔ بس اسی کالج میں پڑھو جہاں تمہارے بہن بھائیوں نے پڑھا ہے۔''

مگر مجھ پر تو بھوت سوار تھا۔ پھر ضروری بھی تو نہیں تھا کہ جس کالج میں سارے بہن بھائیوں نے پڑھا ہے میں بھی اسی کالج میں پڑھوں۔ میں ایک بار پھر ماں کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

''دیکھیں امی وہ کالج اتنا اچھا ہے کہ ساری لڑکیوں کا میڈیکل میں داخلہ ہو جاتا ہے۔''

میں نے منت بھرے لہجے میں دلیل دی، مگر میری اماں کہاں ماننے والی تھیں۔ فوراً مجھے نا اہلی کے طعنے دینے لگیں۔

''میری باقی اولاد بھی ہے، مگر مجال ہے جو کسی نے اتنا ستایا ہو......'' اپنی حساس طبیعت کے باوجود مجھے اماں کی باتیں برداشت کرنے کی عادت ہوگئی تھی اور پھر یہاں تو میرا اپنا مطلب تھا۔ میرا ذاتی خیال تھا کہ اماں کو میری کوئی پروا نہیں۔ وہ صرف اپنے کاموں میں مصروف رہتیں۔ میں اکثر اماں سے اس بات کا گلہ کرتی تو وہ مجھے حسب معمول جواب دیتیں۔

''تم چاہتی ہو ساری دنیا کے کام چھوڑ کر تمہارے سرہانے بیٹھی رہوں۔ انیس سال کی ہو چکی ہو، بچی نہیں رہیں۔ اب خدا کے لیے بڑی ہو جاؤ۔''

ہوسٹل سے آئے ہوئے مجھے چار دن ہو گئے تھے، مگر میری اور اماں کی کئی مرتبہ نوک جھونک ہو چکی تھی۔ پانچویں دن بھی میرا مطالبہ جوں کا توں تھا۔

''بس اماں میٹرک کے پیپرز کے بعد میں اسی کالج میں داخلہ لوں گی۔ جہاں میری ساری فرینڈز ہیں۔''

اماں میری عادتوں سے اچھی طرح واقف تھیں کہ میں اپنی بات منوانے کے لیے اماں کے سر ہو جایا کرتی تھی۔ میں مزید کچھ کہنا چاہ ہی رہی تھی کہ اماں نے روایتی ماؤں والا انداز اپنا لیا۔ ویسے تو میری اماں بہت باشعور تھیں مگر جب غصہ آتا تھا تو روایتی انداز اپنا لیتیں۔ اور جب ڈانٹنا شروع کرتیں تو بارہا مجھے سر اٹھا کر دیکھنا پڑتا کہ یہ وہی اماں ہیں جو ہر پل مجھ پر اپنی محبت نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتی ہیں سو آج بھی وہ میرے

اصرار سے تنگ آ کر جواب دینے کے لیے تیار تھیں۔
میرا اماں سے بحث کرنا غیر فطری نہیں تھا، مجھے شروع سے ہی اماں کو تنگ کر کے مزا آتا تھا۔ مگر اماں سمجھتی تھیں کہ میں جان بوجھ کر انہیں تنگ کرتی ہوں۔ میرے وقت بے وقت سوالوں سے جھنجلا کر مجھے ڈرانے کو اپنی مخصوص دھمکی کا سہارا لیتیں۔
''اللہ کرے خدا تجھے بھی ایسی اولاد دے جو تجھے بھی ستائے۔'' اماں یہ کہتے ہوئے اتنا سنجیدہ ہوتی تھیں کہ مجھے واقعی خوف آنے لگتا تھا۔

رہا تھا ادھر اماں کی برداشت بھی ختم ہوگئی تھی۔ وہ ساری مروت بالائے طاق رکھ کر گویا ہوئیں۔
''درختوں پر نہیں اگتے پیسے۔ کہاں سے لائیں اتنے پیسے کہ تجھے اس کالج میں داخلہ دلوائیں۔ تمہارا باپ کتنا کماتا ہے۔ اس کی کمائی ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ بنا سوچے سمجھے ہم تمہیں داخلہ دلوا دیں۔ اس تنخواہ میں اولادوں کا پیٹ پالیں یا تعلیمی اداروں کی فیس بھریں۔''
اماں اتنا کچھ کہہ جائیں گی، میرے گمان میں بھی



ساری باتوں میں سے یہ ایک دھمکی کارگر ثابت ہوتی اور میں دل و جان سے اماں کی منتیں کرنے بیٹھ جاتی۔ ''اماں بد دعا تو نہ دو۔'' مجھے ڈر لگتا تھا اگر میری اولاد بھی مجھ جیسی ہوئی تو......
بس یہی سوچ مجھے پریشان کرنے کو کافی تھی۔
پھر میں گھنٹوں اماں سے معافیاں مانگتی۔ ''اماں پلیز اپنی بد دعا واپس لے لیں ورنہ......'' اور اماں بڑے پیار سے مسکرا دیتیں۔ اور وہ ایک مسکراہٹ ہی مجھے مطمئن کر دیتی تھی۔
مگر اماں مجھے اس مسکراہٹ سے کم ہی نوازتی تھیں ابھی ایک دن نہ گزرا تھا کہ میرا مطالبہ پھر اماں کا منہ چڑا

نہیں تھا۔ اماں نے جو کچھ کہا وہ حقیقت اتنی تلخ تھی کہ مجھ سے رہا نہ گیا۔
''چھوڑیں بھی اماں! آپ بھی بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں۔'' میں نے بحث کی کتاب کو سمیٹنا چاہا۔ میرے جواب پہ اکثر اماں کو غصہ آ جاتا۔ میرا مقصد کبھی بھی یہ نہیں ہوتا تھا۔ کہ اماں کو غصہ دلاؤں۔ بس دلیلیں دینے اور سننے کی عادت ہوگئی تھی، ورنہ کوئی بھی اتنا بے وقوف نہیں ہوتا کہ خود اپنی بے عزتی کروائے۔ آج بھی اماں نے بولنا شروع کیا تو ایک چھوڑ میری دس دس پرانی عادتوں کو کوسا۔ ''تم یہ نہیں کرتی ہو۔ تم وہ نہیں کرتی ہو۔'' اماں نہ جانے کہاں سے کہاں

کی ڈھیر ساری خامیاں مجھ میں دیکھ لیتیں اور اس کے بعد مجھے احساس ہوتا کہ شاید مجھ میں کوئی اچھی بات ہے ہی نہیں۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ یہ احساس کبھی شدت اختیار نہیں کر سکا۔

اماں کبھی کبھار بہت ناراض ہو جایا کرتی تھیں۔ اور پھر ایسے میں مجھے بابا جانی کا شدت سے انتظار رہتا۔

آج بھی بابا جانی کی آمد میرے لیے اس لحاظ سے خوشگوار احساس تھا کہ اماں کی ناراضگی جلد از جلد دور ہو جائے گی۔ اماں جب بھی ناراض ہوتیں تو بابا جانی مجھ سے بے جھجک سوال کرتے کہ میں نے ماں سے کس بات پر لڑائی کی ہے۔''

آج بھی بابا جانی کے سوال پہ میں نے یونہی اماں کو تنگ کرنے کے لیے کہا۔ ''مجھے تو نہیں پتا سر میں درد ہے اماں کے۔ ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔''

میرا اتنا کہنا تھا کہ اماں نے دل کی بھڑاس نکالنا شروع کر دی۔ اماں کا ہمیشہ یہی ردعمل ہوتا تھا اور میں چپ چاپ سنتی رہتی تھی۔ اس کے بعد میں اور میرا کمرا۔ آج بھی میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گئی۔ پہلے تو اپنی ٹیچرز کو کوسا، پھر حکومت اور تعلیمی نظام اور پھر اپنی قسمت پر آنسو بہائے۔

میں اماں سے جھگڑے کے بعد ہمیشہ اس بات کی منتظر رہتی کہ اماں مجھے پیار کریں، اپنے گلے سے لگائیں، مجھے اپنے پاس بٹھا کر باتیں کریں۔ مگر اماں تقسیم ہو چکی تھیں۔ گھر کے کاموں میں، لوگوں کے حوالوں میں، رسموں رواجوں میں، ان کو تو اپنے لیے بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ کبھی وہ شادی پر جانے کے لیے تیار رہتیں، کبھی بڑی بہن کی آمد پر تیاری میں مشغول ہو جاتیں تو کبھی کسی کے ہاں ماتم پر جانا ہوتا۔

میں کبھی کبھی کھل کے کہہ دیتی کہ اماں مجھے زندگی کے انسویں سال میں بھی آپ کی اتنی ضرورت ہے جتنی بچپن میں تھی۔ بلکہ اس عمر میں شاید زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔'' مگر اماں اپنی مصروفیات کے گرد میں اٹا جواب دیتیں۔

''ڈرامے نہ کیا کر۔''

پتا نہیں اماں کو کون سی بات ڈراما لگتی تھی، مگر مجھے سوچوں کی دلدل میں دھکیل دیا جاتا تھا۔

☆☆

اس رات بھی میں نے لاکھ چاہا کہ اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہوں کہ اماں آپ میری زندگی ہیں۔ آپ کے دم سے رونقیں ہیں۔''

مگر نجانے کیوں بہت زیادہ کوشش کے باوجود بھی یہ سب کہہ نہ سکی۔

ہمارے معاشرے نے پیار کے اظہار کو برائی کی علامت سمجھ رکھا ہے۔ یا شاید اظہار کو اتنا محدود کر دیا گیا ہے کہ ہم اپنے پیاروں سے بھی اظہار نہیں کر پاتے۔ معاشرہ ہماری سوچوں، ہماری باتوں اور ہمارے افعال پہ اتنا گہرا اثر ڈالتا ہے کہ چار دیواری کے اندر بھی ہم معاشرتی اقدار میں جکڑے رہتے ہیں۔ مجھ پر بھی معاشرے نے گہرے رنگ ڈالے تھے میں نے جب کبھی اماں سے پیار کا اظہار کرنا چاہا تو مجھے ارد گرد سے بہت سی آوازیں سنائی دیتیں۔

''اس کو دیکھو جیسے اور تو کوئی اپنی ماں سے پیار نہیں کرتا۔''

''شو آف مت کر و یار!''

یہ آوازیں کسی غیر کی نہیں بلکہ اپنی ہی بہن اور بھائیوں کی ہوتیں۔

میں نے جب بھی بابا جانی کو تھکے ہارے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر کہنا چاہا کہ بابا جانی آپ نے ہمارے لیے خود کو بھلا رکھا ہے۔ صرف اولاد کی خاطر! بابا جانی میں آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔''

مگر میرے اس خیال کو احترام کا بے رحم پنجہ دبوچ لیتا۔ میری اماں نے مجھے باپ کا احترام کرنا سکھایا تھا۔ اگر کبھی بچپن میں کسی بات سے ڈرانا ہوتا تو باپ کی دھمکی دی جاتی اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ احترام اور خوف لازم ملزوم ہونے لگا۔ میں نے بابا جانی سے جب بھی بات کی، احترام کے دائرے میں رہ کر کی۔ میں نے بہت چاہا کبھی خوف کے دائرے سے نکل کر محبت کے دائرے میں مقید ہو جاؤں، مگر بچپن کے سکھائے گئے سبق نے کبھی اس بات کی اجازت نہیں دی۔ بچپن کے سبق بھلائے نہیں بھولتے۔

بالکل ایسے ہی جب کوئی بیج بوتا ہے تو اس کے اندر ہر چیز چھپی ہوتی ہے۔ جب سرسوں کا بیج پھول میں تبدیل ہو رہا ہوتا ہے تو فطرت یہ بات اس میں رکھ دیتی ہے کہ اس بیج میں اگنے والے پودے پر جو پھول اگے گا وہ زرد ہوگا۔

یونہی بچپن میں ذہن نشین ہونے والی باتیں، واقعات، جوانی کے افعال ترتیب دے دیتی ہیں۔

میں نے بھی سرسوں کے بیج کی طرح فطرت کی خلاف ورزی نہ کی۔ اس رات بھی نہ میں اس طرح اماں کے گلے میں بانہیں ڈال سکی، نہ بابا جانی کی گود میں سر رکھ کر رو سکی۔

............☆☆............

صبح ہوتے ہی اماں اور بابا میرے پسندیدہ کالج میں ایڈمیشن کروانے چلے گئے اور شام تک واپس نہ لوٹے۔ وہ شام میرے بابا جانی اور اماں کی زندگی کی آخری شام ٹھہری۔ وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مگر حقیقت رونما ہو ہی جایا کرتی ہے۔ اماں اور بابا جانی کی لاشیں اپنے سامنے دیکھ کر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ آنسو بہتے رہے پھر یہ آنسو سسکیوں میں بدل گئے۔ سسکیاں اور ہچکیاں صبر میں ڈھل گئیں۔

............☆☆............

اماں اور بابا جانی کی قبر پر بیٹھے ہوئے نہ جانے میں نے کتنے شکوے کیے۔

''یا اللہ اگر یہ ایکسیڈنٹ نہ ہوتا تو......''

مجھے کسی ہاتھ نے سہارا نہ دیا۔ میرا سر بے ساختہ ہی ماں کی قبر کی مٹی کو چھونے لگا اور اس لمحے میں نے کئی اعتراف کیے جو شاید مجھے اماں کی زندگی میں کر لینے تھے۔ اماں آپ تو وہ واحد ہستی تھیں جس کی موجودگی میں پیار کا احساس ہوتا تھا۔ تحفظ کا گمان ہوتا تھا۔ میں سمجھتی رہی کہ آپ میرے دکھوں سے بے خبر ہیں۔ مگر اماں مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے سجدے میں گرتے آنسو آپ کی دعاؤں کے صدقے خشک ہو جاتے ہیں۔ اماں مجھے ہر دعا کے لیے آپ کے 'آمین' کی ضرورت تھی۔ میری پُرسکون نیند، آپ کے ہونے کے احساس کے باعث تھی۔ اماں میری خواہش میری خوشی آپ سے شروع اور آپ پر ہی ختم ہوتی تھی۔ اماں ابھی تو میں نے آپ کے گلے میں بانہیں ڈال کر محبت کا اظہار بھی کرنا تھا۔''

یونہی روتے ہوئے۔ مجھے بابا جانی کی قبر نظر آئی۔ بابا جانی کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد بچپن کا سکھایا گیا احترام آڑے آ گیا۔ میں نے بابا جانی سے بھی بہت کچھ کہنا چاہا مگر احترام نے لبوں پر انگلی رکھ دی۔

پتا نہیں مٹی کے نیچے چلے جانے والے لوگ اتنا کیوں ستاتے ہیں۔ میرے ضبط نے میرے انیس سال کے سیکھے ہوئے اصولوں کو توڑ دیا۔ میری محبت نے میرے احترام کو ڈھیر کر دیا۔ میرے پیار نے معاشرے کی اقدار کو یکسر بھلا دیا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے بابا جانی کی قبر پر سر رکھ کر وہ سب کچھ کہہ دیا، جو میں ان کی زندگی میں نہ کہہ پائی تھی اور مجھے لگا کہ بابا جانی کی آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔ میں اماں کی قبر کی طرف پلٹی۔ ان کی قبر کی مٹی کو چوم کر اپنی وہ حسرت پوری کر لی جو میں انیس سالوں میں پوری نہ کر پائی تھی۔ میں روتے روتے بہت تھک چکی تھی۔ میں جانے لگی تو بابا جانی کی پُرنم آنکھیں اور اماں کی مسکراہٹ مجھے پُرسکون کر گئی۔

............☆☆............

آج جب میں سونے کے لیے لیٹی تو آنسو نہ گرے، بس کچھ خیال ذہن کے طاقچوں پر ابھرتے رہے کہ اپنے چاہنے والوں سے اظہار کرنے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے، ورنہ چاہنے والے انتظار نہیں کرتے۔ معاشرے کے اصول اور سبق اپنی جگہ مگر وہ عظیم ہستیاں جو اپنی ذات کو بھول کر اولاد کی خوشیاں تلاش کرتے کرتے منوں مٹی تلے جا سوتی ہیں۔ وہ ہستیاں اپنے خلوص کے بدلے پیار کا اظہار مانگتی ہیں۔ مگر مصروفیات نہ انہیں ہم سے یہ سب طلب کرنے کا موقع دیتی ہیں اور نہ ہی ہم اپنے قائم کردہ حصاروں سے نکل کر ان انمول جذبوں کو سلام پیش کر پاتے ہیں۔

اپنے الفاظ کو یکجا کیجیے اگر لب ساتھ نہ دیں تو اپنے عمل سے پیار بانٹیے کہ یہ زندگی بار بار نہیں ملتی۔

☆☆☆

ساتویں سچ بیانی

عجب ملن یہ ہمارا ہوا

فیصل ندیم بھٹی

فیصل آباد سے اُس شخص کی کتھا جس نے ایک راندہ دوشیزہ کو عزت اور محبت دی

میرا نام فرحت ہے گذشتہ سال کی بات ہے کہ میرے دوست احسن نے مجھے رات کو فون کر کے کہا کہ فرحت آؤ ایک دوست کے پاس جانا ہے۔'' میں رات کو کھانا کھانے کے بعد احسن کے پاس چلا گیا۔

وہ مجھے موٹر سائیکل پر بٹھا کر ایک دوست کے گھر لے گیا۔ اس دوست کے گھر والے موجود نہ تھے لیکن جب احسن مجھے ایک کمرے میں لے کر گیا تو میں حیران رہ گیا۔ ایک خوبصورت لڑکی وہاں کمرے میں موجود تھی جس کے سرخ گلابی ہونٹ، اونچی ناک، کالے ابرو، گویا حسن کی دیوی، میرے سامنے تھی۔ لڑکی کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔

مجھے دوست نے بتایا کہ لڑکی کو داد عیش کے لیے لے کر آئے ہیں۔ یہ لڑکی رات کو ادھر ہی ہے۔ لڑکی کا نام مہوش تھا۔ میرا ابھی مہوش سے تعارف کروایا گیا میرے دوست نے مجھے مہوش کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کی پیشکش کی لیکن میں نے ٹھکرا دی۔

میں نے جیب سے لڑکی کو دیکھا تھا میرے دماغ میں وہی گھوم رہی تھی۔ اس کی معصومیت سے لگ رہا تھا کہ یہ طوائف نہیں ہے بلکہ ایک گھریلو لڑکی ہے۔ وہاں سے دو گھنٹے کے بعد میں اپنے گھر آ گیا اور مہوش کے بارے میں سوچتا رہا۔ دوسرے دن بھی مجھے فرحت ملا اور اس نے مجھے بتایا کہ مہوش آپ کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور آپ کا موبائل نمبر مانگ رہی تھی۔ میں نے آپ کا نمبر مہوش کو دے دیا ہے۔''

فرحت گلہ کر رہا تھا کہ یار مہوش کو رات بلایا ہم نے تھا لیکن آپ بھولے بادشاہ بنے رہے۔

کچھ بھی نہیں کیا پھر اس نے آپ کا فون نمبر کیوں مانگا اس نے؟''

میں نے فرحت سے کہا کہ بھائی یہ تو مہوش کو ہی پتا ہوگا کہ اس نے میرا نمبر کیوں لیا ہے۔ میں نے آج تک کسی لڑکی کے ساتھ کوئی غلط حرکت نہیں کی۔

مواقع بھی بہت ملے لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اس گناہ سے بچائے رکھا۔''

☆......☆......☆

ایک ہفتہ گزرا ہوگا۔ مجھے عصر کے وقت ایک Unknown نمبر سے کال آئی۔

''السلام وعلیکم!'' لڑکی نے کہا۔ ''آپ فرحت بول رہے ہیں۔''

''جی میں فرحت بول رہا ہوں! محترمہ آپ کون

ہیں؟"

"میں مہوش! آپ سے احسن کے ساتھ اُس رات میں ملاقات ہوئی تھی۔" مہوش معصومیت سے بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میری طبیعت خراب ہے۔اور میں نے دوا لینی ہے۔

میں استعال آباد چوک پر کھڑی ہوں۔ پلیز آپ آجائیں۔"

میں نے جھٹ سے بائیک نکالی اور چوک پر پہنچ گیا جو کہ میرے گھر کے قریب ہی تھا۔ میں مہوش کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر ڈاکٹر کے ہاں لے گیا۔

مہوش کو دوا لے کر دی۔

مہوش نے مجھے کہا کہ آپ فرحت "بہت ہی اچھے انسان ہیں۔

میں نے اسی دن آپ کو جانچ لیا تھا۔" اس نے مجھے بتایا کہ میری طبیعت بھی خراب ہے اور آج رات میں Night کے لیے بک ہوں۔" شام ہو چکی تھی میں نے دوائی کے پیسے دیے اور اس سے کہا۔

"آپ کی طبیعت خراب ہے تو رات کو نہ جاؤ۔"

وہ بولی "مجبوری ہے۔ جانا تو ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ مہوش آپ مجھے ایک گھریلو لڑکی معلوم ہوتی ہیں۔ آپ طوائف نہیں لگتی ہو مجھے۔"

اس نے مجھے کہا کہ آپ میرے گھر آنا میں آپ کو تفصیل سے اپنی کہانی سناؤں گی۔"



☆......☆......☆

میں وہاں سے واپس آ گیا۔ کچھ دن بعد مجھے مہوش نے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

اب تقریباً وہ دن میں مجھے ایک بار کال کر کے سلام دعا ضرور کرتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں کس طرح آپ کے گھر آؤں گا۔ میں آج تک کسی لڑکی سے نہیں ملا تھا۔"

میں ڈر بھی رہا تھا کہ مہوش کے گھر کیسے جاؤں خیر اس نے مجھے تسلی دی کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے آپ آ جائیں۔

اتوار کی صبح مہوش کے گھر جانے کے لیے تیار ہوا تھا۔ مہوش کے دیے گئے ایڈریس پر میں گھر تک پہنچ گیا موٹر سائیکل باہر کھڑی کی۔

جب میں گھر کے اندر داخل ہوا تو دو نوجوان لڑکیوں نے مجھے سلام کیا اور اس کی خالہ نے بھی مجھے سلام کیا اور پھر مہوش کے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔

کمرہ بہت ہی خوبصورت تھا صوفے لگے ہوئے تھے مہوش میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ رسمی باتوں کے بعد اس نے مجھے اپنی کہانی بتانا شروع کی۔

دو سال پہلے میری شادی میرے کزن امجد کے ساتھ طے ہوئی تھی۔ جو خالہ مجھے ملی وہ مہوش کی ساس تھیں اور جو دو لڑکیاں مہوش کی نندیں تھیں۔

مہوش نے مجھے بتایا کہ میں بہاول پور سے بیاہ کر آئی ہوں۔ میری چھ بہنیں ہیں۔ میرا دوسرا نمبر ہے۔ میری شادی میری خالہ کے بیٹے امجد سے کر دی گئی۔ جب میں یہاں بیاہ کر آئی تو میں نے گھر کا ماحول دیکھا کہ اکثر غیر مرد ہمارے گھر آتے تھے اور میری نندیں شاپنگ کرنے کے لیے چلی جاتی تھیں۔

میں حیران تھی کہ اتنے پیسے ان کے پاس کہاں سے آتے ہیں تب ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ ان کے پاس پیسے کہاں سے آتے ہیں۔

اسی اثناء میں مہوش بریانی کی پلیٹ لے کر آئی لذیذ خوشبو میری بھوک سے اشتہاء پیدا کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا کہ بریانی کس ہوٹل سے منگوائی ہے۔" تو مہوش نے کہا کہ خود بنائی ہے۔

بریانی کھانے کے ساتھ ساتھ گپ شپ کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ "میرا شوہر ایک ماہ سات رہنے کے بعد دبئی چلا گیا۔ دیور نے مجھے ایک دفعہ چھیڑا جس کا میں نے ساس کو بتایا لیکن ساس نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ دوسری بار دیور نے مجھے پھر چھیڑا تو پھر میں نے ساس کو بتایا تو اس نے کہا کوئی بات نہیں۔ ایسا تو چلتا رہتا ہے۔" پھر میری نندیں بھی مجھے شاپنگ کرانے ساتھ لے کر جانے لگی تھیں اور وہاں پر اپنے کئی دوستوں کے ساتھ مجھے بھی ملواتی تھیں، گھر میں ان کے مرد دوست مجھ سے بھی ملنے لگے تھے آخر کار میں بھی اسی ماحول میں رچ بس گئی۔ ماحول جو کہ بدکردار تھا اس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

میں رات کو بک ہو کر کئی مردوں کے ساتھ راتیں گزار چکی تھی۔ مجھے بھی اب عادت ہو چکی تھی۔

اب تو ہر روز میں خود کئی مردوں کے ساتھ ان کے من کی آگ بجھاتی ہوں۔

مہوش نے مجھے کہا کہ فرحت اب میں اس زندگی، اس گناہوں کی دلدل سے نکلنا چاہتی ہوں۔ میں عزت کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔"

☆......☆......☆

جب میں نے یہ ساری باتیں اپنے امی ابو کو بتائیں تو انہوں نے کہا مہوش جیسے بھی رہو ہیں رہنا ہے۔

ہم غریب لوگ ہیں۔ آپ کو اب واپس اپنے گھر نہیں رکھ سکتے۔

اب مہوش نے کہا کہ فرحت اب تم مجھ سے شادی کر لو میں آپ کے ساتھ زندگی گزاروں گی۔

آپ جیسے کہو گے۔ گھر کے دروازے سے باہر بھی قدم نہیں رکھوں گی۔"

میں نے مہوش کو دوٹوک بتا دیا کہ میں شادی شدہ ہوں۔ میری ایک بہت اچھی بیوی ہے۔" مگر وہ بضد تھی کہ مجھے یہاں سے لے چلو۔

میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ اس وقت تو میں مہوش کو جواب بھی نہیں دے سکتا تھا۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کو کیا کہوں۔

آخر کار شام قریب ہونے لگی تو مہوش سے واپس

جانے کو کہا لیکن اس کی خواہش تھی کہ میں مزید اس کے پاس وہاں بیٹھوں۔
پتا نہیں کیوں اس میں مجھ کو ایک حسد کی کرن نظر آئی، جب شام ہوئی تو میں واپس گھر آ گیا۔
گھر آ کر رات کا کھانا کھانے کے بعد مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں مسلسل مہوش کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مہوش نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا ہے۔
شاید اگر میری شادی نہ ہوئی ہوتی تو میں مہوش سے شادی کر لیتا۔
بہت دیر تک رات کو سوچتا رہا لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ خیر کچھ دن اسی کشمکش میں گزرتے رہے۔
پھر مجھے ایک دوست علی ملا جس کو میں نے مہوش کے بارے میں بتایا تھا۔ تو وہ بھی مہوش کی کہانی سن کر بہت حیران ہوا تھا۔ علی نے مجھے کہا کہ میں اپنے کسی دوست سے بات کروں گا۔"
وقت گزرتا رہا اب میری اکثر مہوش سے فون پر بات چیت ہوتی رہتی تھی۔
میں کبھی مہوش کے گھر بھی جاتا رہتا تھا۔ تو مہوش سے دیر تک باتیں ہوتی تھیں۔

☆......☆......☆

ایک دن میرے پاس چھٹی والے دن علی آ گیا تو ہم بیٹھک میں بیٹھے کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔
چائے بھی گرما گرم سموسوں کے ساتھ مزہ دے رہی تھی۔ کیوں کہ سردی کی لہر تھی اور موسم بہت ٹھنڈا تھا۔
باتوں باتوں میں بات مہوش کی طرف چلی گئی۔
علی نے مجھے بتایا کہ اس کا ایک دوست جس کا نام ذیشان ہے۔ علی نے اسے مہوش کے بارے میں بتایا۔
سوچ بچار کرنے کے بعد یہ فیصلہ کر لیا ہے اور ذیشان اس بات پر آمادہ ہو گیا ہے کہ وہ مہوش سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہے۔
ذیشان نے کہا کہ اگر میری وجہ سے ایک لڑکی گناہوں کی دلدل سے باہر نکل سکتی ہے، تو میں اس کو گناہوں بھری دلدل سے نکالنے میں مہوش کا ساتھ دوں گا، تو میرے لیے یہ بات جنت کا ذریعہ بن جائے گی۔
اور یہ حقیقت ہے کہ آپ اگر کسی ایک انسان کو گناہوں سے بچانے کا ذریعہ بنتے ہیں تو بلاشبہ آپ نے بہت بڑا عملی مظاہرہ کیا ہے کیوں کہ اسلام کی اصل روح تو یہی ہے کہ آپ کتنے اسلام کے جاننے والوں کو گناہوں سے بچاتے ہیں۔
اور راہ راست پر لے کر آتے ہیں اور میں تو خود ہی سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی نیکی نہیں۔
اب ذیشان نے اپنے گھر والوں کو بھی مہوش کے بارے میں بتا دیا ہے تھا کہ وہ مہوش سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔
پہلے تو ذیشان کے والدین نا مانے جب ذیشان سنجیدگی سے اپنی بات پر قائم رہا تو اس والدین نے بھی اپنی رضامندی بیٹے کے سامنے ظاہر کر دی۔ آخر اکلوتی اولاد کے فیصلوں کے آگے اکثر والدین گھٹنے ٹیک ہی دیا کرتے ہیں۔ اب ذیشان مہوش سے شادی کرنے کے لیے تیار تھا لیکن مہوش کی طلاق کے بغیر ایسا کیسے ممکن تھا۔
اس ملن کی راہ میں یہ مرحلہ بہت ہی کٹھن تھا۔ اب بھلا مہوش کے سسرال والوں کو کیسے آمادہ کیا جاتا کہ وہ مہوش کو امجد سے طلاق دلوائیں۔
مگر اس بات کے لیے کسی کو تو اس کی خالہ سے بات کرنا ہی تھی۔

☆......☆......☆

آخر ایک دن موقع پا کر مہوش نے گھر میں اپنی ساس کو کہہ ہی دیا کہ میں اب اس گناہوں بھری زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اب اس گھر میں نہیں رہوں گی۔
میں اپنے شوہر سے طلاق لوں گی میں ذیشان سے نکاح کر کے عزت کی زندگی گزاروں گی۔،، لیکن مہوش کے گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی خالہ ایک دم سے کس طرح آنکھیں بدل لیں گی۔
یہ بات سن کر وہ غصے سے لال پیلی ہو گئی۔ اور کہنے لگی۔ "مہوش تیری اتنی جرات کہ اب تو یہ سب کچھ چھوڑنے کی بات کر رہی ہے مت بھول کے تیری

خواہش سے یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے۔
امجد کی بیوی بننے کے بعد ہی تو نے اپنی خوشی سے اس دلدل کا انتخاب کیا تھا۔،،
مہوش یہ سن کر بھی نہ گھبرائی اور اٹل لہجے میں بولی ''خالہ آپ بھی مت بھولیں کہ میری پاکدامنی کو تارتار کرنے والی آپ ہیں۔
آپ نے میرے والدین کی غربت سے فائدہ اٹھا کر مجھے گندگی کے اس ڈھیر میں پھینکا ہے۔ آپ کا جو دل چاہے کریں مگر میں نے اٹل فیصلہ کرلیا ہے کہ میں امجد سے ہر حالت میں طلاق لوں گی اور ذیشان سے ہی شادی کروں گی۔،،

☆......☆......☆

مہوش کی اس بات کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا تو ہم دوستوں نے مل کر کچھ کرنا کا پروگرام بنایا۔
رانا صاحب علاقے کی معزز اور با اثر شخصیت تھے۔ میں نے اور ذیشان نے جا کر ان کے حضور سارا معاملہ رکھ دیا۔ ایک ایک حقیقت عیاں کر دی تھی۔ رانا صاحب پر ان باتوں کا بڑا اثر ہوا اور وہ ایک گناہوں سے تائب ہونے والی لڑکی کی ہمت اور جرات کو سراہتے ہوئے ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔

☆......☆......☆

کچھ دنوں بعد رانا صاحب کو ساتھ لے کر ہم تینوں دوست مہوش کے سسرال پہنچ گئے۔
رانا صاحب کو اپنے گھر دیکھ کر مہوش کے سسرال والوں کی سٹی گم ہوگئی۔
لیکن اس کی ساس نے کچھ دیر بعد حالات سنبھال لیے۔ وہ ہماری کہی ہر بات سے صفا چٹ مکر گئی تھی۔ اور الٹا ہمیں ہی موردالزام ٹھہرانے لگی تھی۔
''مہوش کو بلائیں! میں خود بچی سے بات کروں گا۔،، رانا صاحب کی بات سن کرنا چاہتے ہوئے بھی ان لوگوں کو مہوش کو سامنے لانا پڑا۔
''مہوش بیٹا! جو بات ہے کھل کر کہو۔ مجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھو۔،،
رانا صاحب کی طرف سے حوصلہ پا کر مہوش نے الف سے ے تک ہر بات ان کے گوش گزار کر دی۔
رانا صاحب نے اسی وقت موبائل نکالا اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگے۔
مہوش کی ساس نے بھی موبائل نکالا اور کسی کو فون کرنے لگی۔ ''بی بی! اپنا موبائل بند کردے۔
تیری ہر بات کا جواب اور سارے کانٹیکٹ تھوڑی دیر میں خود یہیں ہوں گے۔،،
واقعی کچھ دیر میں سائرن کی آواز کے ساتھ کوئی حکومتی گاڑی دروازے پر تھی۔

☆......☆......☆

شہر بھر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ بہو سے دھندا کروانے والی عورت رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی بیٹیاں بھی انڈر اریسٹ کر لی گئی ہیں۔
رانا صاحب نے واقعی باپ بن کر دکھایا۔ مہوش کی امجد سے فوری طور پر فون پر طلاق دلوائی گئی۔
کچھ ہی عرصے بعد ذیشان نے مہوش کو اپنے عقد میں لے لیا۔ مہوش نے اپنے کردار سے سسرال والوں کا دل جیت لیا اور ذیشان کے گھر والے اپنے بیٹے کے انتخاب کی داد دیتے۔
مہوش نے ایک مجرمانہ زندگی سے گھریلو زندگی گزارنے کا فیصلہ گو کہ مجھ سے ملنے کے بعد کیا تھا۔ لیکن مجھے وہ مہوش آج بھی یاد ہے جو اس رات اپنی گھنیری پلکوں پر معصومیت کے بکل میں مجھے اپنی پاکیزگی کا پتا دے رہی تھی۔ خدا نے مہوش کا ملن ذیشان سے کچھ اس طرح کرادیا کہ سب حیران رہ گئے۔
سچ ہے جوڑے خدا تعالی آسمان پر بناتا ہے۔ مگر اسے ایک دوسرے کا نصیب بننے میں دیر سویر ہو جاتی ہے۔ لیکن کاتب تقدیر ملاتا ضرور ہے۔
اس عجیب ملن کی روداد میں نے من وعن آپ کے گوش گزار کردی ہے۔ آج مہوش اور ذیشان ایک مثالی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے آنگن میں محبت کا ایک پھول وہاج کی صورت کھل گیا ہے اور اپنی مہک سے گھر بھر کو رونق بخش رہا ہے۔

☆......☆......☆

پراسرار کھانی نمبر 2

Email : pearlpublications@hotmail.com

پراسرار نمبر **1** کی پذیرائی کے بعد پراسرار نمبر **2**

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو آپ کو چونکنے پر مجبور کر دیں گی۔

آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔

جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کر دیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرا لیں۔

سچی کہانیاں کا ماہِ اگست کا شمارہ، پراسرار نمبر **2** ہوگا۔

نوٹ: پراسرار نمبر **2** کے لیے کہانیاں بھیجنے کی آخری تاریخ **5** جون ہے۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

زندگی صحرا نشیں ہو جیسے

عبدالغفار عابد

اپنے ہاتھوں، اپنی زندگی صحرا کر لینے والی دوشیزہ کا آل، چیچہ وطنی سے

اس کا نام آسیہ تھا۔ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ اس سے چھوٹے دو بھائی اور ایک بہن تھے۔ بڑی ہونے کے ناتے اس کے والدین اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اور بہن بھائی بہت عزت کرتے تھے۔ سب اسے باجی کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کے گھر والے اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کیسی طبیعت کی مالک تھی۔

جب اس کی شادی ہوئی تو وہ بہت ڈری ڈری سہمی سہمی سی رہتی تھی۔ اس کے دل میں یہ بات ہوئی کہ مجھ



سے کوئی گھر کا کام غلط نہ ہو جائے۔ شادی ہو کر پرائے گھر جانے والی ہر لڑکی کے ایسے ہی خیالات ہوتے ہیں حالانکہ وہ خود میکے کا سارا کام کاج، گھر کی دیکھ بھال، بڑوں کو ڈیل کرنا سب خود کرتی تھی۔

سسرال کا ڈر لوگوں کی طرح طرح کی باتیں سن سن کر اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا حالانکہ اس کے سسرال والے بہت محبت کرنے والے تھے۔ ایک دیور، تین نندیں، ساس سسر ماشاء اللہ بھرا پرا گھر تھا جہاں سب محبتیں نچھاور کرنے والے لوگ رہتے تھے۔

جب دلہن بن کر پہلی مرتبہ وہ اس گھر میں آئی تو وہ سب کو بہت اچھی لگی۔ ہر آنے جانے والے، ملنے والے اس کی تعریف کرتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا اور گھر والوں کے رویوں میں بھی بدلاؤ آنا شروع ہو گیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر روک ٹوک ہونے لگی کیوں کہ وہ ایک چھوٹے سے گھر سے آئی تھی اور اس کا سسرال ماشاء اللہ کوٹھی نما تھا اور وہ خود ایک دو کمروں کے گھر سے آئی تھی ظاہر ہے کس طرح سسرال کے سترہ کمرے سنبھال پاتی۔

اس کی ساس نے پہلے پہل تو گھر کی تمام ذمہ داریاں اس کے سپرد کر دیں لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ شادی کو سال ہونے کو آیا ہے مگر آسیہ اپنی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کے باعث ان ذمہ داریوں کو سنبھال نہ پا رہی تھی تو انہوں نے اسے پہلے تو پیار سے سمجھایا اور ہر بات میں یہی کہا کہ بیٹا کچھ سمجھ میں نہ آئے تو پوچھ لیا کرو۔ بیٹی کوئی کام شروع کرنے سے پہلے مجھ سے ضرور مشورہ لے لیا کرو لیکن وہ آسیہ ہی کیا جو بات سمجھ جاتی۔ اسے لگتا تھا کہ جیسے اس کے ہر کام میں اس کی ساس اپنی روک ٹوک سے روڑے اٹکانے لگی ہے۔

نندیں شادی کے بعد سے بھابی کے نام کا کلمہ پڑھتی تھیں آسیہ نے آہستہ آہستہ انہیں بھی اپنی ماں کے خلاف لگائی بجھائی میں مصروف کر لیا چونکہ اس کی تینوں نندیں بالترتیب پانچ، آٹھ اور بارہ برس کی تھیں اور انہوں نے اپنے گھر میں کبھی اس طرح کا ماحول بھی نہیں دیکھا تھا، ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ امی تو بھابی کی کوئی بات ہم سے نہیں کرتیں لیکن بھابی ہر وقت موقع ملتے ہی امی کے خلاف اس طرح بات کرتی ہیں جیسے امی ان کی سب سے بڑی دشمن ہوں۔

وقت گزرتا رہا اور آسیہ ایک گپ چھپ کردار بن کر، اپنے چہرے پر، مظلومیت کا خول چڑھائے ہر کسی کے آگے سسرال والوں کو ظالم اور خود کو اور اپنے والدین کو مظلوم ثابت کرتی رہی۔

آسیہ کی والدہ پورے خاندان میں ایک تیز طرار اور لڑاکا خاتون مشہور تھیں اور ان کی ایک خاص بات ہر کس و ناکس میں مشہور تھی کہ کوئی ایسا گھر نہ تھا جس میں انہوں نے کبھی کسی کے ساتھ دو بول میٹھے بولے ہوں یا کسی کی برائی نہ کی ہو۔

آسیہ کی والدہ کو کسی کے بچے پسند نہ آتے تھے ہر ایک کے منہ پر وہ صرف اپنی بیٹیوں اور اپنے گھر کی مثالیں دیا کرتی تھیں۔ جب آسیہ بیاہ کر سسرال آئی تو اس کی ماں کے سارے بڑے بول ڈھے گئے اور جب قلعی کھل گئی۔

ظاہری بات ہے جو بندہ ہر بات میں اپنی اولاد کی مثال دیتا ہے۔ پوری دنیا یہ دیکھنے کی منتظر ہوتی ہے کہ دیکھیں فلاں بندے کی اولاد میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ اب آسیہ اپنے سسرال میں پریشان رہنے لگی تھی کیوں کہ ساس کی روک ٹوک وہ قطعاً برداشت نہ کر سکتی تھی اور اس کے گھر والے اس کی عادت خوب جانتے تھے۔

آسیہ کو سینے پرونے کا کوئی شوق نہیں تھا اسے کڑھائیاں آتی تھیں اور وہ اکثر اپنے کپڑوں پر چھپ کر کڑھائیاں کرتی رہتی۔ سسرال میں کوئی آیا گیا ہوتا تو وہ دنیا دکھاوے کو پاس آ کر بیٹھ جاتی اور سب سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی اور کچن میں یوں مصروف ہو جاتی جیسے اس سے زیادہ کوئی مصروف ہی نہیں۔ عین مہمانوں کے سامنے ہی وہ صاف ستھرے آنگن کو دھونا دھلانا شروع کر دیتی۔ ہر آیا گیا یہی سمجھتا یہ آسیہ کولہو کے بیل کی طرح سسرال میں جتی رہتی ہے۔ آہستہ آہستہ پورے خاندان میں آسیہ کی ساس ظالم اور آسیہ مظلوم مشہور ہو گئی۔

آسیہ کی صرف ایک خوبی تھی کہ وہ صرف نندوں سے ساس کی برائی کرتی تھی لیکن شوہر اور ساس سسر اور دیور کے سامنے بالکل خاموش گم صم رہتی تھی۔ آسیہ کا

شوہر چونکہ اپنی ماں اور اپنی ساس کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا اور اس کے ذہن میں صرف ایک بات تھی ''جیسی ماں ویسی بیٹی''۔ اس لیے وہ بیوی کی بھولی صورت دیکھ کر بھی کوئی فیصلہ نہیں کرتا تھا چونکہ اسے علم تھا کہ آسیہ خاموش تو رہتی ہے لیکن ایسا کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنے دل کی بات دل میں رکھے اور وہ آسیہ کی خاموشی کے پیچھے چھپے طوفان کو محسوس کر رہا تھا۔ خیر وقت گزرتا رہا اور آسیہ کا شوہر آسیہ کی تمام تر لاپروائیوں کو برداشت کرتا رہا۔

آسیہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ ماں بننے کے بعد بھی آسیہ کے معمولات تبدیل نہیں ہوئے۔ آسیہ کی ماں نے آسیہ کے سسرال والوں کا جینا حرام کر دیا تھا کہ میری بیٹی کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جاتا ہے اور لگتا ہے میں نے اپنی بیٹی بنگلہ دیش میں بیاہ دی ہے۔''

پورے خاندان میں چونکہ لوگ آسیہ کی ماں سے بہت اچھی طرح واقف تھے اس لیے زیادہ دھیان نہیں دیتے تھے لیکن کہتے ہیں کہ اگر پتھر پر بھی قطرہ قطرہ بوند گرتی رہے تو سوراخ پڑ جاتا ہے۔ لوگ پتھر تو نہیں ہوتے اس لیے اب آہستہ آہستہ آسیہ کی ماں کی باتوں پر تھوڑا بہت یقین کرنے لگے۔

☆......☆......☆

وہ بھی ایک عام سا دن تھا جب آسیہ کے شوہر ہادی کو اس کے فرسٹ کزن کا فون آیا جو کچھ ہی دن پہلے ساؤتھ افریقہ سے لوٹا تھا اور واپسی میں آسیہ کے گھر ہو کر آیا تھا۔

حال احوال کے بعد منظر نے ہادی کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔

''ہادی تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ پڑھے لکھے سمجھدار انسان ہو لیکن مجھے بہت افسوس ہوا کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ اتنا برا سلوک کرتے ہو۔''

''بھائی جان! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔''

''ہادی تم بچے نہیں ہو کہ میری بات نہ سمجھ سکو۔ میں کبھی آسیہ کی ماں کی باتوں پر یقین نہ کرتا اگر وہ مجھے آسیہ کے ہاتھ کا لکھا خط نہ پڑھوا دیتیں۔''

ان کی بات سن کر ہادی ہکا بکا رہ گیا۔ وہ تو یہ بھی نہ کہہ سکتا تھا کہ بھائی جان آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ آسیہ کی خاموشی کے پیچھے جو طوفان چھپا تھا۔ آج اس کی اصل شکل سامنے آ گئی ہے۔

ہادی کا دل اپنی بیوی کی طرف سے کبیدہ خاطر ہو چکا تھا۔ جب دل کے شیشے پر بال آ جائے تو انسان ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ ہادی یہ بات کسی سے نہ کر سکتا تھا لیکن چونکہ وہ آسیہ کے چہرے کے پیچھے دوسرے چہرے کو دیکھ چکا تھا اس لیے وہ اس کی طرف سے محتاط ہو گیا۔

بہت جلد اس پر یہ حقیقت ظاہر ہو گئی کہ اس کی بیوی گھر کی ایک ایک بات اپنی ماں کو خط کے ذریعے لکھ کر بتاتی ہے۔ ہادی نے محلے کے اس معصوم بچے کو بھی ڈھونڈ لیا تھا جسے آسیہ اپنے بیٹے کی کھانے پینے کی چیزوں میں حصے دار بنا کر اور کچھ پیسوں کے لالچ میں اپنے خط پوسٹ کراتی تھی۔ یقیناً پڑھنے والے یہ بات سوچ رہے ہوں گے کہ موبائل اور انٹرنیٹ کے دور میں خط کون لکھتا ہے۔ نہیں قارئین ایسا نہیں ہے۔ آج بھی لوگ خط و کتابت کرتے ہیں اور چونکہ موبائل اور انٹر نیٹ کا دور دورہ ہے اس لیے ان چیزوں کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا کہ لوگ خط و کتابت کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے تخریبی طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

☆......☆......☆

ہادی کی جیب میں آسیہ کا اپنی ماں کو بھیجا گیا خط تھا مگر اس نے ہوش کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور تحمل سے آسیہ سے پوچھا کہ تمہاری والدہ کے پاس تمہارے ہاتھ کا لکھا کون سا خط ہے جسے بھائی منظر پڑھ کر آئے ہیں۔''

آسیہ صاف مکر گئی کہ اس نے ایسا کوئی خط اپنی ماں کو لکھا ہے۔ وہ بولی آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں۔ آپ شروع ہی سے بے اعتبار رہے ہیں میری طرف سے۔ میں خاموش رہتی ہوں اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے منہ میں زبان نہیں۔''

ہادی نے سختی سے پوچھا ''مجھے میری بات کا جواب چاہیے تم نے خط لکھا تھا یا نہیں۔''

آسیہ نے اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ میں اپنے بچے کے سر کی قسم کھاتی ہوں۔ میں نے آج تک خط میں کوئی الٹی سیدھی بات نہیں لکھی۔ آپ مجھ پر شک کرنا چھوڑ دیں اور بھروسہ کرنا سیکھیں۔'' ان کی تیز تیز

آوازیں سن کر گھر بھر جمع ہو چکا تھا۔ ہادی کا دل آسیہ کی طرف سے بہت خراب ہوا اور اس نے اپنی جیب سے خط نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔

جوں جوں خط پڑھا جا رہا تھا آسیہ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ آسیہ کے ڈھول کا پول چورا ہے پر کھل چکا تھا۔ ہادی اپنے بھروسے کرچیاں چنتے چنتے لہولہان ہو چکا تھا اس نے اس جھوٹ اور فریب پر آسیہ کو چار چوٹ کی مار لگائی اور اس دن کے بعد سے ہادی اور آسیہ کے درمیان صرف ایک تعلق رہ گیا تھا جس میں محبت نہیں صرف حقوق و فرائض شامل تھے۔

آسیہ آج بھی اپنے سسرال میں موجود ہے۔ اس کا میکہ اس سے چھوٹ چکا ہے۔ اس کے والدین کی حقیقت پورے خاندان پر کھل چکی ہے۔ لیکن اب آسیہ سسرال کی رانی نہیں بلکہ باندی بن کر زندگی گزار رہی ہے۔ بات تو صرف یہیں پر ختم ہو جاتی ہے لیکن جیسی ماں ویسی بیٹی کی مثال آسیہ نے خوب قائم کی۔ ہر چوتھے دن آسیہ زبان سے مغلظات نہ بکے تو اسے سکون نہیں ملتا۔ اپنے شوہر کو اس نے خود سے اپنی دوہری پالیسی کے تحت سسرال اور میکے میں مظلومیت کی تصویر بننے کی وجہ سے دور کر دیا۔

☆......☆......☆

میری تمام لڑکیوں سے گزارش ہے خدارا شادی کے بعد اپنے سسرال کو اپنا سمجھیں۔ اپنی ساس کو اپنی ماں اور سسر کو باپ۔ دیور نندوں کو اپنے بہن بھائی سمجھیں۔ عورت کا دوسرا نام برداشت ہے۔ سسرال کو اپنا بنانا عورت کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لیکن اس کھیل میں بھی ایمانداری پہلی شرط ہے۔ شوہر کے گھر والے اگر بیوی سے خوش ہوں تو شوہر کے دل میں اپنی بیوی کی عزت اور احترام خود بخود بڑھ جاتا ہے۔ ورنہ رشتہ تو اسی فیصد لوگ نبھاتے ہی ہیں لیکن اس رشتے میں محبت کی چاشنی نہیں ہوتی اور زندگی صحرا کے اس پودے جیسی ہو جاتی ہے جو سرسبز تو ہوتا ہے لیکن اس کے پاس جانا کوئی پسند نہیں کرتا اور صحرا کی ریت ہی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے، جس طرح آسیہ کی زندگی ایک صحرا جیسی گزر رہی ہے۔

☆☆☆

پردیس مت جئیو

شاہد رفیق سہو

کبیروالا سے اُس بیوی کا قصہ، جس نے پردیس کی کمائی کے لالچ میں اپنے شوہر کی محبت تج دی

شادی کے چند سال تو ہم نے نہایت سکون اور خوشی سے گزارے۔ حیات ایک آفس میں معمولی کلرک تھے۔ ایک وقت کی بھی روکھی سوکھی کھا کر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا، لیکن جب خدا کے فضل سے ہمارے چار بچے ہو گئے تو قلیل تنخواہ اور بڑھتی ہوئی مہنگائی میں گزر بسر کرنا مشکل ہو گیا۔ میں منہ سے کچھ نہ کچھ کہتی تھی لیکن میری روز بڑھتی ہوئی جھنجھلاہٹ سے میاں کو اندازہ ہو گیا کہ مفلسی اب ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہے وہ دن رات اسی فکر اور سوچوں میں گم رہنے لگے کہ آمدنی کیسے بڑھائی جائے کہ ضروریات زندگی پوری ہوں اور بچے پیٹ بھر کے روٹی کھا سکیں۔

مفلسی کی انتہا تھی کہ ایک بار چھوٹے بچے کو بخار ہو گیا۔ دوا کے پیسے نہیں تھے۔ دودھ خریدنے کے لالے پڑ گئے تھے۔ دوا دارو کے پیسے اور ڈاکٹر کی فیس کے پیسے کہاں سے آتے۔ تب ہی میں نے حیات کے آگے ہاتھ جوڑ دیے کہ خدا کے لیے کچھ کرو۔ یہ نوکری چھوڑ دو۔ اس کی تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا۔ یہی حالات رہے تو فاقوں تک کی نوبت آ جائے گی کیا پھر کچھ کرو گے؟''

روز روز کے مطالبے پر حیات اوب گیا اور آخر کار اس نے ایک دن ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور کہا اب خوش ہو جاؤ نوکری چھوڑ دی ہے۔''

میں ان کے اس اچانک فیصلے سے دنگ رہ گئی۔ لو اب آمدنی کا رہا سہا سہارا بھی جاتا رہا۔ میں نے ان سے پوچھا اب کیا کریں گے۔''

تو انہوں نے کہا کہ بیرون ملک جا کر کمانے کی کوشش کروں گا۔ چاہے وہاں جا کر جھاڑو لگانا پڑے یا پلیٹیں صاف کرنی پڑیں۔ بچوں کا پیٹ تو بھرنا ہے نا؟''

شوہر کو پریشان دیکھ کر میں بھی پریشان ہو گئی لیکن کیا کرتی۔ میں بھی حالات کے آگے مجبور تھی۔ بچے کھانے پہننے کو مانگتے تھے اور بھی سو طرح کے اخراجات تھے۔

عدم ادائیگی کے سبب جب دو ماہ کا کرایہ چڑھ گیا تو مالک مکان نے بھی گھر خالی کرنے کا نوٹس دے دیا۔

یوں ایک دن چپکے سے ہم لوگوں کو گھر خالی کرنا پڑا۔ حیات مجھے لے کر اپنے بڑے بھائی کے گھر آ گئے انہوں نے بادل ناخواستہ ایک کمرہ عارضی طور پر رہنے کو دے دیا کیوں کہ ہم نے ان کو یہ کہہ رکھا تھا کہ جونہی دوسرا مکان مل جائے گا ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔

میرے جیٹھ خضر کے علم میں یہ بات نہ تھی کہ حیات نے نوکری چھوڑ دی ہے۔ تب ہی مالک مکان نے ہم کو چلتا کیا ہے۔ اگر ان لوگوں کو اصل بات کا علم ہو جاتا تو وہ ہم کو چند دنوں کی پناہ بھی نہ دیتے۔



میری جیٹھانی کافی تیز طرار عورت تھی۔ ایک ہفتے بعد ہی وہ طرح طرح کے اعتراض کرنے لگی اور میرے بچوں پر سختی شروع کر دی۔ ماں کی دیکھا دیکھی ان کے بچوں نے بھی میرے بچوں کی ٹھکائی شروع کر دی۔

ان دنوں حیات کس قدر پریشان تھے کیا بتاؤں۔ دوستوں سے قرض لے کر خرچہ پورا کر رہے تھے۔ آخر کوئی کب تک ساتھ دیتا ہے۔ اس سے پہلے ہم میاں بیوی خودکشی کا سوچتے کہ اللہ تعالیٰ نے رحم کیا اور اچانک ایک دوست کے توسط سے حیات کو دبئی کا ویزا مل گیا اور وہ آناً فاناً زیادہ کمائی کا خواب لے کر دبئی روانہ ہو گئے۔

بہت کوششوں کے بعد بالا آخر دبئی میں حیات کو ایک اچھی ملازمت مل گئی۔ رہائش ان کے اسی دوست کے پاس تھی جو ان کو دبئی لے گیا تھا۔

ان کا پہلا خط بیس روز بعد ملا۔ لکھا تھا اگرچہ نوکری ملنے سے بہت خوش ہوں لیکن تمہاری اور بچوں کی جدائی بہت دکھ دیتی ہے۔ تم سب بے حد یاد آتے ہو۔ جی چاہتا ہے اڑ کر گھر پہنچ جاؤں۔''

اس خط کے جواب میں، میں نے لکھا۔

''پیارے حیات!

جدائی کے یہ دن بھی کٹ جائیں گے، دیکھو آنے کی جلدی نہ کرنا۔ وہاں دل لگا کر کام کرنا اور وہاں اتنا سرمایہ جمع کر لینا تاکہ ہمارے بچے مستقبل میں محفوظ زندگی گزار سکیں۔''

کبھی کبھی حیات کی بہت زیادہ کمی محسوس کرتی تھی

لیکن دل پر جبر کرتی اور ایک سطر بھی ایسی نہ لکھتی تھی جس سے یہ ظاہر ہو کہ میں اس کی جدائی محسوس کر رہی ہوں۔ ان کی ہدایت تھی کہ میں خط کے جواب میں خط ہی لکھوں۔ وہ کہتے تھے کہ جب تم لوگ یاد آتے ہو تو میں بار بار تمہارے خط کو پڑھ کر خود کو بہلا لیتا ہوں۔ فون پر بات پوری طرح نہیں ہو پاتی لیکن خطوط سے ہی ہوتی ہے۔

ان کے لمبے لمبے جذباتی خطوط آتے۔ بار بار لکھتے کہ تمہاری اور بچوں کی بہت یاد آتی ہے۔ لیکن میں ہرگز کوئی ایسا جملہ جواب میں تحریر نہ کرتی کہ جس کو پڑھ کر ان کو احساس ہو ہم بھی ان سے جدا ہو کر پریشان یا افسردہ ہیں۔ ایسا میں جان بوجھ کر کر رہی تھی تاکہ وہ وہاں دبئی میں ٹکے رہیں واپس آنے کی نہ سوچیں۔

میں چاہتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ کما کر بھیجیں۔ کیا خبر دوسری بار ان کو ویزا ملے یا نہیں ایک بار نوکری چھوڑ کر آ گئے تو پھر کیا ضمانت تھی کہ دوبارہ ایسی اچھی نوکری مل پائے گی۔ میں اسی وجہ سے خود غرض بنی ہوئی تھی۔ اپنے اور بچوں کے اصل جذبات ان سے چھپائے ہوئے تھے لیکن ان کے دل کو ٹھیس پہنچ رہی تھی میں یہ نہ سوچ سکی وہ مایوس سے ہونے لگے انہیں لگا جیسے ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے ہمیں صرف پیسے کی ضرورت ہے۔

کاش میں ایک بار لکھ دیتی کہ ہمیں آپ کی کمی محسوس ہوتی ہے اور آپ کے جانے کے بعد جدائی ستاتی ہے۔ آپ کی بہت یاد آتی ہے۔ پردیس میں ان بولوں سے ان کا دل کتنا بھر جاتا۔

اب ان کو گئے ڈیڑھ برس بیت چکا تھا۔ ایک بار انہوں نے لکھا کہ میں بیمار ہو گیا ہوں۔ یہاں بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے، تب پیسہ ملتا ہے۔ بچوں کو دیکھے بہت دن گزر گئے ہیں۔ اب جی چاہتا ہے کہ چند دنوں کی چھٹی لے کر آ جاؤں۔ تم اس بارے میں کیا کہتی ہو۔''

میں ڈر گئی کہ اگر یہ چھٹی لے کر آ گئے اور دوبارہ نہ جا سکے، تب کیا ہوگا؟ جو چار پیسے جوڑ لیے ہیں وہ کھا پی کر برابر ہو جائیں گے۔ پھر کیا کریں گے؟ یہ سوچ کر میں نے اپنے خاوند سے کہا کہ بیماری ہر انسان کے ساتھ ہے۔ آپ علاج معالجہ کرا لیں۔ اللہ نے چاہا تو جلد ٹھیک ہو جائیں گے لیکن ابھی چھٹی لے کر نہ آئیں۔ ورنہ جو رقم کما رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا تسلسل ٹوٹ جائے انہوں نے چھٹی کے لیے درخواست بھی دے دی تھی لیکن جب میرا خط ملا تو انہوں نے چھٹی مؤخر کرا دی۔

اس کے بعد اکثر ان کی تحریر آنسوؤں کی وجہ سے مٹی ہوئی ملتی لیکن میں نے اس بات کو بھی نظر انداز کیا۔ تم کو گئے بہت دن ہو چکے ہیں۔ اب چند دن کی چھٹی لے کر آ جاؤ۔ مگر میں خود غرضی کی بنا پر ایسی نادانی کر کے اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہ مارنا چاہتی تھی۔ تب ہی میں نے ہر بار بس یہی لکھا۔

حیات آپ زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کی کوشش کریں تاکہ ہمارے اکاؤنٹ میں خاطر خواہ رقم جمع ہو جائے پھر مستقبل میں کسی بات کی محتاجی نہ رہے گی۔''

میں جانتی تھی کہ دیار غیر میں آدمی اپنوں کی محبت کے لیے ترستا ہے۔ وہی لوگ اس درد کو سمجھ سکتے ہیں جو پردیس میں اپنوں کے سکھ کی خاطر سخت وقت اور مشقت کا عذاب سہتے ہیں۔ جب وہ سارا دن کام سے تھک کر رات کو بستر پر لیٹتے ہیں، تو کثرتِ مشقت کا عذاب سہتے ہیں۔ اس کثرت مشقت سے ان کے بدن کا انگ انگ ٹوٹتا ہے اور اپنے بچوں کی معصوم صورتیں ان کی نگاہوں میں گھومتی ہیں اور ان کی پیاری پیاری باتیں کانوں میں رس گھولتی ہیں۔

☆☆

حیات کو گئے ڈھائی برس ہو گئے تھے۔ اُس دن حیات کا خط آیا۔

''سہیلہ!

اب تمہارے بن دن کاٹے نہیں کٹتے۔ بتاؤ میں کیا کروں۔ کہو تو آ جاؤں۔''

خط پڑھ کر میرا جی بھر آیا۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ پھر بھی جذبات کو قابو میں کیا اور ان کو لکھ دیا کہ تین سال پورے کر لیں۔ بچے یہاں خوش خرم ہیں اور آس لگائے بیٹھے ہیں کہ جب ابو آئیں گے ہم گھر کے ساتھ نئی گاڑی بھی لیں گے۔''

☆☆

مسلسل کام سے شاید ان کا جی اچاٹ ہو گیا تھا، ہر دم جی ماند رہنے لگا تھا۔ جدائی کے تین برس پورے ہونے والے تھے۔ ان کی صحت خراب ہو چکی تھی۔ مدت

سے گھر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ گھر کے کھانے کا ذائقہ تک بھول چکے تھے۔ بیمار پڑ جاتے تو عیادت کرنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا وہاں کوئی مونس تھا نا غمگسار۔

تین سال بعد کنٹریکٹ ختم ہو گیا۔ کمپنی نے دوبارہ آفر کی انہوں نے قبول نہ کی۔ اور وہ وطن واپس آنے کی تیاریاں کرنے لگے۔

ان کے جذباتی پیار بھرے خطوط بھی آنا بند ہو گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آنے سے ایک ہفتہ پہلے انہوں نے پورا ایک ہفتہ بیوی اور بچوں کے لیے تحائف خریدنے میں لگایا تھا۔ اور تین چار سوٹ کیس تحفوں سے بھر لیے تھے۔ ان کے آخری خط میں صرف تین چار سطریں تھیں کہ میں آپ لوگوں کے پاس بہت جلد پہنچ رہا ہوں۔ میں نے خط پڑھ کر ایک جانب ڈال دیا کہ اب تو آ ہی رہے ہیں۔ میرے خیال سے انہیں ابھی اور کمانا چاہیے تھا کہ ہم آئندہ زندگی سکون سے بسر کر سکیں۔

مجھے خدشہ تھا کہ وہ جس قدر اداس رہے تھے۔ اور آٹھ آٹھ صفحوں کے جذباتی خطوط لکھتے تھے یقیناً وہ یہاں آ کر ہی فیصلہ کریں گے کہ اس جمع شدہ رقم سے وطن میں دکان کریں گے اور واپس لوٹ کر پردیس میں نہ جائیں گے۔ دردِ جدائی کی اذیت ان سے برداشت نہ ہو پائی تھی۔

آخر وہ دن آ ہی گیا جب انہوں نے فون پر بتایا کہ فلاں تاریخ کو ان کی فلائٹ ہے اور وہ فلاں دن پہنچ رہے ہیں۔ میں نے بچوں کو بتایا کہ تمہارے پاپا آنا ہی چاہتے ہیں۔ بچے اپنے باپ کے لیے واقعی اداس تھے۔ وہ بہت خوش ہوئے کہ ابو آ رہے ہیں۔

انہوں نے گھر کی آرائش میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور گارڈن وغیرہ کو بھی اپنے ہاتھوں سے ٹھیک کیا۔ باپ کے استقبال کے لیے پوری طرح سے تیاری کر لی گئی تھی۔ حیات کے آنے سے دو روز قبل فون کی گھنٹی بجی اور پھر یہ منحوس خبر ملی کہ ان کا ٹریفک حادثے کے دوران انتقال ہو گیا ہے۔

یہ منحوس اطلاع ان کے اسی دوست نے دی تھی جو ان کو اپنے ساتھ دبئی لے گیا تھا۔

آہ وہ خوبصورت خواب جو پورا ہونے والا تھا عین وقت پر ٹوٹ گیا۔ ٹوٹ کر ایسا بکھرا کہ پھر کبھی جڑ نہ سکا۔

وہ کمائی جو ہزار دکھ سکھ سہہ کر انہوں نے اپنے بچوں کے لیے جمع کی تھی اب وہی میرے بچوں کے لیے کل جمع پونجی تھی۔ ظاہر ہے یہ روپیہ عمر بھر کے لیے تو کافی نہیں تھا۔ یہ صرف چند سال کے لیے ہی تھا۔

ہم صرف ایک چھوٹا سا پلاٹ خرید سکے تھے۔ اس پر گھر بنانے کی توفیق نہ ہوئی اور میرے سرتاج اس جہاں سے چلے گئے۔ بعد میں کمپنی نے کچھ رقم بھجوائی تھی جس سے میں نے اس پلاٹ پر دو کمرے تعمیر کروا لیے۔ یوں کرائے کے مکان سے نجات ملی لیکن آہ میرا پیارا شوہر تو ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔ اب سوچتی تھی کہ کاش میں ان کو ایسے روکھے پھیکے خطوط نہ لکھتی بلکہ پیار بھرے الفاظ رقم کرتی تو ان کو خوشی محسوس ہوتی۔ انہیں سکون ملتا کہ صرف وہ ہی نہیں ہم بھی ان سے پیار کرتے ہیں، ان کے لیے افسردہ ہیں، اور ان کی جدائی کے درد کو اسی طرح سہہ رہے ہیں جسے وہ جھیل رہے تھے۔

برا ہو اس پردیس کی کمائی کا جو آدمی کو لالچی اور خود غرض بنا دیتی ہے۔ اگر وہ پہلے آ جاتے تو شاید ہم سے مل جاتے اور حادثے سے بچ جاتے کیوں کہ موت اور حیات اللہ پاک کے اختیار میں ہے۔ وہ چاہتا تو ان کو ہم سے ملنے کی مہلت دے دیتا۔

آج بھی ان کے خطوط پڑھتی ہوں تو رو رو کر پاگل ہو جاتی ہوں۔ ان خطوط میں انہوں نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ یہ میں سنگ دل تھی کہ ان کی کمائی کے لالچ میں ان کی محبت کے ان بولوں کی وقت پر قدر نہ کر سکی لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ گزرا ہوا وقت واپس نہیں آتا اور جانے والا اس دنیا سے چلا جاتا ہے تو وہ پھر لوٹ کر آتا نہیں۔

کاش میں دنیاوی دولت اور عیش و آرام کے لالچ میں خود غرض نہ بنی ہوتی اور اپنے پیارے شوہر کی محبت کی قدر کرتی۔ محبت کا جواب محبت سے دیتی تو آج مجھے اپنے شوہر اور بچوں کو ان کے پیارے باپ کی رفاقت ملی ہوتی جدائی اور محرومی کا صدمہ برداشت نہ کرنا پڑتا۔ میں صرف ایک بات سب کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں کہ خدارا! اپنے پیاروں کو پردیس مت بھیجیں۔ اگر بھیجیں تو پلیز میری طرح متاع کے لالچ اور مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے خود سے اتنا دور نہ کر دیں کہ خدا بھی ناراض ہو جائے۔

☆......☆......☆......☆

دسویں سچ بیانی

میں بانجھ ہوں

حمیرا راحت

کراچی سے ایک عورت کے انتقام کی انوکھی کتھا، جسے زمانے نے بانجھ قرار دے کر اس کے لیے زمین تنگ کر دی تھی

بختاور کی کرخت آواز کی گونج سے جیسے چڑیاں بھی سہم کر اپنے گھونسلوں میں بیٹھ گئی تھیں۔

تاجور نے اپنے ماتھے کا پسینا دوپٹے کے پلو سے پونچھا اور تھوڑا سا گھونگٹ نکال کر مری ہوئی چال چلتی بختاور کے سامنے جا کھڑی ہوگئی۔

''جی اماں جی!'' اس کی آواز بہت مدھم تھی۔

''اماں کی بچی! کہاں مرگئی تھی' ایک گھنٹے سے آوازیں دے رہی ہوں۔ حلق خشک ہوگیا میرا، مگر تجھے کیا پروا! تُو' تو مہارانی بنی پھرا کر۔ بڈھی ساس موجود ہے نا چوکیداری کرنے کو گھر کی!'' بختاور نے حسب عادت بہو کے لتے لینے شروع کر دیے۔

تاجور یہ سب کچھ سننے کی عادی ہو چکی تھی۔ شادی کو پانچ سال ہوگئے تھے۔ جب وہ بیاہ کر بختاور کے گھر آئی تھی تو دیکھنے والوں نے کہا تھا کہ بختاور! تیرے گھر تو چاند اتر آیا ہے' سنبھال کر رکھنا اس گلاب کے پھول کو۔''

مگر بختاور کا کڑوا مزاج بھی سبھی کے علم میں تھا۔ چند دن تو وہ تاجور کے ناز اٹھاتی رہی، مگر آخر بہو تو بہو ہوتی ہے۔ جلد ہی اس نے مہربان ساس کا لبادہ اتار پھینکا اور ایسی ظالم و جابر ساس بن گئی کہ تاجور کا گلاب سا روپ کملا کر رہ گیا۔ وہ بختاور کی آواز سن کے ہی کانپ جاتی۔

اس کا شوہر احمد ایک بے حد کم گو اور بزدل سا انسان تھا اور ماں سے بے حد ڈرتا تھا۔ اگر بختاور' تاجور کو لعن طعن کرتی یا اس پر ہاتھ اٹھاتی' تب بھی احمد لاتعلق سا' مٹی کا مادھو بنا ایک طرف بیٹھا رہتا۔ نہ وہ ماں کی طرف داری کرتا' نہ بیوی کی! وہ قطعی غیر جانبدار رہتا تھا۔

اس کا یہی رویہ تاجور کے لیے نہایت اذیت کا باعث تھا۔ ماں کے سامنے بولنے کی ہمت نہ تھی تو کم از کم تنہائی میں تو اس کے زخموں پر مرہم رکھ سکتا تھا۔ اکیلے میں تو اپنی ماں کے رویے کی مذمت کر سکتا تھا۔ ہمدردی کے میٹھے بول پا کر تاجور اپنے سارے دکھ بھول جاتی' شاید ہر عورت کی سرشت یہی ہوتی ہے، مگر تاجور سسکتی رہتی' اپنی چوٹوں کو سہلاتی اور کراہتی رہتی اور احمد کروٹ بدل کر سو جاتا۔

وہ ایک بے حس انسان تھا۔

شادی کے دوسرے سال کے گزرتے ہی بختاور

نے اپنی بہو کے ساتھ گالی گلوچ اور مار پیٹ کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اسے پوتا چاہیے تھا۔ ہر صورت میں' ہر قیمت پر لیکن قدرت ابھی تاجور پر مہربان نہ تھی اور جوں جوں خوشخبری ملنے میں دیر ہو رہی تھی' بختاور کا غصہ اور نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔

''ارے! صورت شکل لے کر چاٹنا ہے کیا؟ ایسی عورت کس کام کی جو خاندان کا وارث جنم نہ دے سکے۔ ہائے ربا! میرا بیٹا بے نام و نشان رہ جائے گا کیا؟''

وہ اکثر بین کرنے والے انداز میں کہتی اور پھر تاجور کو گالیوں اور کوسنوں کا ایک طویل سلسلہ سننے کو ملتا، مگر اس نے کبھی بھی پلٹ کر ساس کو جواب نہیں دیا تھا' خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہتی۔ معمولی معمولی غلطیوں پر بختاور اسے بیدردی سے مارتی اور وہ خاموشی سے پٹتی رہتی۔

پڑوسنیں تاجور سے ہمدردی رکھنے کے باوجود اسے بچانے کی ہمت نہ کر پاتیں کیونکہ بختاور کے غصے اور بدمزاجی سے بھی ڈرتے تھے۔

............☆☆............



جوں جوں وقت گزر رہا تھا' تاجور کے لیے زندگی کٹھن سے کٹھن تر ہوتی جا رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے لیے امید کا ہر روزن بند کر رکھا تھا۔ تازہ ہوا کا جھونکا بھی اس کے نصیب میں نہ تھا۔

اولاد نہ ہو تو قصوروار ہمیشہ عورت ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ شہر میں پڑھے لکھے باشعور افراد کا رویہ بھی عموماً یہی ہوتا ہے کہ وہ عورت کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ نور پور تو پھر ایک گاؤں تھا' ناخواندہ اور سمجھ بوجھ سے عاری، سادہ لوح افراد کی بستی!

شادی کے بعد پانچ سال ''یونہی'' گزر گئے تو عورتیں بختاور کو بہو کے علاج کا مشورہ دینے لگیں۔ چند ایک نے دبی دبی زبان سے دوسری شادی کا مشورہ بھی دینا شروع کر دیا اور یہ مشورہ بختاور کو جی جان سے پسند آیا۔

''ہاں' تو اور کیا۔ میں تو اب اپنے احمد کی دوسری شادی کروں گی۔ میرا تو ایک ہی پتر ہے۔'' بختاور بانگ دہل کہتی اور کام کرتے ہوئے تاجور کے ہاتھ کانپ جاتے۔

وہ بے بسی سے ساس کی طرف دیکھتی اور اپنے آنسو اپنے اندر اتارتی رہتی۔

جب پہلی بار بختاور نے احمد کی دوسری شادی کا ارادہ ظاہر کیا تو تاجور خوب روئی تھی۔

جیسا بھی تھا' احمد اس کا شوہر تھا۔ اسے احمد سے محبت تھی اور اپنی محبت میں تقسیم تو کوئی عورت بھی برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ خواہ وہ گاؤں کی ہو یا پڑھی لکھی شہری عورت!

رات کو جب احمد کام پر سے واپس آیا تو اسے کھانا دیتے وقت تاجور بے حد اُداس تھی، مگر احمد نے حسبِ عادت کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ اپنے آپ میں گم رہنے والا بندہ تھا۔ پھر رات کو احمد کے سونے سے پہلے پہلے تاجور نے موقع دیکھ کر اسے بختاور کے ارادے سے آگاہ کیا۔

''ماسی کہتی ہے کہ اگر اولاد نہ ہوئی تو وہ تیرا دوسرا ویاہ کرائے گی۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''ایک ویاہ کر کے کون سا سکھ چین ملا ہے جو دوسرے کے خواب دیکھوں!'' احمد تلخی سے بولا۔

''کیا! کیا کہہ رہا ہے تُو؟ کیا میں تجھ سے لڑتی جھگڑتی ہوں؟ تیری خدمت نہیں کرتی' تیرے آرام کا خیال نہیں کرتی؟'' تاجور رونا دھونا بھول کر ششدر سی رہ گئی۔

''میرا مطلب تھا' اولاد کا سکھ چین!'' احمد نے ترشی سے کہا اور کروٹ دوسری طرف لے لی۔

''اولاد! کہاں سے لاؤں اولاد؟ اولاد تو مرد کے نصیبوں سے ہوتی ہے۔ سب مجھی کو دوش کیوں دیتے ہیں؟'' تاجور کی آنکھوں میں ایک بار پھر ڈھیر سارے آنسو اتر آئے۔ احمد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے یہ یقین دہانی بھی نہیں کرائی کہ وہ دوسری شادی نہیں کرے گا۔ تاجور کے لیے تسلی کا ایک حرف بھی نہیں تھا احمد کے پاس!

☆☆☆

بختاور کا معمول تھا کہ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی سر پہ برقع ڈال کر پاس پڑوس کی خبر لینے نکل جاتی' صبح کی گئی وہ دوپہر کے کھانے کے وقت ہی لوٹ کر آتی۔ اس دوران میں تاجور گھر کی صفائی کرتی' مرغیوں کے ڈربے' اور کبوتروں کے کابک کی صفائی کرنے میں اسے خاصا وقت لگ جاتا۔ پھر وہ کھانا تیار کرتی۔ دوپہر کا کھانا لینے اکثر جمیل آجاتا تھا جو احمد کے کھیتوں پر ہی کام کرتا تھا اور تاجور گھونگٹ کی آڑ کیے کیے دو آدمیوں کا کھانا اسے تھما دیتی۔ دوپہر کے کام سے نمٹ کر وہ کپڑے دھونے بیٹھ جاتی۔ یوں گھر کے کام کاج کا ایک طویل سلسلہ تھا جس سے رات گئے ہی تاجور کو فراغت ملتی تھی۔

اس روز بختاور کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ وہ سر پہ دوپٹا لپیٹے بستر پہ پڑی تھی۔

تھوڑی دیر میں محلے سے چند عورتیں آگئیں۔ بختاور کی مزاج پرسی کرنے کے لیے اور اسی کے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔

تاجور حسبِ معمول کام میں مصروف تھی۔ کچھ دیر

میں وہ کسی کام سے بختاور کے کمرے کے قریب سے گزری تو اس نے سنا' ماسی زینب خاصی تیز آواز میں کہہ رہی تھی۔

''نی بختو! میں تو صاف کہہ دوں' تیری بہو کے ہاں کبھی اولاد پیدا نہیں ہوگی اور کیا! اولاد ہونے کو ہوتی تو شادی کے پہلے ہی سال ہو جاتی ہے اور یہاں تو پورے پانچ سال گزر گئے۔ تیری بہو تو بانجھ ہے۔ بانجھ عورت کبھی بھی بچہ جنم نہیں دے سکتی۔ کہیں بانجھ عورت بھی ماں بنی ہے۔ میں نے تو اپنی نئی بہو سے کہہ دیا ہے کہ کبھی سویرے سویرے تاجور کی شکل نہ دیکھے کیونکہ بانجھ عورت کی شکل صبح صبح دیکھنا منحوس ہوتا ہے۔'' باقی عورتیں بھی ماسی زینب کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔

تاجور کو چکر سا آ گیا۔ گھبرا کر اس نے دیوار کا سہارا لیا۔

''بانجھ! بانجھ! بانجھ!''

یہ لفظ نہیں' ایک انگارہ تھا جو اچانک دل کی دہلیز پہ سلگ اٹھا تھا۔

یہ لفظ کسی بیاہی عورت کے لیے گالی سے کم نہیں ہوتا۔ تاجور کو یوں لگ رہا تھا جیسے گاؤں کی ساری عورتوں نے مل کر اس کے چہرے پر کالک تھوپ دی ہو۔ وہ مردہ چال چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی اور پلنگ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

''ہائے ربا! تُو کیوں نہیں سن لیتا میری! کیا میں واقعی بانجھ ہوں۔ کیا میرے کان ہمیشہ ایک معصوم بچے کی قلقاریاں سننے کو ترستے رہیں گے؟ میرے بازو ایک ننھے وجود کو تھامنے کے لیے ہمیشہ بے قرار رہیں گے؟ کیا مجھے ''اماں'' کہہ کر پکارنے والا کوئی نہیں ہوگا؟''

ان سوالوں کے جواب دینے والا کون تھا؟ کوئی بھی نہیں۔ یہاں تک کہ اس کے جیون ساتھی کے پاس بھی ان سوالوں کے جواب نہ تھے۔

کافی دیر وہ مجبوری کے عالم میں روتی رہی لیکن آخر کب تک! گھر کا کام تو کرنا ہی تھا۔ جمیل کھانے لینے آنے والا تھا۔

اس روز کے بعد تو جیسے بختاور کے ہاتھ ایک نیا شوشا آ گیا۔ اب تک تو وہ پھر بھی تاجور کی طرف سے پُرامید تھی۔ شاید دیر آمد درست آمد کے تحت ''امید'' کی کوئی صورت نظر آ جائے' شاید ''بہار'' اب بھی راستہ بدل کر ادھر آ نکلے اور اس سنسان گھر کی خاموشی میں کسی ننھے بچے کی چیخ ایک مسرت آمیز شور بن کے پھیل جائے، مگر اب گاؤں کی عورتوں کی باتوں نے اسے یکسر ناامید کر دیا تھا۔ اب وہ تاجور کو برملا 'بانجھ' کہتیں۔

یہ لفظ تاجور کے دل پہ تیر کی طرح لگتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس لفظ کا انتقام کس طرح لے؟ وہ پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ جیسے بانجھ پن کا احساس کسی زہر کی طرح آہستہ آہستہ اس کی رگ رگ میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ کبھی وہ خودکشی کی ترکیب سوچنے لگتی لیکن پھر موت سے بھی خوف آتا اور یہ تو سراسر حرام ہوتی۔ تاجور ایک دن میں ستر بار مرتی اور زندہ ہوتی۔

اس کی ساس کے مظالم میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جتنی دیر بختاور گھر سے باہر رہتی' سکون رہتا تھا لیکن اس کے گھر میں آتے ہی تاجور کا چین و سکون غارت ہو جاتا۔ گالیاں' کوسنے اور مار پیٹ! ذرا ذرا سی غلطیوں پر ایک طوفان کھڑا کر دینا بختاور کا معمول تھا اور شاید یہ اس کی عادت بھی بنتی جا رہی تھی۔ تاجور کو نہ اس کی گالیاں بری لگتیں' نہ ہی اس کی مار پیٹ سے تکلیف پہنچتی۔

بس اذیت پہنچتی تو صرف ایک لفظ 'بانجھ'' سے! وہ اس لفظ کو کسی بھی صورت سننا نہیں چاہتی تھی۔ یہ لفظ کسی خنجر کی طرح اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر جاتا تھا اور وہ اپنے دل کے ٹکڑے سمیٹتے سمیٹتے نڈھال ہونے لگتی تھی۔

............☆☆............

اسی کشمکش میں سات سات گزر گئے۔ سات

طویل، بنجر اور ویران سال!

اس کی کوکھ یونہی سونی کی سونی رہی۔ اس کے نصیب میں شاید کوئی پھول تھا ہی نہیں۔

لیکن ایک دن گویا معجزہ ہوگیا۔

تاجور کام کرتے کرتے اچانک الٹی کرنے آنگن کے کنارے لگے نل کی طرف بھاگی تو گھر میں داخل ہوتی بختاور سانس روکے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ کیا بانجھ زمین پر بھی پھول اُگتے ہیں؟ شاید یونہی بدہضمی ہوگئی ہے۔ کھانی بھی تو بہت ہے۔ پیٹ خراب ہوگیا ہوگا۔ موسم بھی ٹھنڈا ہونے لگا ہے۔ بختاور امید اور ناامیدی کے درمیان کھڑی تھی۔

تاجور نل کے پاس سے اٹھی تو اس کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔ واپس باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

بختاور بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آگئی۔ ''کب سے یہ الٹیاں لگی ہیں تجھے؟'' اس نے غور سے بہو کا چہرہ دیکھا۔

''یہی کوئی دس بارہ دن سے۔'' تاجور کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

''لو بھلا! اتنے دن گزر گئے اور تو نے مجھے خبر بھی نہ ہونے دی۔ ہاں، تو میں بھلا ہوتی کون ہوں تیری! مجھے کچھ سمجھتی تو بتاتی۔'' بختاور ناراضگی سے بولی۔ ''اور وزن نہ اٹھالینا کوئی، احتیاط کرنا، دیکھ بھال کر چلنا اور یہ کام وام چھوڑ کر چارپائی پر بیٹھ جا! میں ذرا رحمت دائی کو بلالاؤں۔ اللہ کرے کہ وہ مجھے کوئی ''خوشخبری'' ہی سنائے۔'' مارے خوشی کے بختاور کے قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

پہلے اس نے سوچا کہ پڑوس کے بچے سے دائی رحمت کو بلوائے مگر پھر وہ خود ہی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہی دائی رحمت ہانپتی کانپتی آ گئی۔ خود دائی بھی بختاور کی طرح بے حد خوش تھی۔ اس نے کمرے میں لے جا کر تاجور کو دیکھا اور پھر باہر آ کر مسرت بھری آواز میں اطلاع دی۔

''ڈھیروں مبارکاں بختاورے! تیرے گھر پوتا آنے والا ہے۔''

''اچھا! ہائے میرے سوہنے ربا!'' بختاور فوراً ہی سجدے میں گر گئی۔

''جوڑا لوں گی اور چاندی کے کڑے بھی!'' ماسی رحمت ہنس کر بولی۔

''ارے! فکر نہ کر، سب کچھ دوں گی جو تُو مانگے گی، بس اللہ تعالیٰ میری مراد پوری کرے۔ میرے آنگن کا سناٹا تو ٹوٹے۔ میرے کان تو کب سے ایک بچے کے رونے کی آواز سننے کے لیے ترس رہے ہیں۔''

بختاور نے دائی کے ہاتھ میں پچاس روپے کا نوٹ پکڑایا تو وہ دعائیں دیتی ہوئی واپس چلی گئی۔

رحمت دائی کے جانے کے بعد بختاور کمرے میں آئی تو تاجور ساکت لیٹی چھت کی کڑیوں کو تک رہی تھی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا اور آنکھیں خالی خالی! غیر متوقع طور پر اتنے عرصے بعد اس ''خوشخبری'' پر اسے جتنا خوش ہونا چاہیے تھا، وہ اتنی خوش نہیں تھی بلکہ وہ تو شاید خوش ہی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر بیزاری تھی اور آنکھوں میں تفکر!

بختاور نے اس کیفیت کو اس کا جی خراب ہونے پر محمول کیا اور اسے لیٹے رہنے کا کہہ کر خود باورچی خانے میں چلی گئی، پھر بختاور نے تاجور کو پلنگ سے اٹھنے نہ دیا۔ سارا دن کام میں وہ خود لگی رہی۔

رات کو وہ بہت تھک گئی تھی۔ کام کرنے کی عادت تو اب چھوٹ ہی گئی تھی۔ جب سے تاجور بیاہ کر آئی تھی، اس نے سارا گھر سنبھال لیا تھا اور بختاور اپنی جگہ سے ہل کر پانی بھی نہ پیتی تھی۔

لیکن آج کام کرنا پڑا تو اس کام نے اسے اس قدر تھکا دیا کہ پوری رات وہ بے ہوشی کی نیند سوئی اور صبح بھی خاصی دیر سے جاگی۔

☆☆

باورچی خانے میں آج بالکل سناٹا تھا۔ نہ تاجور کی مخصوص آہٹیں تھیں اور نہ ہی اس کی چوڑیوں کی مترنم جھنکار، نہ ہی برتن کھڑکنے کی آوازیں آرہی

تھیں۔ پورے گھر نے ایک پراسرار خاموشی کا لبادہ اُوڑھ رکھا تھا۔ بختاور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

باورچی خانے میں جا کر اس نے چولہا جلایا اور اپنے لیے تھوڑی سی چائے بنائی۔ وہ ہمیشہ لسی کے بجائے چائے اور باسی روٹی کے ساتھ ناشتا کیا کرتی تھی۔

احمد بھی نہیں تھا اور تاجور بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ پہلے بختاور نے سوچا کہ شاید وہ فارغ ہونے کھیتوں کی طرف گئی ہو، مگر کافی دیر گزر گئی تو اس کا خیال غلط ثابت ہوگیا۔

دھوپ کافی چڑھ گئی تھی۔ بختاور نے اندازہ لگایا کہ ضرور گیارہ بجے کا وقت ہوگیا۔ یہ تاجور کہاں چلی گئی؟ اسے تشویش ہونے لگی۔

جیسے تیسے اس نے کھانا پکایا اور جمیل کا انتظار کر رہی تھی کہ اچانک احمد گھر میں داخل ہوا۔ بختاور تیر کی طرح اس کے قریب پہنچی۔ ''احمد! تاجور گھر میں نہیں ہے۔''

اس نے اپنے تئیں بیٹے کو نہایت اہم اطلاع دی۔

''ہاں، اسے تو میں صبح چھوڑنے گیا تھا اس کے گاؤں۔ ابھی وہیں سے آ رہا ہوں۔'' احمد تھکے تھکے انداز میں بولا۔

''اچھا تو میکے گئی ہے لیکن ایسے اچانک بنا کچھ کہے سنے، چلو کوئی بات نہیں۔ بہت دنوں سے نہیں گئی تھی۔ ذرا دل بھی بہل جائے گا اور آرام بھی مل جائے گا۔'' اس نے اپنے آپ کو تسلی دی اور جا کر کھانا نکالنے لگی۔

احمد ہاتھ، منہ دھو کر، پیڑھی گھسیٹ کے بیٹھ گیا تھا۔

بختاور نے ایک تھالی میں روٹی اور پلیٹ میں سرسوں کا ساگ نکال کر اس کے آگے رکھ دیا اور وہ سر جھکا کر کھانا کھانے لگا۔

بختاور نے غور سے احمد کے چہرے کی طرف دیکھا۔ گھر میں کئی سال بعد ایک 'خوشخبری' کی بازگشت گونجی تھی، مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ نہ تو اس خبر نے بہو کے چہرے پہ پھول کھلائے تھے اور نہ ہی بیٹے کے! بلکہ احمد تو پہلے سے بھی زیادہ اداس اور اجڑا

کہاں ہے تُو

دردکے صحرا میں
کسی روز آ کے دیکھ
آنکھوں سے نکلتے آنسو
دِل کے مچلتے ارماں
تیرا ہی نام پکاریں
اور تُو
کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو کر
دوسرے شہر جا بسا

ناصر سلیم۔خانیوال

ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے کھانا بھی کم ہی کھایا اور ہاتھ کھینچ لیا۔

''اچھا اماں! کھیتوں پہ جا رہا ہوں میں۔'' وہ ماں کی طرف دیکھے بغیر بولا اور تیز تیز چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

............☆☆............

کئی دن بیت گئے۔

تاجور ایسی گئی کہ پلٹ کر نہ آئی۔ اس سے پہلے وہ جب بھی میکے گئی، دو چار روز سے زیادہ نہیں رکتی تھی لیکن اس بار تو پورے پندرہ روز گزر گئے اور وہ نہ آئی تو بختاور کو تشویش ہونے لگی۔

پڑوسنیں آ آ کر کر اسے مبارک باد دے چکی تھیں اور سب کی سب بے چینی کے ساتھ تاجور سے ملنے اور اسے مبارک باد دینے کی منتظر تھیں، مگر تاجور تو آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

بختاور روز احمد سے کہتی کہ بہو کو واپس لے آ، مگر تاجور کا نام سنتے ہی احمد کا چہرہ پھیکا پڑ جاتا اور وہ سر جھکا کر باہر نکل جاتا۔

''کہیں دونوں کی لڑائی تو نہیں ہوگئی؟ ہوسکتا ہے ایسے ہی ہو ورنہ احمد جا کر اسے لے آتا۔ میں خود منا کر لے آؤں گی اسے۔ اس حالت میں اسے ناراض

کرنے کی کیا تک تھی بھلا! بختاور کو احمد پر غصہ آ گیا۔

............☆☆............

اگلے روز وہ صبح جلدی اٹھ گئی۔ جلدی جلدی گھر کا کام نمٹایا اور پھر دوپہر کو وہ تاجور کو لینے کے لیے اس کے گاؤں جانے والی بس میں بیٹھ گئی۔ اپنے پروگرام کی اطلاع اس نے احمد کو بھی نہ دی تھی۔

بختاور جب تاجور کے گاؤں پہنچی تو شام ڈھل رہی تھی۔ گاؤں کے کچے پکے مکان مٹیالی سی چادر اوڑھے کھڑے تھے۔ تاجور کے گھر میں ایک پراسرار سی خاموشی اور بے نام اداسی نے آگے بڑھ کر بختاور کا استقبال کیا۔

تاجور کی ماں سے علیک سلیک کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ تاجور کے پاس آ بیٹھی۔

وہ ایک تخت پہ بے حد خاموش اور گم صم بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ بے اثر تھا اور آنکھیں کھوئی کھوئی! سر کے اشارے سے بختاور کو سلام کر کے وہ پھر اپنے آپ میں گم ہو گئی۔ بختاور کو اس کے سرد رویے کے باوجود اس پہ بڑا پیار آ رہا تھا کیونکہ اس نے بختاور کے گھر کے وارث کو جنم جو دینا تھا۔

''بیٹی! کب چلے گی گھر؟ میرا تو آنگن سونا پڑا ہے تیرے بغیر۔ سچ اب تو مجھ سے ایک دن بھی نہ کاٹا جائے تیرے بنا۔ تو واپس چل۔ بے شک تو چارپائی پہ بیٹھ کر کھانا۔ میں سارا کام کروں گی۔ خدمت کروں گی اپنی بہو کی! احمد بھی بہت اداس اداس سا رہتا ہے تیرے بغیر! میں اسے بتا کر نہیں آئی' سوچا کہ اچانک تجھے دیکھے گا تو کھل اٹھے گا۔'' بختاور بہت نرم اور محبت بھرے لہجے میں بول رہی تھی۔

تاجور نے خالی خالی نگاہوں سے بختاور کی طرف دیکھا پھر سر جھکا لیا۔ چند لمحے خاموشی کا ایک دبیز پردہ ان دونوں کے درمیان تنا رہا پھر تاجور بے تاثر لہجے میں بولی۔

''ماں جی! اب میرا تیرے آنگن سے کوئی ناتا نہیں رہا۔ میں سارے رشتے توڑ کر آئی ہوں۔''

''کیا؟'' بختاور گنگ سی رہ گئی۔ تاجور اس کی طرف دیکھے بغیر زہریلے لہجے میں بولی۔

''تجھے یاد ہوگا' ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ تو مجھے 'بانجھ' کہا کرتی تھی اور گاؤں کی عورتوں کا خیال تھا کہ صبح سویرے میرا منہ دیکھنا منحوس ہوگا اور تُو مجھے اٹھتے بیٹھتے بانجھ ہونے کا طعنہ دیا کرتی تھی۔ یہ لفظ 'بانجھ' کسی انگارے کی طرح ہر گھڑی میرے دل پہ دھرا رہتا تھا اور مجھے ہر صورت اس انگارے پہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ڈالنے تھے۔ مجھے اس داغ کو اپنے ماتھے سے مٹانا تھا۔ عورت جب کرنے پہ آئے تو سب کچھ کر گزرتی ہے۔ میں نے بھی یہ ثابت کرنے کے لیے بانجھ میں ہوں یا تیرا بیٹا احمد۔ وہ سب کچھ کیا۔ اور اب جب یہ بات کھل چکی ہے کہ سات برس میں نے ایک بانجھ مرد کے ساتھ گزارے، میرا اس مرد اور اس کے آنگن سے ہر رشتہ، ہر تعلق ختم ہو گیا ہے۔''

''یہ تو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے تاجور؟ احمد تیرے ہونے والے بچے کا باپ ہے۔ نہ تُو بانجھ ہے نہ میرا بیٹا!'' بختاور تڑپ کر بولی۔

''اس سے بڑا جھوٹ کوئی اور نہیں ہے۔'' تاجور سرد آواز میں بولی۔ ''فیصلہ میں نے پہلے ہی دن احمد کو سنا دیا تھا۔ تبھی وہ مجھے تین طلاقیں دے کر یہاں چھوڑ گیا ہے۔''

ایک لمحے کے لیے بختاور کی جیسے سانس رک گئی۔

تاجور پتھریلے لہجے میں بولتی رہی۔ ''اور ٹھیک چار مہینے بعد جمیل سے میرا نکاح ہو جائے گا، جو میرے ہونے والے بچے کا باپ بھی ہے اور اس نے مجھے یہ تاج بھی پہنایا ہے کہ میں بھی جنم دے سکتی ہوں۔ میں...... بانجھ نہیں ہوں۔''

بختاور کے ہوش و حواس پر ایسی بجلی گری تھی کہ نہ وہ بول سکتی تھی اور نہ سن سکتی تھی۔ بس صرف دیکھ سکتی تھی...... اور اپنی پتھرائی ہوئی پھٹی پھٹی آنکھوں سے تاجور کو دیکھے جا رہی تھی جو اس کی زبان سے نکلے ایک لفظ کا ''انتقام'' لینے کے لیے کس قدر آگے بڑھ گئی تھی۔

☆☆......☆☆

گیارہویں سچ بیانی

بہت دیر کر دی

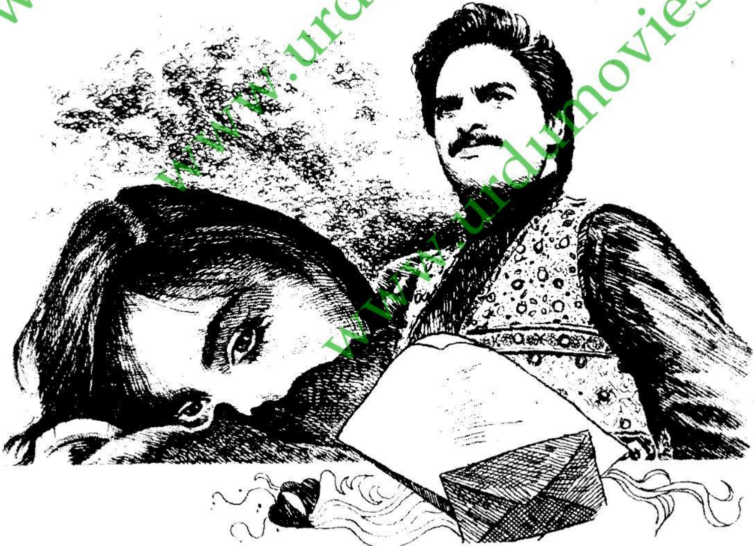
بازنایاب

منچن آباد سے، دنیاوی خوشیوں کی چمک میں اپنی
عاقبت کو اندھیرا کر دینے والے نوجوان کی کتھا

آخر بھاگتی ہوئی زندگی سے فرصت نکال کر میں پاکستان پہنچ ہی گیا۔ لاہور ائیر پورٹ پر قدم رکھتے پاکستان کی مہکتی ہوئی خوشبو کو اچھی طرح اپنی سانسوں میں جذب کیا۔

میرے عزیز تو گنے چنے سے ہی تھے۔ اماں اور ابا کے بعد ایک دور کی خالہ تھی۔ ائیر پورٹ سے باہر نکل کر ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا اور ڈرائیور میرا اشارہ دیکھ کر ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر آ گیا۔ "جناب کہاں جا میں گئے آپ۔" ڈرائیور نے پوچھا؟

میں نے اُسے اپنے گاؤں کا نام بتایا اور کہا کہ وہاں تک جانے کے کتنے پیسے لو گئے؟ جناب آپ جو مناسب ہوں وہ دے دینا۔" اُس نے جواب دیا میں چپ چاپ ٹیکسی میں



بیٹھ گیا اور ٹیکسی چل پڑی۔

''کب سے ٹیکسی چلا رہے ہو۔'' میرے سوال پر ڈرائیور نے پھیکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔'' جناب جب سے بڑا ہوا ہوں، یہی کام کر رہا ہوں۔ پہلے میرا والد کرتا تھا جب وہ بوڑھا ہو گیا تو اب یہ کام میں کر رہا ہوں ۔'' ڈرائیور شکل سے کافی مہذب نظر آ رہا تھا۔ شاید کچھ پڑھا ہوا بھی تھا اُس کی آنکھوں میں معاشی تنگدستی واضح نظر آ رہی تھی۔ میرا ذہن بے اختیار ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا۔

۔زندگی کہاں لے جاتی ہے کچھ پتا نہیں چلتا۔ میرا گاؤں ہی میری کل دنیا ہوا کرتا تھا۔ میری شرارتوں نے گاؤں والوں کی ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ روز ہی کوئی نا کوئی میری شکایت لے کر ابا کے پاس پہنچ جاتا تھا اور کہتا تھا۔'' سمجھا لو اپنے لاڈلے بشیرے کو۔'' اور میرا ابا اُن سے کہتا تھا۔' تو گھبرا نہ۔ میں ابھی اُسے ٹھیک کرتا ہوں اور پھر مجھے ڈھونڈ کر گھر لے جاتے تھے اور پیار سے کہتے تھے پتر بس کر اب تو بڑا ہو گیا ہے۔'' اور شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے تھے اور اُن کے ہاتھ کا لمس اپنے سر پر محسوس کر کے میں بہت خوش ہوتا تھا اور سوچتا تھا کہ گاؤں میں واحد لڑکا تھا میں جس کے ابا نے کبھی نہیں مارا تھا۔ ویسے بھی میں اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا اکلوتا بیٹا تھا۔ گاؤں میں ابا کی جو زمین تھی وہ اچھی خاصی زرخیز تھی اور فصل خوب ہوتی تھی۔ ابا کو مجھے پڑھانے کا خوب شوق تھا مجھے گاؤں کے اکلوتے مدرسے سے آٹھ جماعتیں کروانے کے بعد شہر میں خالہ کے پاس مزید پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔

پھر شہر میں میٹرک کے بعد کالج میں داخلہ لے لیا میرے لیے شہر کی دنیا بڑی عجیب تھی بڑی بڑی سڑکیں اور سڑکوں پر دوڑتی چم چماتی گاڑیاں مجھے بڑی اچھی لگتی تھی۔ ایک دفعہ میرے ایک کلاس فیلو سے ملنے اُس کا ایک دوست آیا وہ بڑی شاندار گاڑی پر آیا تھا۔ میرے دوست نے بتایا کہ دیکھو اس کا باہر کا ویزا لگ گیا ہے۔ اب اس کے وارے نیارے ہیں۔ تب مجھے پتا چل گیا جو لوگ باہر ولیت چلے جاتے ہیں۔ وہ خوب پیسے کماتے ہیں اور شاہانہ زندگی گزارتے ہیں۔ پھر میں نے بھی سوچ لیا کہ چاہے جو کچھ مرضی ہو جائے میں باہر ولیت ضرور جاؤں گا۔

کالج سے تعلیم مکمل ہونے پر میں گاؤں واپس آ گیا اور آتے ہی اماں ابا سے ضد کرنے لگا مجھے باہر ولیت بھیجو اور وہ میرا یہ مطالبہ سن کر بڑے پریشان ہو گئے اور ابا نے سمجھایا کہ پتر تجھے پتا ہے ہم تیرے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتے۔ پھر تو کیوں ضد کر رہا ہے۔ تیری ماں نے تو بڑے مشکل دن گزارے ہیں جب سے تو شہر گیا ہے اور اب تو باہر جانے کی بات کر رہا ہے تجھے کس چیز کی کمی ہے۔ تیری اپنی زمین ہے۔ اُسے سنبھال اور تجھے کیا چاہیے۔ مگر میری آنکھوں میں جو باہر جانے کا نشہ چڑھا ہوا تھا وہ نہیں اترا شروع سے ہی ضدی تھا اپنی ہر بات منوانے والا آخر میری گھر سے چلا جانے کی دھمکی سن کر میرے ابا نے میرے آگے ہتھیار ڈال دیے اور آدھی زمین بیچ کر مجھے ولیت بھیج ہی دیا۔ گھر سے جاتے ہوئے اماں کے آنسو ہی نہیں رکتے تھے بار بار کہتی تھی۔ ''پتر جلدی واپس آ جانا اور وہاں سے فون کرتے رہنا۔'' میں نے اماں کو کہا ہاں اور تیاری رکھنا میں جلدی آؤں گا پھر تجھے اور ابا کو ساتھ لے جاؤں گا مگر ابا نے مجھے کہا۔

''پتر ہمارا مرنا جینا اسی وطن میں ہے تو ولیت دیکھ کر آ جا مگر ہمیں لے جانے کی بات نہ کر یہ زمین کی خوشبو ہی ہماری زندگی کی کل جمع پونجی ہے اور پھر کہا اپنا خیال رکھنا اور یاد رکھنا تیرا سب کچھ بھی تیرے اپنے وطن میں ہے۔ پھر پورے گاؤں والوں سے مل کر میں ولیت روانہ ہو گیا۔

ولیت جا کر تو میری زندگی ہی بدل گئی شروع شروع میں ابا اور اماں کو فون کرتا رہا مگر پھر وہاں کی تیز اور چمکیلی روشنیوں میں ایسا ڈوبا اور اندھی خواہشوں کی دلدل میں ایسا دھنسا کہ کچھ یاد نہیں رہا کہ میں پاکستان میں بھی رہتا تھا کبھی۔ میرے اماں ابا بھی ہوتے تھے پھر تانیہ بہرام سے شادی کر کے وہیں اپنے ڈیرے جما لیے۔

جب کافی عرصے بعد ابا کو فون کیا تو ابا نے کہا پتر لگتا ہے تو ہمیں بھول گیا ہے اتنے عرصے بعد تجھے ہماری یاد آئی ہے۔ اب تجھے خدا کا واسطہ، واپس آ جا۔ تیری اماں تو تجھے یاد کر کر کے بیمار ہو گئی ہے اب مزید انتظار کی سکت باقی نہیں رہی اور زندگی میں پہلی بار میں نے ابا کو فون پر روتے ہوئے سنا اور پھر اماں سے بات کرتے تو اماں سے بات ہی نہیں ہو رہی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر بس روئے جا رہی تھی۔ میں نے واپس آنے کا دلاسہ دیا اور فون بند کر دیا اب میں انھیں کیا بتاتا کہ میری زندگی کے لوازمات میری بیوی اور بچے ہیں۔

پھر ایک عرصہ بیت گیا میں نے فون پر ہی خبر نہ لی۔ پاکستان آنے سے پہلے تانیہ نے کہا تھا کہ کیا ضرورت ہے پاکستان جانے کی بچے آپ کے بغیر اُداس ہو جائیں گے مگر جب میں نے یہ کہا کہ تانیہ میں بھی تو کسی کا بچہ ہوں۔ جو ابھی تک میری راہ تک رہے ہیں۔ پھر وہ خاموش ہو گئی۔

''جناب! آپ کا گاؤں آ گیا ہے ڈرائیور کی آواز جب میری سماعت سے ٹکرائی تو میں ماضی کے خیالوں اور سوچوں کے طوفان سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں پہنچ گیا۔

گاؤں ویسے کا ویسا ہی تھا۔ دھول مٹی اُڑاتی ٹیکسی ہرے بھرے کھیتوں کے قریب سے گزر رہی تھی جس میں میرا بچپن مسکرا رہا تھا اور میرا لڑکپن اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔

زندگی کیسے اتنی تیزی سے کروٹ بدلتی ہے کچھ پتا نہیں چلتا۔ مدرسے میں بچے پڑھ رہے تھے اور ماسٹر غلام رسول ہمیشہ کی طرح حقہ پیتے ہوئے بچوں کو اُونچی اُونچی آواز میں پڑھنے کو کہہ رہا تھا۔ جب کہ شہتوت کی چھڑی اُس کے پاس پڑی تھی جس سے وہ ضدی بچوں کو ٹھیک کرتا تھا۔ اب ماسٹر کا چہرہ بھی کافی عمر رسیدہ لگ رہا تھا۔ بچے اپنا سبق بھول کر ٹیکسی کو دیکھنے لگ گئے۔ میرا دل کیا ماسٹر سے سلام دعا کر لوں پھر سوچا اماں ابا سے ملنے کے بعد ہی ملوں گا۔

دیتو اپنی فصل کے پاس کھڑا مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید میری ولیت کی رنگت سے اُسے مجھے پہچاننے میں دشواری ہو رہی تھی۔ دیتو کی فصل پر میں خوب ہلا گلا کرتا تھا بیچارے کی گنے کی فصل میرا ہمیشہ شکار رہتی تھی۔ اُس منظر کو یاد کر کے بے ساختہ میرے لبوں پر ہلکی سی مسکان آ گئی۔

''اس پہلی گلی میں موڑ لو۔'' میں نے ڈرائیور کو کہا۔ اب ٹیکسی گاؤں کی گلیوں میں داخل ہو چکی تھی۔ گلیوں میں کھیلتے ہوئے بچے ٹیکسی کے پیچھے بھاگنا شروع ہو گئے۔

''ادھر روک لو۔'' ایک کچے سے مکان کی طرف اشارہ کر کے میں نے ڈرائیور کو بتایا۔ ٹیکسی سے نکل کر میں باہر آیا اور یادوں کے خوبصورت ادوار میرے دلوں و دماغ کو معطر کرنے لگے۔ کچے پکے مکانات میرے گھر کے قریب اپنی جواں اُمیدوں کے ساتھ ویسے کے ویسے ہی موجود تھے کچھ تبدیلی نہیں تھی۔ گھر کے دروازے پر پہنچا تو دروازے پر لگا ہوا تالا دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ چاچا پھتو نے مجھے دیکھ لیا تھا جس کی (ہٹی) دکان ہماری گلی میں موجود تھی۔

''اوئے بشیرے تو کب آیا'' چاچا پھتو نے مجھے پہچان لیا تھا۔ تو نے بڑی دیر کر دی۔ اب کیا لینے آیا ہے یہاں۔'' چاچا پھتو نے بڑے زخمی لہجے سے مجھے کہا۔ میں نے چاچا پھتو کے سوال کو نظر انداز کر کے کہا۔ چاچا یہ میرے گھر تالا کیوں لگا ہوا ہے۔ اماں ابا کہاں گئے۔''

''اماں ابا تیری راہ تکتے تکتے زندگی کی بازی ہار گئے بشیرے۔'' چاچا پھتو کی بات سن کر میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ اذیتوں کا طوفان میری آنکھوں میں اُمڈ آیا۔ میں ساکت کھڑا کسی مجرم کی طرح یہ دل ہلا دینے والی خبر سن رہا تھا۔ ''تیرا کوئی اتا پتا ہی نہیں تھا کہ تجھے خبر دیتے تیرے ابا کے مرنے کے بعد تیری اماں حوصلہ ہار بیٹھی اور انتظار لے کر اس دنیا سے چلی گئی۔ جاتے ہوئے تجھے یہ پیغام دے گئی کہ جب میرا پتر بشیر آئے تو اُسے میری قبر پر ضرور آنے کا کہنا۔'' چاچا پھتو بتاتا جا رہا تھا اور غم اور سسکیاں میرے وجود کو چھلنی کر رہی تھی۔ ندامت کے شرمناک آنسو میری آنکھوں سے جاری تھے۔ مجھے اپنے وجود سے گھن آ رہی تھی ممتا کے انتظار کو، محبت اور پیار کی مٹھاس کو میں نے کھو دیا۔ باپ کی شفقت کا لمس اپنی زندگی کی مستیوں میں پامال کر دیا۔ میں بوجھل قدموں سے چاچا پھتو کے ساتھ قبرستان چل پڑا اور اماں اور ابا کی قبر پر خوب دھاڑیں مار مار کر رویا۔ زندگی بھر اماں اور ابا نے مجھے خوشیاں ہی خوشیاں دی تھیں اور میں نے اُن کو بے حسی اور سفاکی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ آنکھوں سے نکلنے والے زار و قطار آنسو بھی میرے دامن پر لگے بے رحمی کے داغدار دھبوں کو بھی دھو نہیں سکیں گے۔ پورا دن اماں اور ابا کی قبر پر گزارنے کے بعد اپنی یادوں کے گھر واپس آیا اور پھر سامنے والی ماسی جیراں سے اپنے گھر کی چابی لے کر گھر داخل ہوا۔ تین کمروں پر مشتمل گھر کتنا پیار بھرا تھا جس میں اماں اور ابا کی پیار بھری آوازیں گونجتی تھیں اور اب وہاں سوائے میری بکھری ہوئی یادوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آہ کس طرح گزارے ہوں گے میرے انتظار کے دن میری اماں، ابا نے۔'' یہ احساس اب جاگا جب میں نے اپنی زندگی کی بہاروں کو کھو دیا۔ اور اب غم اور دکھ کے موسم ہمیشہ میری زندگی میں رہیں گے اور رہنے بھی چاہیے۔ آہ، ضمیر کی آواز نے جاگتے جاگتے بہت دیر کر دی، آہ! ضمیر کی آواز نے جاگتے جاگتے بہت دیر کر دی۔

☆......☆......☆......☆

بارہویں سچ بیانی

میری دلہن تم ہو!

اسماء اعوان

اپنوں کے ستم کا شکار اُس دوشیزہ کی کتھا، جسے دعاؤں نے اپنے حصار میں لے لیا تھا

رات کے کوئی ایک بجے کا عمل ہوگا' اس نے ایشل کے کمرے میں بلب جلتا دیکھا تو دبے پاؤں اس طرف آ گیا۔ دروازہ ہلکے سے ناک کیا تو از خود کھلتا چلا گیا۔ وہ کمرے میں آیا۔ وہ اب اسکول کی دہلیز عبور کر کے کالج میں جانے والی تھی لیکن اب تک بے ترتیبی اور لاپرواہی/ لاپروائی اس کی طبیعت میں موجود تھا۔

وہ بچوں کی طرح بے ترتیب آڑھی ترچھی خوابِ خرگوش میں محو تھی۔ اس نے ایک ہلکی سی دھپ اس کے سر پر لگائی اور مسکراتے ہوئے بلینکٹ اس پر ڈال دیا اور بلب آف کر کے نائٹ بلب آن کر دیا اور جس طرح آیا تھا' اسی طرح دبے پاؤں واپس اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔

نیند کی ٹیبلیٹ معمول کی طرح نگل کر بیڈ سے سر کے پیچھے دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر پشت ٹکالی۔

سارے دن کے واقعات یکے بعد دیگرے ذہن کی اسکرین پر چلنے لگے۔

اس نے سر جھٹکا اور سائیڈ ٹیبل سے ایک رسالہ نکال کر ورق گردانی کرنے لگا۔ اچانک ایک شعر پڑھتے ہوئے اس کی چلتی سانسیں تھم سی گئیں پھر بار بار اس نے وہ شعر پڑھا۔

وہی جو درمیاں آباد تھی خواب اور حقیقت کے
وہ دنیا ہوگئی زیروزبر آہستہ آہستہ

اس کی آنکھیں نم ہو کر ماضی کی کھڑکی کھول چکی تھیں۔

.....•.....•.....•.....

مشعل نہ میرے اسکول یا کالج کی کوئی فرینڈ تھی اور نہ ہی میرے آفس کی کولیگ' وہ میرے تایا کی بیٹی تھی۔ تائی کی گود خدا نے بڑی دیر بعد بھری تھی۔ اپنی عمر کے چار سال میں نے اپنی ماں کے کم' تائی کی گود میں زیادہ گزارے تھے۔

تائی سے محبت فطری بات تھی۔ تایا کا بھی میں لاڈلہ تھا مگر ابا کو تایا سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے تایا کو بھلی بری سناتے رہتے۔

اماں اُن کے برعکس تھیں اسی لیے میرے باپ کے سینے میں بھائی کے لیے نفرت کی آگ ماں کی اُن لوگوں سے محبت کی وجہ سے ٹھنڈی ہی رہتی۔

وقت گزرتا رہا لیکن میں اس نفرت کی وجہ نہ سمجھ سکا۔

مشعل کی پیدائش نے تایا تائی کی ویران زندگی میں جان ڈال دی تھی۔ مجھ سے بھی اُن کی محبت کم نہ ہوئی تھی لیکن اب محبت کا بٹوارہ ہو گیا تھا۔

میں اسکول جانے لگا تو میں نے زیادہ محسوس نہ کیا پھر

جب میں چہارم کلاس میں آیا تو مشعل بھی اسکول جانے لگی۔
ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھتے چلے گئے۔ معلوم نہیں کب محبت کا پودا پروان چڑھ گیا تھا' پتا ہی نہ چلا۔
میں کالج پہنچ گیا پھر یونیورسٹی جبکہ مشعل نے صرف انٹر کیا اور گھر بیٹھ گئی۔
میرے بغیر وہ اپنے اندر ہمت نہ پیدا کر سکی تھی۔ اس عرصے میں میرا اکلوتا پن برقرار رہا جبکہ تائی کے ہاں مشعل کے دس سال بعد ایشل بھی دنیا میں آ گئی تھی۔
اب مشعل کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ تائی اور امی کے ساتھ مل کر ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی۔
تایا ابا اب بڑے فکر مند نظر آتے تھے۔ دو دو بیٹیوں کی فکر نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی جبکہ میرے بابا کا ہر چڑھتے دن کے ساتھ سینہ پھولتا جا رہا تھا جس میں تکبر کے پہاڑ بھرے محسوس ہوتے تھے اور پھر چلتے وقت نے میری زندگی پر ایک تازیانہ لگا دیا اور ابا جی نے ایک بہت بڑے گھرانے میں میرا رشتہ میری مرضی پوچھے بغیر طے کر دیا۔ جب انہوں نے مجھے اطلاع دی' میرا خون کھول گیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے زبان کھول دی۔
''ابا جی......! یہ میری زندگی کا فیصلہ ہے' آپ نے میری مرضی معلوم کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی' یہ آپ کی زیادتی ہے۔'' میں غصے میں کہہ رہا تھا۔
''او پتر......! تو ایویں ای تک نہ چھلا' غور سے سن میری بات' یہ دنیا صرف پیسے کو سلام کرتی ہے۔ میں نے جہاں تیری بات پکی کی ہے' وہ کروڑ پتی لوگ ہیں' تیری زندگی بن جائے گی' موج کرے گا تو پوری زندگی۔'' وہ شان سے کہہ رہے تھے۔
''نہیں ابا......! میں نے زندگی لالچ کی سیڑھی چڑھ کر شروع نہیں کرنا۔ آپ اگر مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں تو فوراً جو بات آپ نے طے کی ہے' اسے ختم کر دیں۔'' میں



نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
''کیا میں نے تجھے اس دن کے لیے تعلیم دلائی تھی کہ تو میرا مان، میری پگ زمین پہ روندے؟ باپ کی کوئی پروا نہیں اسے؟'' وہ گرج کر بولے۔
''باپ کی پروا ہے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ کل قاضی کے سامنے میں ناں کر دوں تو جو تماشہ اس وقت بنے گا، بہتر ہے، چہار دیواری کے اندر ہی معاملہ رفع دفعہ ہو جائے۔'' مجھے غصہ شدید آ رہا تھا کہ میرے باپ نے گھر کے اندر اپنے بھائی کی اولاد کی طرف کیوں نہیں دیکھا؟ کیوں اتنی اونچی اڑان اڑان چاہی تھی جبکہ اللہ کا دیا سب کچھ ہمارے پاس تھا؟ میرے باپ کے پاس کچھ کمی نہیں تھی، کمی تھی تو اپنے بھائی کے لیے محبت کی اور یہ نفرت ہی تو تھی جس نے اپنے بھائی کی طرف بیٹے کے لیے نظرِ کرم نہ کیا تھا۔ اس کی بیٹی نظر نہ آئی تھی۔ گھر کے اندر اپنی اولاد کے سر پر چادر نہ ڈالی تھی اور اسی سوچ نے مجھے باپ کے آگے دو بدو بات کرنے پر اکسایا تھا۔
''اچھا تو پھر تُو بتا، تیری کہاں مرضی ہے؟'' ابا جی نرم پڑے تھے شاید۔
''آپ کو گھر کے اندر دکھائی نہیں دیتا کیا؟ کیا باہر جا کر بہو ڈھونڈنے کی ضرورت ہے آپ کو؟'' جانے کس طرح دل کی بات زبان پر آ گئی تھی۔
''اچھا تو یہ بات ہے، ٹھیک ہے، جیسے تیری مرضی۔'' وہ کس انداز میں کہہ گئے، میں واقعی ان کا لہجہ سمجھ نہیں پایا تھا۔

....

میری مشعل سے نسبت طے پا گئی تھی۔ ہم دونوں چپکے چپکے خواب بُننے لگے۔
''خوابوں کی عمر ہی کتنی ہوتی ہے، آنکھ کھلی اور ختم......'' مشعل اکثر میرے مستقبل کے منصوبے سن کر کہتی۔
''پگلی، خواب دیکھتے ہیں تو تعبیر ملتی ہے نا، ہمارے خواب، انشاء اللہ، تعبیر پائیں گے۔ میں اپنی محنت سے اپنا ایک الگ گھر بناؤں گا جس میں اپنی کمائی سے تیرے لیے سب کچھ لاؤں گا۔'' میں اس کا ہاتھ دبا کر کہتا۔
''پتا نہیں سیفی، مجھے مستقبل کا سوچ کر ڈر کیوں لگتا ہے؟ چاچا کی ابا سے تو کبھی نہیں بنی، میرا رشتہ کس طرح ہو گیا تم سے، میں بالکل بھی نہیں سمجھی۔'' وہ اپنا سر میرے سینے سے لگا کر رونے لگتی۔
''مشعل، تم صرف سیف اللہ کی ہو اس لیے تمہارا نام میرے نام کے ساتھ جڑا ہے۔ ہمارا مستقبل روشن ہے۔ کیوں اپنی جان ہلکان کرتی ہو؟ تم روتے ہوئے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔'' اور پھر میں مشعل کو ایسے ایسے لطیفے سناتا کہ وہ لوٹ پوٹ ہو جاتی۔

....

''سیفی......! آپا ابھی تک نہیں آئیں؟ باہر وہ اسٹاپ والے اسٹور سے دھاگے کی نلکیاں لینے گئی تھیں۔'' دفتر سے آ کر شرٹ کے بٹن کھولتے میرے ہاتھ وہیں رک گئے جب سات سالہ ایشل نے مجھے یہ خبر سنائی۔
''تائی اماں! آپ نے مجھے فون کیوں نہیں کیا؟ کتنی دیر ہو گئی ہے؟'' میں بے چین ہو کر پوچھ رہا تھا، ساتھ ہی امی بھی ابھی دروازے سے اندر آئیں اور معاملے کی نزاکت دیکھتے ہوئے فوراً پاس آ گئیں۔ وہ بھی ابھی آئی تھیں کیونکہ دو دن سے وہ اپنے بھائی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔
''سیفی......! دو گھنٹے ہو گئے، میں سمجھی، پڑوس کی دردانہ کے پاس ہو گی لیکن جب ایشل کو بھیج کر پتا کرایا تو وہ وہاں نہیں تھی۔ میں تو پورا محلّہ چھان آئی، میں کیا کروں، میری بچی کو کون لے گیا، کہاں چلی گئی؟'' تائی دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی، ہر جگہ تلاش کیا لیکن مشعل کہیں نہ ملی۔
فجر کی اذانیں شروع ہو گئیں۔ میری ہر کوشش رائیگاں گئی تھی۔ پولیس نے بھی ہر جگہ ڈھونڈا تھا مگر مشعل کو تو گویا زمین کھا گئی تھی۔
اس کا اغوا ہو گیا تھا۔
وہ پھر کبھی نہ ملی۔
میری زندگی میں ایسا خلا پیدا ہو گیا جو شاید کبھی نہ بھر سکتا تھا۔
تایا کو جب مشعل کے متعلق پتا چلا تھا تو وہ مشعل کی جدائی کا صدمہ سہہ نہ پائے تھے۔ ہارٹ اٹیک نے انہیں بہت دور پہنچا دیا۔

تائی اماں کی آنکھ کے آنسو ان کی روشنی بھی اپنے ساتھ بہالے گئے تھے۔ ایشل کو میں نے سنبھالا دے دیا۔

میری ماں کی مشعل سے محبت تین ماہ بعد سامنے آئی تھی جب امی نے مجھے کمرے میں بلایا۔

''سیفی میری جان......! جانتا ہے' یہ زیور میں نے صرف مشعل کے لیے بنوایا تھا۔ اس زیور میں اس کالمس ہے' یہ تو سنبھال لے۔ اب میں یہ بوجھ نہیں سہار سکتی۔ خدا کرے' میری بچی جہاں ہو' اچھی ہو مگر میرے بچے......! مجھے نہیں لگتا' میں اپنی دلہن کی شکل دیکھ پاؤں گی۔ لے سنبھال میری مشعل' میری بہو کی امانت۔'' وہ میرے گلے لگ کر بہت بہت روئیں۔

اور پھر نئی صبح اُن کے لیے زندگی کی ساری روشنیاں گل کر گئی۔

اماں جی کے دسویں کے بعد میں ابا جی کے پاس آیا تھا۔

''ابا جی! کیا آپ کو دکھ نہیں ہوا؟ دن دھاڑے/ دیہاڑے آپ کی ہونے والی بہو اغوا ہوگئی؟ آپ کا بھائی' آپ کی بیوی آپ کو چھوڑ کر چلے گئے؟ آپ کی بھابھی/ بھابی' بیٹی کی جدائی میں رو رو کر اندھی ہوگئیں؟ آپ نے کسی سے بھی اُن کے دکھ میں دو لفظ ہمدردی کے نہیں کہے؟ آخر کس مٹی کے بنے ہیں آپ؟''

وہ آرام سے پلیٹ بھر کر کاجو کھاتے رہے۔

''ابا جی......! میں آپ سے کچھ کہہ رہا ہوں؟''

''او پتر......! لے کاجو کھا' جو جہاں گیا' اس کی جگہ وہیں تھی۔ کھا' پی اور جی۔''

میں ان کی بات سن کر پاگل سا ہوگیا۔ جانے میرے سر میں کیا سمائی۔ میں ہاتھوں میں سبز جزدان میں لپٹا قرآن اٹھا لایا۔

''ابا جی......! مجھے شک ہے کہ آپ نے مشعل کے اغوا میں کہیں نہ کہیں آپ کا ہاتھ ضرور ہے۔ میرا دل کہتا ہے' آپ ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہیں۔ ابا جی......! قرآن پر ہاتھ رکھیں اور میرے دل سے شک کا بیج نکال دیں۔'' میں رو دیا۔

''اوئے......بات سن' میں تیرا باپ ہوں' کوئی ایرا غیرا نہیں۔ رہی بات قرآن کی تو میں قرآن پہ ہاتھ کیوں رکھوں؟ اچھی ضد ہے۔'' وہ آنکھیں لال کیے مجھے گھورنے لگے۔

''ابا جی......! اگر آپ نے کچھ نہیں کیا تو رکھیں قرآن پہ ہاتھ۔'' میں نے قرآن ان کے بہت قریب کر دیا۔ وہ اِس اللہ کی کتاب پر ہاتھ رکھنے سے ہچکچا کیوں رہے تھے؟ میں نے دوبارہ کہا۔

''ابا جی......! رکھیں ہاتھ۔'' انہوں نے بڑھ کر قرآن پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میں کسی بھی معاملے سے پاک ہوں۔ جو تم سوچ رہے ہو' وہ غلط ہے' شک ہے' بس؟'' ان کی آواز کسی کھائی سے آتی معلوم ہو رہی تھی' ان کی آنکھوں کی ویرانی بڑھنے لگی۔

میں قرآن لے کر وہاں سے نکل گیا اور پھر گھر پر ٹھہرنا میرے لیے مشکل ہوگیا۔ میں مشعل کی یادوں کو لیے گھر سے باہر نکل گیا۔

کوئی بارہ بجے کے وقت میں گھر کی طرف آیا تو دیکھا' محلے میں لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

'کیا مسئلہ ہے؟ گلی میں آج اتنا رش کیوں ہے؟'

میں فکر مند ہو کر چاچا رحیم کے پاس پہنچا۔

''کیا بات ہے چاچا؟ آج یہ رش کیوں ہے گلی میں؟'' وہ مجھے دیکھ کر گلے سے لگانے لگے اور بولے۔

''صبر کرو بیٹا......! خدا نے تمہیں امتحانوں کے لیے چن لیا ہے۔ حوصلہ رکھ کر سنو' کوئی سات' سوا سات بجے کی بات ہے' تمہارے گھر سے بھائی جی کی دھاڑیں مار مار کر رونے کی آواز آرہی تھی۔ ہم لوگ پریشان ہوگئے۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ معاملے کا پتا لگائیں کہ بھائی جی باہر آگئے اور بالکل بیچ گلی میں گندی گندی گالیاں دینے لگے۔ سب جمع ہوگئے پھر کبھی روتے' کبھی ہنستے پھر چیخ چیخ کر کہنے لگے۔

''میں نے مار دیا......سب کو مار دیا......حنیف میرے بیٹے کو داماد بنانا چاہتا تھا' میں نے بیچ دیا اپنی بہو کو......بیچ دیا......'' پھر ہنسنے لگے۔ بیٹا......! ہم سب انہیں بڑی مشکل سے ہسپتال چھوڑ کر آئے ہیں۔ خدا ان کے حال پر رحم کرے۔ تمہاری بہت تلاش کی لیکن تم نہیں مل سکے۔ ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ گھر میں بھابھی/ بھابی

اور بیٹی کے پاس چھوڑ آتے ورنہ شاید وہ انہیں بھی کوئی نقصان پہنچا دیتے۔''

ان کی باتیں سن کر مجھے ذرا دکھ نہیں ہوا۔ میں نے بے ساختہ خدا کے حضور ہاتھ اٹھا دیئے۔

''بے شک میرے مولا! تیرا انصاف عظیم ہے۔''

میرے باپ نے قرآن پر جھوٹا ہاتھ رکھ کر بیان دیا تھا۔

قرآن کی مار پڑ گئی تھی میرے باپ کو۔

......

گھر بار بیچ کر میں تائی اور ایشل کو لے کر ایک نئے علاقے میں موجود گھر خرید کر سیٹل ہو گیا۔ آخری بار اپنے باپ سے ملنے گیا تھا۔

پاگل خانے کے سارے پاگل سلاخوں کے پیچھے مجھے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ میرا باپ سب کو کہانی سنا رہا تھا۔

''مار دیا...... میں نے سب کو مار دیا......'' آخری لفظ کہتے ہوئے اس نے فخر سے کہا اور قہقہہ مار کر ہنسا۔

اسے اس کے کیے کی سزا مل گئی تھی۔ میں شکستہ قدموں واپس آ گیا اور پھر کبھی اس طرف کا رخ نہ کیا۔

......

تائی کی بے نور آنکھیں آج بھی کسی معجزے کی منتظر تھیں۔

میں مشعل کی یادوں کے سہارے زندگی گزار رہا تھا۔ ایشل کی تعلیم جاری تھی، وہ بھی اگلے سال میٹرک پاس کر لے گی۔

اس کا خیال رکھنا ہر طرح میرا فرض ہے۔ اچانک مجھے نیند آ گئی اور یادوں کے کواڑ بند ہو گئے۔

مگر میں ان دریچوں سے محبت کی بھینی بھینی اٹھتی خوشبو محسوس کر سکتا ہوں۔ میرے ہاتھ مشعل کے لمس کو محسوس کرتے ہیں۔

زندگی صرف پانے ہی کا تو نام نہیں، کھونا بھی زندگی ہے۔

کتنا معصوم ہے ابھی انساں
زندگی کیا سوچتا ہے ابھی

......

آج صبح دیر سے اٹھا تھا، بہت دیر تک سوتا رہا تھا، ایشل کی ہفتہ اتوار کی چھٹی ہوتی تھی، ہفتہ تھا اس لیے وہ میرے سر پر کھڑی ہو کر اٹھا رہی تھی۔

''بھائی جان! ایک گھنٹے سے اٹھا رہی ہوں، اب فوراً اٹھیں، چھ بجے اٹھنے والے آج آٹھ بجے تک سو رہے ہیں۔'' وہ چھوٹی سی گڑیا میری ماں بن کر کھڑی تھی۔

''ارے بابا! تم لوگ تو چھٹی مناؤ دو دن ہفتے کی، میں ذرا دیر سو بھی نہیں سکتا۔'' میں مسکرا کر بولا۔

''اچھا جی! تو ایسا کرتے ہیں آپ رائل سٹی میں ایڈمیشن کرا لیں اور پھر آپ بھی دو دن کی چھٹی کے مزے لوٹیں۔'' وہ کہاں ہار مانتی تھی۔

''اچھا، میری ماں، تو جا، میں ابھی آتا ہوں۔'' میں نے ہار مان لی۔ میں جلدی سے تیار ہو کر ڈائننگ ٹیبل تک پہنچا اور کرسی سنبھال کر ناشتا کرنے لگا۔ تائی بھی پاس ہی تھیں۔

''آج آپ پراٹھا کھا لیں، بہت خستہ بنایا ہے میں نے۔'' اس نے میرے ہاتھوں سے بریڈ کا سلائس چھینتے ہوئے کہا۔

''ارے، میری عمر اسے ہضم نہیں ہونے دے گی۔'' میں نے بہانہ کہا۔

''کوئی بات نہیں، ہاجمولا کس مرض کی دوا ہے۔'' ایشل جھٹ جواب دے رہی تھی۔

''خاموش، بھائی بڑا ہے تو اس کی زبان کیوں پکڑ لیتی ہے؟ بدتمیز۔'' تائی کو اس حاضر جوابی پر غصہ آ گیا تھا۔

''نہیں تائی اماں! اسے کچھ نہ کہیں، اس کی باتیں ہی تو میری زندگی ہیں، بولا کر تو تائی کی باتوں کا برا نہ منایا کر۔'' میں نے ایشل کا موڈ ٹھیک کیا۔ خاموشی سے ناشتا کرتے ہوئے اچانک وہ پھر سے بول پڑی۔

''بھائی جان! رات کو میں نے خواب دیکھا کہ ہم سب ایک مزار پر حاضری دے رہے ہیں۔'' وہ کہہ گئی تو اچانک مشعل کی بات میری سماعت میں گونجنے لگی۔

''خواب کی کیا حقیقت ہے سیفی! آنکھ کھلی اور خواب اپنی موت آپ ہی مر گیا۔'' میں نے جلدی سے چائے ختم کی اور اٹھنے لگا تھا۔

''بیٹا! بڑے دن ہو گئے، حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزار گئے۔ کسی دن لے چل مجھے۔'' تائی کو ایشل کے

خواب سے اپنی مزار پر حاضری یاد آ گئی تھی۔

''جی اچھا تائی اماں! چلیں گے اس اتوار۔'' میں کہہ کر آفس کے لیے نکل گیا۔

•......•......•

تائی اماں جب مزار پر پہنچیں تو انہیں کسی بزرگ خاتون نے ''جیا شاہ جیلانیؒ'' کا مزار کا بتایا تھا کہ پرانے سکھر میں ایک ایسا مزار ہے کہ وہاں حاضری دینے والے کے دل کی ہر مراد پوری ہوتی ہے۔ مزار پر آج زیادہ زائرین موجود نہیں تھے۔ جانے کیوں' دُعاؤں اور مزاروں سے میرا اعتبار اٹھ سا گیا تھا۔ دس سال' پورے دس سال میں نے خدا سے کیں' کس طرح دُعا نہ کی تھی لیکن لا حاصل۔

اب مزار سے واپسی پر تائی کو سکھر جانے کی سجائی تھی۔ میں تائی کی کوئی بات ٹال نہ سکتا تھا' وہی میری سب کچھ تھیں۔

زندگی نے تائی اماں اور ایشل کے علاوہ میری جھولی میں چھوڑا ہی کیا تھا' سب کچھ تو چھین لیا تھا۔ تائی نے دو ماہ سے رٹ لگائی تھی کہ میں نے سکھر جانا ہے۔ باباؒ کے مزار پر حاضری دینا ہے۔ مجھے زندگی ہی میں لے چل۔''

تائی کچھ اس طرح کہتیں کہ میں شرمندہ ہو جاتا لیکن کیا کرتا' سکھر جانے کے لیے کم از کم ایک ساتھ تین چھٹیاں تو لازمی ہی تھیں۔ چلو بندہ اگر جمعرات کی رات کو نکلے' جمعہ' ہفتہ' اتوار کی چھٹی لیکن ذہن بھی تو فریش ہو' میں ایشل کو کنڈیشن بتا چکا تھا کہ۔

''چلیں گے' ذرا فراغت ہو جائے۔ تائی اماں کو سمجھاؤ نا۔ میں بھولا نہیں' مجھے یاد ہے۔''

''مگر تائی اماں تو کچھ سننے کو ہی تیار نہ تھیں' مجبوراً تمام پریشانیوں کو ایک طرف رکھ کر میں نے تین دن کی چھٹی لے لی۔

•......•......•

جمعرات کی صبح ہم سکھر کے لیے روانہ ہو گئے۔ تائی اماں کی خوشی دیدنی تھی جیسے اُس مزار پر حاضری دے کر اُن کی ہر خواہش پوری ہو جائے گی۔

شام ہونے تک ہم سکھر پہنچ گئے تھے۔ نو بجے تک ہم بڑی مشکل سے بھکر چوک سے سفر کر کے ''جیا شاہ جیلانیؒ'' کے مزار پر پہنچ گئے۔

پورے چاند کی رات میں وہ مزار جس کے ہر ہر کونے پر چاندی کا کام تھا' یوں چمک رہا تھا کہ گویا زمین پر چاند اتر آیا ہو۔

وضو وغیرہ کر کے نذر نیاز سے فارغ ہو کر ہم نے مزار کے احاطے میں ہی پڑاؤ ڈال دیا تھا گو کہ موسم معتدل تھا لیکن پھر بھی ایک سحر تھا جس نے چاروں طرف سے ہمیں جکڑ رکھا تھا۔

تائی تو مزار کی جالی تھام کر سر ٹکائے دُعا میں مشغول ہو گئی تھیں۔ ایشل بھی یٰسین پڑھ رہی تھی۔ میں نے تسبیح نکال کر پڑھنا شروع کر دی۔ اچانک میرے برابر میں ایک بزرگ آ کر بیٹھ گئے۔

نیلے کپڑے پہنے' سر پر سندھی ٹوپی پہنے اور اجرک کاندھوں پر اوڑھے وہ گھٹنوں میں منہ دیے بیٹھے تھے۔

میں نے کچھ دیر بعد اُن سے کسی ہوٹل کا پوچھا۔

''رے بابا سائیں! ام کو معلوم' تم کہاں ہو؟ اِدر ہوٹل نئیں ہوتا ہے۔ سائیں! وہ دیکھو اُدر سے اٹھ کر جاؤ' اندر جتنا کھانا ہے' کھاؤ بابا! لنگر ہے شاہ باباؒ کا۔ جو مانگو وہ پاؤ۔''

وہ کہہ کر مجھے ساتھ ہی لنگر خانے میں لے گیا۔

واقعی لنگر سیر ہو کر کھا کر میں اُس سے کافی حد تک مانوس ہو گیا تھا۔

''بابا صاحب! میری تائی بڑی مراد لے کر آئی ہیں۔ بس اللہ پاک اِن کی دُعاؤں کی لاج رکھ لے اور اِن کی آنکھیں واپس آ جائیں۔ میری اتنی سی خواہش ہے۔'' اُن کے پوچھنے پر میں نے یہاں آنے کا مقصد بیان کر دیا۔

''بابا سائیں! اِدر ہم نے تم کو بولا نا' جو مانگو وہ پاؤ اور بابا! اِدر تو سو سال کا کھویا بھی مِل جاتا ہے باباؒ کی دُعا سے۔ اللہ سائیں باباؒ پہ مہربان ہے سائیں! تم کو ایک مزار کا اور پتا بتاؤں' اگر تم سچی لگن کے ساتھ جاؤ تو بابا! جو مانگو وہ پاؤ۔''

وہ مزاروں پر رہنے والے بزرگ تھے' اُن سے ایک مانوسیت سی ہو گئی تھی۔ ''بتا دیں بابا! انشاء اللہ' اگر ہو سکا تو ضرور جائیں گے۔'' میں نے اُن کی محبت میں کہا۔

''سائیں! میں نے بھی کل باگڑ شاہؒ کے گاؤں جانا ہے۔ تم کو بابا! میں اپنے ساتھ ہی لے چلوں گا۔ کراچی

سے آئے ہو سائیں! اتنی دور تو خدا کی شان بھی دیکھتے جاؤ۔ جنگل میں منگل بھی دیکھنا کل تم۔'' مسکراتے ہوئے اُن بزرگ کا چہرہ نورانی ہو گیا تھا۔

''بابا صاحب! آپ ذرا اِدھر ہی ٹھہریں' میں ذرا گھر والوں کو دیکھ آؤں۔'' میں تائی اور ایشل سے کھانے وغیرہ کا پوچھنے چل دیا۔

''ایشل! کچھ کھایا پیا نہیں؟ تائی کو بھی بھوک لگی ہوگی۔'' میں نے ایشل کو دیکھتے ہی پوچھا۔

''بھائی جان! اتنی ٹیسٹی بریانی میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں ہو سکتی ہے؟ دو مرتبہ لنگر کھا چکی ہوں اور امی نے بھی کھانا کھالیا ہے۔'' وہ بچوں کی طرح مزے دار لنگر کی تعریف کر رہی تھی۔

جیسے تیسے رات گزری۔ مزار کے نُوری احاطے میں کب سورج طلوع ہو گیا' پتا ہی نہ چلا تھا۔

کتنا سکون ہے یہاں دھونی مار کر بیٹھنے میں۔ واقعی خدا کتنا قریب محسوس ہوتا ہے ایسی پاک جگہوں پر۔

مزاروں پر عمریں گزار دینے والے رب کو شاید بہت قریب محسوس کرتے ہیں۔

دنیا کی بے ثباتی' عیش و آرام بھول کر رونقوں سے منہ پھیر کر کچھ تو ملا ہے یہاں اسی لیے تو اتنے سارے قافلے کے قافلے زیارت کو آتے ہیں اور مستقل ٹھکانے لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ خدا کو پا لیتے ہیں۔''

•......•......•

صبح سویرے ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ تائی سے اجازت لے کر میں نے حامی بھری تھی۔ تائی تو خوش ہو گئی تھیں کہ چلو ایک اور بڑے بزرگ کے مزار پر حاضری ہو جائے گی۔

گاڑی دو گھنٹے کے بعد کہیں جا کر باگڑجی گاؤں پہنچی تھی۔ لق و دق بیابان جنگل دیکھ کر مجھے بابا صاحب کے ساتھ آنے کے فیصلے پر افسوس ہو رہا تھا۔

پیدل چلتے چلتے ہم کافی دور نکل گئے تھے لیکن مزار کا نام و نشان نہ تھا اور پھر اچانک ایک بیل گاڑی نظر آئی تو بابا صاحب نے اشارہ کر کے گاڑی بان کو بلایا اور سندھی میں بات کی اور اس بیل گاڑی پر سوار ہو گئے۔

شکارپور میں باگڑجی گوٹھ کے اس جنگل میں سفر کرتے کرتے آخر کار ہم قادر شاہ جیلانی بابا کے مزار پر پہنچ گئے۔

ایسا لگا کہ ہم کسی جنگل میں نہیں بلکہ پُر رونق شہر میں موجود ہیں۔ بابا کے مزار پر سبز پرچم رُوحانی زندگی کی نوید دے رہا تھا۔

''بابا! خدا کی قدرت دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔'' میں نے بابا صاحب سے کہا۔

''سائیں......! دیکھا تم......ہم نے تم کو کہا تھا نا کہ جنگل میں منگل دکھائیں گے۔ اب تم لوگ اِدر ہی مجاوروں کے ساتھ بیٹھو۔ اِدر بی سائیں! رات گزارو' دیکھنا کہ قدرت تم کو کون کون سا رنگ دکھاتی ہے۔ ذرا وضو بنا لو پھر اندر چلتے ہیں۔''

وضو بنا کر ہم لوگ اِس جنت میں داخل ہو گئے۔

ایسا سکون کہ جیسے انسان ترسا ہوا ہو اس ماحول کے لیے۔

ہاتھ خود بخود جالیوں کو پکڑنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ میں اور بابا صاحب مردانے حصے میں تھے جبکہ ایشل اور تائی زنانے حصے میں تھیں۔

ادھر پردے کا بہت خاص اہتمام تھا۔

آہستہ آہستہ سورج ڈھل رہا تھا۔ مزار کی بتیاں آہستہ آہستہ ہر طرف روشنی بکھیرنے لگیں۔ بیچ جنگل میں نُور برسنے لگا تھا۔

شہر سے آئے لوگوں کا سن کر ایک مجاور لڑکی گز بھر لمبا گھونگھٹ تانے گاؤں کا روایتی لباس پہنے' چادر اوڑھے اُن دونوں کے لیے لنگر سے بھری پلیٹ اور دو کپ چائے لیے ہمارے سامنے تھی۔

میں نے نظریں اٹھانا مناسب نہ سمجھا اور اُس کا شکریہ ایسے ہی نظریں زمین پر گاڑے ادا کیا۔

''بابا صاحب! اِن کا بہت بہت شکریہ کہ انہوں نے ہمارا اتنا خیال رکھا۔'' میری آواز سن کر اس نے اچانک نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا۔

میری نظریں اب بھی نیچے تھیں۔ بابا صاحب نے شکریہ ادا کیا اور وہ اندر زنان خانے میں چلی گئی۔

''بابا صاحب! کون ہے یہ؟ کیوں اتنا خیال کیا ہمارا اس نے۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''سائیں......! یہ دکھیا تو بڑی نیک، پرہیزگار اور پردہ دار ہے۔ دن کے وقت تو ادھر نظر بھی نہیں آتی، اپنی کھولی میں بڑی عبادت کرتی رہتی ہے۔ رات کو مزار کی جالی تھامے بیٹھی رہتی ہے۔ جب شہر سے کسی کے آنے کا سنتی ہے تو خاص طور پر اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر لاتی ہے، لنگر لاتی ہے، کوئی نہیں جانتا یہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے؟ کوئی دس بارہ سال سے ادھر پڑی ہے۔'' بابا صاحب کہہ کر خاموش ہو گئے تھے لیکن میرے اندر ایک امید نے سر اٹھانا شروع کیا اور پھر دل کے اندر صدائیں بلند ہونے لگیں۔

''خواب کی زندگی ہی کتنی ہوتی ہے سیفی، آنکھیں کھولو تو خواب اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔'' مشعل کی آواز بلند سے بلند ہونے لگی تھی۔ میں نے سب خیال یکسر جھٹک دیئے۔

''نہیں، بھلا اس جنگل ویرانے میں ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''

•......•......•

رات کا جانے کون سا پہر تھا، مجھے ایسا لگا کہ شاید کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔

''یا میرے مالک! یہ قادر شاہ باباؒ کے مزار پر مجھے کسی بچھڑے کی خوشبو کیوں آ رہی ہے؟'' میں نے دل میں سوال کیا۔

وہی لڑکی جو لنگر اور چائے لائی تھی، وہ بالکل کونے میں کھڑی شاید میری ہی منتظر تھی۔ وہ دیوار سے پشت لگائے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ کوئی ان دیکھی طاقت مجھے اُس طرف جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں اٹھا اور اس کی سمت چلنے لگا۔

''کون ہو تم؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ خواب کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، آنکھ کھلنے پر اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔''

''مشعل......!'' میں نے اُسے بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔

''مشعل......! میری زندگی......! تم یہاں؟'' میں نے رندھے گلے سے کہا۔

''سیفی......! میں مر چکی ہوں، زندہ کب تھی، ایک آس نے مرنے نا دیا، ایک امید کی روشن کرن تھی جو خدا نے میرے من میں روشن کی ہوئی تھی۔'' وہ بے تحاشہ رونے لگی۔

''سیفی......! خدا نے میری سن لی سیفی......!'' وہ یکدم میرے ہاتھوں میں جھول گئی۔

''مشعل......! مشعل......! ہوش میں آؤ۔'' میں اسے اٹھائے مزار کے احاطے میں لے آیا۔

''یا قادر شاہ باباؒ! آپ کی شان واقعی نرالی ہے۔ خدا نے آپ کی بزرگی کے صدقے بچھڑے ملا دیے بابا! واقعی خدا بڑا غفور الرحیم ہے۔ جس نے آج ہمیں اِس دَر پر سبب بنا کر بھیجا تاکہ ہم اپنی امانت لے جائیں۔'' میں خدا کے آگے سجدہ ریز ہو گیا۔ دو نفل پڑھ کر میں نے مشعل پر پانی کے چھینٹے مارے تو وہ ہوش میں آ گئی۔

مشعل اور میں ایک طرف کو بیٹھ گئے۔

''مشعل......! کہاں چلی گئی تھیں تم میری زندگی کو تلاش کے حوالے کر کے؟'' میں نے اُس کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

''سیفی......! میں نے اس دن گھر سے قدم نکالا تو نہیں جانتی تھی کہ کبھی اس دروازے پر لوٹ نہ پاؤں گی، گلی میں سناٹا تھا، گلی ابھی پار بھی نہ کی تھی کہ......'' وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

''کیا ہوا تھا پھر؟'' میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر حوصلہ دیا۔

''وہ پانچ آدمی جانے کب سے دھاگ لگائے بیٹھے تھے؟ مجھے تو چیخ تک مارنے کی مہلت نہ ملی تھی پھر ایک کالے شیشوں والی گاڑی میں پورے تین چار گھنٹے تک سفر ہوا تھا۔ جب میں ہوش میں آئی، ایک سرکنڈوں کی کٹیا تھی۔ گھٹاٹوپ اندھیرے مجھے یکدم ڈسنے لگے۔ میں نے ایک چیخ ماری تو دو آدمی اندر آئے۔

''سائیں......! ہوش میں آ گئی ہے چھوری، رات نشلی بنانے کے لیے میں ابھی کچی لے کر آتا ہوں، جب تک تم اندر آ کر اس سے ہاتھ سیک لو۔'' وہ کہہ کر باہر نکلا تو تین آدمی اور آ گئے۔ اب وہ چار، میں اکیلی، میں چیختی رہی، چلاتی رہی لیکن ان کی آنکھوں میں شیطان ناچ رہا تھا، ان چاروں میں سے ایک آدمی میرے پاس نہ آیا تھا، وہ دور

یہ سب کچھ ہوتا دیکھ رہا تھا۔ میں نیم برہنہ ہوگئی تھی۔ میری عزت کا جنازہ نکلنے ہی والا تھا۔ میں دوڑ کر چلاتی ہوئی اس الگ کھڑے شخص کے قدموں کو پکڑ کر چلانے لگی۔

''میرے بھائی......! مجھے بچالو...... بھیا......! میرا قصور بتادو میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ خدا کے واسطے اس کے رسول کے صدقے' میرے پاس میری عزت کے علاوہ کوئی دولت نہیں' آج اگر یہ انمول موتی چھن گیا تو میں ابھی' اسی وقت اپنی جان دے دوں گی' بچالو۔''

وہ وقت کی جانے کون سی نیک گھڑی تھی کہ اسے مجھ پر ترس آ گیا۔

''چھوڑ دے لال محمد' اسے۔'' وہ گرجا۔

''کیوں ابا...... تیری بھین ہے یہ؟'' وہ خباثت سے ہنسا۔

''لال محمد' اب اسے کسی بندے نے ہاتھ لگایا تو ماں قسم' پھاڑ کے رکھ دوں گا۔'' اب کے اس نے مجھی اٹھا کر سینے سے لگایا اور اپنی اجرک میرے جسم پر لپیٹ دی۔ پانچوں آدمی نے آ کر اسے بہت برا بھلا کہا تھا کہ۔

''اس کے اپنوں نے اسے لٹنے کے لیے ہمارے ساتھ راضی خوشی بھیجا ہے' تو اپنی بک بک اپنے پاس رکھ'' لیکن وہ بھی اپنے قول کا پکا تھا۔ وہ ان سب سے بچا کر مجھے اپنے ساتھ شکارپور لے آیا۔ میں نے گھر جانے کا کہا تو اس نے منع کر دیا اور کہا کہ تیرے اپنے ہی تیرے دشمن ہوگئے ہیں۔

''سیفی......! میرا دل پھٹ گیا تھا اس وقت جب میرا ذہن سوچ سوچ کر چاچا جی ہی کی طرف انگلی اٹھاتا تھا۔ وہ میرا منہ بولا بھائی بن گیا۔ چار دن میں اس کے گھر رہی پھر میں نے اس سے کہا کہ مجھے کسی ایسی جگہ پہنچا دے جہاں ساری زندگی سکون سے گزر جائے۔

سیفی......! دس سال سے میں اپنے وہ سامنے کچے حجرے میں مزار پر پڑی ہوں۔ میرے منہ بولے بھائی کی زبان کی تاثیر تھی کہ اس مزار پر ہر شخص میری عزت کرتا ہے۔ بہت خیال رکھتے ہیں یہاں کے لوگ میرا۔ ایک انتظار تھا کہ شاید اس جنگل میں کوئی میرا اپنا بھولے سے آ جائے۔ خدا سے مانگی ساری دعائیں آج پوری ہوگئیں سیفی! مجھے میرے اپنے مل گئے۔'' مشعل پرسکون ہوگئی تھی اور میرا دل پارہ پارہ ہوگیا تھا۔

''سیفی! چاچا جی کے بارے میں تم نے کچھ نہیں بتایا؟ وہ کہاں ہیں؟ حالانکہ چاچی اور ابا کے بارے میں تم نے سب بتا دیا تھا۔'' وہ ملائم نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''مشعل......! ابا جی کو خدا نے اپنے کیے کی سزا دے دی تھی۔ وہ اماں جی کے انتقال کے بعد پاگل ہوگئے تھے اور تین چار ماہ پہلے ہی ایسی ہی دیوانی حالت میں ان کا انتقال ہوگیا۔ دس سال پاگل پن میں گزارے تھے انہوں نے پورے دس سال۔'' میں اوپر چمکتے چاند کو تکنے لگا۔ ''مشعل......! مجھ سے وعدہ کرو کہ تم ابا جی کا نام اپنے اغوا کے معاملے میں سینے میں قبر کھود کر آج اور ابھی دفن کردوگی۔'' میں نے گڑگڑا کر کہا تھا۔

''میں نے علاقہ چھوڑ دیا تھا کہ ایشل اور تائی کے کانوں میں ابا جی کا زندگی کا یہ بھیانک کارنامہ نہیں پڑنے دیا۔'' میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''سیفی......! یہ قبر تو دس سال پہلے ہی کی بنی ہوئی ہے۔ تم بھروسہ رکھو۔'' وہ مسکرانے لگی۔

''مشعل......! کیا تم نے تائی سے ملاقات نہیں کی؟ ایشل بھی تو اندر ہے۔'' میں نے زنان خانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''پہچان کر انجان اس لیے بنی رہی کہ ڈر رہی تھی کہ خون نے خون کو پہچاننے سے انکار کیا تو کیا ہوگا؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''پھر مجھ سے بات کیوں کی؟'' میں نے اُس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''تم پر تو خود سے زیادہ بھروسہ تھا اور ہے۔'' اس نے کہا کہ میں جھوم اٹھا۔

''شادی کر لی تم نے؟'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں' تم میری دلہن سے مل کر بہت خوش ہوگی لیکن تائی کے سامنے ذکر نہ کرنا۔'' میں نے اسے یہ کہہ کر زنان خانے میں بھیج دیا۔

صبح کا سورج میرے لیے میری زندگی کے سارے رنگ ایک ساتھ لے آیا تھا۔ تائی اماں کو گویا مشعل کی شکل

میں آنکھوں کی روشنی مل گئی تھی۔ ایشل نے بہن کو پا لیا تھا اور میں نے زندگی کو۔

•......•......•......•

صبح سویرے کراچی کے لیے سفر کا آغاز ہوگیا تھا۔ بابا صاحب ہمارے ساتھ ہی کراچی کے لیے روانہ ہوگئے تھے۔

مزارات کی زیارت میں ہم نے تین دن صرف کیے اور پھر جب گھر پہنچے تو کراچی کے جتنے مزار تائی کو یاد تھے' وہ حاضری دینے پہنچیں۔

بابا صاحب واپس چلے گئے۔ مشعل کو آئے تین دن ہوگئے تھے۔ اس نے اب تک میری دلہن کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہ کی تھی۔

شام کو جب میں آفس سے واپس آیا تو مشعل میرے کمرے میں چلی آئی۔ میں باتھ لے کر باہر آیا اور کپڑے پہن کر ڈریسنگ کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا۔ اس نے آتے ہی سوال کیا۔

''سیفی......! تمہاری دلہن کہاں ہے؟ تین دن ہوگئے ہیں' میں نے اب تک ای جان سے بھی کچھ نہیں پوچھا' لے آؤ اسے سسرال سے۔'' وہ اپنی دانست میں جو ضروری سمجھا' بول رہی تھی۔

''ابھی لے آتا ہوں' وہ دیکھو۔'' ڈریسنگ کے بڑے سادے شیشے کے سامنے وہ کھڑی تھی۔

''کہاں ہے؟ کیا کوئی تصویر دکھا رہے ہو کیا؟'' وہ بے چینی سے کہہ رہی تھی۔

''ہاں' وہ دیکھو' اپنے بالکل سامنے۔'' وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر ہڑبڑا گئی اور کچھ سمجھتے ہوئے دھیرے سے مسکرا دی۔

میں نے اس کے گرد باہوں کا گھیرا تنگ کر دیا۔

''تم ہو نا میری دلہن' تمہاری یادوں میں جیتا رہا ہوں' کوئی اس دل میں نہیں سمایا تمہارے بغیر۔ تم ہی میرا انعام ہو' تم ہی سے تو زندگی میں رنگ بھرنے کے خواب دیکھے تھے' خواب کی تعبیر کل بھی تم تھیں اور آج بھی تم ہو۔'' میں نے کہتے ہوئے اس کا ماتھا چوم لیا۔ وہ یکدم گلابی سی ہوگئی۔ اسے بھی شاید اب خواب سچے لگنے لگے تھے۔

☆☆☆

پُرسکون نیند کے لیے

اکثر یہ تجربہ ہوتا ہے کہ بہت سی راتیں بے خوابی اور بے سکونی کے عالم میں کٹ گئیں۔

رات کا مہیب سناٹا ہو، بستر پر کروٹیں بدل رہے ہوں، نیند، آنکھوں سے دور بھاگ رہی ہو تو بہت کوفت اور الجھن کا شکار ہوجاتے ہیں۔

ہماری صحت کے لیے نیند، بڑی اہم ہے۔ گہری اور پُرسکون نیند سے ہمارے جسم میں نئے سرے سے جان پڑجاتی ہے اور دماغ تر و تازہ ہوجاتا ہے۔ بصورت دیگر ہماری کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ جسمانی اور ذہنی طور پر چاق و چوبند رہنے کے لیے ضروری ہے کہ گہری نیند سو لیا جائے۔

رات کی پُرسکون اور اچھی نیند کے لیے ہمیں کچھ طریقے اختیار کرنا چاہئیں:

1- دن میں سونے سے گریز کیجیے۔

2- رات کو ایک مقررہ وقت پر سو جایئے اور صبح ایک مقررہ وقت پر بستر سے اٹھیے۔

3- سونے سے پہلے نیم گرم پانی سے نہا لیجیے تاکہ اعصاب کو سکون ملے۔

4- سونے سے پہلے ایسی چیزوں سے پرہیز کیجیے جو نیند کو بھگاتی ہیں مثلاً الکحل، کیفین (چائے یا کولا)

5- آپ کا بستر آرام دہ ہونا چاہیے۔

6- آپ کے کمرے میں اندھیرا اور خاموشی ہو۔ کمرہ نہ زیادہ گرم اور نہ زیادہ ٹھنڈا ہو۔

7- شام کے بعد زیادہ دیر کوئی محنت طلب کام یا ورزش نہ کریں۔

8- بستر پر لیٹنے کے بعد نیند نہ آئے تو بہتر ہے کوئی کتاب پڑھنا شروع کر دیں۔

مندرجہ بالا ہدایات پر عمل کریں تو انشاء اللہ اچھی اور پُرسکون نیند آپ کی ساتھی ہوگی۔

شاہدہ شکیل، کراچی کی حسن نظر کا ماحصل

ہمشکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

سطر سطر تجسس سموئے، نئے سنسنی خیز سلسلے کی ساتویں کڑی

خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ اُن کے قصوں اور ٹوٹکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے سات ''ہمشکل'' بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیئے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کرلیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہوکر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رُکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو ''عالی'' کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہمشکل والی یعنی کہ ایک اور ''ہمشکل'' اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ ''عالی'' جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط سمجھانے کی اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات باور کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے جس کی شکل عالی سے



مشابہ ہے۔ بہرکیف عالی کے خاندان والوں کو جب شاہ زیب کی حقیقت معلوم ہوئی تو وہ اس کے احسان مند ہوگئے اور شکریہ ادا کرتے اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ شاہ زیب نے بتایا کہ اس کی دادی ماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے سات ہمشکل ہوتے ہیں بس میرا دل چاہا کہ اپنی زندگی میں اپنے ہمشکلوں کو تلاش کروں اور یقین کریں کہ مجھے میرے دو ہمشکل مل گئے ایک دلاور اور آپ کا عالی اور تیسرا میں اور اب چوتھے ہمشکل کی تلاش ہے۔

عالی کے گھر والے اس کو خاصی رقم دے کر رخصت کرتے ہیں۔ شاہ زیب اپنے تیسرے ہم شکل عالی کے بعد وہاں سے نکل کر ایک فور اسٹار ہوٹل میں جاتا ہے۔ اب شاہ زیب کی زندگی میں سیزارو آجاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے ایک خفیہ گینگ سے منسلک ہے۔ جس نے سیزارو کو ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ ابھی شاہ زیب سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسے کوروتی ٹکرا جاتی ہے۔ کچھ بندے اُسے زبردستی اُس جگہ پہنچا دیتے ہیں جہاں پر ڈینیل نے کوروتی کو رکھا ہوا ہے۔

اب آگے ملاحظہ کیجیے

وہ گہری نگاہوں سے شاہ زیب کا جائزہ لیتا رہا، پھر اس نے کہا۔

''تم یقیناً سوچ رہے ہوگے کہ میں تمہارے اصل نام سے کیسے واقف ہوگیا۔ ڈکٹافون ایک معمولی سی ایجاد ہے۔ کوروتی کے کمرے میں ایک سیٹ لگا ہوا ہے جس کے ذریعے وہاں ہونے والی تمام گفتگو سنی جا رہی تھی، لیکن اسی گفتگو نے تمہاری پوزیشن صاف کردی ہے اور تمہیں ایک عذاب سے بچالیا ہے۔ میرے ساتھی کنور شمشیر سنگھ کو نہیں جانتے۔ انہیں صرف اس کی فلمی تصویریں دکھائی گئی ہیں۔ تمہارے خدوخال کافی حد تک کنور شمشیر سنگھ سے ملتے جلتے ہیں اس لیے وہ لوگ تمہیں پکڑ لائے تھے۔''

جواب میں شاہ زیب خاموش رہا تھا۔ ڈینئل نے پھر کہا ''میں تمہیں اپنی طرف سے سیاحت کی دعوت دیتا ہوں اور پچاس لاکھ روپے نقد معاوضے کی پیشکش بھی کرتا ہوں بشرطیکہ تم اس کی تکمیل میں پوری پوری محنت کرو۔''

شاہ زیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی، ڈینئل بھی مسکرانے لگا، پھر شاہ زیب نے کہا۔

''مجھے کیا کرنا ہوگا سر۔''

''میرا نام ڈینئل مارکو ہے، میں بھارت کے ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر جا رہا ہوں۔ وہاں سے ہماری حکومت ضرور ختم ہوگئی لیکن ہندوستان میں ہمارے وفاداروں کی کمی بھی نہیں تھی۔ کچھ لوگوں نے میرے خلاف کارروائی کی تھی اور ان سے بدلہ لینے کی خواہش آج بھی میرے دل میں چٹکیاں لیتی رہی ہے۔ یہ معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ میں کچھ لوگوں کے خلاف صف آراء ہوں اور اسی سلسلے میں تمہیں استعمال کرنا چاہتا ہوں۔''

شاہ زیب گردن ہلانے لگا پھر اس نے آہستہ سے کہا ''ڈینئل مارکو تم مجھ پر اعتبار کیسے کروگے اور مجھے یہ بات قطعی ناپسند ہوگی کہ جب میں تمہارا کام کرنے کا وعدہ کرلوں تو تم مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھو۔''

ڈینئل مارکو منہ سے پائپ نکال کر ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا ''میں نے پون صدی گزار دی ہے۔ عمر کے بیس سال نکال دو تو پچپن سال تجربے کے ہیں، یہ بات مجھ پر چھوڑ دو کہ کس طرح تم پر اعتماد کرنا ہے؟''

''تو پھر ٹھیک ہے مسٹر ڈینئل، میں پچاس لاکھ کے حصول کے لیے ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں جو تم کہو۔''

مسٹر ڈینئل مارکو نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر کہنے لگا ''اس کے لیے تمہیں بدستور کوروتی کو بیوقوف بنانا ہوگا، حسین لڑکی ہے اپنے طور پر تم جس طرح چاہو اس سے تعلقات رکھو۔ تم سے متاثر ہوکر اگر وہ تمہیں اپنا قرب بخش دے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں ان لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جو اس لڑکی کے سرپرست ہیں یا اس کے والدین ہیں۔ بس اتنا سا کام ہے جو تمہیں کرنا ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ لڑکی خود بھی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ صرف ایک کمبخت تھا جو سچ بات بتا سکتا تھا اور اس کا نام بھرت چند تھا جو مر چکا ہے۔ ہمارے تمام ذرائع بے اثر

ہو چکے ہیں چنانچہ اب ایک ہی ترکیب ذہن میں آتی ہے اور وہ بھی تمہارے توسط سے تم کوروتی کو واپس ہندوستان لے جاؤ، راجپوتانہ کے علاقے میں تمہیں سکھی پور جانا ہے، اس کی تمہارے ساتھ موجودگی اس بات کی تصدیق کردے گی کہ تمہارا تعلق اسی سے ہے اور خود کوروتی کو اس طرح اپنے ساتھ شامل کرو کہ وہ تم پر مکمل اعتبار کرلے۔ ہوسکتا ہے وہ لوگ جو کوروتی کے اپنے ہیں کسی طرح اسے پالیں اور ہمارا کام بن جائے۔ میں تمہیں کچھ نام دوں گا جن سے تمہیں اس طرح ملاقات کرنی ہے کہ یہ ملاقات حقیقی محسوس نہ ہو اور پھر تم ان حقیقتوں کو پاسکتے ہو جن کا معاوضہ پچاس لاکھ روپے ہے۔''

ڈینئل کی اس بات پر شاہ زیب دیر تک غور کرتا رہا، پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے مسٹر ڈینئل! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ تمہارا یہ کام انجام دوں گا۔''

''باقی گفتگو ہماری دوسری ملاقات پر ہوگی۔ تم کوروتی کے ساتھ رہو اور اس پر اپنا اعتماد بڑھانے کی کوشش کرو۔''

اس کے بعد شاہ زیب ڈینئل کے پاس سے اٹھ گیا تھا اور چند لوگوں نے اسے وہیں چھوڑ دیا جہاں پر کوروتی موجود تھی۔ وہ شاہ زیب کو دیکھ کر مضطربانہ انداز میں کھڑی ہوگئی۔

''کیا ہوا شاہ زیب؟''

''ڈینئل نے مجھے شناخت کرلیا ہے کہ میں کنور شمشیر سنگھ نہیں ہوں، لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ ذمے داری بھی میرے سپرد کردی ہے کہ میں تمہیں لے کر ہندوستان چلا جاؤں اور بھرت چند کے خاندان کو تلاش کر کے ان سے تمہارا راز معلوم کروں۔''

''اوہ.تم نے اس بات کی حامی بھرلی ہے؟''

''اس کے علاوہ تمہاری مدد کرنے کا اور کوئی ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اطمینان رکھو جو کچھ ہو رہا ہے تمہارے حق میں بہتر ہو رہا ہے۔''

''میں تو پاگل ہوگئی ہوں یہ سن کر کہ اپنے دیس جارہی ہوں۔ شاہ زیب تمہیں کچھ دے تو نہیں سکتی بس یہی کہہ سکتی ہوں کہ جیون بھر تمہارا احسان مانوں گی۔ کسی طرح مجھے میرے اپنوں سے ملادو۔''

''میں پوری کوشش کروں گا۔ تم فکر مت کرو۔''

اس کے بعد کوروتی شاہ زیب سے طرح طرح کے سوالات کرتی رہی تھی اور شاہ زیب بڑی ہوشیاری سے جواب دیتا رہا تھا، پھر وہ خاموش ہوگئی۔ شاہ زیب نے بھی اسے نہیں چھیڑا تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن پھر شاہ زیب کو مسٹر ڈینئل مارکو کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بیٹھا پائپ پی رہا تھا، شاہ زیب کو دیکھ کر اس نے مردہری سے گردن ہلائی اور سامنے بیٹھنے کی پیشکش کی۔

''اگر تم کہو تو یہ رقم تمہیں کام کی تکمیل سے پہلے بھی ادا کی جاسکتی ہے۔ یہ صرف تم پر منحصر ہے۔'' اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

''نہیں میں کام پورا ہونے کے بعد سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''گڈ.تمہارا یہ جواب انتہائی تسلی بخش ہے۔ تمہیں جتنی جلد ممکن ہوسکا ہندوستان روانہ کردیا جائے گا۔ کام کا آغاز تمہیں اسی طرح کرنا ہے جس طرح تم نے کوروتی سے کہا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ سکھی پور میں جاکر تمہیں بھرت چند کے اہل خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہیں۔ اگر بھرت چند کے اہل خاندان سے ملاقات نہ ہو تو پھر تم دھونا نواس جاؤ گے کیونکہ ویریندر سنگھ ان غداروں میں سے تھا جنہوں نے جان بوجھ کر ہمیں دھوکہ دیا اور ڈبل کراس کیا، ویریندر سنگھ زندہ نہیں ہے البتہ اس کی اولادیں وہاں موجود ہیں۔ کنور شمشیر سنگھ کے بارے میں بھی ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اپنی بستی نہیں پہنچا بلکہ وہاں سے روپوش ہے، ہمارے پاس اب اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ ہم کوروتی کو منظر عام پر لے آئیں۔ حالات جس جس طرح تمہارے سامنے آتے رہیں اسی انداز میں کام کرو۔ اس سے پہلے کبھی کسی کو ایسا موقع نہیں مل سکا کہ

وہ کوروتی کے ساتھ اس کے اہل خاندان کی تلاش میں نکلے، لیکن تم پہلے آدمی ہو جسے یہ آزادی دی گئی ہے۔ کنور شمشیر سنگھ کی خبر مل جائے تو اسے بھی اپنے جال میں پھانسو اور اس سے کوروتی کے زیور کے بارے میں معلومات حاصل کرو، اگر وہ زیور تمہارے ہاتھ آجاتا ہے تو ممکن ہے اس کے بعد ہمیں کسی دوسرے کام کی ضرورت نہ پیش آئے۔''

''میرا خیال ہے ڈینئل تقریباً تمام ہی ضروری باتیں تم نے مجھے بتا دی ہیں، البتہ اگر کچھ اور معلوم ہو جاتا تو میں زیادہ محنت سے کام کر سکتا تھا۔''

''کچھ اور سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''اس تمام کارروائی کے پس پردہ کیا حقیقت ہے؟''

''نہیں میرے دوست یہ راز تمہیں نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔'' وہ تھوڑی دیر تک کر دوبارہ بولا ''تم کوئی موثر منصوبہ تیار کرلو کہ تمہیں یہاں سے فرار کس طرح ہونا ہے۔ یہ تمہاری ذمے داری ہے۔ کوروتی کو اس کا احساس نہ ہونے پائے کہ تم ہمارے لیے کام کر رہے ہو۔''

''اس کی تو تم فکر ہی مت کرو، جہاں تک یہاں سے روانہ ہونے کا تعلق ہے اس کا بندوبست تمہیں ہی کرنا ہوگا۔ میں خود کچھ نہیں کر سکتا۔'' شاہ زیب نے کہا اور ڈینئل پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا پھر کچھ دیر کے بعد وہ بولا۔

''ٹھیک ہے تمہیں یہاں سے منتقل کیا جائے گا اور اس کے بعد راستے میں تم فرار ہونے کی کوشش کرنا، کسی ہوٹل میں ٹھہر جانا باقی انتظامات کرنے کے بعد تمہیں ہندوستان روانہ کر دیا جائے گا۔''

شاہ زیب نے پرسکون انداز میں گردن ہلائی اور وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد وہ ڈینئل کی ہدایات کے مطابق عمل کرتا رہا۔ کوروتی بھی کافی پُرسکون تھی، پھر ڈینئل کے پروگرام کے مطابق وہ دونوں ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔

☆......☆......☆

کافی خوبصورت ہوٹل تھا، وہاں انہیں کمرہ حاصل ہو گیا تھا، کوروتی اس احساس سے خوش تھی کہ اسے ایک بار پھر اپنی سرزمین پر جانا نصیب ہو رہا تھا۔

شاہ زیب نے سب سے پہلے ہوٹل کے اس کمرے میں ڈکٹا فون تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ کمرہ ڈینئل کی طرف سے بک نہیں کرایا گیا تھا بلکہ اسے شاہ زیب نے اپنے طور پر حاصل کیا تھا چنانچہ ڈکٹا فون نہیں مل سکا اور وہ مطمئن ہو کر وہاں مقیم ہو گیا۔

''آزادی کے لمحات بھی کتنے خوشگوار ہوتے ہیں شاہ زیب؟'' کوروتی نے بستر پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا ''تمہارے بارے میں کچھ تفصیلات نہیں معلوم ہو سکیں، بہر طور میں سمجھتی ہوں کہ تمہارا سہارا میرے لیے نہایت قیمتی ہے۔''

''اپنے بارے میں تمہیں صرف اتنا ہی بتا سکوں گا کہ ایک آوارہ گرد ہوں۔''

''تمہارے چاہنے والے بھی تو تمہاری واپسی کے منتظر ہوں گے۔ اگر ان کے بارے میں کچھ بتانے میں دقت محسوس کرتے ہو تو تم سے معافی چاہتی ہوں، کچھ نہیں پوچھوں گی۔ لیکن ایک دوسرے سے تعارف تو ضروری ہوتا ہے، تمہاری تو کم از کم شناخت ہے، مجھ سے کوئی یہ سوال کرے تو ذرا میری کیفیت کا اندازہ لگالو۔''

''میں جانتا ہوں کوروتی، لیکن تمہیں یہ سن کر یقیناً حیرت ہوگی کہ کم از کم تم کسی کی تلاش میں تو سرگرداں ہو، اپنے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہوں۔ جبکہ میں اپنے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی کسی کی تلاش میں سرگرداں نہیں ہوں کیونکہ یہ جاننا میرے لیے دکھ کا باعث ہے۔''

''میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم میرے محسن ہو تو میں تمہاری اس محبت کو کیسے بھول سکتی ہوں؟ تم نے میرے دل میں امید کی بہت سی روشنیاں پیدا کر دی ہیں۔''

اس نے ایک صوفے پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ واقعی کسی ماہر سنگتراش کا ایک حسین مجسمہ معلوم ہو رہی تھی، شاہ زیب گہری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ یہ حقیقت تھی کہ کوروتی کو اگر ساری زندگی اپنے سامنے بٹھا کر دیکھا جاتا تو زندگی

گزرنے کا احساس بھی نہ ہوتا۔ وہ پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک ایک ایسی مکمل عورت تھی، جس کے بعد تناسب کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو شاہ زیب اپنی محویت سے چونکا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں کوروتی، تم پر غور کر رہا تھا۔ بلاشبہ تمہیں کسی ریاست کی راجکماری ہی کہا جا سکتا ہے کیونکہ عام لوگ اتنے حسین نہیں ہوتے۔''

شاہ زیب کے ان الفاظ پر اس کے چہرے پر شگفتگی چھا گئی تھی، لیکن اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں ریاست کی راجکماری کے بجائے اگر کسی بنیے کی لڑکی بھی نکلوں تو مجھے اتنی ہی مسرت ہوگی جتنی کسی راجکماری کے ہونے سے۔''

''ایک سوال کروں برا تو نہیں مانو گی۔''

''نہیں! اب تمہاری کسی بات کا برا ماننا میرے بس میں بھی نہیں ہے۔''

''کنور شمشیر سنگھ کے بارے میں تمہارے ذہن میں کیا تاثرات تھے؟''

''وہ صرف لمحوں کا ساتھی تھا۔ اس بات کے امکانات بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ مجھ سے محبت یا وفاداری بھول کر جنم کنڈلی سے اپنا ہی کوئی مقصد حاصل کرنے میں مصروف ہو گیا ہو۔ دنیا کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا شاہ زیب۔ لوگ طرح طرح کے ہوتے ہیں اور زیادہ تر افراد اپنے مفاد کو سب سے زیادہ برتر سمجھتے ہیں۔''

''ہاں کوروتی، اس میں کوئی شک نہیں اور اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں ان میں سے نہیں ہوں تو ظاہر ہے یہ میرا کہا ہوگا اور تمہارا اس پر یقین کرنا ضروری نہیں ہوگا۔''

''نہیں شاہ زیب، یہ جملے کہہ کر میرا دل مت توڑو۔ اندر کی آواز بھی کچھ ہوتی ہے اور اس وقت میرے اندر سے جو آواز ابھر رہی ہے اس کے الفاظ یہی ہیں کہ تم دوسروں سے مختلف ہو۔''

شاہ زیب کا دل چاہا کہ زور زور سے قہقہے لگائے۔ نجانے کتنے لوگوں نے اسے اپنا ساتھی بنایا تھا۔ نجانے کس کس نے اپنے مفادات حاصل کیے یہ کہانی اگر رقم کرنے بیٹھتا تو اسے دنیا کی سب سے بڑی گپ سمجھا جائے گی۔ یہ راجکماری یا بنیے کی بیٹی اس پر اس قدر بھروسہ کر رہی تھی، لیکن دنیا کا جو رنگ وہ دیکھ چکا تھا وہ کچھ اور ہی کہتا تھا۔ وہ اگر کسی سے مخلص بھی ہے تو ضروری نہیں ہے کہ وہ بھی شاہ زیب کے لیے اتنا ہی مخلص ہو۔

............☆☆............

دہلی ایئرپورٹ تک کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ ان دونوں کو دہلی سے بذریعہ ٹرین راجپوتانہ کا سفر کرنا تھا اور پھر سکھی پور تک جانے کے راستے دریافت کرنے تھے۔ کوروتی نے شاہ زیب سے پوچھا کہ اب کیا ارادہ ہے، دہلی میں قیام کیا جائے گا یا فوراً ہی یہاں سے روانگی کا بندوبست۔

''جیسا تم کہو کوروتی۔ بہتر تو یہ ہے کہ دہلی میں رک کر ہم اپنے آپ کو سنبھالیں اور اس کے بعد آگے کا سفر کریں، کچھ منصوبے بھی بنانے ہیں۔ اس دوران تو ہم اس قسم کی کوئی بات کر ہی نہیں سکے۔''

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

کوروتی نے کہا اور اس کے بعد وہ دونوں کسی ہوٹل کی تلاش میں چل پڑے۔ راکس حسین ترین ہوٹل تھا۔ جس میں ان دونوں کو کمرہ مل گیا اور وہ اس کمرے میں مقیم ہو گئے۔

کوروتی اس دوران شاہ زیب سے کافی بے تکلف ہو چکی تھی۔ یہاں ان دونوں نے اپنے نام پاسپورٹوں کے مطابق ہی درج کرائے تھے جو جعلی تھے۔ اس کی ہدایت بھی ڈینئل ہی نے کی تھی۔ انہوں نے خاصا وقت کمرے میں گزارا اور پھر شام کو نیچے اتر آئے۔ طے یہ پایا کہ تھوڑی دیر دہلی کی سڑکوں پر چہل قدمی کی جائے اور پھر دونوں ہوٹل سے نکل کر پیدل ہی چل پڑے تھے۔

لاتعداد روایتوں کا شہر دہلی ان کے سامنے تھے۔ شاہ زیب اس سے پہلے کبھی دہلی نہیں آیا تھا، لیکن اس کی کہانیاں بہت سی تھیں۔ آج دہلی کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی لیکن ان روایتوں کے کھنڈرات آج بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ کوروتی شاہ زیب کے ساتھ بہت خوش تھی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ لاتعداد نگاہیں ان کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ پتا نہیں اس کی وجہ کیا تھی لیکن کوروتی کچھ جھینپی جھینپی سی نظر آرہی تھی۔

کافی دیر تک وہ چہل قدمی کرتے رہے اور اس کے بعد راکس واپس آگئے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر کوروتی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شاہ زیب! کیا تم نے محسوس کیا کہ بہت سے لوگ ہمیں خاص طور سے دیکھ رہے تھے؟''

''ہاں۔'' شاہ زیب نے سرسری انداز میں کہا۔

''اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟'' کوروتی کے ہونٹوں پر ہلکی سی خوشی مسکرارہی تھی۔

''تمہاری خوبصورتی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔'' شاہ زیب نے سادہ سے انداز میں کہا، ظاہر ہے یہی بات اس کے ذہن میں آئی تھی، لیکن کوروتی کی آنکھوں میں شرم کے تاثرات نظر آنے لگے تھے وہ بولی۔

''اور تمہیں کیوں دیکھ رہے تھے؟'' اب شاہ زیب نے محسوس کیا کہ اس کے اس سوال میں شرارت سی چھپی ہوئی ہے، چنانچہ اس نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

''سوچ رہے ہوں گے کہ حور کے پہلو میں لنگور کہاں سے پہنچ گیا؟'' کوروتی ہنس پڑی۔

''یہ انکسار، تو لکھنؤ والوں کا ہے، تم نے کہاں سے سیکھ لیا؟''

''سچ بولا ہے اس میں انکسار کی کیا بات ہے؟''

''میرا خیال کچھ اور ہے۔''

''کیا؟''

''بس جو ہے بتایا نہیں جاسکتا۔''

''چلو ٹھیک ہے جانے دو۔'' شاہ زیب آہستہ سے بولا۔ کوروتی خاموش ہوگئی، ذرا دیر بعد پھر کہنے لگی۔

''یوں لگتا ہے جیسے برسوں کی قید کے بعد رہائی ملی ہو۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات ضرور ہیں شاہ زیب، مگر تمہارا ساتھ مل جانے سے ایسا لگتا ہے جیسے اب میں محفوظ پناہ میں ہوں۔''

''میں کوشش بھی یہی کروں گا کہ تمہیں اس پناہ کا احساس ہوتا رہے اور تم اپنی منزل پر پہنچ جاؤ۔''

''منزل۔'' اس نے ایک سسکی لی۔ ''یہ منزل تو میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے نجانے کیسا لگے گا اس وقت جب میرے اپنے مجھے ملیں گے۔ کیسے ملیں گے، یہ بھگوان ہی جانے۔'' شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پھر بولی۔

''تم کچھ بجھے بجھے سے ہو؟''

''نہیں کوروتی ایسی بات تو نہیں ہے۔''

''پتا نہیں تمہارا دل کہاں جانے کا تھا، میرے چکر میں پڑ کر اپنا راستہ کھوٹا کرلیا۔ اس کے صلے میں میں تمہیں کیا دوں گی۔''

''نہیں کوروتی، تم جو کچھ سوچ رہی ہو ایسا نہیں ہے۔ میں اپنی خوشی سے تمہارے کام کے لیے آمادہ ہوا ہوں اور میری یہی خواہش ہے کہ تمہارے مقصد کی تکمیل ہوجائے۔'' شاہ زیب نے کہا اور کوروتی ہنس کر چپ ہوگئی۔

شام کو اتر کر وہ ہال میں آگئے۔ دونوں اپنی میز پر بیٹھے خوش گپیاں کررہے تھے کہ ان کی نگاہ تھوڑے فاصلے پر اٹھ گئی۔ ایک بہت ہی قد آور اسمارٹ سا سکھ بیٹھا ہوا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت عورت بھی تھی، اس کی توجہ بھی ان کی طرف ہی تھی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ شاہ زیب خاص طور سے اس کے بارے میں سوچتا۔ لیکن اس وقت وہ ضرور چونکا جب وہ سکھ جوڑا اٹھ کر ان کی میز کے پاس آگیا۔

''بھیا جی، کسی بھی جوڑے کے بیچ میں مداخلت کرنا اچھی بات نہیں، لیکن دوستیوں کی خواہش کس کے دل میں نہیں

ہوتی۔ اجازت ہو تو آپ کے چند لمحات ہم لے لیں؟''

اس نے اتنی خوش اخلاقی سے یہ جملے ادا کیے تھے کہ انکار کرتے نہ بن پڑا اور شاہ زیب نے آہستہ سے کہا ''بیٹھیے سردار جی۔''

''بیٹھو روشالی۔'' اس نے اپنی ساتھی عورت سے کہا اور دونوں بیٹھ گئے۔ کوروتی بھی چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

''ہمارا نام جی وشال سنگھ ہے اور یہ ہماری دھرم پتنی روشالی سنگھ ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت سجتے ہیں اور آج ہمارا یہ خیال ہے کہ ہم دوسرے نمبر پر آ گئے۔ آپ کی دھرم پتنی بہت سندر ہیں اور آپ بھی۔'' اس نے کوروتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور کوروتی کا چہرہ گلال ہو گیا۔ شاہ زیب نے کچھ کہنا چاہا تو کوروتی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ شاہ زیب کے ذہن میں یہی تصور ابھرا تھا کہ کوروتی ان جملوں کی تردید نہیں کرنا چاہتی، چنانچہ وہ مسکرا کر رہ گیا۔

''آپ سے تعارف نہیں ہوا بھائی جی! آپ کا شبھ نام؟''

''میرا نام نینا سنہا ہے اور یہ میرے پتی رمیش سنہا۔'' شاہ زیب کے بجائے بجائے کوروتی بول پڑی تھی۔

''بڑی خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر۔ کہیں باہر سے آئے ہیں شاید، دلی کے نہیں لگتے؟''

''ہاں، ہم دونوں کئی ملکوں کی سیر کر کے واپس آئے ہیں۔''

''اوہو، میرا بھی یہی خیال تھا۔ تُو نے دیکھا روشالی، میں نے سچ ہی کہا تھا۔ دراصل آپ کا لباس بتاتا ہے کہ آپ تازہ تازہ کہیں باہر سے لوٹے ہیں۔'' وشال سنگھ کہنے لگا۔ ''میرا یہاں گاڑیوں کا چھوٹا موٹا کاروبار ہے اور واہ گورو کی عنایت سے اچھی خاصی زندگی گزار رہے ہیں۔ بات یہ ہے جی کہ ہم حسن پرست ہیں۔ روشالی نے ایک نگاہ مجھے دیکھا اور پسند کر لیا اور تل گئی اس بات پر کہ شادی کرے گی تو مجھ سے ہی کرے گی۔ میں نے اسے دیکھا تو میں نے بھی یہ سوچا کہ چلو ٹھیک ہے۔ اپنی ٹکر پر آ ہی جائے گی آہستہ آہستہ۔'' روشالی ہنسنے لگی تھی اور شاہ زیب احمقوں کی طرف ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ وشال سنگھ نے پھر کہا۔

''کیا بات ہے بھائی جی آپ ذرا کم بولتے ہیں مگر آپ کی دھرم پتنی جی خاصی خوش اخلاق ہیں''

''نہیں دوست، خوش اخلاق تو میں بھی ہوں۔ بس مجھے ذرا اپنی خوش اخلاقی کا اظہار کرنے میں دیر لگ جاتی ہے۔'' شاہ زیب نے صورت حال کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ویسے کوروتی کی اس حرکت کو بھی اس نے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا تھا، رفتہ رفتہ وہ کھلتی جا رہی تھی۔ خیر اب ایسی بات بھی نہیں تھی کہ وہ اس کی اس بے تکلفی سے کسی پریشانی کا شکار ہو جاتا۔ بس فطرتاً ہی وہ دیر سے کھلنے ملنے والوں میں سے تھا۔

وشال سنگھ ضرورت سے زیادہ ہی ملنسار تھا۔ ہم لوگوں کو اس نے اپنی رہائش گاہ پر دعوت بھی دے دی اور وعدہ لیا کہ ہم لوگ دوسرے دن رات کا کھانا وشال سنگھ اور اس کی بیوی کے ساتھ کھائیں گے۔ زبردستی کی بات تھی شاہ زیب اور کوروتی تو یہ فیصلہ بھی نہیں کر پائے تھے کہ دوسری رات وہ لوگ دہلی میں رکیں گے یا آگے بڑھ جائیں گے۔ خیال یہی تھا کہ یہاں کچھ وقت گزار کر ذرا معلومات حاصل کی جائیں گی اور اس کے بعد وہ لوگ راجپوتانہ کی طرف چل پڑیں گے۔

جب وہ لوگ اپنے کمرے میں پہنچے تو شاہ زیب نے کوروتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کوروتی بات سمجھ میں نہیں آئی؟''

''محسوس مت کرنا شاہ زیب۔ دراصل نجانے کیوں مجھے ان لوگوں کی آنکھوں میں کچھ شبہات محسوس ہوئے تھے اور تم جانتے ہو کہ اس وقت میں زمانے سے ڈری ہوئی ہوں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ہم انہیں اپنی اصلیت بتا دیں اور پھر زبانی طور پر یہ جملے کہنے میں اتنا بڑا حرج بھی نہیں ہے۔''

''تعجب ہے۔'' شاہ زیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ تم ہندوستانی خاتون ہو اور ہندوستانی لڑکیوں کے بارے میں میں نے یہ سنا ہے کہ وہ جسے ایک بار دل

سے اپنا پتی مان لیتی ہیں۔ ساری زندگی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔''

کوروتی ہنسنے لگی پھر بولی ''تم اطمینان رکھو شاہ زیب، میرے اور تمہارے درمیان تو بہت بڑی خلیج حائل ہے، مذہب کی خلیج...اور پھر ویسے بھی نہ تم اتنی بری طبیعت کے مالک ہو اور نہ میں.. پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تم جب چاہو گے ،میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گی۔''

شاہ زیب نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر بولا ''اور اگر میں نہ چاہوں تو؟''

''یہ سب بعد کی باتیں ہیں پہلے تو ہمیں اپنی منزل تلاش کرنی ہے۔ جس کا تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔'' کوروتی نے کہا اور ایک لمحے میں شاہ زیب نے محسوس کرلیا کہ اب اس کی ذہنی کیفیت کافی بدل چکی ہے۔ وہ شاہ زیب کی طرف مائل نظر آتی تھی۔ چند لمحے وہ دونوں خاموشی سے کچھ سوچتے رہے پھر شاہ زیب نے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کوروتی۔ یہ شک کس قسم کا ہوسکتا ہے؟''

''میں نہیں جانتی بس یوں سمجھ لو میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کیا تھا اور میں نے ان کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ہماری طرف دیکھ دیکھ کر کچھ گفتگو کررہے تھے۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ دن میں جب ہم لوگ چہل قدمی کررہے تھے تو بہت سی نگاہیں ہماری طرف اٹھی تھیں۔ لیکن ان نگاہوں کا مفہوم کچھ اور تھا۔ جبکہ اس جوڑے کی نگاہوں میں میں نے کچھ مختلف کیفیت دیکھی ہے۔''

رات کا کھانا ان دونوں نے کمرے میں ہی منگوالیا تھا اور اس کے بعد وہ آرام کرنے لیٹ گئے۔

کوروتی شاہ زیب سے کچھ فاصلے پر لیٹی خاموشی سے چھت کو گھور رہی تھی۔ نجانے کیوں شاہ زیب کے ذہن میں سنسناہٹیں پیدا ہونے لگیں۔ کافی دیر اسی طرح خاموشی سے گزر گئی، پھر کوروتی نے شاہ زیب کو پکارا۔

''نیند آرہی ہے۔''

''نہیں کوئی خاص نہیں۔''

''تو پھر خاموش کیوں ہو؟''

''یہ بھی کوئی خاص بات نہیں۔''

''چلو عام ہی سہی بتا تو دو؟''

''نہیں کوروتی، ظاہر ہے مختلف خیالات ذہن میں آتے رہتے ہیں۔ ان میں عموماً بے سروپا ہی ہوتے ہیں۔ میں اس وقت کوئی خاص بات نہیں سوچ رہا، لیکن تم بھی تو کسی سوچ میں گم تھیں۔''

''ہاں...میں تو بس وہی سب کچھ سوچ رہی تھی جو آج تک سوچتی رہی ہوں۔''

''ہاں میں جانتا ہوں تمہارے ذہن میں نجانے کیا کیا خیالات آتے ہوں گے۔''

''نیند آرہی ہے تو پھر کیوں نہ چائے منگوا کر پی جائے؟''

''اگر تم ضرورت محسوس کررہی ہو؟''

''نہیں..بس بیٹھیں گے، کچھ باتیں کریں گے؟'' کوروتی نے کہا۔

ابھی وہ بات ہی کررہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ نجانے کون آیا تھا۔ شاہ زیب نے دروازہ کھولا تو بہترین لباس میں ملبوس ایک شخص ایک ویٹر کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ ویٹر وہی تھا جو ان لوگوں کے کمرے میں سروس کررہا تھا۔ دوسرے شخص نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔

''معاف کیجیے گا۔ مجھے آپ کے آرام میں مداخلت کا حق تو نہیں پہنچتا، لیکن ہوٹل کے منیجر کی حیثیت سے مجھ پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی تکمیل میں ضروری سمجھتا تھا۔ کچھ باتیں کرنی ہیں آپ سے، اس ویٹر کو اپنی تصدیق کے لیے ساتھ لے آیا تھا۔''

''آیئے منیجر صاحب، ویٹر تم ہمارے لیے چائے بھجوادو۔''

''بہت بہتر جناب۔'' ویٹر نے گردن خم کی اور واپس چلا گیا۔ منیجر اندر آ گیا اس نے کوروتی کو دیکھا جس نے اب سلیپنگ گاؤن پہن لیا تھا۔

''میں آپ لوگوں کی توجہ اس شخص کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں، جس کا نام وشال سنگھ ہے اور جس نے اپنی ساتھی عورت کے ساتھ آپ سے ملاقات کی تھی۔''

''ساتھی عورت۔ اس نے اس کا نام کوروتی بتایا تھا اور اسے اپنی بیوی کہا تھا۔''

''ایک بات میں آپ سے عرض کر دوں، کوروتی سب کچھ ہو سکتی ہے اس کی بیوی نہیں ہے۔ یہ بات آپ جہاں سے چاہیں تصدیق کر لیں، وہ ایک ٹرانسپورٹر ہے لیکن اس کا کاروبار درحقیقت کچھ اور ہے۔ پولیس کے پاس ممکن ہے اس کے سلسلے میں کوئی ثبوت ہو لیکن پولیس نے اسے آج تک گرفتار نہیں کیا۔ وہ مختلف جرائم میں ملوث ہے، غیر ملکیوں سے دوستی بڑھاتا ہے اور پھر انہیں اپنے جال میں پھانس لیتا ہے۔ ہر چند کہ آپ مقامی لوگ ہی معلوم ہوتے ہیں، لیکن چونکہ باہر سے آئے ہیں اس لیے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ آپ کو صورت حال بتا دوں۔''

''شکریہ، مسٹر منیجر! آپ نے ہم پر احسان کیا ہے۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔ ''ہم جے پور جانا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں ہماری ضروریات پوری نہیں ہو سکی تھیں۔ چنانچہ ہم نے یہاں دہلی میں قیام کیا ہے آپ براہ کرم کل دن میں کسی وقت ہمارے جے پور جانے کا بندوبست کر دیجیے۔''

شاہ زیب نے کوروتی سے مشورہ کئے بغیر پروگرام بنا لیا، ہو سکتا ہے وشال سنگھ کے دل میں ان دونوں کے لیے کوئی ایسی ہی بات ہو اور وہ کسی بھی قسم کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس وقت تک خطرات کو ٹالتے رہنا زیادہ بہتر تھا جب تک صورت حال ناگزیر نہ ہو جائے۔ منیجر نے گردن خم کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی خواہش کی تکمیل ہو جائے گی، ظاہر ہے آپ بذریعہ ٹرین روانہ ہونا پسند کریں گے۔''

''بے حد شکریہ منیجر، ایک بار پھر ہم اس عنایت کے شکر گزار ہیں۔''

''کوئی بات نہیں جناب! یہ میرا فرض تھا۔ اجازت چاہتا ہوں۔'' منیجر نے کہا اور وہ لوگ اسے دروازے تک چھوڑنے آئے۔ دروازہ بند کر کے شاہ زیب نے کوروتی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اب سنجیدہ ہو گئی تھی کہنے لگی۔

''ہو سکتا ہے وشال سنگھ ہمیں غیر ملکی جوڑا سمجھ کر لوٹنا چاہتا ہو، یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی اس ملاقات میں کوئی گہرائی پوشیدہ ہو۔''

''کیا کہا جا سکتا ہے لیکن محتاط رہنا اچھی بات ہے تم میری اس کارروائی سے اختلاف تو نہیں رکھتیں؟''

''بالکل نہیں شاہ زیب، یہ بہتر ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے ہم یہاں سے نکل جائیں نجانے کیوں میں ذہنی طور پر ایک خلش سی محسوس کرنے لگی ہوں ایسا لگ رہا ہے جیسے وشال سنگھ...'' وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ شاہ زیب نے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن تقریباً گیارہ بجے منیجر نے ان دونوں کو ٹرین کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کے دو ٹکٹ لا کر دیے اور بتایا کہ بارہ بج کر بیس منٹ پر ٹرین روانہ ہوگی۔ تمام انتظامات مکمل کر دیے گئے ہیں۔

منیجر کو تمام ادائیگیاں کر دی گئیں اور ان دونوں نے ذاتی طور پر شکریہ بھی ادا کیا پھر اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ مقررہ وقت سے کافی پہلے اسٹیشن پہنچ گئے۔ یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ وشال سنگھ کہیں سے انہیں پا لے۔ ٹرین کہیں اور سے آ رہی تھی، دہلی کے اسٹیشن پر اسے صرف بیس منٹ رکنا تھا چنانچہ ان دونوں کے اسٹیشن پر پہنچنے کے چند منٹ کے بعد مطلوبہ ٹرین آ گئی اور یہ دونوں فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کو تلاش کر کے بیٹھ گئے۔

کمپارٹمنٹ میں ان دونوں کے علاوہ بھی بہت سے افراد تھے، شاہ زیب اور کوروتی کو ہر شکل پر شبہہ سا ہوتا کہ وشال سنگھ آ پہنچا ہے۔ ٹرین چلی تو کوروتی اطمینان سے بیٹھ کر مسکراتی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھنے لگی۔

''ابھی تک تمہارے ذہن پر وشال سنگھ ہی سوار ہے۔''

''ہاں تم نے اپنی ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دی ہے۔'' شاہ زیب نے کہا اور وہ لگاوٹ کے انداز میں شاہ زیب کو دیکھنے لگی پھر اس نے آہستہ سے آنکھیں بند کرلیں۔

☆......☆......☆

یہ لوگ جے پور ریلوے اسٹیشن پر اترنے کے بعد ہوٹل چل دیے۔ شہر بڑا شاندار تھا، ماحول میں وہی سب کچھ تھا جس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ہوٹل میں مقامی اور غیر مقامی لوگ موجود تھے۔ یہاں وہ دونوں اپنے کمرے میں بند ہوکر رہ گئے۔ اب فیصلہ یہ کرنا تھا کہ یہاں سے پہلے دھونا نواس کی جانب روانہ ہوا جائے یا سکھی پور کی طرف، جہاں کوروتی نے پرورش پائی تھی اور جہاں سے ان دونوں کو بھرت چند کے بارے میں معلومات حاصل ہوسکتی تھیں۔ کوروتی نے پہلے دھونا نواس چلنے کا مشورہ دیا جہاں ویریندر سنگھ کا خاندان آباد تھا۔ ہوسکتا ہے کچھ ایسی باتیں انہیں معلوم ہوں جو کوروتی کے لیے بہتر ثابت ہوں۔

دوسرے دن صبح تیار ہونے کے بعد شاہ زیب کوروتی کے ساتھ باہر نکلا ہی تھا کہ اس کی نگاہ سامنے کی جانب اٹھ گئی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ یہ قابل یقین بات نہیں تھی، لیکن آنکھوں کو جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ان کے سامنے کچھ فاصلے پر وشال سنگھ اپنی نام نہاد بیوی کے ساتھ موجود تھا، دونوں اس طرح آرہے تھے کہ اگر وہ دونوں ان کے سامنے سے ہٹنا بھی چاہتے تو یہ ممکن نہ ہوتا، لیکن ان کا انداز ایسا تھا، جیسے انہیں شاہ زیب اور کوروتی کے بارے میں معلوم نہ ہو۔ ان کا اچانک یہاں پہنچ جانا قابلِ حیرت تھا، لیکن اب جو سامنے تھا وہ جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا، پھر وہی ہوا، یعنی ان دونوں نے شاہ زیب اور کوروتی کو دیکھ لیا اور ٹھٹک کر رہ گئے۔ وشال سنگھ کا منہ حیرت سے پھیل گیا، اس نے پہلے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پھر ان دونوں کی طرف بڑھا۔

''بھائی جی ذرا یہ کرپان تو میرے پیٹ میں چبھو دو تاکہ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین آجائے یا پھر بڑے آرام سے یہ کہہ دو کہ تم وہ نہیں ہو جس کی ہمیں تلاش تھی۔''

''تمہارا یہاں پہنچ جانا بھی تو اتنا ہی حیرت انگیز ہے وشال! تمہیں دہلی میں ہونا چاہیے تھا۔'' شاہ زیب نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''بھائی جی، ہم ذرا دوسرے قسم کے آدمی ہیں، جو بات دل میں ٹھان لیتے ہیں اسے کرکے چھوڑتے ہیں۔ تم لوگ ہوٹل چھوڑ کر چل پڑے ہمیں بتائے بغیر۔ کسی کی دعوت ایسے بھی ٹھکرائی جاسکتی ہے، یہ تجربہ ہمیں پہلی بار ہوا تھا، مگر وشالی سنگھ جانتی ہے کہ واہ گرو کی مدد سے وشال سنگھ ہر اس جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں اسے پہنچنا ہوتا ہے، دیکھو لو، ہم تمہیں تلاش کرتے ہوئے آہی گئے، اب کیا خیال ہے، کیسے نکلو گے ہمارے چنگل سے؟''

''تعجب کی بات ہے وشال سنگھ، تم تو واقعی الہ دین کے چراغ کے مالک معلوم ہوتے ہو۔''

''ہاں جی! بالکل ٹھیک کہا آپ نے، لیکن ہم الہ دین نہیں وشال سنگھ ہیں، اب تو آپ ہمارے چراغ کی بات کریں۔ یہ بتائیں چلے کہاں گئے تھے؟''

''کہیں نہیں، جے پور آگئے تھے، اچانک ہی پروگرام بنا تھا اور سوچا کہ وشال سنگھ سے تو اب دوبارہ زندگی میں ملنا نہیں، کون معذرت کرے۔ میری بیوی جے پور آنا چاہتی تھی، چنانچہ فوری فیصلے کے تحت ہم یہاں آگئے۔''

''ٹھیک ہے جی، اب اپنے کمرے میں چائے بھی مت پلاؤ ہمیں، وشال سنگھ اتنا ہی برا آدمی ہے۔''

شاہ زیب ان دونوں کو لے کر اپنے کمرے میں آگیا اور انہیں چائے کی پیشکش کی۔

''مگر بھائی جی، تم نے کم از کم ہمیں اطلاع تو دے دی ہوتی کہ جارہے ہیں، بڑے اہتمام سے پہنچے تھے تمہارے پاس کہ تمہیں ساتھ لے آئیں گے، مگر پتا چلا کہ تم تو دن ہی میں وہاں سے چل پڑے ہو، بس یہ تو تمہاری محبت ہی تھی کہ ہم تمہاری خوشبو سونگھتے ہوئے یہاں پہنچ گئے۔''

''تم ہوا میں اڑ کر آئے ہو وشال سنگھ۔''

''بالکل ٹھیک جی، بالکل ٹھیک... میں ریل کے سفر کا قائل نہیں ہوں، بس کچھ ذرائع ہیں میرے پاس، مگر دیکھو! کیسا پکڑا تمہیں۔ اب اگر تم چاہو تو خاموشی سے یہاں سے بھی فرار ہو جاؤ۔ وشال سنگھ وہیں نہ پہنچ جائے، جہاں تم جاؤ تو اس کا نام بھی وشال سنگھ نہیں۔''

شاہ زیب ہنسنے لگا تھا، درحقیقت اس شخص سے اُسے کوفت محسوس ہو رہی تھی، عجیب چپکو آدمی تھا، جان کو لگا تھا تو چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتا تھا، لیکن وہ یہ بات ماننے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا کہ اسے شاہ زیب اور کوروتی کے جے پور آنے کی خبر نہیں ہے، یا تو اس کا ذریعہ منیجر ہی بنا تھا یا ہو سکتا ہے کہ وشال سنگھ کے اپنے ذرائع ہوں اور اس نے ان دونوں پر کڑی نگاہ رکھی ہو اور اسے بروقت اطلاع دے دی گئی ہو کہ بذریعہ ٹرین جے پور کا سفر کر رہے ہیں اور اسی وقت ان دونوں کے ساتھ چل پڑا ہو، یہاں اس ہوٹل میں پہنچ جانا بھی معمولی بات تو نہیں تھی۔ یہ ساری باتیں ذہن میں آ رہی تھیں، لیکن ظاہر ہے کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وشال سنگھ سنجیدگی سے کہنے لگا۔

''ہمارا ٹرانسپورٹ کا کاروبار ہے بھائی جی اور ہندوستان کے مختلف صوبوں میں ہمارے ٹرک آتے رہتے ہیں، یہاں جے پور میں بھی میرے چھ ٹرک آتے ہیں، دن اور رات کا سفر ہے ان کا، یہاں بھی ہم نے اپنے لیے ٹھکانہ بنا رکھا ہے اور بھیا جی دیکھو، ایک بار ہماری دعوت ضرور قبول کر لو، بعد میں چاہے جیون بھر مت ملنا، مگر وشال سنگھ کے دل میں یہ خلش نہیں رہنی چاہیے کہ اس نے کسی کو مہمان بنانے کی کوشش کی اور اس نے اسے ٹھکرا دیا۔''

''ہم سات بجے آ رہے ہیں گے۔'' شاہ زیب نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' کوروتی نے بھی پُرسکون انداز میں آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی۔

جب وہ دونوں چلے گئے تو کوروتی پھر شاہ زیب سے مخاطب ہوئی۔ ''یہ سب اتفاق نہیں ہے شاہ زیب بلکہ سوچی سمجھی اسکیم ہے، لیکن تم نے کچھ اور بھی تو کہا تھا۔''

''کیا؟'' شاہ زیب نے حیرت سے پوچھا۔

''تم نے کہا تھا کہ ڈینئل نے کچھ ایسے لوگوں کو ہماری نگرانی کے لیے مقرر کیا ہے جو سادھوؤں کے بھیس میں ہوں گے۔ ابھی تک تو کوئی نظر نہیں آیا۔''

''پتا نہیں، یہ سب کیا ہو رہا ہے ویسے یہ خطرناک آدمی ہے، یہ بات میں دعوے سے کہتا ہوں''

''پھر کیا خیال ہے کیا یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی جائے، اگر ممکن ہو سکے تو اب ہم دھونا نو اس جا کر ہی پناہ لیں۔''

''نہیں... میرا خیال ہے اس سے دو دو ہاتھ ہونے چاہیے ہیں۔''

''میں نے بھی اسی لیے وعدہ کیا ہے، دیکھیں تو سہی، میں نے تو پہلے بھی تم سے کہا تھا کہ میں خود کسی ایسے آدمی کو چاہتی ہوں جو ہماری طرف متوجہ ہو۔ میرا خیال ہے شاہ زیب اسے اچھی طرح دیکھ لیا جائے۔ ہم تیاریاں کر کے چلیں گے اور اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو پھر۔''

''ٹھیک ہے، تم اطمینان رکھو۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

شام چھ بجے کے قریب کوروتی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولی۔

''تیار ہو جائیں کیونکہ وقت ہونے والا ہے۔ وہ پہنچنے ہی والا ہوگا۔''

''ہاں۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

کوروتی نے ایک انتہائی حسین ساڑی زیب تن کی جس سے وہ بلاشبہ کوئی ہندوستانی راج کماری ہی معلوم ہو رہی تھی، وقت مقررہ پر وشال سنگھ اور روشالی سنگھ پہنچ گئے۔

''آپ لوگ تیار ہیں؟'' وہ آتے ہی چہکا۔

''ہاں وشال سنگھ جی، یہ انوکھی اور بڑی دلچسپ دعوت ہے کیونکہ زبردستی کی جا رہی ہے۔''

وشال سنگھ نے ایک بلند قہقہہ لگایا ''ہاں بعض دعوتیں ایسی بھی ہوتی ہیں؟''

شاہ زیب کوروتی کو ساتھ لیے باہر نکل آیا، نیچے ایک خوبصورت کار کھڑی تھی۔ کار کا سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا تھا، کچھ ہی دیر کے بعد وہ لوگ سرخ پتھروں سے بنی ہوئی اس حویلی میں داخل ہور ہے تھے۔ شاہ زیب اور کوروتی نے اس حویلی کی کافی تعریف کی تھی۔ وشال سنگھ ہنس کر کہنے لگا۔

''تم نے یہ تو سوچا ہوگا رمیش سنہا جی کہ وشال سنگھ بس ایسے ہی لفنگا سا آدمی ہے، مگر کوئی بات نہیں۔ وشال سنگھ کی دوستی کتنی فائدہ مند رہتی ہے، یہ وہی جانتے ہیں جو اس کے دوست ہیں۔''

وشال سنگھ ان دونوں کو لیے ہوئے عظیم الشان ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جس کا ایک حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، روشنیوں کا انتظام کچھ اس طرح کیا گیا تھا کہ ڈرائنگ روم کے مختلف حصے تاریکی میں رہیں۔ جہاں اُن لوگوں کو بٹھایا گیا تھا وہاں مکمل روشنی تھی۔ اُن کے سامنے چائے اور خشک میوے لاکر رکھ دیے گئے اور ان دونوں کی ابتدائی خاطر مدارت شروع ہوگئی۔ شاہ زیب وشال سنگھ سے مختلف باتیں کرتا رہا، شاہ زیب نے ایک تصویر دیکھی جو کوروتی کی تھی اور صورت حال اس کی سمجھ میں آگئی۔ اسی وقت وشال سنگھ نے کہا۔

''ایک منٹ؟'' وہ اپنی جگہ سے اٹھا روشالی بھی اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی تھی۔ تب شاہ زیب نے سرگوشی کے انداز میں کوروتی سے کہا ''کوروتی جو چیز یہ شخص دکھانا چاہتا ہے میں دیکھ چکا ہوں، شاید تم نے اس کا اندازہ نہ لگایا ہو، لیکن میری تیز آنکھیں اس چیز کو دیکھ چکی ہیں، ایک تصویر جو ہو بہو تمہاری ہے، اس سلسلے میں ہم تنہائی میں بات کریں گے، میں تمہیں ایک وارننگ دینا چاہتا ہوں جس پر تمہیں پوری توجہ سے کام کرنا ہے۔''

''کیا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ تصویر سو فیصدی تمہاری ہے، تم اسے دیکھ کر حیرت کا اظہار ضرور کروگی، لیکن کسی قسم کا اضطراب یا کوئی ایسی کارروائی نہیں کروگی جس سے وشال سنگھ کو یہ احساس ہو کہ تم اس تصویر سے کوئی وابستگی رکھتی ہو۔''

''اوہ....اوہ....''

''وہ واپس آرہا ہے، خیال رکھنا۔'' شاہ زیب نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا اور وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ اپنے آپ پر قابو کس طرح پاتی ہے؟ وشال سنگھ نے تیز روشنی کردی اور پورا ڈرائنگ روم جگمگانے لگا، وہ دونوں حیرت اور دلچسپی کا اظہار کررہے تھے۔

وشال سنگھ نے آہستہ سے کہا ''دوستو! میرے ساتھ آؤ۔''

کوروتی اور شاہ زیب اٹھ گئے۔ وشال سنگھ نے روشالی کو وہیں تصویر کے قریب چھوڑ دیا تھا، پھر اس نے اس کی طرف اشارہ کیا اور شاہ زیب اور کوروتی وہ تصویر دیکھنے لگے۔ وشال سنگھ کی نگاہیں ان دونوں کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ تصویر ہو بہو کوروتی کی تھی، شاہ زیب نے حیرت و دلچسپی کا اظہار کیا۔ کوروتی نے بھی کمال کی اداکاری کی تھی، اس کے ہونٹوں پر پُر تجسس مسکراہٹ تھی اور وہ دلچسپی کی نگاہوں سے تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ شاہ زیب نے وشال سنگھ سے کہا۔

''وشال سنگھ، کمال ہے یہ تو نینا کی تصویر ہے۔''

''ہاں..نینا ہمارے پاس بہت پہلے سے موجود ہے۔'' وشال سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم انہیں کہاں سے چرالائے، یوں لگتا ہے نینا کا یہ دوسرا جنم ہوا اور پہلے جنم سے تمہارا ان سے کوئی تعلق ہو؟''

وشال سنگھ نے قہقہہ لگایا اور آہستہ سے بولا ''ویسے سچ بتا نا رمیش جی، نینا کو دیکھ کر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اس تصویر میں نہیں ہیں؟''

''نہیں وشال سنگھ، تم نے واقعی ہمیں حیران کردیا ہے، نینا کی یہ تصویر تو کافی پرانی معلوم ہوتی ہے۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ وہ کبھی یہاں آچکی ہے، کم از کم اس جنم میں تو یہ ممکن نہیں، ہاں پہلے جنم کی بات اور ہے، کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ نینا کا پہلا جنم ہے؟'' شاہ زیب نے پوچھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا "نہیں، لیکن اس سے تمہیں یہ اندازہ ضرور ہو گیا ہوگا کہ میری تم سے دلچسپی بے لوث نہیں تھی۔"

"کمال ہے، واقعی کمال ہے۔ تصویر کافی پرانی معلوم ہوتی ہے اور ہم اس سے پہلے یہاں نہیں آئے۔"

"بالکل ٹھیک، تصویر کافی پرانی ہے، اس کے رنگوں سے تم اندازہ لگا سکتے ہو لیکن اتنی قدیم بھی نہیں ہے کہ تم اسے سو سال پرانی کہہ سکو، تمہیں یہ سب کر تعجب ہوگا کہ یہ تصویر کسی کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔"

"نینا کو اگر یہ لباس پہنا دیا جائے تو کیا وہ اس تصویر کی طرح نہیں ہو جائے گی؟"

"ہاں میرا بھی یہی اندازہ ہے۔"

"اور میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ کوئی اس میں بہت دلچسپی لے رہا ہے۔ آؤ میرا خیال ہے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

وشال سنگھ روشالی کے ساتھ واپس آ گیا اور یہ سب صوفوں پر بیٹھ گئے۔

کوروتی نے واقعی بڑے تحمل کا مظاہرہ کیا تھا اور شاہ زیب اس بات سے خوش تھا کہ اس نے ان لوگوں کو ذرا بھی موقع نہیں دیا تھا۔ اس کی نگاہیں اب بھی کوروتی اور شاہ زیب کا جائزہ لے رہی تھیں۔ شاہ زیب نے شدید حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اب اس راز پر سے پردہ اٹھا بھی دو وشال سنگھ، یہ بات تو ثابت ہو گئی بلکہ تم نے خود اس کا اعتراف کر لیا کہ تم بلاوجہ ہماری طرف متوجہ نہیں ہوئے اور وہ کون شخص ہے جو اس تصویر میں دلچسپی لے رہا ہے؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے ڈیئر رمیش، میں تمہیں مختصر الفاظ میں ایک بات بتانا چاہتا ہوں، لیکن اس سے پہلے کچھ سوالات بھی ضروری ہیں۔"

"ضرور ضرور..." شاہ زیب نے جواب دیا۔

"بڑی بری بات ہے، لیکن بعض باتیں جان بوجھ کر کرنا ہوتی ہیں۔ راکس جیسے ہوٹل میں قیام کرنے والے مالی طور پر کمزور تو نہیں ہوتے، لیکن میں پھر بھی یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے مالی حالات کیسے ہیں؟"

"بہت اچھے نہیں، لیکن اطمینان بخش..." شاہ زیب نے جواب دیا۔

"اگر تمہیں مزید اطمینان حاصل ہو جائے تو کیا حرج ہے؟" وہ پُراسرار انداز میں مسکراتا ہوا بولا۔

"مطلب؟" شاہ زیب نے پوچھا۔

"تھوڑا سا کام، اور اس کے عوض لاکھوں روپے، کیا تم پسند کرو گے؟"

"کام کی نوعیت معلوم ہو جائے تو جواب دیا جا سکتا ہے۔ تم اس سے انکار نہیں کرو گے وشال سنگھ کہ ایک ایسا جوڑا جو ایک دوسرے سے پوری طور پر مطمئن ہو اور اپنے طور پر ایک بہتر زندگی گزار رہا ہو کسی خطرے میں پڑنا پسند نہیں کرے گا۔ میرے اپنے جو وسائل ہیں انہی کے تحت میں اپنی دھرم پتنی کو خوش رکھنا چاہتا ہوں، لیکن اگر تمہارا کوئی کام بن جائے اور مجھے کچھ مل جائے تو میں اسے برا بھی نہیں سمجھتا، بشرطیکہ اس میں کوئی خطرہ نہ ہو۔"

"خطرہ؟" وشال سنگھ پُرجوش انداز میں بولا "تم وشال سنگھ کو نہیں جانتے رمیش سنہا! میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں، اتنے لمبے کہ ان کی لمبائی کا تمہیں اندازہ ہو جائے تو تم اس سے دوستی پر ناز کرو گے میری جان۔ ایک ایسی پارٹی میرے چنگل میں ہے جو نینا یا اس کی ہم شکل کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ہم اگر ایک پروگرام بنا کر اس پارٹی کو مطمئن کر دیں تو یقینی طور پر ہمارے قبضے میں اتنی بڑی رقم آ جائے گی کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں تمہیں دس لاکھ روپے کی پیشکش کرتا ہوں اگر تم میرے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہو جاؤ۔"

"یہ بہت بڑی رقم ہے اور اس کے لیے خطرہ بھی مول لیا جا سکتا ہے، لیکن تم بغیر کسی پریشانی کے اس کام کی تفصیل بتا دو، ایک بات کا تم سے وعدہ کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ اگر یہ کام ہمیں اتنا ہی خطرناک لگا کہ ہم اس کرنے سے گھبرائے تو تمہیں انکار ضرور کر دیں گے، لیکن تمہارا یہ راز کبھی ہمارے سینوں سے باہر نہیں جائے گا۔"

''مجھے اطمینان ہے اور میں خود بھی انہی شرائط پر تم سے سودا کرنا چاہتا ہوں۔ جس پارٹی کو اس تصویر کی ہم شکل لڑکی کی ضرورت ہے، وہ بہت بڑی پارٹی ہے اور نیک نام تصور کی جاتی ہے۔ بہت پہلے کی بات ہے کہ مجھ سے اس سلسلے میں ان کی گفتگو ہوئی تھی اور یہی تصویر اس وقت میرے حوالے کی گئی تھی۔ میں نے ان سے معلوم کرنے کی کوشش بھی کی کہ انہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آ گئی ہے تو مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا گیا، بس یہ کہا گیا کہ میں اگر اسے تلاش کر کے ان کے حوالے کر دوں تو وہ اس کے لیے مجھے بہت بڑی رقم پیش کر سکتے ہیں۔'' تھوڑی دیر کے لیے وہ رکا اور اس کے بعد پھر بولا۔

''میں نے ابتداء میں بہت کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ مجھے کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی تھی۔ پھر میں نے یہ تصور چھوڑ دیا اور اس دن تم لوگ اتفاق ہی سے مجھے نظر آ گئے تھے۔ میں نے روشالی سے کہا کہ کیا یہ لڑکی اس تصویر کی ہم شکل نہیں ہے تو روشالی نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہم کسی بھی طرح تم لوگوں کو اس بات پر مجبور کرنا چاہتے تھے کہ تم ہماری یہ پیشکش قبول کر لو، لیکن اگر یہ کام دوستانہ بنیاد پر ہو جائے تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے بعد میں یہی فیصلہ کیا کہ خود تمہیں بھی اس راز میں شریک کر لیا جائے، لیکن اس کے لیے میرے اور میری پتنی کے درمیان اور تجویز طے پائی تھی۔ ہم نے سوچا تھا کہ پہلے تمہیں یہ تصویر دکھا دی جائے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے کہ کیا نینا جی وہی لڑکی ہیں جس کی تلاش تھی یا پھر صرف یہ اتفاق ہے۔ اگر نینا جی وہی ہوتیں تو یقیناً تم لوگ اس تصویر کو دیکھ کر حیران ہوتے، ہمارے بارے میں سوچتے، لیکن یہ اندازہ با آسانی ہو گیا کہ تم نے اس تصویر کو دیکھ کر حیرت کا اظہار ضرور کیا لیکن اس سے اپنی کوئی شناسائی ظاہر نہیں کی، جس کا مطلب ہے کہ یہ صرف اتفاق ہے۔ تو پھر کیوں نہ ہم اس اتفاق سے فائدہ اٹھائیں۔ رمیش سنہا جی! میں تم سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہوں۔ انہیں ان کے حوالے کر دیں گے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی ہم اس بات کا بھی پورا پورا خیال رکھیں گے کہ کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ ان سے ہمارا بہترین ذریعوں سے رابطہ رہے گا اور اگر ان لوگوں کے قبضے میں پہنچنے کے بعد نینا جی کوئی کوئی خطرہ محسوس ہوا تو فوراً اور اگر نہ ہوا تو کچھ دن کے بعد نینا جی کو وہاں سے واپس حاصل کر لیا جائے گا۔ اس دوران ہم رقم وصول کر چکے ہوں گے اور پھر اس رقم کا آدھا آدھا ہم لوگ آپس میں تقسیم کر لیں گے۔ کیوں نینا جی! آپ کا کیا فیصلہ ہے؟'' اس نے کوروتی سے پوچھا۔

''اگر میرے لیے خطرہ مول لے کر یہ رقم حاصل کرنا ہی ہے تو تم لوگ جانو، میں اس معاملے میں خود کوئی مداخلت نہیں کر سکتی، بس میری زندگی کو کوئی خطرہ پیش نہیں آنا چاہیے اور اگر رمیش کو میرے ذریعے اتنی بڑی رقم حاصل ہو سکتی ہے تو میں اس سے انکار بھی نہیں کروں گی۔'' نینا نے کہا۔

''نہیں نہیں نینا جی، آپ کی زندگی کے لیے کوئی خطرہ مول لے کر تو ہم دس کروڑ بھی پسند نہیں کریں گے۔ میں سچے دل سے آپ سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مجھے آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس میں ایک مفاد ضرور ہے۔ مگر ایسے نہیں کہ اس مفاد پر آپ کو بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ جہاں تک آپ کی کسی تکلیف کا معاملہ ہے تو آپ اس کی ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ ایک ایک لمحہ آپ کی نگرانی کی جائے گی اور ہم زندگی کی قیمت پر یہ کام کریں گے۔ اگر آپ کو اطمینان ہو تو ٹھیک ہے، یہ ایک تجویز بھی جو پیش کر دی گئی اور اگر آپ یہ محسوس کرتی ہیں کہ اس میں زندگی کا خطرہ ہے تو پھر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ دولت تو کمائی جا رہی ہے اور کمائی جاتی رہے گی، ہم آپ کی زندگی کی قیمت پر کوئی دولت نہیں چاہتے۔''

''مجھے منظور ہے۔'' نینا نے جواب دیا ویسے شاہ زیب اور کوروتی دونوں ہی سنسنی محسوس کر رہے تھے۔ شاہ زیب نے وشال سنگھ سے پوچھا۔

''اب جبکہ ہمارے درمیان یہ معاہدہ ہو چکا ہے کہ کام اسی انداز میں کریں گے جس میں تم چاہتے ہو تو کم از کم یہ تو بتا دو کہ وہ پارٹی کون ہے اور نینا کو کہاں لے جانا ہوگا، یہ معلوم ہو جائے تو ہم اپنے طور پر بھی سوچ سمجھ سکیں۔''

وشال سنگھ نے روشالی کی طرف دیکھا اور روشالی نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں اب اس میں کوئی حرج تو نہیں۔ ویسے بھی میرا خیال ہے رمیش سنہا جی کسی بھی قیمت پر ہم سے بدعہدی نہیں کریں گے۔''

''نہیں اس کا کوئی چانس نہیں ہے۔ تم لوگ اطمینان رکھو؟'' شاہ زیب نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا۔
''ہمیں ایک قدیم ریاست شاستری پور جانا ہوگا۔ شاستری پور کے دیوان گرو داس جی نے یہ پیشکش کی ہے۔''
شاہ زیب نے اور کوروتی نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کوروتی گردن ہلاتے ہوئے بولی۔
''تعجب کی بات ہے مگر جیسا آپ لوگ فیصلہ کریں۔'' وشال سنگھ انہیں ہوٹل تک چھوڑنے آیا تھا۔
کوروتی شاہ زیب سے کہنے لگی ''یہ نیا نام سامنے آیا ہے شاہ زیب، شاستری پور! میں اس سے پہلے اس نام سے واقف نہیں تھی۔ یہ دیوان گرو داس جی کون ہو سکتے ہیں اور انہیں میری ضرورت کیوں پیش آ گئی؟''
''یہ تو بعد میں ہی معلوم ہو سکتا ہے، لیکن تم یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو؟''
''اسے خطرہ نہ کہو شاہ زیب، میں اپنی شناخت ہی تو چاہتی ہوں، پہنچ جانے دو مجھے شاستری پور، یہ معلوم تو ہو کہ آخر کسی کو میری کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے اور اس کی وجہ کیا ہے؟''
شاہ زیب کوروتی کے الفاظ کی گہرائی پر غور کرنے لگا تھا۔

............☆☆............

کوروتی شاہ زیب پر مکمل اعتبار کر چکی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو شوہر اور بیوی کی حیثیت سے لوگوں میں متعارف کرایا تھا۔ یہ ایک عارضی ضرورت تو تھی لیکن شاہ زیب نے بارہا کوروتی کے چہرے پر ایسے تاثرات دیکھے تھے جیسے یہ الفاظ سن کر اسے برا نہ لگتا ہو۔ عورت خواہ کچھ بھی ہو بعض چیزوں سے بہت متاثر ہوتی ہے۔ کوروتی اس وقت اپنے آپ کو اس احساس سے باز نہیں رکھ پائی تھی، جب اس کا تعارف شاہ زیب کی بیوی کی حیثیت سے کسی سے ہوتا۔ اس کے چہرے پر ایسا حجاب پھیل جاتا جس میں ناگواری کے تاثرات نہیں ہوتے تھے، اس کے چہرے کا گلابی پن اس کیفیت کا مظہر ہوتا تھا کہ وہ ان الفاظ سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔
آج بھی کوروتی پر کچھ ایسی ہی کیفیت طاری تھی۔ وشال سنگھ سے ملاقات کے بعد اس کے اندر ایک عجیب سا اضطراب نمودار ہو گیا تھا۔ بہرطور شاہ زیب نے ایک گہری سانس لے کر پاؤں پھیلا دیے تھے۔ کوروتی لباس تبدیل کر کے آئی تو شاہ زیب کی کھوپڑی ہوا میں اڑ گئی۔ یہ لباس یقیناً اس نے جان بوجھ کر پہنا تھا، وہ ایسی لڑکی نہیں تھی کہ دلی کیفیات کو لباس کے ذریعے منتشر کرتی، اس کے لہجے میں بھی کبھی ایسی کیفیت نہیں نمودار ہوئی تھی۔ جانے کہاں کہاں پرورش پائی تھی اور کیسے کیسے لوگوں کے ساتھ رہی تھی۔ لیکن شخصیت کا وہ حجاب جو مشرق کی دین ہے اس کے وجود میں موجود تھا۔ شاہ زیب نے اس کی آنکھوں میں ہلکی سی گلابی کیفیت اور ہونٹوں میں معمولی سی لرزش دیکھی تھی۔ اس وقت جو لباس اس نے زیب تن کیا تھا وہ اسے ہزار گنا زیادہ حسین بنا کر پیش کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس وقت کسی ایسی کیفیت کا آئینہ دار نہیں تھا جسے لطیف جذبات سے منسوب کر دیا جا سکتا۔ اس کے برعکس اس کے چہرے پر ایک مایوسی طاری تھی، آنکھوں میں یاسیت جھلک رہی تھی۔ اس کی کیفیت دیکھ کر شاہ زیب نے اپنے آپ کو سنبھالا وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں غور و فکر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔
''اب کیا سوچنے لگیں، آرام کرو، ہم جو فیصلہ کر چکے ہیں وہ غلط نہیں ہے۔ کم از کم میں اس سے پوری طرح مطمئن ہوں، ہاں اگر تمہارے ذہن میں کوئی ایسی بات ہے تو براہِ کرم مجھے بتاؤ۔''
''نہیں شاہ زیب، میں اس مسئلے پر نہیں سوچ رہی، بلکہ میرے ذہن میں کچھ اور ہی خیالات بھٹک رہے ہیں۔''
''مجھے بتانا پسند کرو گی؟''
''تمہیں نہیں بتاؤں گی تو پھر کیا کروں گی۔ میری زندگی میں اب تمہارے علاوہ اور ہے کون؟'' کوروتی نے جواب دیا اور شاہ زیب کھوپڑی پر ہاتھ پھیرنے لگا، یہ الفاظ بڑی اہمیت کے حامل تھے، لیکن شاہ زیب سے تو بہت سے لوگوں نے کہے تھے۔ جانے کس کس نے... جانے کس کس نے شاہ زیب سے کیا کیا امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ لیکن اب کوئی اس کے نزدیک نہیں تھا، کوروتی بھی چند روز کا کھیل تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آخر وہ بھی ایک دن فضاؤں میں گم ہو جائے گی اور شاید

چند ہی روز کے بعد شاہ زیب اس کی کہانی بھی بھول جائے گا کیونکہ اس پر اس سے بھی بڑی افتاد پڑ چکی ہو گی۔ کوروتی کو خود بھی اپنے الفاظ کا احساس نہیں تھا۔ وہ بدستور سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی، پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''ہم نے ساری باتیں سوچیں شاہ زیب لیکن ایک بات نہیں سوچی، کیا تمہارے ذہن میں بھی وہ بات نہیں آئی؟''

''کیا؟'' شاہ زیب نے بے اختیار پوچھا۔

''یہ بتاؤ وہ تصویر کس کی تھی؟''

''اوہ.. وشال سنگھ نے بھی ہمیں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''اگر میں اس سے پوچھتی تو وہ کیا بتا سکتا تھا؟'' کوروتی نے سوال کرنے والے انداز میں کہا۔

''بھلا مجھے کیا معلوم؟''

''چلو چھوڑو وشال سنگھ کو، تم بتاؤ، تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ تصویر انتہائی قدیم تھی، اس میں جو لباس تھا میں نے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا، لیکن کیا یہ لباس مہارانیوں کا سا نہیں تھا۔ وہ تصویر مجھ سے اتنی مل رہی تھی کہ میں خود بھی شاید اسے دیکھتی تو یہ یقین نہ کر پاتی کہ وہ میری نہیں ہے، لیکن اتنی قدیم تصویر اور میری؟''

''تمہارا مطلب کیا ہے کوروتی؟''

''تم سوچ نہیں رہے شاہ زیب، تم نہیں سوچ رہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں گم کردہ منزل ہوں، میں اپنے ماضی، خاندان اور لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی، میں انہی کی تلاش میں تو سرگرداں ہوں، میں یہ سوچ رہی ہوں کہ کہیں اس تصویر کا تعلق مجھ سے نہ ہو، کہیں کہیں وہ میری ماں نہ ہو۔ دیکھو شاہ زیب، یہ باتیں ڈرامائی حیثیت ضرور رکھتی ہیں، لیکن ان کی وجہ سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوتا کہ بہت سی اولادیں اپنے ماں باپ کی ہم شکل ہوتی ہیں، اتنی ہم شکل کہ لوگ حیرت کرتے ہیں۔''

''ہاں. تمہارا خیال درست ہے، میں نے تو ہم شکل کے معاملے میں بڑی چوٹیں کھائی ہیں، مجھ سے ایسی بات کر رہی ہو؟'' شاہ زیب نے سوالیہ انداز میں کہا اور کوروتی پُر خیال انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ پھر پُر تجسس انداز میں بولی۔

''کیا یہ ممکن نہیں ہو گا کہ اس تصویر کے بارے میں معلومات حاصل کریں؟''

''جہاں تک میرا خیال ہے کوروتی، وشال سنگھ براہ راست اس مسئلے میں ملوث نہیں ہے، تمہیں ہوٹل کے منیجر کے الفاظ ضرور یاد ہوں گے، اس نے کہا تھا کہ وہ ایک جرائم پیشہ شخص ہے اور ہر طرح کی لوٹ مار کے دھندے کرتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے وشال سنگھ نے ہم سے جو کچھ کہا ہو، صحیح ہو اور بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ اس کی باتیں سچ ہیں۔ کسی نے اس سے رابطہ قائم کر کے یہ تصویر اس کے حوالے کی ہو اور کہا ہو کہ اس طرح اسے ایک لڑکی کی تلاش ہے۔ وشال سنگھ نے اپنے طور پر ہمیں دیکھا اور پھر یہ جاننے کے لیے کہ کیا تم وہی لڑکی ہو، ہمیں اپنی حویلی میں لے گیا۔ یہ صرف اتفاق ہے کہ ہم نے دہلی سے جے پور ہی کا رخ کیا۔ میرا خیال ہے کہ وشال سنگھ کو حقیقت نہیں معلوم ہو گی، اس نے دس لاکھ روپے کی پیشکش کی ہے، ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں اسے پچاس لاکھ روپے یا اس سے کچھ زیادہ کی پیشکش ہوئی ہو۔ وشال سنگھ یقیناً ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکے گا۔''

کوروتی نے ایک سسکی لی ''نجانے کیوں میرے ذہن میں بار بار یہ تصور ابھرتا ہے کہ اس تصویر کا میرے خاندان سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔''

''ہو سکتا ہے ایسی بات ہو؟'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

کوروتی کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں، اس سے پہلے وہ کبھی اس قدر متاثر نظر نہیں آئی تھی لیکن اب نئی سوچ نے اسے یقیناً اداس کر دیا تھا، شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

''تم تو بڑی باہمت لڑکی ہو، بعض لوگ تقدیر کے ہیٹے ہوتے ہیں۔ انہیں زندگی میں ایسے مسائل درپیش ہوتے ہیں کہ وہ ان سے نمٹنے کی اہلیت نہیں رکھتے، لیکن بہر طور! جب مسئلے کا وجود ہے تو اس کے ساتھ ہی حل کا نام بھی آتا ہے۔ ہمیں

دیر ضرور لگ رہی ہے، لیکن ایک دن یقیناً ایسا ہوگا جب تم اپنوں کے بیچ پہنچ جاؤ گی۔ یقیناً تمہیں اس بات پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ ویسے بھی تمہاری زندگی میں ایسی کوئی بری بات نہیں جس کی وجہ سے تمہیں کسی گناہ کی سزا ملے۔ تم اطمینان رکھو۔ ایک دن ایسا ضرور ہوگا۔ ہراساں نہ ہونا۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں جھلملا رہے ہیں؟''

کوروتی بے اختیار ہوگئی ''میں تھک گئی ہو شاہ زیب...'' اس نے روتے ہوئے کہا ''یقین کرو میں تھک گئی ہوں۔ بعض اوقات سوچتی ہوں کہ اگر میں اپنے گھر میں ہوتی، اپنے لوگوں میں ہوتی میرے سر پر سایہ ہوتا، لوگ میری پشت پر ہوتے تو کیا اس قدر جدوجہد کرسکتی تھی، کیا کیا نہیں ہوا میرے ساتھ، کس طرح پرورش پائی غیروں کے درمیان، اور اس کے بعد کیسے کیسے لوگوں کے ہاتھوں میں بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ یہ تقدیر کیسے تبدیل کی جاسکتی ہے شاہ زیب! بتاؤ میں اپنی تقدیر کیسے بدل لوں۔ میں تو سکون کی زندگی چاہتی ہوں۔ میں اپنا گھر چاہتی ہوں۔ اپنے لوگوں کے درمیان جینا چاہتی ہوں، لیکن کیا یہ جینا ہے، کیا اسی کو جینا کہتے ہیں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور شاہ زیب خالص عورتوں کی طرح اسے تسلیاں دینے لگا۔ اس کا رونا دھونا اور بے اختیاریاں حد سے بڑھیں تو شاہ زیب نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی، کوروتی اس معصوم بچی کی طرح ہو رہی تھی جو صدیوں سے کسی پیار بھری آغوش کی بھوکی تھی۔ وہ ایسی بے قرار روح بن گئی تھی جس کا آنگن سالوں سے ساون کی جھڑی کا منتظر رہا ہو۔ شاہ زیب نے اسے تسلیاں دیں، اس نے اپنی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق الفاظ داظہار کے سارے طریقے استعمال کردیے تھے۔ شاہ زیب کی تسلیاں اور ہمدردیاں بن بادل برسات کی طرح اس کی سونی آنکھوں میں برس رہی تھیں۔ پھر دفعتاً اس نے چونک کر دہشت زدہ نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا پھر بولی۔

''شاہ زیب۔''

لیکن شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا، اس نے سمٹ کر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا، پھر اس نے نگاہیں اٹھا کر شاہ زیب کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیر تک دیکھتی رہی، اس کے بعد اس نے آنکھیں بند کرکے آہستہ سے گردن جھٹکی ''مجھے مشورہ دو کہ میں کیا کروں۔ میری زندگی ہر لمحہ ایک نئے حادثے سے روشناس ہوتی ہے شاہ زیب، مجھے میری منزل تک پہنچادو، مجھے میری منزل تک پہنچادو، میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔''

''کوروتی مجھے معاف کردینا۔''

''نہیں شاہ زیب، ٹھیک ہے جو کچھ ہوسکتا ہے وہ ہوتا رہے گا، کوئی نہیں روک سکتا اسے۔ تم بتاؤ میں ہوں کیا چیز، ایک ایسی شخصیت جس کا کوئی محور نہیں ہے، براہ کرم! ان احساسات کو ذہن سے نکال کر سو جاؤ۔''

اُس نے اس کی ہدایت پر عمل کیا، کوروتی بھی سونے کے لیے لیٹ گئی تھی، جانے کب نیند نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ پھر جب سورج کی کرنیں کھڑکی کے راستے سے اندر داخل ہورہی تھیں۔ فون کی گھنٹی سے شاہ زیب کی آنکھ کھل گئی تھی، چند لمحے گھنٹی کو نظر انداز کیا جاتا رہا، لیکن جب وہ مسلسل بجتی رہی تو شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹیلی فون کی جانب بڑھ گیا۔ کوروتی بھی جاگ گئی تھی۔ شاہ زیب نے ریسیور کان سے لگالیا اور آواز صاف کرکے ہیلو کہا، لیکن دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ البتہ ایک عجیب سی خرخراہٹ سنائی دے رہی تھی۔

''ہیلو... کون بول رہا ہے کیا بات ہے؟'' شاہ زیب نے پھر سوال کیا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے دوسری طرف کوئی چیز گھسیٹی جارہی ہو، پھر ایک کھرکھراتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

''مسٹر... مسٹر رمیش... رمیش...''

شاہ زیب نے حیرت سے اس آواز کو سنا جو نسوانی تھی اس نے پھر کہا ''ہیلو کون بول رہا ہے''

''رمیش سنہا... رمیش رمیش....''

''ہاں میں ہی ہوں، مگر آپ کون ہیں؟''

''روشالی... روشالی۔'' اس نے جواب دیا۔

''ارے روشالی سنگھ جی، کیا بات ہے، یہ بول کیسے رہی ہیں آپ؟'' شاہ زیب نے چونک کر کہا۔

''فوراً میش جی، فوراً فوراً ہوٹل فورٹ ولا آ جاؤ، ہوٹل فورٹ... روم نمبر دو سو چار۔ پلیز...''
''مگر تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے روشالی۔ یہ تم کیسے بول رہی ہو۔''
''پلیز جلدی جلدی.. جلدی کرو۔'' اس نے کہا اور شاہ زیب کو یوں محسوس ہوا جیسے ریسور اس کے ہاتھ سے گر پڑا ہو، شاہ زیب نے کئی بار ہیلو ہیلو کہا لیکن پھر اسے کوئی آواز سنائی نہیں دی، البتہ ریسیور کریڈل پر نہیں رکھا گیا تھا۔ شاہ زیب نے پریشان نگاہوں سے کوروتی کی طرف دیکھا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
''کیا بات ہے، کیا کہہ رہی تھی روشالی، تم تم پریشان کیوں ہو گئے تھے؟''
''اوہ... کوروتی... روشالی نے مجھے ٹیلی فون کیا تھا۔ ہوٹل فورٹ ولا کے کمرہ نمبر دو سو چار میں اس نے مجھے بلایا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی اذیت کا شکار ہو۔''
''روشالی.. ہوٹل فورٹ ولا.. کمرہ نمبر دو سو چار۔ مگر وہ ہوٹل فورٹ ولا میں کیوں ہے، وشال سنگھ کہاں ہے؟'' کوروتی نے متحیرانہ انداز میں سوال کیا۔
''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، بولو کیا کرنا چاہیے؟''
''چلو چلتے ہیں، ان لوگوں سے تو اب ہماری بھی ضرورت اٹک گئی ہے، پتا نہیں کیا ہوا، یہ اپنی حویلی سے اس ہوٹل میں کیسے پہنچ گئے؟''
''میں کچھ نہیں جانتا، اگر چلنا ہے تو لباس تبدیل کر لو۔'' شاہ زیب نے کہا۔
کوروتی پھرتی سے اٹھ بیٹھی، وہ جلدی سے لباس تبدیل کر کے باہر آ گئی تھی۔ شاہ زیب بھی تیار ہوا اور پھر دونوں باہر نکل آئے۔ کوروتی کے بدن میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ نیچے اتر کر اس نے پریشان نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔
''اب کیا کرنا چاہیے میں تو پریشان ہو گئی ہوں۔ کہیں وہاں ہمارے لیے کوئی خطرہ نہ ہو۔''
''اب جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا، فی الحال یہی دونوں ہمارے پروگرام میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ کم از کم دیکھا تو جائے چل کر کہ ہوا کیا ہے؟''
''کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ کوئی سازش نہ ہو ہمارے خلاف۔ تمہیں یقین ہے کہ وہ آواز روشالی کی تھی؟''
''تقریباً اسی فیصد۔ اس آواز میں ایک زخمی کیفیت تو تھی لیکن بولنے کا انداز روشالی کا ہی تھا۔ پھر چونکہ میں بھی نیند سے اٹھا تھا اور ذہن پوری طرح حاضر نہیں تھا اس لیے اس پر غور نہیں کیا۔'' کوروتی گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ شاہ زیب خود بھی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ لیکن پھر اس نے یہی سوچا کہ اس کی زندگی تو ہے ہی ان حالات سے منسوب۔

............☆☆............

ہوٹل میں داخل ہونے کے بعد لفٹ کے ذریعے وہ دونوں اوپر کی منزل پر پہنچ گئے، جہاں کمرہ نمبر دو سو چار تھا۔ شاہ زیب کا دل دھڑک رہا تھا، کوروتی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، ابھی ہوٹل میں چہل پہل شروع نہیں ہوئی تھی، ویٹر وغیرہ بھی نظر نہیں آ رہے تھے، راہداریاں سنسان پڑی تھیں۔ شاہ زیب نے کمرہ نمبر دو سو چار کے سامنے رک کر آہستہ سے دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو اس نے انگلی سے دروازے کو دھکیل کر دیکھا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا، ایک لمحے تک سوچنے کے بعد وہ کوروتی کو لے کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں تیز روشنی جل رہی تھی، شاہ زیب نے جو منظر دیکھا اس نے ایک لمحے کے لیے اسے ہلا دیا۔ مسہری پر وشال سنگھ پڑا تھا، لیکن اس کی گردن مسہری کے نیچے تھی، بے گردن کا بدن مسہری پر چاروں شانے چت پڑا تھا اور اتنا خون بہا تھا کہ شاید مسہری کا گدا بھی اس خون کو جذب کرنے میں ناکام رہا تھا۔ کوروتی کی چیخ نکلنے ہی والی تھی کہ شاہ زیب نے اس کا منہ بھینچ لیا۔ کمرے کے ایک گوشے میں ٹیلی فون کے بالکل نزدیک روشالی بری طرح مڑی تڑی اوندھے منہ زمین پر پڑی تھی۔ ٹیلی فون کا ریسیور کریڈل پر نہیں تھا بلکہ اس کے نزدیک ہی لٹکا ہوا تھا۔ شاہ زیب نے پھرتی سے کوروتی کو سنبھالا دے کر روشالی کو سیدھا کرنے کی کوشش کی لیکن یہ دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے کہ اس کے سینے میں کئی گہرے زخم تھے جن سے خون رس رس کر نیچے قالین میں جذب ہو رہا تھا۔ اس نے

آنکھیں کھولیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس کی بینائی رخصت ہوگئی ہو، پھر اس کی کمزور آواز ابھری۔
''کون...کون ہے...؟'' پھر شاید وہ شاہ زیب کو پہچان گئی تھی اس کے منہ سے پھر نکلا۔
''مسٹر...سنہا انہوں نے وشال کو قتل کر دیا۔ وہ سادھو تھے...انگریز سا...'' روشالی بس یہ الفاظ ادا کر سکی تھی اور پھر اس کی آواز بھیج گئی۔
شاہ زیب ایک دم کھڑا ہو گیا، کوروتی نے پھرتی سے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر اپنی دوبارہ اٹھنے والی چیخ کو روکا تھا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ اپنے ہاتھ بڑی طاقت سے منہ پر جمائے ہوئے تھی، روشالی کو اسی طرح چھوڑ کر شاہ زیب پیچھے آ گیا اور اس نے کوروتی کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔
''نہیں کوروتی، چیخنے کی کوشش مت کرو، ورنہ ہم ایسے الزام میں گرفتار ہو جائیں گے جس سے نکلنا ممکن نہیں ہوگا۔''
''شاہ زیب۔''
''سنبھلو کوروتی... سنبھلو۔ خود کو سنبھالو اور یہ سوچو کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ یہاں سے نکل چلیں یا یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ وشال سنگھ...''
''نہیں پلیز...چلو یہاں سے، جلدی چلو۔'' کوروتی نے رو دینے والے انداز میں کہا اور پھر مسہری کی طرف دیکھ کر بولی ''اس کی گردن...اس کی گردن...''
''آؤ یہ منظر مت دیکھو، تم سے برداشت نہیں ہو سکے گا۔'' شاہ زیب نے دروازے کے قریب پہنچ کر اسے اس احتیاط سے کھولا کہ اس کی انگلیوں کے نشانات اس پر نہ رہیں۔ دروازے کے بیرونی ہینڈل کو بھی رومال سے صاف کیا اور پھر کوروتی کو ساتھ لے کر راہداری میں تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں ان دونوں کو دیکھ نہ لیا جائے۔ خوش بختی ہی تھی کہ ان کی اس تمام کارروائی کو کسی نے نہیں دیکھا، اب ذرا رونق ہو گئی تھی۔ لوگ باگ اور ویٹر اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ یہ دونوں برق رفتاری سے ہوٹل فورٹ ولا سے باہر نکل آئے۔
تھوڑی دیر کے بعد یہ دونوں اپنے ہوٹل پہنچ گئے تھے، کوروتی دھم سے مسہری پر گر پڑی اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔
''یہ کیا ہو گیا...یہ کیا ہو گیا؟''
''خود کو سنبھالے بغیر چارہ نہیں ہے کوروتی، اگر تم نے کسی کمزوری کا اظہار کیا تو ہم پھنس جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کسی نے ہمیں وشال سنگھ کے ساتھ دیکھا ہو، ممکن ہے ہمیں ان کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جائے۔''
''پھر کیا کیا جائے، کیا کیا جائے؟''
''سب سے پہلا کام یہی ہے کہ خود کو سنبھالے رکھو۔ جب تک ہم ذہنی طور پر معتدل نہیں ہوتے کوئی فیصلہ نہیں کر پائیں گے۔''
''کیا جے پور چھوڑ دیا جائے؟''
''یہ بھی سوچنا پڑے گا، کہیں یوں نہ ہو کہ ہماری نشاندہی کی جائے اور جب ہم جے پور سے غائب پائے جائیں تو ہماری تلاش شروع کر دی جائے اور ہمیں قاتل تسلیم کر لیا جائے۔ خیر یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تازہ دم ہو جاؤ۔ میں چائے وغیرہ منگواتا ہوں۔ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے، جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا، لیکن اب اس کا اظہار ہمارے چہروں یا ہماری حرکات سے نہیں ہونا چاہیے۔''
کوروتی اب شاہ زیب کے احکامات کی تعمیل فوراً ہی کرتی تھی، چنانچہ وہ باتھ روم کی جانب بڑھ گئی اور شاہ زیب کے ذہن نے گھومنا شروع کر دیا۔
وشال سنگھ کو قتل کر دیا گیا تھا، روشالی نے صاف الفاظ میں انگریز سادھوؤں کا ذکر کیا تھا اور وہ انگریز سادھو ڈینئل کے آدمی ہی ہو سکتے تھے۔ شاہ زیب کو ان کے بارے میں اطلاع دے دی گئی تھی، لیکن انہوں نے وشال سنگھ کو کیوں قتل کر دیا؟

وہ تو ان دونوں کے تحفظ کے لیے مامور تھے۔ کیا ان کی زندگیوں کو وشال سنگھ اور روشالی سے کوئی خطرہ تھا اور اس خطرے کو وقت سے پہلے ٹالنے کے لیے انہوں نے ان دونوں کو ٹھکانے لگا دیا یا کوئی اور بات تھی؟ یہ بات بھی حیرت انگیز تھی کہ وہ لوگ اپنی حویلی میں قیام کرنے کے بجائے ہوٹل فورٹ ولا میں کیوں مقیم تھے؟

کوروتی کے آنے سے پہلے اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا، وہ نہا کر اور نکھر گئی تھی۔ ویٹر چائے اور ناشتے کا سامان لے آیا۔ کوروتی نے شاہ زیب کے لیے چائے بنائی اور پھر وہ دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

''ہے بھگوان! کتنا وحشیانہ قتل تھا، انہوں نے اس کی گردن کاٹ کر نیچے پھینک دی تھی۔'' کوروتی نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ چائے کا کپ اس کے ہونٹوں پر کانپ گیا تھا۔

''تذکرہ کرتے ہوئے بھی احتیاط کرو کوروتی، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''

کوروتی نے آنکھیں بند کرلیں۔ غالباً وہی منظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ ویٹر برتن وغیرہ اٹھا کر لے گیا تو ان دونوں نے اپنے آئندہ پروگرام پر گفتگو شروع کردی۔

''یہ سب کچھ ہمارے لیے غیر متوقع ہوا ہے، کوروتی یوں سمجھو کہ ہمارے پروگرام کے تمام راستے رک گئے ہیں۔ میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ وشال سنگھ کوئی صحیح آدمی نہیں تھا، لیکن کم از کم وہ ہمیں ہماری منزل کی جانب لے تو جا رہا تھا۔ اب ایک بار پھر ہم تنہا رہ گئے ہیں۔''

''میرا دماغ تو کام نہیں کر رہا شاہ زیب۔''

''تمہیں اپنی قوتوں سے کام لینا ہوگا کوروتی، جن کے سہارے تم آج تک حالات سے نمٹتی چلی آئی ہو۔'' شاہ زیب نے کہا۔ کوروتی نے عجیب سے انداز میں شاہ زیب کی طرف دیکھا اور بولی۔

''اب جی نہیں چاہتا۔''

''میں نہیں سمجھا۔''

''اب میری ذمہ داری تم پر ہے، صرف تم پر۔''

شاہ زیب نے دل ہی دل میں ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلائی تھی۔ پھر وہ سوچنے لگا 'ہاں میں تو پھنس گیا ہوں، یہ ذمے داری مجھے ہی سنبھالنی پڑے گی۔' لیکن کوروتی پر اس نے اپنے احساسات کا اظہار نہیں کیا تھا۔

دوپہر ہوگئی، یہ لوگ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے، بس ایک عجیب سے انداز میں انہیں انتظار تھا اس بات کا کہ کوئی ان دونوں تک پہنچے، ان سے کچھ کہے، وشال سنگھ کی حویلی میں ملازمین بھی تھے، انہوں نے ان دونوں کو دیکھا تھا۔ ہوسکتا ہے وشال سنگھ کی موت کے بعد کوئی ان دونوں کی نشاندہی کرے، لیکن یہ احساس بھی احمقانہ ہی تھا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کوروتی نے کہا۔

''اب بتاؤ شاہ زیب ہمیں کیا کرنا چاہیے، ہمارے سامنے چند نام ہیں، کیا ہم شاستری پور چلیں اور وہاں جا کر گرو داس سے ملنے کی کوشش کریں۔''

''وشال سنگھ، گرو داس سے یہ وعدہ کر کے آیا تھا کہ وہ اس تصویر کی ہم شکل لڑکی کو تلاش کر کے ان کے حوالے کرے گا اور اس نے ہمیں اس کے لیے دس لاکھ روپے کی پیشکش کی تھی۔ اس بات کو ذہن میں رکھو کوروتی اگر ہم براہ راست گرو داس تک پہنچ جائیں تو ہوسکتا ہے کسی ایسی فوری مشکل میں گرفتار ہوجائیں جس سے چھٹکارا ممکن نہ ہو، اس کے بعد ہمارے راستے رک جائیں گے اور کام نہیں ہوسکے گا جو ہم کر رہے ہیں۔''

''ہاں یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا ہے۔ کیوں نہ اس کی تکمیل کی جائے۔ ہم سیدھے سکھی پور جا کر بھرت چند کے اہل خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔ اگر مجھے کملا اور اس کی ماتا جی مل گئیں تو پھر سمجھو کہ کافی کام ہوجائے گا۔ ہوسکتا ہے وہ لوگ میری حیثیت بتا سکیں، یہ بات تو پہلے ہی ہمارے پروگرام میں شامل تھی نا، اگر وشال سنگھ ہمیں نہ مل جاتا تو ہم سکھی پور ہی جاتے۔''

''ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''
باقی وقت بھی ان دونوں نے اپنے ہوٹل ہی میں گزارا، باہر کے حالات کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ رات ہوگئی اور یہ دونوں ہوٹل سے باہر نہ نکلے، رات کا کھانا بھی کمرے میں ہی کھایا اور پھر سونے کے لیے لیٹ گئے۔

☆☆

دوسرے دن کوروتی کسی قدر مطمئن نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی بشاشت تھی، گویا اس نے شاہ زیب کو اپنے آپ میں تسلیم کر لیا تھا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے ناشتا کیا اور پھر شاہ زیب تیار ہو کر ہوٹل سے باہر نکل آیا تاکہ سکھی پور جانے کے لیے کسی سے معلوم کر سکے۔ سیڑھیاں عبور کرنے کے بعد شاہ زیب نے باہر قدم رکھا۔ خوف کے احساس کو وہ ابھی تک ذہن سے جھٹک نہیں پایا تھا، ہر لمحے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے عقب سے پولیس کے جوان آئیں گے اور اس کی گردن دبوچ کر گرفتار کر لیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا، شاہ زیب لرزتے قدموں سے آگے بڑھتا رہا اور اس کے بعد جب یہ امید ہوگئی کہ کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا تو پھر اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اسے معلوم ہوا کہ سکھی پور تک جانے کے لیے بس مل جاتی ہے اور اس میں کوئی وقت نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ کسی قدر مطمئن انداز میں اپنے ہوٹل آ گیا۔
کوروتی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوا اس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی گنگناہٹ تھی۔ گویا اپنے آپ کو اس نے کافی حد تک سنبھال لیا تھا یا پھر وہ شاہ زیب پر بہت زیادہ اعتماد کرنے لگی تھی۔ شاہ زیب کو دیکھ کر وہ سنبھل گئی اور مسکرا کر پوچھنے لگی۔
''کہو! کچھ کامیابی حاصل ہوئی۔''
''ناکامی کا کیا سوال ہے۔ سکھی پور جانے کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر کے آیا ہوں۔ ایک ہی ذریعہ ہے وہاں پہنچنے کا اور وہ ہے گھٹیا قسم کی ٹوٹی پھوٹی بسیں۔''
''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارا سفر کتنا طویل ہوگا، بالآخر سکھی پور پہنچ ہی جائیں گے، چنانچہ اس سلسلے میں تم بالکل فکرمت کرو۔''
سکھی پور روانہ ہونے کے لیے تھوڑی سی خریداری بھی کرنی تھی، چنانچہ سب سے پہلے ہوٹل کا بل ادا کر کے ہوٹل چھوڑ دیا گیا۔ پھر ٹہلنے کے سے انداز میں شہر کے بازاروں میں نکل آئے۔ جے پور کی روایتی زندگی جاری وساری تھی۔ سڑکیں گلیاں بازار اب کافی ماڈرن ہو چکے تھے اور یہاں کی قدیم تاریخ تبدیل ہوگئی تھی۔ ایک بازار سے اُن کی ضرورت کی اشیاء مل گئیں۔ سیاحوں کی حیثیت سے یہ سفر طے کرنا تھا اور خصوصی طور پر کسی کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانا انہیں مقصود نہیں تھا۔ چنانچہ ایک مناسب جگہ دیکھ کر کوروتی نے وہ معمولی سی ساڑی زیب تن کر لی جو انہوں نے اس سفر کے لیے خاص طور سے خریدی تھی اور اس کے ساتھ ہی راجپوتانہ کے وہ روایتی چاندی کے زیور بھی جنہیں کوئی ماڈرن لڑکی کسی قیمت پر پہننا پسند نہ کرتی۔ شاہ زیب نے بھی اپنے لباس میں تبدیلیاں کر لیں اور اس کے بعد وہ لوگ معمولی شہریوں کی حیثیت سے بسوں کے اڈے پر پہنچ گئے۔ بس سکھی پور جانے کے لیے تیار تھی، چنانچہ یہ دونوں بس میں بیٹھ گئے۔ بس میں طرح طرح کے مسافر بھرے ہوئے تھے جن میں زیادہ تر کا تعلق راجپوتانہ ہی سے تھا۔
سفر تقریباً پونے چار گھنٹے تک جاری رہا۔ فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا، لیکن راستہ دشوار گزار تھا۔ خاص طور سے تقریباً دس یا بارہ میل کا ایک ٹکڑا تو بڑا ہی تکلیف دہ ثابت ہوا۔ کچی سڑک اور خوفناک گھاٹیاں۔ یہاں سفر کی رفتار بہت سست رہی تھی اور صرف یہی ایک ٹکڑا تقریباً ایک گھنٹے بلکہ اس سے بھی کچھ وقت زیادہ میں طے ہوا تھا، اس کے بعد والی سڑک بہتر حالت میں تھی۔
سکھی پور چھوٹا سا پہاڑی قصبہ اپنی حسین روایات کے ساتھ مصروف زندگی تھا، لال پتھروں کے مکانات، لیکن کچے مکانات اور جھونپڑیاں زیادہ تھیں۔ ایک دیہاتی سے ان لوگوں نے قیام گاہ کے لیے پوچھا تو وہ حیرت سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ان لوگوں کو کچی سرائے کا حوالہ دیا جہاں چھوٹے چھوٹے ڈربے نما خانے بنے ہوئے تھے۔ ان

میں ایک ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ شاہ زیب اور کوروتی کو اس عالیشان سرائے میں ایک رہائش گاہ حاصل ہوگئی، سرائے کے دیہاتی مالک نے ان لوگوں کے ڈربے میں ایک چارپائی کا اور اضافہ کردیا، لیکن اس کے بعد بس اتنی گنجائش تھی کہ دونوں چارپائیوں کے درمیان سے نکل کر دروازے تک پہنچا جاسکے۔ ان دونوں نے اپنا سامان چارپائیوں کے نیچے ٹھونس دیا۔ چارپائی پر بیٹھ کر کوروتی نے ایک گہری سانس لی اور مسکراتی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھنے لگی۔

''ویسے یہ ایڈوینچر بھی برا نہیں ہے۔''

شاہ زیب بھی مسکرادیا تھا، شام جھک آئی تھی۔ سرائے میں ان دونوں کو جو، گیہوں اور چنے کے ملے جلے آٹے کی روٹیاں کھانے کو ملیں۔ جن کے ساتھ ساگ کی ترکاری تھی۔ یہ تمام چیزیں بھلا جدید زندگی میں کہاں، چنانچہ بے حد لذیذ محسوس ہوئیں اور انہوں نے صبر و شکر سے انہیں کھالیا پھر سرائے کے کمرے میں پڑ رہے تھے۔ کچی پکی سرائے میں گزرنے والی رات بھی کسی اعلیٰ پائے کے ہوٹل سے کم نہیں تھی۔ یہ تو صرف انسان کی سوچ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مخمل کے گدوں میں زیادہ پرسکون محسوس کرے۔ کوروتی کی کیفیت زیادہ بہتر تھی، حالانکہ یہ اضطراب اسی کا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد کوروتی نے شاہ زیب سے پوچھا کہ سکھی پور میں بھرت چند کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔'' شاہ زیب چند لمحات سوچتا رہا پھر بولا۔

''دیکھو کوروتی میں تو ان علاقوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ظاہر ہے میں اس سلسلے میں کوئی نام لے کر کچھ بھی تو نہیں کہہ سکتا، چلتے ہیں جس طرح اور جہاں سے جو کچھ معلوم ہوسکا کوشش کریں گے۔''

''تو پھر میں اس کے علاوہ کیا کہہ رہی ہوں تم سے؟'' اس نے مسکراتی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا اور شاہ زیب آنکھیں بند کرکے گردن جھٹکنے لگا۔

''کیوں کیا بات ہے؟ کیا رات کو پرسکون نیند نہیں آئی؟''

''نہیں نہیں، بہت سکون سے سویا۔'' شاہ زیب نے شریر لہجے میں کہا اور کوروتی کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی، غالباً اس نے شاہ زیب کے الفاظ سے کچھ اور نتیجہ اخذ کرلیا تھا۔

اس کے بعد وہ لوگ باہر نکل آئے۔

خاص طرز کی بستی تھی، ویسے بھی راجپوتانہ کے علاقے کی آبادیوں میں ذرا احتیاط انداز میں چلنا ضروری تھا کیونکہ لوگ کسی قدر اکھڑ طبیعت کے مالک تھے۔ مختلف علاقوں میں بھرت چند کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں۔ کچھ ایسے لوگ ملے جنھوں نے اس سے واقفیت کا اظہار کیا اور اس کی درد بھری کہانی مزید درد بھرے انداز میں سنائی، لیکن ان میں سے کوئی یہ نہ بتاسکا کہ بھرت چند کی بیوی اور بیٹی کملا سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے۔

سارا دن اسی کاوش میں گزر گیا۔ جب تھکن سے چور ہوگئے تو سرائے میں آکر ٹھہر گئے اور اس کے بعد وہی معمولات زندگی۔ چند لمحات میں ساری تھکن دور ہوگئی کم از کم کوروتی کا یہی خیال تھا کہ بلکہ اب تو وہ کھلے الفاظ میں یہ کہنے لگی تھی کہ اس کی زندگی کا مقصد حاصل ہونہ ہوا سے ایک ایسی شخصیت ضرور مل گئی جو اس کی زندگی کا مقصد ہے۔

اور ایسے لمحات میں شاہ زیب خوفزدہ انداز میں سوچتا تھا کہ وہ خود تو اس کی زندگی کا مقصد نہیں ہے اگر اس کا کام نہ ہوسکا تو پھر شاہ زیب کی زندگی میں اس کی کیا جگہ ہوگی۔ سکھی پور کا دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ کوئی مقصد حاصل نہیں ہوسکا تھا۔ بھرت چند کے سلسلے میں بہت سے شناسا ملے، لیکن کوئی بھی اس بات کی نشاندہی نہیں کرسکا کہ اس کے اہلِ خاندان کہاں گم ہیں؟ اس سلسلے میں انہیں ایک اور چھوٹی بستی بھی جانا پڑا، جہاں کے بارے میں اشارہ ملا تھا کہ ہوسکتا ہے وہاں سے ان لوگوں کا پتا چل جائے۔ لیکن وہاں سکھی پور سے ملنے والی اطلاعات کی تصدیق نہیں ہوسکی تھی۔ اب ان لوگوں کے ذہنوں میں مایوسی پیدا ہوگئی تھی۔ وشال سنگھ اگر زندہ ہوتا تو شاید یہ صورتِ حال درپیش نہ ہوتی، اس دوران شاہ زیب نے ان بد بخت انگریز سادھوؤں کو بھی نہیں دیکھا تھا جو ڈینئل کے ہرکارے تھے۔ پتا نہیں وہ کہاں غائب رہتے تھے۔

ایک روز کوروتی کہنے لگی کہ اب سکھی پور میں پڑے رہنا بیکار ہے۔''
''تو پھر کیا کرنا چاہیے؟'' شاہ زیب نے پوچھا۔
''میں شرمندہ ہوں شاہ زیب کہ تمہیں بلاوجہ اپنے ساتھ الجھائے ہوئے ہوں، لیکن جو کچھ تم نے اپنی زندگی کے بارے میں مجھے بتایا ہے اس سے اطمینان ہوتا ہے کہ کم از کم تم کسی ایسے نقصان میں نہیں ہو جو تمہارے لیے پریشان کن ثابت ہو اور اب تو میں تم پر یہ حق رکھتی ہوں کہ تمہیں اپنے مشن کے لیے محدود کر دوں، چاہے ہمیں اس میں کتنا ہی وقت لگ جائے۔''
''تو ان باتوں کا تذکرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کب کہا کہ میں تم سے فرار چاہتا ہوں''
''نہیں شاہ زیب، اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔ میں بہت زیادہ محسوس کر رہی ہوں کہ بجائے اس کے کہ تم سکون کے کچھ لمحات گزارو، میرے ساتھ نگر نگر سرگرداں ہو۔''
''اچھا چھوڑو ان باتوں کو اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''
''ایک ہی بات ذہن میں رہ جاتی ہے، وہ یہ کہ شاستری پور چلیں اور اپنے آپ کو گرو داس کے حوالے کر دیں۔ گرو داس اگر کسی کو اتنی بڑی رقم اس لیے پیش کر سکتا ہے کہ اسے کوروتی کی ہم شکل لڑکی مل جائے تو یقیناً کوروتی کو دیکھتے ہی ختم نہ کر دے گا۔''
''جیسا تم مناسب سمجھو۔'' شاہ زیب نے گردن ہلا دی۔
''تو پھر کل یہاں سے شاستری پور کے سفر کے بارے میں معلومات حاصل کیے لیتے ہیں اور اس کے بعد وہاں چلیں گے۔''
دوسرے دن ان لوگوں نے یہ معلومات حاصل کر لیں، بھلا اس میں کیا دقت ہو سکتی تھی، یہاں سے ایک بس ان لوگوں کو شیام پور تک لے جاتی اور وہاں سے دوسری بس شاستری پور کے لیے مل سکتی تھی۔ شیام پور کا راستہ دو گھنٹے کا ثابت ہوا، یہاں بھی وہی معمول کے مطابق ماحول تھا، گرم ریت، گرم پہاڑی علاقہ اور اس کے بعد شیام پور کی شام جو اتنی گرم نہیں تھی۔ راجپوتانہ میں ایک بڑی خوبی تھی کہ دن کو شدید گرمی پڑتی تھی لیکن جونہی سورج ڈھلنا شروع ہوا فضا میں خنک ہوائیں اتر آتیں اور اس کے بعد رات بے حد سرد اور انتہائی سرد ہوتی۔
شیام پور ایک چھوٹی سی بستی ثابت ہوئی، لیکن یہاں کمبخت سرائے بھی نہیں تھی، البتہ ان لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہاں سے شاستری پور جانے کے لیے بس مل سکتی ہے۔ صرف ایک ہی بس شاستری پور جاتی تھی اور اسی سے ان لوگوں کو سفر کرنا تھا۔ چنانچہ بہتر یہی سمجھا گیا کہ رات بس کے اڈے پر گزاری جائے۔ یہاں ایک پیپل کے درخت کے نیچے ان لوگوں نے دھونی رمالی۔ کھانے پینے کے لیے حلوہ پوری اور بھاجی ترکاری مل گئی۔ جیسے تیسے رات گزری۔ صبح ہی وہ بس آ کر رک گئی جسے شاستری پور جانا تھا۔
ان لوگوں نے ٹکٹ خریدے اور بس میں جا بیٹھے۔ رفتہ رفتہ سواریاں آنا شروع ہو گئیں۔ لیکن کئی گھنٹے انتہائی بوریت کے عالم میں گزرے کیونکہ جب تک تمام سواریاں پوری نہ ہو جاتیں بس کی روانگی ممکن نہ تھی۔ تقریباً پونے گیارہ بجے بس نے آخری سواری بٹھائی اور چل دی۔ شام ساڑھے پانچ بجے شاستری پور پہنچے۔ عمارتیں مخصوص انداز کی تھیں۔ اب تک کسی اور بستی میں عمارتوں کا یہ طرز تعمیر سامنے نہیں آیا تھا، یہ لوگ بس سے اتر کر چل پڑے۔ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ کچے راستوں پر لگنے والے جھٹکوں نے شاہ زیب اور کوروتی کے بدن کو چور چور کر دیا تھا۔ آبادی بس کے اڈے سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی، ذرا دیر کے بعد چند گھڑ سوار ان دونوں کی جانب آتے ہوئے نظر آئے۔ پہلے تو وہ ان کے نزدیک سے گزرتے چلے گئے، لیکن تھوڑے ہی فاصلے پر پہنچ کر ان کے درمیان ہلچل مچ گئی۔
وہ طوفانی انداز میں واپس پلٹے اور قریب آ کر گھوڑوں سے نیچے کود پڑے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول دبے ہوئے تھے جن کا رخ ان دونوں کی جانب تھا۔ کوروتی اور شاہ زیب ہکا بکا رہ گئے تھے، دوسرے لوگوں نے لپک کر شاہ زیب کو بازوؤں سے پکڑ لیا۔ ان میں سے ایک نے کوروتی کی کنپٹی سے پستول لگا دیا تھا۔ کچھ لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو رک گئے لیکن کسی نے قریب آنے کی جرات نہیں کی۔ شاہ زیب ابھی حیرت زدہ ہی تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر کس دیے

گئے۔ تب شاہ زیب نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔
''کیا بدتمیزی ہے۔ کون ہو تم لوگ؟''
''معلوم ہو جائے گا کہ ہم لوگ کون ہیں اور یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' ایک دراز قامت آدمی نے جس کی مونچھیں لمبی لمبی اور نوکیلی تھیں اور ٹھوڑی پر ایک بہت بڑا مسّہ نظر آ رہا تھا طنزیہ لہجے میں کہا۔
''ہم اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کریں گے، شرط یہی ہے کہ یہ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلے۔''
''مگر کہاں؟'' شاہ زیب نے پوچھا۔
''جہاں تمہیں لے جایا جائے۔''
''تم لوگ پاگل معلوم ہوتے ہو۔ کیا تمہارے ہاں سیر و سیاحت کے لیے آنے والوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے؟'' شاہ زیب نے کہا۔
''بہت زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو، نقصان اٹھاؤ گے۔ چلو۔'' دراز قد آدمی نے کہا اور وہ ان لوگوں کو آگے دھکیلنے لگے، تب ان میں سے ایک بولا۔
''انہیں گھوڑوں پر بٹھا دیں مہاراج؟''
''بٹھا دو۔'' ان دونوں کو گھوڑوں پر سوار کرا دیا گیا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ کوروتی کو رسیوں سے نہیں کسا گیا تھا، بلکہ گھوڑوں پر بیٹھے ہوئے آدمی پستولوں سے اس کا نشانہ لیے ہوئے تھے۔ صورتِ حال چند لمحے تو سمجھ ہی میں نہیں آئی تھی۔ بہر طور یہ لوگ آگے بڑھتے رہے۔ شاستری پور میں کوروتی اور شاہ زیب کا استقبال کافی دلچسپ ہوا تھا۔ بالآخر یہ لوگ عمارتوں کے حصے میں داخل ہو گئے۔ یہاں زندگی مصروف تھی، لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے، لیکن ان دونوں کو دیکھ کر سب کاروبار چھوڑ کر کھڑے ہو گئے، مگر کسی نے اس مسئلے میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔
مختلف سڑکوں، گلیوں سے گزر کر انہیں ایک پتھروں سے بنی ہوئی عظیم الشان عمارت میں لے جایا گیا، جسے حویلی کا نام دیا جا سکتا تھا۔ نوکیلے گنبد اس کے آخری سرے پر نظر آ رہے تھے، درمیانی دروازہ بے پناہ لمبا چوڑا تھا اور اس سے گزرنے کے بعد پتھر کی سلوں سے بنائی ہوئی سڑک تھی، جس کے دونوں اطراف نہایت خوبصورت انداز میں گھاس لگائی گئی تھی۔ ایک لمبی روش طے کر کے ان دونوں کو صدر دروازے تک پہنچا دیا۔ جہاں سے اوپر جانے کے لیے تقریباً چوبیس سیڑھیاں تھیں۔ اس کے بعد ایک اور چوبی دروازہ نظر آ رہا تھا جس میں پیتل کی کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ دروازے کے دونوں طرف دو دربان کھڑے ہوئے تھے جن کے جسموں پر مخصوص طرز کے رنگین لباس تھے، انہوں نے دروازہ کھولا اور وہ لوگ اندر داخل ہو گئے۔ اندر ایک لمبی راہداری تھی جس کے ذریعے ان لوگوں کو ایک بڑے ہال میں پہنچا دیا گیا۔
''مل گئے... مل گئے یہ دونوں۔'' ان میں سے ایک شخص نے کہا۔
''ہاں مہاراج، پاپی دھوکہ دے رہے تھے ہمیں۔'' اسی دراز قامت شخص نے کہا جو ان دونوں کی گرفتاری کا سبب بنا تھا۔
''بند کر دو انہیں، لے جاؤ۔'' وہ شخص دانت پیس کر بولا اور وہ لوگ ان دونوں کو پھر آگے لے گئے۔ انہیں ایک مخصوص کمرے میں پہنچ کر چند سیڑھیاں نیچے اترنا پڑا۔ یہ غالباً زیرِ زمین تہہ خانہ تھا۔ ان دونوں کو اس تہہ خانے میں بند کیا گیا اور اس کے بعد وہ خاموشی سے واپس چلے گئے۔ کوروتی کے ہاتھ چونکہ کھلے ہوئے تھے چنانچہ اس نے چند ہی لمحوں میں شاہ زیب کے ہاتھوں کی رسی بھی کھول دی۔ وہ خاصی خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔
''یہ سب کیا ہے۔ یہ کیا ہو گیا؟''
''جو کچھ بھی ہوا ہے میرے خیال میں برا نہیں ہوا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے ہم گرو داس کے پاس پہنچ چکے ہیں۔''
''اوہ... میرا بھی یہی خیال تھا لیکن....''
''تم اس لڑکی کی ہم شکل ہو جس کی تلاش کے لیے وشال سنگھ کو گرو داس نے مامور کیا تھا اور میری صورت کے بارے میں تمہیں اندازہ ہے۔''

''کنور شمشیر سنگھ۔'' کوروتی نے سرسراتے لہجے میں کہا۔
''میرا خیال ہے،ہم دونوں کو انہی کے دھوکے میں پکڑا گیا ہے۔''
''اوہ....'' کوروتی نے گہری سانس لی، بیٹھنے کے لیے کچھ نہیں تھا،ننگی زمین تھی۔شاہ زیب اور کوروتی کھردری زمین پر بیٹھ گئے۔تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے کہ اچانک تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور کچھ روشنیاں اندر آتی ہوئی محسوس ہوئیں۔آنے والوں میں وہی دراز قد آدمی تھا جس نے ان دونوں کو گرفتار کیا تھا،اس کے ساتھ چار آدمی اور بھی تھے،اس نے کڑک دار آواز میں کہا۔
''کیا تم سو گئے؟''
''نہیں..نہیں،ہم تمہاری مہمان نوازی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔''
''باہر آؤ،تمہاری اچھی طرح مہمان نوازی کی جائے گی۔''اس نے اسی انداز میں کہا۔
شاہ زیب اور کوروتی کھڑے ہو گئے، وہ دونوں ان کے ساتھ چلتے رہے۔اس بار انہیں کئی راہداریوں اور غلام گردشوں سے گزرنا پڑا اور پھر انہیں ایک اور کمرے میں لے جایا گیا جہاں فانوسوں کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ایک زرنگار کرسی پر دبلے پتلے بدن کا مالک پینسٹھ ستر سالہ شخص بیٹھا ہوا تھا۔لباس بھی شاہانہ تھا۔کانوں میں لمبے لمبے بالے لٹک رہے تھے۔اس نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھا اور اس کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کر اُن کے قریب آگیا۔وہ دیر تک شاہ زیب اور کوروتی کو دیکھتا رہا، پھر بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔
''یہ کیا چکر ہے،تم کنور شمشیر سنگھ ہو نا؟''اس نے شاہ زیب کی طرف رخ کر کے کہا۔
''تمہارا کیا خیال ہے؟''
''تم سے جو کچھ پوچھا جا رہا ہے اس کا جواب دو۔میں جواب نہ دینے والے کی زبان کھینچ کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا کرتا ہوں۔''
''تمہارا اپنا نام کیا ہے؟''شاہ زیب نے بھی غراتے ہوئے انداز میں پوچھا۔
''تم مجھے نہیں جانتے؟''
''نہیں...''
''بکواس کرتے ہو۔''
''جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں اس کا وہی مقصد ہے۔اگر تم تیس مار خان ہو تو اطمینان رکھو آسانی سے مجھ پر قابو نہیں پا سکو گے۔''شاہ زیب کو بھی غصہ آگیا تھا۔وہ خونی نگاہوں سے شاہ زیب کو گھورتا رہا۔پھر کوروتی کی طرف متوجہ ہو گیا۔
''اور کماری جی...آپ اپنے بارے میں کیا کہتی ہیں؟''
کوروتی خاموش رہی،اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔پھر اس نے طویل القامت آدمی کی طرف رخ کر کے کہا''جاؤ ان دونوں کو بھی لے آؤ۔''
دو آدمیوں نے شاہ زیب اور کوروتی کو دیوار کے ساتھ کھڑا ہونے کے لیے کہا تھا۔زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ چند اور افراد اندر داخل ہوئے،ان میں دو چہرے دیکھ کر شاہ زیب اور کوروتی حیران رہ گئے۔ان میں ایک شاہ زیب کا ہم شکل تھا اور دوسری بالکل کوروتی۔شاہ زیب کا ہم شکل بہت ٹوٹا پھوٹا نظر آرہا تھا۔اس کی پیشانی پر زخم کا نشان تھا،لباس بوسیدہ اور میلا کچیلا تھا،جس پر جا بجا خون کے دھبے نظر آرہے تھے،شاہ زیب کو یہ جاننے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی کہ وہ اصل شمشیر سنگھ ہے۔ان دونوں کو بھی شاہ زیب اور کوروتی کے برابر کھڑا کر دیا تھا،لیکن شاہ زیب کی شکل دیکھتے ہی کنور شمشیر سنگھ بری طرح اچھل پڑا،پھر اس نے کوروتی کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔اس کے انداز میں بڑی عجیب سی کیفیت نظر آرہی تھی،لیکن زبان سے اس نے کچھ نہ کہا۔
زرنگار کرسی پر بیٹھا ہوا شخص جس کے بارے میں اب شاہ زیب نے اندازہ لگا لیا تھا کہ گرو داس کے علاوہ کوئی نہیں

ہے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کران کے سامنے آ گیا، پھر وہ چاروں کے سامنے ایک ایک منٹ تک رک کران کی صورتیں دیکھتا رہا۔ پھراس کے منہ سے نکلا۔

''حیرت انگیز... بہت عجیب۔'' وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا، پھر شاہ زیب کی طرف رخ کر کے بولا'' جانتے ہو کون ہو تم، تم کنور شمشیر سنگھ ہو اور تم... تم بھی کنور شمشیر سنگھ ہو، اور لڑکی تم...'' اس نے کوروتی کی ہم شکل لڑکی کی طرف رخ کر کے کہا'' تم کوروتی ہو، اور تم بھی کوروتی ہو، کیسی عجیب بات ہے۔ سنسار میں دو کردار ایک شکل کے ایک نام کے یکجا ہو گئے ہیں اور میرا نام سنو! میرا نام گرو داس ہے، سمجھے تم لوگ.. لوگوں کا خیال ہے کہ مجھے دھوکہ دینے والے کسی دوسرے کو دھوکہ دینے کے لیے زندہ نہیں رہتے، تم میں سے کون زندگی چاہتا ہے اور کون موت؟''

وہ چاروں ہی خاموش رہے تھے۔ گرو داس شاہ زیب کے سامنے رکا اور آہستہ سے کہا'' تم بتاؤ تم... تم کون ہو؟''

''میرا نام رمیش سنہا ہے۔''

''اور یہ لڑکی۔''

''اس کا نام نینا سنہا ہے۔''

''ہوں... وہ چند لمحے شاہ زیب کو دیکھتا رہا اور اس کے بعد وہ شمشیر سنگھ کے پاس پہنچ گیا۔

''اور تم تم کون ہو؟''

''میں رمیش سنہا ہوں اور میری ساتھی لڑکی نینا۔'' کنور شمشیر سنگھ نے کہا اور شاہ زیب اور کوروتی چونک پڑے۔

گرو داس چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر طویل القامت آدمی کی طرف رخ کر کے بولا۔

''ٹھیک ہے ان چاروں کو ایک جگہ بند کر دو، کل صبح کے بعد انہیں میرے سامنے پیش کرو، میں دیکھوں گا کہ یہ کتنے پکے لوگ ہیں۔ اگر یہ اپنا نام اپنے منہ سے نہ پکاریں تو گرو داس اپنی ناک کاٹ کر ان کے سامنے پھینک دے گا۔''

گرو داس کا لہجہ غضب ناک تھا۔ وہ چاروں واپس اسی قید خانے میں لائے گئے تھے جہاں سے شاہ زیب اور کوروتی کو نکال کر گرو داس کے پاس لایا گیا تھا۔

قید خانے کا دروازہ بند ہوا تو کنور شمشیر سنگھ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر قید خانے کے ایک در میں نصب مشعل روشن کر دی غالباً وہ پہلے بھی اسی قید خانے میں رہ چکا تھا اور یہاں کے بارے میں اسے معلومات حاصل تھیں۔ مشعل کی ملگجی روشنی پورے قید خانے میں پھیل گئی۔

کنور، کوروتی کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا'' کوروتی؟'' اس نے سرسراتی آواز میں کہا، لیکن کوروتی خاموش رہی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ شاہ زیب کا اس معاملے میں کیا ردعمل ہو سکتا ہے۔ اُس کی اجازت کے بغیر وہ کچھ نہیں بول سکتی تھی۔

''تم خاموش کیوں ہو کوروتی، میں کنور شمشیر سنگھ....''

''بہتر ہے کہ اسے خاموش رہنے دو اور مجھ سے گفتگو کرو۔'' شاہ زیب نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا اور کنور شمشیر سنگھ شاہ زیب کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''یہ بات تو میں مان سکتا ہوں دوست کہ یہ راج کماری کوروتی ہیں، لیکن تم کون ہو اور تم کنور شمشیر سنگھ کیسے بن گئے، یہ میرے پلے نہیں پڑا۔'' وہ آہستہ سے ہنسا اور بولا۔

''بڑی دلچسپ بات ہے، ہم دونوں میں سے ایک اصلی ہے اور ایک نقلی، یعنی میں اصل اور تم نقل، اور تمہاری ساتھی کوروتی اصل اور میری ساتھی یہ لڑکی نقلی، بڑا دلچسپ اتفاق ہے، کیا تم اس اتفاق پر مسکراؤ گے بھی نہیں؟''

''اطمینان سے مسکراؤں گا کنور، پہلے تم سے سوالات کرنے ہیں، ان کے جواب دے دو تو میرا خیال ہے ہمارا وقت مسکراہٹوں ہی میں گزرے گا۔''

''ہوں بیٹھ جاؤ۔'' کنور شمشیر سنگھ کی ساتھی لڑکی بیزار بیزار سی نظر آ رہی تھی۔ ویسے وہ بھی حیرت انگیز طور پر کوروتی کی ہم شکل تھی۔ کنور شمشیر سنگھ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا'' میں تو یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ میں کنور شمشیر سنگھ ہوں اور کوروتی

مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔ یہ لڑکی جو میرے ساتھ ہے اس کا اصل نام شیری ہے اور یہ میری دوست ہے۔ بلکہ میں نے انتہائی مہارت سے اس کا بھیس بدلا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے چہرے پر بھی میک اپ ہے؟''

''نہیں یہ میری اصل شکل ہے۔''

''اور تمہارا نام؟''

''بتا چکا ہوں رمیش سنہا۔''

''میرے اتنے ہم شکل کیوں ہو؟''

''یہ نہیں معلوم۔'' شاہ زیب نے بے اختیار مسکرا کر کہا۔

''دیکھو دوست بہتر یہ ہے کہ ہم دوستانہ ماحول ہی میں گفتگو کریں۔ کوروتی براہ کرم مجھے آپ میرے سوال کا جواب دیجیے۔''

''میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا پسند نہیں کرتی کنور، تم دھوکے باز ہو، مکار ہو۔''

''گڈ! میں یہ تمام باتیں تسلیم کرتا ہوں مہارانی جی، مگر آپ کو چند باتیں تو بتانا ہی ہوں گی، یہ بتائیے کہ کس منصوبے کے تحت آپ اس شخص کو میرا ہم شکل بنا کر یہاں لائی ہیں؟''

''میں نے کہہ دیا کہ میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔''

''میں آپ کو مجبور کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا، جو کام میں کر رہا ہوں، وہ کرتا رہوں گا، ایک بات آپ کان کھول کر سن لیجیے، گرو داس آپ کو زندگی دینے کے لیے نہیں بلکہ موت دینے کے لیے گرفتار کر کے لایا ہے، جلد یا دیر سے وہ بالآخر ہم سب کو مار ڈالے گا، کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم اس وقت تک ایک دوسرے سے تعاون کریں جب تک گرو داس کی قید میں ہیں؟''

کوروتی کے بجائے شاہ زیب نے کہا ''میں تمہاری اس تجویز سے متفق ہوں، بہتر ہے دوستانہ ماحول میں بات کریں۔''

''تم مجھے صورت ہی سے سلیقے کے آدمی معلوم ہوتے ہو، کوروتی کا معاملہ دوسرا ہے۔ ان کے اور میرے درمیان ایک ایسا چکر چل گیا تھا جس میں قصور میرا تھا نہ ان کا، بس کچھ مجبوریاں تھیں جن کی وجہ سے انہیں یہ احساس ہوا کہ میں نے انہیں دھوکہ دیا ہے۔''

کوروتی نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا شاہ زیب نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر بولا ''تم کہاں سے گرفتار ہوئے؟''

''بھائی بڑی دلچسپ کہانی ہے، شیری کے بارے میں میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ میری دوست ہے اور مجھ سے پریم کرتی ہے، ہم دونوں ساتھ جیون گزارنے کا وعدہ کر چکے ہیں لیکن میں ابھی زندگی کے اس مسئلے سے گزر رہا ہوں، جس کی تکمیل کے بعد کچھ کر سکتا ہوں۔ کوئی ڈیڑھ مہینہ پہلے گرو داس نے مجھے گرفتار کیا تھا اور میں اسی قید خانے میں اس کا قیدی تھا، تین چار دن پہلے میں نے ایک ترکیب لڑائی اور اس کے چنگل سے نکل بھاگا۔ یہاں سے زیادہ دور نکلنے کا موقع نہیں مل سکا، ہم لوگ کٹڑی پور کے پہاڑوں میں چھپے ہوئے تھے کہ اس کمبخت کے آدمی ہم تک پہنچ گئے اور ہمیں گرفتار کر لیا گیا۔ اگر مجھے ایک دن بھی اور مل جاتا تو گرو داس کے فرشتے بھی مجھے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میری یہ گرفتاری میرے لیے بڑی کارآمد ہے کیونکہ میری ملاقات کوروتی سے ہو گئی۔''

''اور زخموں کے یہ نشانات۔''

''ان ہی کم بختوں کے لگائے ہوئے ہیں۔''

''کیوں؟''

''کچھ معلومات حاصل کر رہے تھے مجھ سے۔''

''کیا معلومات؟''



(زندگی کے پیچیدہ راستوں میں اپنے ہم شکلوں کی کھوج میں نکلے، شاہ زیب کی اگلی منزل کیا ہوگی......؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے۔)

محبت اور نفرت کی دھیمی دھیمی آنچ
میں لو دیتی ہوئی، شعلہ ساماں تحریریں

ڈھونڈوں کہاں اماں؟

محمد علی روشن

اسلام آباد سے، آج کے حالات کی سچی تصویر، جس کا درد ہر ذی نفس محسوس کرے گا



"ماما میرے بابا کہاں رہتے ہیں؟"

"میرے بابا کا نام کیا ہے؟"

"وہ ہمارے پاس کیوں نہیں رہتے؟"

ننھا احد جب بھی یہ سوال اپنی ماں شبنم سے کرتا، نگو ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ وہ اتنا ہنستی کے اس کی آنکھوں سے پانی نکلنے لگتا۔ شبنم نگو کو گھور کے دیکھتی۔

"تُو اس کو بتا کیوں نہیں دیتی کہ....."

"چپ کر جا نگو!" شبنم نے اس کو روکتے ہوئے کہا۔

"جاؤ احد! باہر جا کر کھیلو۔"

شبنم نے بچے کو باہر بھیجتے ہوئے کہا۔ احد منہ بناتا ہوا باہر نکل گیا۔

"کتنی باری منع کیا ہے احد کے سامنے ایسی باتیں نہ کیا کر۔ وہ بڑا احساس بچہ ہے۔"

"شبنم تُو غلطی کر رہی ہے۔ تو کوٹھے پہ رہتی ہے۔ ایک نہ ایک دن اس کو پتا چل ہی جاتا ہے کہ اس کے باپ کا کیا نام ہے۔

"اسد۔ طاہر..... پھر پیر احمد۔ اس نے بھی تو کوٹھے پہ دلاّ ہی بننا ہے۔ یا پھر تُو اسے کوئی آفیسر



بنائے گی۔ یا پھر مولوی۔"

"مولوی!" شبنم نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ہاں اسے میں مولوی ہی بناؤں گی۔"

نگو پر پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"چلو بھئی احد مولوی بنے گا۔" نگو پورے کوٹھے پہ بھاگتی ہوئے گانے لگی۔

شبنم دونوں گھٹنوں میں سر رکھ کر ہلکے ہلکے رونے لگی۔

☆☆

شبنم! شبنم کی طرح پاکیزہ تھی۔ وہ آزاد کشمیر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی۔ اس کا باپ مولوی تھا۔ آج بھی اس کو اپنے باپ کی شکل یاد تھی۔ اتنا نورانی چہرہ کہ نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ وہ گاؤں کی مسجد کا امام تھا۔ اس کے تین چھوٹے بھائی تھے۔ وہ اکلوتی بیٹی تھی۔ شبنم کو اپنے گھر کا ایک ایک کونا یاد تھا۔ پہاڑی کے اوپر بنا ہوا گھر، جس کے نیچے سے صاف شفاف نہر بہتی تھی، جس کا شور روح میں ایک تراوٹ سی اتار دیتی تھی۔ اتنا سکون کہ آدمی خود بہ خود روحانی ہو جاتا۔ دور دور تک سبزہ ہی سبزہ۔ جب وہ اپنے جانور چرانے کے لیے جنگل میں جاتی تو دل چاہتا بس زندگی یہیں



رک جائے۔ اکثر وہ سوچتی یہ صاف شفاف ندیا، یہ جنگل میں پرندوں کا شور، یہ خاموشی......

کیا بس یہی زندگی ہے۔ اتنی خوب صورت زندگی یا یہ کوئی جنت کا عکس ہے۔

وہ کوئل کی کوک، نہر کا گنگناتا پانی، وہ حد نگاہ تک سبزہ ہی سبزہ۔ زندگی نہ ہو کوئی سپنا ہو۔ جس طرح ندی کا پانی شور مچاتا گزرتا رہتا ہے۔ اس طرح زندگی بھی تھی۔ کبھی زندگی ہم کو بدل دیتی ہے کبھی ہم زندگی کو۔

وہ منحوس دن آج بھی شبنم کو اچھی طرح یاد تھا۔

روز کے معمول کی طرح وہ جانوروں کو چرانے کے لیے جنگل میں گھوم رہی تھی کہ اس کو ایسا لگا جیسے زمین دو ٹکڑوں میں بٹ گئی ہو۔

اتنے زور زور کے جھٹکے تھے کہ وہ چکرا کر زمین پر گری، پھر اس کو ہوش نہیں رہا۔

جب ہوش آیا تو اجنبی سا ماحول تھا۔ وہ زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے اسے اپنے دوپٹے کا خیال آیا۔ دوپٹا تو کیا ایک طرف سے اس کا گورا بدن

جھانک رہا تھا۔ اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں وحشت سی ناچنے لگی۔

''ماں......'' یہ کہہ کر جیسے وہ اپنے آپ میں چھپنے لگی۔ مگر کہاں تک چھپتی۔

خانم کی نظریں جیسے ہی اس کے گورے بدن پر پڑیں۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''ہیرا ہے ہیرا!'' خانم شبنم کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ریشمی بالوں کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے بولی۔

''ڈرو نہیں بیٹا! کیا نام ہے تمہارا۔''

''شبنم مزید سمٹ گئی۔''

ڈر رہی ہے۔ تم ڈرو نہیں۔ مجھے اپنا سمجھو۔ زلزلہ آیا تھا۔ سب تباہ ہو گیا۔ یہ خدا کا عذاب ہی تھا تمہاری ساری بستی تباہ ہو گئی۔ بس کچھ لوگ بچے تھے۔ تمہارا سارا گھر تباہ ہو گیا۔

''سب مر گئے۔ تمہاری ماں، تمہارا باپ، تمہارے بہن، بھائی......''

شبنم کو اک جھٹکا سا لگا۔ زمین گھومنے لگی۔

اک بڑی سی الٹی آئی اور وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔

............☆☆............

خانم کے ہاتھ جو ہیرا لگا وہ انمول تھا پہلی نظر میں ہی وہ جان گئی تھی کہ یہ دنیا کی نظر میں کوہ نور سے زیادہ قیمتی ہے۔''

اب میں یہ لکھنے نہیں بیٹھوں گا کہ شبنم کس طرح شبنم طوائف بنی۔ یہ بڑی پرانی کہانی ہے۔ یہاں دنیا کے بازار میں ہر چیز بکتی ہے۔

مصر کا بازار اب بھی لگتا ہے۔

اب بھی مجبوری بکتی ہے۔

کوئی بیچتا ہے۔ کوئی خریدتا ہے۔

شبنم کو بھی بکنا پڑا۔ بڑی کوشش کی اپنے آپ بچانے کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔

مدہوشی میں درندوں کی طرح اس کے جسم کو ہی نہیں اس کی روح کو بڑی بے دردی سے مسلا گیا۔

زلزلہ تو صرف ایک بار آیا تھا مگر شبنم کی زندگی میں ہر روز زمین پھٹتی تھی۔ ہر روز وہ زندہ زمین میں درگور ہوتی رہی۔

کبھی کسی وزیر کے در پہ۔

کبھی کسی وڈیروں کے ڈیروں پہ۔

اس کی کمائی نے خانم کو مالا مال کر دیا تھا۔ شبنم اس کے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرغی ثابت ہوئی تھی۔ اس لیے خانم شبنم کا خاص خیال رکھتی تھی۔

شبنم کو بھی آہستہ آہستہ اپنی اہمیت کا احساس ہو گیا تھا۔ اب اس نے بھی اب خانم سے اپنا حصہ وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔

............☆☆............

پیر عالم نے صرف ایک نظر ہی شبنم کی جھلک دیکھی تھی۔ اتنا معصوم حسن جیسے چودھویں کا چاند۔ پیر عالم بھی اس کی چاندنی میں راتیں گزارنا چاہتے تھے۔ مگر خدا کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔

''خانم!''

''جی پیر صاحب حکم!''

''خانم...... ہمیں تمہارے حرم سے ایک ہیرا پسند آ گیا ہے۔''

''خانم قربان جائے! کون خوش نصیب ہے وہ جو آپ کے پیروں کی خاک بنے گی۔''

''نام تو معلوم نہیں مگر وہ آدھی شب کے چاند سے زیادہ روشن ہے۔''

''شبنم کی بات تو نہیں کر رہے۔''

''شاید وہ شبنم کی طرح پاکیزہ ہی ہے۔'' خانم کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

پیر صاحب کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ گدی نشین تھے۔ وزیر تھے۔ ہزاروں ایکڑ زمین کے مالک۔

'واہ خانم واہ! آج تو تیری قسمت جاگ گئی۔ بس اب تو ساری عمر بس کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ چھپڑ پھاڑ کے ملا ہے۔'

''ہم نکاح کریں گے۔'' پیر صاحب نے کہا۔

''نکاح!! پیر صاحب کیا بات ہے۔ مگر......''

''مگر کیا!''

''وہ پیر صاحب آپ تو جانتے ہی ہیں میں تو ڈھل چکی ہوں۔ اب مجھے کون پوچھتا ہے؟''

''خانم ہیرے کے بدلے ہیروں کا ڈھیر ہی ملے گا۔ ساری عمر بیٹھ کے کھاؤ گی۔''

''خدا آپ کو خوش رکھے۔ میں شبنم سے پوچھ لوں۔''

☆☆

خانم نے جب شبنم سے نکاح کی بات کی تو شبنم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کتنا مال ملے گا خانم۔''

''ساری عمر بیٹھ کے کھائے گی۔''

''کون میں یا تم!''

شبنم کو پتا تھا یہی موقع ہے۔ جب خانم کو وہ لگام ڈال سکتی تھی۔

''پیر صاحب جو دیں گے وہ میرے نام پہ ہوگا۔''

''خانم سمجھ گئی کہ چڑیا کے اب پر نکل آئے ہیں۔

اب وہ شبنم کی محتاج تھی۔

شبنم نے نکاح سے پہلے ہی سب کچھ اپنے نام کروالیا۔ ایک بڑا گھر، زیور، زمین، خانم کچھ بھی نہ کرسکی۔

شبنم دو سال پیر صاحب کے نکاح میں رہی۔

جیسے ہی اس کو حمل ٹھہرا۔ پیر صاحب ایک صبح طلاق کے کاغذات شبنم کے تکیے کے نیچے رکھ کر چلے گئے۔ کبھی نہ آنے کے لیے۔

شبنم نے ابارشن نہ کرایا۔

خانم نے لاکھ کہا۔

''ابھی تو جوان ہے۔ اب بھی اس بازار میں تیرے کتنے ہی چاہنے والے موجود ہیں۔ ایک بار جوانی ڈھل گئی تو کھوٹا سکہ بن جائے گی۔''

مگر شبنم نے ننھے احد کو جنم دیا۔

ماں بن کے وہ اور نکھر گئی تھی۔

شبنم نے آنکھیں موندیں تو سارے پرانے منظر پھر سے زندہ ہو گئے۔

کچا صحن، گھر میں بچوں کے قرآن پڑھنے کی آوازیں، بکری کے بچوں کے پیچھے بھاگتے بہن، بھائی۔ کوئل کی کوکیں، ندیا کا شور، رم جھم برستی بارش......

زندگی کبھی رکتی نہیں۔ شبنم زندہ رہی۔ اس کے سارے رشتے مر گئے۔ زندگی چلتی رہی۔

آندھیاں سب چراغ بجھا نہیں سکتی۔

یہ سب اوپر والے کے کام ہیں۔

کبھی سورج غروب ہو رہا ہوتا ہے۔ کبھی طلوع..... ہر تاریکی کے اندر سویرا چھپا ہوا ہوتا ہے۔

انسان مرتے ہیں زندگی نہیں۔ جسم مردہ ہو جاتا ہے روح نہیں۔ آلودہ جسم ہوتا ہے۔ روح پاکیزہ رہتی ہے۔

☆☆

''کیا واقعی تو احد کو مولوی بنائے گی۔'' نگو جو شبنم کی دوست تھی اس نے پوچھا۔

''نگو! میری زندگی تو گناہوں سے آلودہ ہوگئی ہے۔ جانے قیامت کے دن کس حالت میں اٹھائی جاؤں۔ میرا باپ مولوی تھا۔ اس کی اذان کی آواز آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ شاید احد کو قرآن حفظ کروانے سے خدا مجھے بھی معاف فرما دے۔ اے خدا تیری جنت کی چاہ میں! میں احد کو قرآن حفظ کرواؤں گی۔ اے خدا مجھے ہمت دے کہ میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں۔

شبنم کی آنکھوں سے ساون برسنے لگا۔ جیسے آسمان سے بارش......

☆☆

مولوی صاحب میں اپنے بچے کو قرآن حفظ کروانا چاہتی ہوں۔ شبنم احد کا ہاتھ پکڑے مولوی صاحب کے سامنے بیٹھی تھی۔ مولوی صاحب نے نظر اٹھا کر شبنم کی طرف دیکھا۔ نقاب اوڑھے شبنم کی آنکھیں اندھیری رات میں ستاروں کی طرح روشن تھیں۔

احد کی طرف دیکھتے ہوئے مولوی صاحب نے پوچھا۔

''بیٹا تمہارا نام کیا ہے۔'' احد شبنم کے پیچھے چھپنے لگا۔
''احد بیٹا اپنا نام بتاؤ۔'' شبنم کے کہنے پہ احد نے اپنا نام بتایا۔
''کیا احد رہے گا بھی یہاں۔''
''جی مولوی صاحب!'' شبنم احد کو اس ماحول سے دور رکھنا چاہتی تھی۔
''اس کے لیے......'' مولوی صاحب کے کہنے سے پہلے ہی شبنم نے بیس ہزار مولوی صاحب کے سامنے رکھ دیے۔
شبنم سارا سامان لے کے آئی ہوئی تھی۔ شبنم نے نم آنکھوں سے احد کو گلے لگایا۔
''مما۔ آپ جا رہی ہیں۔'' احد نے زور سے شبنم کا ہاتھ پکڑ لیا۔
''ہاں بیٹا۔ میں ہر مہینے آیا کروں گی۔''

............☆☆............

شبنم جب سے احد کو مدرسے میں داخل کروا کر آئی تھی۔ اس کے دل میں ایک بوجھ سا آ پڑا تھا۔ دل کو سکون نہیں آ رہا تھا۔
شبنم آدھی رات کو اٹھ کر سجدے میں جا کے اس قدر روئی کہ سارے بادل ڈھل گئے۔ وہ پھر سے اپنے اندر وہی شبنم کو محسوس کر رہی تھی جو زلزلہ آنے سے پہلے تھی۔ اس نے دنیا کے دروازے بند کر کے اپنے دل کے دروازے کھول دیے۔ اس کے سجدے طویل سے طویل ہوتے چلے گئے۔ اس نے نمازوں میں اپنا سکون ڈھونڈ لیا۔
مہینے میں ایک بار وہ جا کے احد سے مل آتی تھی۔

............☆☆............

دن پہ دن گزرتے چلے گئے۔ شبنم کے بالوں میں چاندی چمکنے لگی تھی۔ دوپہر کی دھوپ منڈیروں پہ چڑھ کے بیٹھی ہوئی تھی۔
احد قرآن حفظ کر چکا تھا۔ اب دوبارہ دہرا رہا تھا۔
اب وہ اذان بھی دینے لگا تھا۔ اس کی آواز بالکل اپنے نانا پہ گئی تھی۔ شبنم جب بھی اس کو دیکھتی اس کو اپنا باپ یاد آ جاتا تھا۔

ویسا ہی روحانی چہرہ۔ چمکتی آنکھیں۔ روشن چہرہ۔ احد کو اذان دیتے ہوئے، سنتے ہوئے شبنم کی آنکھوں میں پانی سا اتر آتا تھا۔
وہ دوبارہ ان ہی پہاڑوں پہ بھاگنے لگتی۔ ندیا کا پانی شور مچانے لگتا۔
بکری کے بچے کان ہلاتے ہوئے سرسبز وادیوں میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگتے۔ بارش کے قطرے روح کو بھگونے لگتے۔ مسجد سے بلند ہوتی اذان۔
حی علی الفلاح، حی علی الفلاح۔

............☆☆............

آج صبح جب شبنم فجر کی نماز پڑھ رہی تھی۔ تو سجدے میں اس کو احد کی ہلکی ہلکی ہچکیوں کی آواز آئی۔ وہ سجدے میں تھی۔
نماز پڑھ کے فارغ ہوئی تو دل ہلکا ہو گیا مگر دماغ میں ایک بے چینی سی تھی۔ شاید کافی دنوں سے وہ احد سے ملنے نہیں گئی تھی۔ اس لیے دل کو سکون نہیں مل رہا تھا۔ آج میں ضرور احد سے ملنے جاؤں گی۔
آج کل ملک کے حالات بھی صحیح نہیں تھے۔ ہر روز بم دھماکے، اب تو مسجدیں، امام بارگاہیں کوئی مقام ایسا نہیں تھا جو محفوظ ہو۔
چاروں طرف خون۔ لاشیں......
ایسی ایسی لاشیں جن کو گھر والے بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ ٹکروں میں بٹی ہوئی۔
کسی کو کچھ نہیں پتا کون کس کی قبر میں گیا تھا۔
سنا تھا قیامت کا ایک دن مقرر ہے۔
مگر یہاں ہر روز ایک قیامت برپا تھی۔
کہیں کوئی ماں اپنے بچے کی لاش پہ ایسے بین کر رہی ہوتی کہ آسمان بھی ٹوٹ کے زمین پر آ پڑے۔
کہیں کوئی بچے اپنے باپ کی لاش سے لپٹے، بابا آج کہاں جا رہے ہو آج تو تم نے کھلونے دلانے کا وعدہ کیا تھا۔''
کہیں کوئی سہاگن جس نے آج ہی اپنے ہاتھوں میں مہندی رچائی تھی۔

نیاز مندی سے بے نیازی تک

شادی کے ابتدائی دنوں میں انہوں نے نہایت سعادت مند بیوی کی طرح رات کے وقت میری واپسی کا انتظار شروع کیا لیکن اس انتظار میں انتظار کم ہوتا اور سعادت مندی زیادہ یعنی اگر کسی دن میری واپسی میں کچھ زیادہ دیر ہو جاتی تو وہ انتظار کرنے سے زیادہ رو رہی ہوتیں۔

میں نے انہیں سمجھایا کہ بعض اوقات مردوں کی واپسی میں دیر بھی ہو جایا کرتی ہے، بیویوں کو اس کا بُرا نہیں ماننا چاہیے۔ پھر یہ کہ میں اپنی زندگی کو دفتر سے گھر تک کس طرح محدود کرلوں۔ ان باتوں کا ان پر اچھا اثر ہوا یعنی بہت جلد انہوں نے میرا انتظار سرے سے ترک کر دیا بلکہ جس شام میں باہر جاتا، اس شام وہ گہری نیند کو دعوت دے کر سو جاتیں۔ ایک رات دروازے کی کنڈی کھٹکھٹا کر اور انہیں پکار پکار کر میں تھک گیا۔ آخر کار محلے کے ایک لڑکے نے دیوار پھاند کر اندر سے کنڈی کھولی۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور کہا کہ آپ آ گئے......؟'' میں ان کی اس غیر ضروری بیداری پر حیران رہ گیا۔

نظیر صدیقی کے ایک انشائیے سے احسن عرفان راجپوت کراچی کا انتخاب

دھواں تھا، خون تھا۔ عذاب تھا۔ سارا شہر کاندھوں پہ لاشیں اٹھائے گھوم رہا تھا۔

جانے کون قاتل ہے۔ قاتل کو معلوم نہیں وہ مقتول کو کیوں قتل کر رہا ہے۔ مقتول کو معلوم نہیں قاتل اس کو کیوں قتل کر رہا ہے۔

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

............☆☆............

شبنم نے جیسے ہی احد کے مدرسے والی گلی میں قدم رکھا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ شبنم کو ایسا جھٹکا لگا۔ وہ زور سے زمین پہ سر کے بل گری۔ کچھ منٹ تک اس کو سمجھ ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے؟

مدرسے میں دھماکہ ہوا ہے۔ مدرسے میں دھماکہ......

شبنم چپل چھوڑ کے بھاگی۔ جہاں مدرسہ تھا وہاں دھواں ہی دھواں تھا۔ مدرسے کے دونوں مینار زمین بوس ہو چکے تھے۔

قیامت کی آہ و بکا تھی۔ مدرسے کا صحن بچوں کے خون کے لوتھڑے سے اٹا پڑا تھا۔ کوئی ایسا جسم نہیں تھا جو ثابت ہو۔

شبنم کی چیخیں آسمان کو چھو رہی تھی۔

احد!! احد!! احد!! وہ صحن میں پڑی لاشوں کے انبار میں احد کو دیوانہ وار تلاش کر رہی تھی۔

دو تین لاشوں کے نیچے خون میں نہائی ہوئی احد کی لاش پڑی تھی۔ شبنم احد کو اس کے ہاتھ میں بندھے ہوئے دھاگے سے پہچانی۔ یہ وہی دھاگہ تھا جو کبھی شبنم کی ماں نے اسے آفتوں سے بچاؤ کے لیے باندھا تھا۔

شبنم نے احد کا سر اپنے زانوں پہ رکھ لیا۔ احد کے سینے سے قرآن کے ورق لپٹے ہوئے تھے۔

''یا خدا!!'' شبنم نے احد کو سینے سے چمٹاتے ہوئے ایسی چیخ ماری کہ پہاڑوں سے پتھر سرکنے لگے۔ ندیا کا پانی کناروں سے سر پٹخنے لگا۔ جانور چیخیں مارتے ہوئے جنگل سے بھاگنے لگے۔ آسمانوں سے خون کی بارش ٹپکنے لگی۔ شبنم کی ناک سے خون بہنے لگا۔ اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی تھی۔

وہ وہیں زمین پہ احد کو گود میں لیے گرتی چلی گئی۔

شبنم کی کھلی ہوئی آنکھیں جیسے سوال کر رہی تھیں۔

جس کا جواب آہ و فغاں تھی......

خون ہی خون تھا۔ ایک نا ختم ہونے والی بے بسی تھی۔

ابھی نہ جانے اور کیا تھا۔ نا جانے......!

☆☆☆

سب کچھ مایا......

حمیرا خان

اُس کی دوشیزہ کی کتھا جسے مایا نے ایک پل میں اپنی عفریت میں لے لیا

کچے پکے سے اس گھر میں شام دبے پاؤں اتر آئی تھی۔ کچے صحن میں کچھ دیر پہلے کیے گئے ہلکے ہلکے پانی کے چھڑکاؤ کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ گرمی کی شدت کم ہوتی محسوس ہو رہی تھی بلکہ گیلی مٹی کی سوندھی خوشبو بھی ہرسو پھیلی ہوئی تھی۔ عام طور پر گاؤں میں گھروں کے صحن کافی بڑے ہوتے ہیں مگر اس لحاظ سے اس گھر کا صحن کافی چھوٹا تھا۔ گنتی کی تین چار چارپائیوں کی ہی جگہ تھی بس لیکن پھر بھی دیوار کے ساتھ ساتھ لگے گلاب کے پودے گھر کے مکینوں کی خوش ذوقی کو بیان کر رہے تھے۔ صحن میں دوسری طرف نلکا لگا تھا، جس کے آگے چھوٹا سا حصہ سیمنٹ لگا کے پکا کر دیا گیا تھا۔ نلکے سے تھوڑا ہٹ کر چولھا رکھا تھا اور اس کے آگے دو کمرے قطار میں بنے دکھائی دیتے تھے جبکہ ایک کمرہ جو کہ باقی دو سے قدرے چھوٹا تھا باہر کے دروازے کے ساتھ بنا ہوا تھا جسے بیٹھک (ڈرائنگ روم) کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ گھر کو ایک نظر دیکھنے میں ہی دو چیزیں بہت نمایاں طور پر دکھائی دیتی تھیں۔ ایک تو اس گھر کی غربت اور دوسرا سلیقہ۔ دائیں طرف والے کمرے سے دبلی پتلی مگر مضبوط جسم والی ایک عورت باہر آئی۔ اس کا رخ باہر کے دروازے کی طرف تھا اور آنکھوں سے تفکر جھلک رہا تھا۔ عورت نے دروازے پر پڑا پردہ ہٹا کر گلی میں جھانکا، جہاں گیارہ بارہ سال کی عمر کے بچوں کا ایک گروپ کھیلنے میں مگن تھا ''کالو۔۔۔ او کالو! ذرا ادھر تو آنا۔'' بچوں کے گروپ کا بغور جائزہ لینے کے بعد اس نے ایک بچے کو آواز دی۔ اس پکار کے جواب میں سبھی بچے کھیل روک کر اس کی طرف دیکھنے لگے اور ایک قدرے دبلا پتلا لڑکا جسے یہ نام یقیناً اس کی گہری سیاہ رنگت کی بنا پر دیا گیا تھا دوڑ کر اس کے پاس آیا۔

''جی ساجدہ خالہ'' بچہ خاصا فرمانبردار قسم کا لگ رہا تھا۔

''فرزانہ اور عاصم صبح سے اپنی پھوپو کے گھر گئے ہوئے ہیں۔ شام سر پر آ گئی ہے، ابھی تک واپس نہیں آئے۔ تیرا خالو بھی آج شہر گیا ہوا ہے۔ تُو ذرا دوڑ کے جا میرا بچہ۔ انہیں بلا کر لے آ۔''

''ٹھیک ہے خالہ میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔'' بچے کے انداز پر ساجدہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''شاباش میرا بچہ۔'' ساجدہ نے اس فرمانبرداری پر اسے شاباش دی مگر وہ یہ الفاظ سننے سے پہلے ہی دوڑ لگا چکا تھا۔ ساجدہ مسکراتے ہوئے مطمئن انداز میں دروازہ بند کرتی گھر کے اندر چلی گئی۔

☆☆☆☆

تین گلیاں چھوڑ کر ایک چھوٹا سا بازار آتا تھا اور بس اس کے ساتھ والی گلی میں ساجدہ کی نند کا گھر تھا۔ اگرچہ شام ہو چلی تھی اور اس دن موسم خاصا مہربان بھی تھا کہ صبح سے ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی لیکن پھر بھی جب کالو نادیہ کے گھر پہنچا تو پسینے میں بری طرح بھیگ چکا تھا۔ گھر کا دروازہ اندر سے بند نہ تھا، کالو بلا جھجک دروازہ کھولتا گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

اس گھر کی حالت پہلے والے گھر سے بھی خراب دکھائی دے رہی تھی۔ گھر کے آنگن میں دو چھوٹی عمر کے لڑکے کھیل میں مگن تھے جبکہ نادیہ صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھی جانے کن سوچوں میں گم تھی کہ اسے کالو کے اندر آنے کی بھی خبر نہ ہوئی۔ چونکی تو تب جب کالو نے زوردار سلام جھاڑا۔

''وعلیکم السلام! کیسا ہے کالو، بڑے دن بعد چکر لگایا۔'' کالو جو نادیہ کے چونکنے پر دانت نکال رہا تھا۔ اس کے بے حد سنجیدگی سے سوال کرنے پر خود بھی سنجیدہ ہو گیا۔

''بس خالہ ٹیم (ٹائم) ہی نہیں ملتا۔'' کالو نے کچھ ایسے شانِ بے نیازی سے کہا جیسے کہ وہ کوئی بڑا افسر لگا ہوا ہو۔ کوئی اور وقت ہوتا تو نادیہ اس کی اس بات پر خوب ہی ہنستی لیکن آج جانے کیوں وہ اس قدر پریشان دکھائی دے رہی تھی کہ کسی بھی بات کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں تھا۔

''میں فرزانہ اور عاصم کو بلانے آیا ہوں۔ ساجدہ خالہ بڑی پریشان ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟''

''کون؟؟'' نادیہ کا ذہن شاید کہیں اور طرف تھا

''فرزانہ اور عاصم! مجھے لگتا ہے خالہ آج تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ شاید گرمی لگی ہو گی، کہو تو حکیم صاحب سے دوا لا دوں؟ بڑی فکرمندی سے کہتے ہوئے آخر میں کالو نے اپنی خدمات بھی پیش کر دیں۔

''ہاں مجھے بھی ایسے ہی لگ رہا ہے گرمی لگ گئی ہے مجھے۔ بخار بھی محسوس ہو رہا ہے لیکن حکیم صاحب نبض دیکھے بنا دوا کہاں دیتے ہیں۔ سوچ رہی ہوں آج کل میں خود ہی چکر لگاؤں گی۔''

''اچھا وہ عاصم اور فرزانہ۔''

''وہ تو صبح آئے تھے کوئی آٹھ بجے کے قریب اور



لسی دے کر اسی وقت واپس چلے گئے تھے۔'' کالو کی بات کاٹ کر نادیہ نے تیزی سے جواب دیا۔''تو پھر کہاں گئے؟''

کیا مطلب کہاں گئے۔ اپنے گھر ہوں گے اور کہاں جانا ہے انہوں نے۔'' ساجدہ نے سرسری سے انداز میں کہتے ہوئے سامنے کھیلتے بچوں پر نظر دوڑائی جن میں جانے کس بات پر لڑائی شروع ہو چکی تھی۔

''ساجدہ خالہ تو کہہ رہی تھیں وہ اب تک گھر نہیں آئے۔ اسی لیے تو انہوں نے مجھے بھیجا ہے کہ ان دونوں کو بلا لاؤں۔''

''بچے ہیں اِدھر اُدھر کہیں کھیل میں لگ گئے ہوں گے۔ بھابی کی تو عادت ہی ہے۔ ہر بات پر جلدی سے پریشان ہو جانے کی۔''

''اچھا خالہ اب میں چلتا ہوں۔''

''ارے بیٹھ اتنی گرمی میں آیا ہے۔ ٹھنڈا پانی تو پیتا جا۔''

''میرے دوست میرا انتظار کر رہے ہیں۔'' اس نے جاتے جاتے جواب دیا اور تیزی سے دروازہ پار کرتا بھاگتا چلا گیا۔ اس کے ساتھی کافی کھیل چکے ہوں گے اور وہ پیچھے رہ گیا، انہی سوچوں میں گم وہ بھاگتا ہوا اپنی گلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

☆☆☆☆

جب کالو واپس ساجدہ کے پاس پہنچا، تب تک ساجدہ کا شوہر بھی گھر آ چکا تھا۔ کالو کی بات سنتے ہی ساجدہ کی پریشانی میں یکدم بے تحاشا اضافہ ہو گیا کیونکہ وہ اپنے بچوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اس طرح بنا بتائے اتنے گھنٹے کہیں کھیلنے میں مگن نہیں رہ سکتے تھے۔ اور وہ بھی اتنی گرمی کے دنوں میں۔ وہ دن بھر کہاں اور کس کے ساتھ کھیل میں گزار سکتے تھے۔ اس کا دل کسی انہونی کی طرف اشارہ کر رہا تھا، جسے وہ صبح سے نظر انداز کرنے کی کوشش میں لگی تھی، لیکن صبح سے خود کو تسلیاں دیتی ساجدہ اب ہمت ہار کر رونے لگی تھی۔

ذرا سی دیر میں ہی یہ بات سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ فرزانہ اور عاصم گھر سے غائب ہیں۔ بہت سے لوگ گروپ بنا کر انہیں تلاش کرنے میں ساجدہ کے شوہر کی مدد کر رہے تھے لیکن ان کا کہیں نام و نشان تک پتا نہیں چل رہا تھا۔

کئی گھنٹوں کی تلاش کے بعد ہر طرف سے مایوس ہو کر آخر افضل بچوں کی گمشدگی کی رپٹ لکھوانے تھانے جا پہنچا گاؤں کے بہت سے لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔ ان میں کچھ تو افضل کی ہمدردی میں اور کچھ محض تماشائی کی حیثیت میں اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

☆☆☆☆

جس وقت یہ چھوٹا سا قافلہ تھانے پہنچا شام کی لالی رات کی سیاہی سے گلے مل رہی تھی۔ خلافِ توقع تھانیدار بھی اس وقت تھانے میں موجود تھا۔

''میں لٹ گیا جی! میں برباد ہو گیا۔'' افضل جو دوپہر سے برداشت کی کڑی مشقت سے گزرتے ہوئے ساجدہ کو حوصلہ دیتا بچوں کی تلاش میں لگا تھا۔ تھانیدار کو دیکھتے ہی اس کی طرف بڑھا اور زور زور سے بولنے لگا۔

''چپ کراوئے! رولا نا پا۔ یہ تھانہ ہے کوئی تیرے پیو جی کا گھر نہیں۔ اور یہ پیچھے کیا بارات ساتھ لایا ہے؟ نکلو سارے......'' تھانیدار کے بولنے سے پہلے ہی حوالدار نے ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے افضل سمیت سب کو ڈانٹ پلائی۔ لمحوں میں سب کے سب تھانے سے باہر نکل گئے اور افضل بھی سہم خاموش ہو گیا البتہ اس کی آنکھیں اب بھی برس رہی تھیں۔

''ہاں اب بتا کیا ہوا ہے؟'' خاموشی چھاتے ہی تھانیدار نے افضل سے سوال کیا۔

''جناب میرے دونوں بچے صبح کے گھر سے نکلے ہیں اور اب تک گھر نہیں لوٹے۔ سارا گاؤں چھان مارا مگر ان کا کوئی پتا نہیں، مہربانی کریں جناب مجھے میرے بچے ڈھونڈ دیں۔ جلدی بچے نہ ملے تو میری بیوی تو رو رو کر اپنی جان دے دے گی۔ اس کی حالت بڑی خراب ہے جناب۔'' بیوی بچوں کا ذکر کرتے ہوئے افضل کے آنسوؤں میں تیزی آ گئی۔ اس کے بعد تھانیدار کے پوچھنے پر اس نے صبح بچوں کے اپنی پھوپو کے گھر جانے سے لے کر اب تک پیش آنے والے سارے واقعات ایک بار پھر بڑی تفصیل سے اُس کے گوش گزار کر دیے۔ تھانیدار کے کہنے پر بچوں کی گمشدگی کی رپورٹ درج کر

لی گئی اور اسے تسلی دے کر واپس روانہ کر دیا گیا۔

☆☆☆☆

یہ ملتان شہر کے گردونواح میں موجود ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں اغواء جیسی وارداتیں خال خال ہی ہوتی نظر آتی تھیں، البتہ زمینوں کے جھگڑوں میں پچھلے آٹھ سالوں میں دو قتل ہو چکے تھے۔ ان دو وارداتوں کے علاوہ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ ایسے میں دو بچوں کی اس طرح کی گمشدگی کا واقعہ پیش آنا اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ پولیس والوں کا خیال تھا کہ بچے کہیں کسی رشتے دار کے گھر ہوں گے۔

لیکن ان کا یہ خیال اگلی صبح ہی غلط ثابت ہو گیا جب افضل ایک بار پھر روتا پیٹتا تھانے میں موجود تھا اس بار اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔

☆☆☆☆

بچوں کو غائب ہوئے دوسرا دن تھا۔ دوپہر سہ پہر میں بدل رہی تھی لیکن اب تک پولیس بچوں کو تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی۔ ساجدہ اور افضل کا جو حال تھا سو تھا لیکن نادیہ کی حالت بھی بے حد ابتر تھی۔ بھتیجا بھتیجی کے غم میں وہ اپنے تین سالہ دونوں جڑواں بیٹوں کو بھی فراموش کر بیٹھی تھی۔ آس پڑوس کے گھروں نے ہی ان دونوں بچوں کو سنبھال رکھا تھا۔ بچوں کے گم ہونے کی خبر سنتے ہی وہ میاں اور بچوں سمیت بھائی بھاوج کا غم بانٹنے آ پہنچی تھی اور اس وقت سے ایک بار بھی اپنے گھر نہیں گئی تھی۔ ''ہائے اوئے ربا تُو میرے دونوں پتر لے لے پر میرے ماں پیو جیسے بھائی بھابی کے دل کا چین قرار لوٹا دے۔'' نادیہ نے ایک بار پھر سینہ کوبی کرتے ہوئے زوردار آواز میں دہائی دی اور بلند آواز میں رونے لگی۔ رو رو کر ان کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اور جیسے آنکھوں سے آنسو تک ختم ہو گئے تھے مگر اس کی پکار میں ایسا درد تھا کہ گاؤں کی عورتیں دل تھام کر رہ گئیں۔

ساجدہ کی حالت عجیب تھی۔ وہ اب رو نہیں رہی تھی نہ کچھ بول رہی تھی۔ بس ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی خلاؤں میں گھور رہی تھی یوں جیسے اسے اردگرد ہوتے ہنگامے سے اُسے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ اس کی آنکھوں سے جھلکتے درد کے تاثرات میں اب مایوسی بھی جھلک رہی تھی۔

''آئے ہائے بیچاری ساجدہ! اس نے بھلا کسی کے ساتھ کیا برائی کی تھی جو ایسا صدمہ سہنا پڑ رہا ہے۔ اس بیچاری کی تو گود ہی اجڑ گئی۔'' کسی نے با آواز بلند ہمدردی کی اور باقی سب نے ''چچ چچ'' کی آوازیں نکالتے ہوئے اور کچھ نے ''ہائے بیچاری'' کہہ کر اس کا ساتھ دیا۔

''اللہ رحم کرے۔ ایسا تو نہ کہیں انشاءاللہ مل جائیں گے دونوں بچے'' شاید کسی کو گود کے اجڑنے والی بات نا بھائی تھی سو فوراً ٹوک دیا گیا تھا۔ جس پر افسوس کرنے والی خواتین منہ بناتے ہوئے سرگوشیوں میں اس بولنے والی کی شان میں قصیدے پڑھنے میں لگ گئیں۔ اور کچھ دیر کے لیے ساجدہ اور اردگرد کے ماحول کو بھول ہی گئیں۔ افضل گھر کے باہر بیٹھا تھا۔ اس کے اردگرد بیٹھے لوگ افضل سے اظہار افسوس کرنے کے بعد اب دنیا کی بڑھتی برائی کا ذکر کرتے ہوئے قبر کے عذاب اور آخرت کی باتیں کرتے ایک دوسرے کو نصیحتیں کرنے میں مگن ہو گئے تھے، تو کچھ لڑکے بالے افضل کے گھر آتی جاتی لڑکیوں کو دیکھ کر اشاروں کنایوں میں دلوں کا حال بیان کر رہے تھے۔ دونوں طرف نگاہوں سے سلام و پیام دینے کا سلسلہ جاری تھا۔ افضل بھی شاید اب بچوں کی واپسی سے مایوس ہو چکا تھا اسی لیے اس نے چپ سادھ لی تھی لیکن اس کی منتظر نظریں اب بھی گھر کی طرف آتے راستے پر لگی تھیں اور جب بھی کوئی گلی میں داخل ہوتا وہ چونک چونک جاتا مگر پھر بچوں کو نا پا کر مایوسی سے سر جھکا لیتا۔

☆☆☆☆

''تجھے کیا لگتا ہے نذیرے!! کس...... کا کام ہے یہ؟'' تھانیدار نے مونچھیں مروڑتے ہوئے ایک موٹی سی گالی دے کر نذیر کی رائے پوچھی جو کہ اس کا سب سے بااعتماد بندہ تھا۔

''کچھ سمجھ نہیں آ رہی سر جی۔ افضل بڑا سیدھا سادہ بندہ ہے۔ کسی کے ساتھ کوئی دشمنی بھی نہیں کوئی۔ زمین جائیداد بھی نہیں کہ اس کی وجہ سے کوئی بچے اٹھاتا۔''

''سب کے بیانات کے مطابق بچے آخری بار

پھوپھی کے گھر جاتے دیکھے گئے اس کے بعد سے ان کو کسی نے نہیں دیکھا۔''

''جی سر جی! بالکل سب کے بیانات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔''

''ہوں ں ں ں ں ں ں ں'' تھانیدار نے مونچھیں مروڑنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے ایک لمبا ہنکارا ابھرا۔

''یہ..... افضل کا اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ کیسا تعلق ہے؟''

''ایک دم فٹ فاٹ جی! گاؤں بھر میں اس گھرانے کی محبتوں کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ افضل کا بہنوئی بھی ایک دم سیدھا بندہ ہے۔''

''اچھا.....'' تھانیدار کو یقیناً اس جواب سے خاصی مایوسی ہوئی تھی۔

ابھی وہ اسی بارے میں سوچ بچار میں گم تھے کہ ایک مرد اور عورت تھانے کی عمارت میں داخل ہوئے۔ مرد جس کی عمر تقریباً چالیس کے لگ بھگ تھی۔ پینٹ کوٹ پہنے ہوئے تھا جبکہ عورت جس کی عمر تیس کے آس پاس دکھائی دیتی تھی جدید فیشن کے مطابق بہترین لباس میں ملبوس تھی۔ دائیں کاندھے پر ایک خوبصورت بیگ جھول رہا تھا جبکہ اس نے دوپٹے کو فولڈ کر کے گلے میں ڈالا ہوا تھا۔ یہ سب اپنی جگہ لیکن وہ خود بلا شبہ اتنی حسین تھی کہ عام سے حلیے میں بھی ہر ایک کی توجہ کھینچ لینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اپنے حلیے اور ہر ہر انداز سے وہ لوگ گاؤں میں اجنبی دکھ رہے تھے۔ آنے والوں کی شخصیت اتنی پُراثر ضرور تھی کہ یکدم تھانے میں خاموشی چھا گئی اور سب کے سب اٹین شن ہونے والی پوزیشن میں آنے والوں کو دیکھنے میں لگ گئے۔

''ایکسکیوزمی'' آنے والے مرد کی آواز سے تھانے میں چھائی خاموشی کی فضا میں دراڑ پڑی اور جیسے یکدم سب لوگ کسی سحر سے آزاد ہو گئے۔ یہ اور بات کہ اب بھی سب کی توجہ اسی طرف تھی۔

''جی حکم کریں جناب۔'' تھانیدار نے کھڑے ہو کر آنے والوں کا استقبال کرتے ہوئے کسی قدر مرعوب لہجے میں سوال کیا اور انہیں سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''دراصل ہمیں ایک چوری کی رپورٹ درج کرانی ہے۔'' دونوں نے کرسیاں سنبھال لیں تو مرد نے عورت کی طرف دیکھتے ہوئے گویا آگے اسے بولنے کی دعوت دی۔

''چوری! کیا چوری ہوا ہے اور کہاں سے؟''

تھانیدار نے رپورٹ لکھنے کے لیے دوسری ٹیبل پر بھیجنے کی بجائے اشارہ کر کے رپورٹ لکھنے والے کو اسی جگہ بلا لیا وہ بھی جیسے اسی کا منتظر تھا لمحوں میں حاضر ہو گیا۔

''گولڈ کے جیولری چوری ہوئی ہے۔ یہی کوئی لگ بھگ بیس پچیس تولہ کے زیورات ہوں گے۔'' بیس پچیس تولہ.....'' تھانیدار کے لہجے میں حیرت کے ساتھ مرعوبیت میں بھی اضافہ ہوا۔ عورت کے چہرے پر تفکر ضرور جھلک رہا تھا لیکن وہ بدحواس قطعاً نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب صاف ظاہر تھا کہ اس کے لیے سونے کی یہ مقدار اتنی بھی اہم نہیں کہ وہ اپنی حیثیت بھلا کر رونے دھونے میں لگ جائے۔''

''آپ لوگ یہاں اجنبی دکھائی دے رہے ہیں۔ آپ نے کہاں stay (رہائش) کیا ہوا ہے؟'' تھانیدار نے اپنی یادداشت کے خانے کو جلدی سے کھنگال کر انگلش کا لفظ تلاش کیا اب وہ قدرے پراعتماد دکھائی دے رہا تھا۔ وہ لوگ کسی بھی حیثیت کے مالک ہی لیکن وہ یہاں کا تھانیدار تھا اور تھانے میں تھانیدار کے آگے سارے صفر ہوتے ہیں۔ شاید اسی قسم کی سوچوں نے اسے اعتماد بخشا تھا۔ اب وہ پروفیشنل انداز میں سوالات کرنے میں لگا ہوا تھا۔

''میں ڈاکٹر رضوان ہوں اور یہ ڈاکٹر فاخرہ ہیں۔ ہم لوگوں نے ایک این جی او کے پروگرام کے تحت اس بار اس گاؤں میں فری میڈیکل کیمپ لگایا ہوا ہے۔ ادھر ریلوے لائن کے قریب جو میدان ہے، وہاں پر ہمارا کیمپ ہے۔ ہم لوگ کل صبح یہاں آئے ہیں۔ چوہدری نعمان کا مہمان خانہ فی الحال ہماری رہائش گاہ ہے۔ البتہ زیورات کی گمشدگی کا پتا کچھ دیر قبل ہی لگا ہے جب ڈاکٹر فاخرہ نے اپنے بیگ چیک کیے۔''

چوہدری نعمان اگرچہ اس گاؤں کا چوہدری تھا لیکن عام چوہدریوں سے بالکل مختلف تھا۔ ایک تو وہ مال و دولت کے لحاظ سے اردگرد کے علاقوں کے چوہدریوں

سے حیثیت میں کم تھا دوسرا اچھا خاصا روشن خیال انسان تھا۔ چوہدری نعمان اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا اور اس نے تھوڑی بہت جائیداد کے علاوہ باقی ساری دولت اور جائیداد گاؤں والوں کی بھلائی کے لیے وقف کر دی تھی اسی لیے گاؤں والوں کے دلوں میں اس کے لیے خوف کی بجائے بے انتہا عزت پائی جاتی تھی۔

''چوہدری نعمان آج کسی ضروری کام کی وجہ سے شہر گئے ہوئے ہیں اسی لیے ہم نے اس واقعہ کی اطلاع انہیں دے کر زحمت دینے کی بجائے آپ کے پاس آنا مناسب خیال کیا۔''

''آپ نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے جناب! آپ صرف چوہدری صاحب کے ہی نہیں بلکہ پورے گاؤں کے مہمان ہیں۔ میں کیسے بھی کر کے آپ کا مال نکلوالوں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں، لیکن اتنا زیور لے کر آپ لوگ کیمپ لگانے آئے ہیں...... یہ بات کچھ سمجھ نہیں آئی۔''

''بات دراصل یہ ہے آفیسر کہ اس ہفتے میری بہن کی شادی ہے۔ وہ زیورات اسی کے ہیں۔ ہم لوگوں کا ارادہ سیدھا گھر جانے کا تھا لیکن ایک ڈاکٹر کو ضروری کام سے جانا پڑا تو اس کی جگہ ایک دن کے لیے ہم لوگوں کو یہاں رکنے کا کہا گیا، اس لیے ہمیں یہاں یعنی راستے میں ہی رکنا پڑ گیا اور ظاہر ہے زیورات بھی ہمارے ساتھ ہی تھے۔''

کچھ اور سوالات کرنے کے بعد تھانیدار نے انہیں چائے پلا کر عزت و احترام کے ساتھ رخصت کر دیا۔ اور خود گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بار بار بدل رہے تھے اور آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس کیس کی کڑیاں تلاش کرنے میں لگا ہوا تھا۔

☆☆☆☆

ساجدہ کے گھر کا منظر اس وقت بھی تقریباً وہی تھا صرف عورتوں کی تعداد میں کچھ کمی ہو گئی تھی، جو یقیناً اپنے گھر کے کام کاج دیکھنے جا چکی تھیں۔ کہیں کتنا بھی بڑا حادثہ کیوں نا ہو جائے کاروبارِ دنیا رواں دواں رہتا ہے ایسا ہی یہاں بھی ہو رہا تھا۔ گاؤں والے افضل اور ساجدہ کے دکھ میں شریک تھے لیکن آخر وہ کب تک ان کے گھر میں ان کے ساتھ بیٹھے رہ سکتے تھے۔ تبھی گلی کے نکڑ پر شور سا اٹھا۔ گلی میں افضل کے ساتھ بیٹھے مرد چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے تھانیدار اپنے عملے کے ساتھ افضل کے گھر کی طرف آتا دکھائی دے رہا تھا۔ تھانیدار کو دیکھ کر افضل کی آنکھوں میں امید کی چمک پیدا ہوئی۔

''کیا میرے بچے مل گئے جناب؟'' اس نے آگے بڑھ کر بیتابی سے سوال کیا۔

''بچوں کا پتا بھی لگ جائے گا افضل! پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہاری بہن اور بہنوئی تمہارے گھر پر ہیں یا اپنے گھر جا چکے ہیں۔''

''وہ دونوں تو کل سے ہی ہمارے گھر پر ہیں جناب! ایسے میں وہ اپنے گھر جا بھی کیسے سکتے ہیں۔'' اسی دوران کسی نے بیٹھک کھلوا کر تھانیدار اور اس کے ساتھیوں کے بیٹھنے کا انتظام کر دیا تھا۔ تھانیدار کے آنے کی خبر نے اندر بیٹھی عورتوں میں بھی کھلبلی مچا دی تھی اور وہ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ اتنے میں نادیہ کو بیٹھک سے بلاوا آ گیا۔ بلانے والا ان کا ایک قریبی رشتے دار تھا۔

''مجھے کیوں بلا رہے ہیں میں نے کیا کیا ہے؟'' تھانیدار کے آنے کی خبر نادیہ کو بھی مل چکی تھی۔ اس بلاوے نے اس کو بدحواس کر دیا جو کہ کسی بھی گھریلو عورت کے لیے ایک فطری بات تھی۔

''پریشان نا ہو آپا! تھانیدار صاحب نے دو چار سوال کرنے ہیں بس۔ افضل بھائی بھی بیٹھے ہیں بیٹھک میں۔'' بلانے والے نے افضل کا بتا کر گویا اسے تسلی دی۔ نادیہ دوپٹہ سر پر لیتے ہوئے مرے مرے قدموں سے بیٹھک کی طرف بڑھ گئی۔ تھانیدار نے نادیہ کے علاوہ افضل سمیت باقی سب کو باہر بھیج دیا اور اس سے سوال جواب کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں تھانے کا عملہ نادیہ کی معیت میں اس کے گھر کی طرف رواں دواں تھا۔ آنکھوں میں بے تحاشا الجھن لیے افضل بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ بند کمرے میں ہوئی باتوں سے ناواقف تھا اور تھانیدار نے بھی فی الحال اسے کچھ بتانے سے انکار کر دیا تھا۔ گاؤں کے لوگ بھی تھوڑا فاصلہ رکھ کر

ان کے پیچھے پیچھے تھے۔

☆☆☆☆

کچھ ہی دیر میں کئی لوگوں کی موجودگی میں نادیہ کی نشاندہی پر کمروں کے پیچھے بنے چھوٹے سے صحن کی کھدائی شروع کر دی گئی۔ مٹی تازہ کھدی ہوئی تھی اس لیے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں پڑی۔ مٹی میں لتھڑے عاصم اور فرزانہ کو دیکھتے ہی کئی لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ افضل جو ایک طرف کھڑا یہ ساری کاروائی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا عاصم اور فرزانہ کو دیکھ کر ایک لمحے کو گم صم رہ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ چیخ چیخ کر روتے ہوئے بچوں کی لاشوں سے لپٹ گیا۔ ہر آنکھ اشک بار تھی اور ساتھ ہی سب کے ذہنوں میں ڈھیروں سوالات جنم لے رہے تھے جن کا جواب یا تو تھانیدار کے پاس تھا یا پھر نظریں جھکائے کھڑی نادیہ کے پاس۔

☆☆☆☆

اس روز ساجدہ نے دہی بلو کر مکھن نکالا تھا اور لسی بنائی تھی تا کہ کڑھی چاول پکا سکے، اور یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ نادیہ اس لسی کی دیوانی تھی سو اس نے لسی بنتے ہی ڈول بھر کر گلی میں کھیلتے بچوں کو آواز دے کر اندر بلایا اور نادیہ کے گھر ڈول دے کر آنے کو کہا۔

بچے ڈول ہاتھ میں جھلاتے ہنستے مسکراتے اپنی پھوپھی کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے جبکہ ساجدہ کڑھی چاول پکانے کی تیاری میں لگ گئی۔

''نادیہ تو آج بڑی خوش ہو جائے گی لسی دیکھ کر، شام کو اس کے بھائی کے ہاتھ کڑھی چاول بھی بھجوا دوں گی بلکہ بھجوانا کیا ہے میں ان دونوں کو ہی آج ادھر بلا لیتی ہوں۔ ارے میں بھی کتنی جھلی ہوں ابھی بچوں کے ہاتھ شام کو آنے کو کہلوا دیتی۔ اب عاصم کا ابا شام کو تھکا ہارا شہر سے لوٹے گا اور پھر اسے بھیجنا پڑے گا، وہ اپنی عقل کو کوستی خود ہی خود کو برا بھلا کہے جا رہی تھی۔''

نادیہ کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ کام کرتی کرتی ماضی دہرانے لگی۔

کس قدر مشکل تھا وہ وقت، کتنی بڑی آزمائش تھی، جب نکاح کے بعد ساجدہ کو افضل نے منہ دکھائی میں آٹھ سالہ نادیہ لا تھمائی تھی۔ نادیہ اور افضل کی عمروں میں کافی فرق تھا۔ افضل اور نادیہ کے باپ کا انتقال تو کافی پہلے ہو چکا تھا لیکن اب ماں کے مرنے کے بعد نادیہ ایک سوال کی صورت سب کے سامنے تھی۔ نادیہ کو گھر پر اکیلے نا چھوڑا جا سکتا تھا۔ گھر میں ایک عورت کی موجودگی ضروری تھی۔ آخر صلاح مشورے کے بعد برادری کے بڑوں نے یہی فیصلہ کیا کہ ماں کے قل کے بعد شام میں سادگی سے افضل کا نکاح اس کی خالہ کی بیٹی ساجدہ سے کر دیا جائے جو کہ اس کی بچپن کی مانگ تھی۔

افضل اور افضل کی ماں بڑی دھوم دھام سے اسے بیاہ کر اس گھر میں لانا چاہتے تھے اسی لیے یہ شادی رکی ہوئی تھی لیکن انسان کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے، ہونا تو وہی ہوتا ہے جو کہ کاتبِ تقدیر نے لکھ دیا ہوتا ہے۔ اس نے اسی وقت دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ بھابی نہیں بھابی ماں بن کر دکھائے گی اور نادیہ کی زندگی میں کبھی کسی چیز کی کوئی کمی محسوس نہ ہونے دے گی۔ اس نے یہ عہد نبھایا بھی تھا۔ شادی کے سال بعد ہی عاصم اس کی گود میں آ گیا مگر پھر بھی نادیہ کی دیکھ بھال میں اس کی طرف سے کوئی کمی نہ ہونے پائی تھی۔ وہ قیامت کے دن اپنی ماں جیسی پیار کرنے والی خالہ کے سامنے سرخرو ہونا چاہتی تھی۔ اس عہد کو پورا کرتے کرتے کئی بار کئی مشکل موڑ بھی زندگی میں آئے جب اسے اپنے بچوں کو نظر انداز کر کے نادیہ کی خواہشوں کو پورا کرنا پڑا لیکن وہ صبر اور تحمل سے یہ پل صراط بھی پار کر گئی۔ یہ سب یاد کرتے ہوئے ساجدہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''میں بھی کتنی پاگل ہوں اب تو مشکل وقت گزر گیا۔ اب کیا رونا؟ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے عہد نبھانے کی توفیق اور ہمت دی۔'' اپنے آنسو دوپٹے کے پلو سے پونچھتے ہوئے وہ خود کو ڈانٹ کر مسکرا دی۔ کھانا پک گیا تھا لیکن بچے ابھی تک نا لوٹے تھے۔

'بچوں کے ساتھ کھیل میں لگ گئے ہوں گے اور ویسے بھی کتنے دن بعد گئے ہیں پھوپھی سے ملنے۔ اتنی جلدی تھوڑا ہی آنے دے گی۔ وہ نادیہ کی بچوں کے لیے دیوانگی سے اچھی طرح واقف تھی اسی لیے پریشان ہوئے بنا تھوڑی دیر آرام کرنے کا سوچ کر کمرے میں جا لیٹی۔ ارادہ تو آرام کرنے کا تھا لیکن ذہن کے

پردے پر ایک بار پھر ماضی کا عکس لہرانے لگا۔

یہ وہ وقت تھا جب نادیہ کے لیے رشتے آنے لگے تھے۔ نادیہ اچھی خوبصورت لڑکی تھی قد کاٹھ بھی اچھا نکالا تھا لیکن وہ گدڑی میں چھپا لعل تھی جو کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ کپڑے برتن تو اس کے جہیز کے لیے تھے لیکن زیورات کے نام پر سوائے ایک جوڑا بالیوں کے اور کچھ نہ تھا۔ ایسے میں ساجدہ نے ایک بار پھر نادیہ کے لیے ماں بن کر سوچا اور اپنے میکے سے ملا سارا زیور شوہر کے سامنے لا رکھا۔ اسے وہ دن آج بھی اچھی طرح یاد تھا جب لڑکے والے جہیز سے مطمئن ہو کر نادیہ کے رشتے کے لیے ہاں کر کے گئے تھے۔

☆☆☆☆

جیسے ہی ساجدہ دروازہ بند کر کے پلٹی تو اس کی نظر پیچھے کھڑی نادیہ پر پڑی وہ دانستہ مسکرا دی لیکن اس کی یہ مسکراہٹ بھی اس کے چہرے پر چھائے تفکرات کو دور کرنے میں ناکام رہی۔

''بیٹھک میں سے برتن اٹھا کر کچن میں رکھ دو۔ میں ذرا صغریٰ خالہ سے مل کر آتی ہوں۔'' نادیہ کی احتجاجی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ دوپٹہ ٹھیک سے لیتے ہوئے باہر کے دروازے کی طرف بڑھی۔

''بھابی آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں جبکہ آپ جانتی ہیں مجھے یہ سب برا لگ رہا ہے۔ بہت تکلیف دے رہا ہے مجھے'' نادیہ کا لہجہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ کمرے کی طرف جاتی ہوئی ساجدہ آگے بڑھتی بڑھتی رک گئی اور پلٹ کر اس کی طرف آئی۔

''کیا برا لگتا ہے تمہیں؟؟ ہاں؟ یہ کہ ہم تمہارے بھلے کا سوچتے ہیں، تمہاری خوشیوں کے لیے کوشش کرتے ہیں، ہم یہ سب نہیں کریں گے تو کیا غیر کریں گے؟؟'' ساجدہ کے اپنائیت سے کہنے پر نادیہ بے ساختہ اس کے گلے لگ گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''آخر کب تک بھابی آخر کب تک آپ اور بھائی میرے لیے قربانیاں دیتے رہیں گے۔ اپنی اور اپنے بچوں کی ضرورتیں نظر انداز کر کے میرے لیے سوچتے رہیں گے۔''

''جب تک ہم زندہ ہیں تب تک، اور یہ اتنی فضول سوچیں تمہارے ذہن میں آتی کہاں سے ہیں؟ دوبارہ ایسی کوئی بات سوچنا بھی مت۔ ہمارے لیے جس طرح فرزانہ اور عاصم ہیں ایسے ہی تم بھی ہماری بیٹی ہو سمجھی؟'' ساجدہ کے لہجے میں ناراضگی جھلکنے لگی تو نادیہ شرمندہ سی نظر آنے لگی۔

''لیکن بھابی۔''

لیکن ویکن کچھ نہیں، بس تم یہ سب سوچنا چھوڑ دو اور پیا دیس جانے کی تیاری کرو'' ساجدہ کے شرارتی لہجے میں کہنے پر نادیہ کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی اور لبوں پر مسکراہٹ جگمگانے لگی۔

''اچھا سنو تمہارے بھیا دکان سے آتے ہی ہوں گے اور بچوں کی بھی چھٹی کا ٹائم ہو رہا ہے۔ سالن میں نے بنا دیا تھا تم روٹی ڈال لینا اور ہاں تم لوگ کھانا کھا لینا میرا انتظار نہ کرنا۔ مجھے شاید کچھ دیر ہو جائے۔ خالہ سے مل کر مجھے نجمہ کے ساتھ بازار بھی جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے بھابی۔''

''دروازہ اندر سے بند کر لو۔'' وہ آخری ہدایت دیتی گھر سے روانہ ہو گئی۔ نادیہ نے باہر کے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور روٹیاں بنانے صحن کے اس حصے کی طرف چل دی جہاں چولہا رکھ کر کچن کا کام لیا جاتا تھا۔

☆☆☆☆

اور اس دن کے مہینہ بھر بعد ہی نادیہ رخصت ہو کر سسرال چلی گئی تھی جو کہ ان کے گھر سے تین گلیوں کے فاصلے پر ہی تھا۔ رخصتی کے وقت دیکھنے والے کسی طور نا کہہ سکتے تھے کہ یہ ایک دوسرے کی ماں بیٹی نہیں بلکہ نند اور بھابی ہیں۔

اس روز ساجدہ کو لگا اس کی خالہ اوپر آسمانوں میں بیٹھی مسکرا کر اسے دیکھ رہی ہے۔ بہت سالوں بعد بڑی سکھ کی نیند آئی تھی اسے اس رات۔

دروازے پر ہونے والی دستک اسے اس کے خیالوں سے باہر کھینچ لائی۔ کوئی فقیر تھا جو دروازہ بجا کر صدا لگا رہا تھا۔ ساجدہ نے اسے کھانا دیا اور پھر سے چارپائی پر آلیٹی۔ بچے ابھی تک نہیں آئے تھے جبکہ دوپہر ڈھلنے کو تھی۔

"کیوں نا میں خود نادیہ کے گھر چلی جاؤں...... لیکن کہیں عاصم کا ابو گھر آ گیا تو تالا لگا دیکھ کر پریشان ہو جائے گا۔ اتنی دوپہری میں بھیجوں بھی تو کس کو۔ تھوڑی دیر انتظار کر لیتی ہوں، پھر کسی کو بھیجتی ہوں۔ گھر آئیں گے تو ڈانٹوں گی بہت، اتنی دیر بھی لگاتا ہے کوئی۔" وہ دل ہی دل میں بچوں کو ڈانٹنے کا پروگرام بناتے ہوئے قمیض لے کر کڑھائی کرنے بیٹھ گئی۔ کسی طور وقت بھی تو کاٹنا ہی تھا۔

☆☆☆☆

اس دن دونوں بچے اپنے گھر سے نکل کر ایک دوسرے سے اٹھکیلیاں کرتے ڈول گھماتے چلے جا رہے تھے، ساتھ میں راستے میں آئی چھوٹی چھوٹی کنکریوں کو ٹھوکر مارنے کا مشغلہ بھی جاری تھا تبھی عاصم کی نظر لیدر کے ایک چھوٹے سے بیگ پر پڑی۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر بچوں نے وہ بیگ کھولا تو اندر ڈھیر سارے زیورات دکھائی دیے۔ بچوں کی دلچسپی اس بیگ میں ختم ہو چکی تھی نادیہ کا گھر سامنے ہی تھا۔ وہ بیگ لیے لیے پھوپھی کے گھر میں داخل ہو گئے۔ نادیہ کے پوچھنے پر بچوں نے سارا واقعہ کہہ سنایا اور بیگ اس کے حوالے کر دیا۔ بیگ کو کھولتے ہی نادیہ کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اتنا سونا تو اس نے زندگی میں کبھی دیکھا تک نہ تھا۔

"اگر یہ سب میرا ہو جائے تو......" لالچ اور شیطان اس کے اندر جگہ بنانے لگا اور وہ طرح طرح کے منصوبے بنانے میں لگ گئی۔ تھوڑی دیر نادیہ کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کے بعد عاصم اور فرزانہ نے گھر جانے کا ارادہ کیا لیکن نادیہ نے بہانے سے انہیں روک لیا اور پھر جانے وہ نرم و نازک نادیہ اور محبتیں نچھاور کرنے والی پھوپھی کہاں جا چھپی اور اس کی جگہ ایک لالچی، خود غرض اور ظالم لڑکی آ کھڑی ہوئی۔ لمحوں کا کھیل تھا عاصم اور فرزانہ کے گلے گھونٹ کر انہیں زندگی کی قید سے آزاد کرنے میں نادیہ کو بس کچھ منٹ ہی لگے تھے۔ دوسری فکر ان کی لاشوں کو چھپانے کی تھی لیکن شیطان اس کی رہنمائی کو موجود تھا، سو کوئی بھی کام مشکل نہ تھا۔ کل ہی اس کے میاں نے صحن کی کھدائی کر کے اسے سبزیاں لگانے کے لیے تیار کیا تھا۔ نادیہ نے زمین میں گڑھا کھودا اور دونوں بہن بھائیوں کی لاش کو اس میں ڈال کر اوپر مٹی برابر کر دی اور جیسے ہی بچوں کی گمشدگی کا شور اٹھا گھر کو تالا لگا کر دونوں بچوں کو لیے روتی پیٹتی بھائی کے گھر جا پہنچی۔

ساری حقیقت جان کر سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ نادیہ ایسا بھی کر سکتی ہے۔ ساجدہ اور افضل کی حالت بہت خراب تھی۔ انہیں کسی طور یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کے بچے اس دنیا میں نہیں رہے اور ایسا کرنے والی ان سب کی پیاری چہیتی نادیہ ہے۔

☆☆☆☆

اس روز ڈاکٹر فاخرہ نے باتوں کے دوران یہ بھی بتایا تھا کہ راستے میں مٹی کے ڈھیر پڑے ہونے کی وجہ سے انہیں گاڑی سے اتر کر کچھ فاصلہ پیدل چل کر جانا پڑا تھا اور حفاظت کے خیال سے انہوں نے وہ چھوٹا سوٹ کیس ڈرائیور کو اپنے ساتھ ہی لانے کو کہہ دیا تھا جبکہ باقی سامان گاڑی میں ہی رہنے دیا تھا اور گاڑی لاک کر دی تھی۔ اور جس راستے سے گزر کر وہ لوگ گئے تھے وہ وہی تھا جہاں سے گزر کر بچے نادیہ کے گھر گئے تھے۔ شاید سوٹ کیس کی زپ تھوڑی کھلی رہ گئی تھی اور ڈرائیور کی لاپروائی کی وجہ سے زیورات والا بیگ وہیں گر گیا اور بعد میں بچوں کو مل گیا۔ انہی خطوط پر کام کرتے ہوئے تھانیدار آصف قاتل تک جا پہنچا تھا۔

☆☆☆☆

"شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا ہے جناب! آپ لوگوں کی رپورٹ لکھوانے کی وجہ سے ہی میرے ذہن نے اس سمت میں سوچنا شروع کیا تھا۔" ڈاکٹر فاخرہ کے شکریہ ادا کرنے پر تھانیدار آصف نے جواب دیا جبکہ ڈاکٹر فاخرہ جو ساجدہ اور نادیہ کی ساری کہانی سے واقف ہو گئی تھی، یہ سوچ رہی تھی کہ نادیہ جیسے لوگوں کو صرف قاتل کہنا کافی نہیں، یہ لوگ قاتل سے کچھ بڑھ کر ہیں کیونکہ یہ انسان کے ساتھ ساتھ رشتوں، اعتماد اور محبتوں کا قتل بھی کرتے ہیں۔

☆☆☆

تیسرا شعلہ

اگھورا نفس مورا

نسیم سکینہ صدف

اپنے نفس کی آگ سے، اپنوں کو بھسم کر دینے والی دوشیزہ کی عبرتناکی، سیالکوٹ سے



طیبہ بوتیک کا گرے اور پنک کنٹراسٹ خوبصورت ایمبرائیڈری سے سجا سوٹ پہن کر معنی خیز انداز میں مسکراتی ہوئی، چھت پر آئی اور چھت کی دیوار سے پار ماسی برکتے کی بیٹی شمع کو آواز دی۔ کچے سے صحن میں سردیوں کی ٹھنڈی دھوپ میں وہ چار پائی پہ بیٹھی اپنے کھردرے بے رنگ بالوں کو سمیٹتے ہوئے ایک ہاتھ سے چھوٹی گڑیا کو چار پائی کے نیچے بندھے کپڑے کی جھلنگی سے جھولے دے رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے سوا سالہ سنبل کو فیڈر پلا رہی تھی جبکہ کل سے اسے بخار تھا اور وہ ضدی اور چڑچڑی ہو رہی تھی۔ اور شمع اس کو بہلانے کی کوشش میں بے حال ہوئے جا رہی تھی کہ زری کی آواز سن کر اس نے سر اوپر اٹھایا تو وہ دیوار سے لٹکی اسے اپنا سوٹ دکھا رہی تھی۔ شمع نے اتنا خوبصورت سوٹ دیکھ کر ستائشی نظروں سے پوچھا۔ کتنے میں لیا ہے۔

اس نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

''تیرے بندے نے مجھے دلایا ہے۔'' اور شمع کے سینے میں آگ لگا کر چہکتے ہوئے نیچے اتر گئی۔ شمع کے کلیجے میں مانو کسی نے چھری گھونپ دی۔

بہت دن سے وہ کہہ رہی تھی کہ پچھلے دو سال کے گرم سوٹ پرانے ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ سے پھٹ گئے ہیں۔ کچھ پیسے دے دیں تاکہ میں بھی ایک آدھ سوٹ لے لوں اور خود سلائی کر کے پہن لوں گی۔ بچے بھی سردی سے



نزلہ زکام میں مبتلا تھے۔ ان کو بھی گرم کپڑوں کی اشد ضرورت تھی۔ شمع کی ماں کہاں تک ان کا ساتھ دیتی۔ بھائی بھی کوئی نہیں تھا۔ شمع اور زرقا دو ہی بہنیں تھیں۔ باپ عین جوانی میں ہی داغ مفارقت دے گیا تھا۔ ماں نے بھری جوانی میں لوگوں کے گھروں میں کام کاج کیا اور پھر جب صاحب لوگوں کی بری نظروں سے بچنا محال ہو گیا تو اس نے اپنے محلے میں اپنے ماموں کے مشورے پہ ایک سبزی کی دکان اپنے گھر کے ایک کمرے میں کھول لی جس کا دروازہ باہر گلی میں کھلتا تھا۔ ماموں کا ملازم سبزی منڈی سے سبزی لا کر شمع کی امی کے حوالے کر جاتا اور وہ اپنی دکان چلا لیتیں۔ وہ اپنے ماموں کی بہت مشکور تھیں کیوں کہ ماموں نے سبزی منڈی میں مردوں کے رش سے بچانے کے لیے اپنے ملازم کو یہ کام سونپ دیا تھا اور وہ بھی فی سبیل اللہ یہ کام کرتا تھا اور بہت عزت کرتا تھا کہ عورت ذات ہو کر کتنی جواں مردی سے روزگار کے لیے کمر بستہ ہے۔

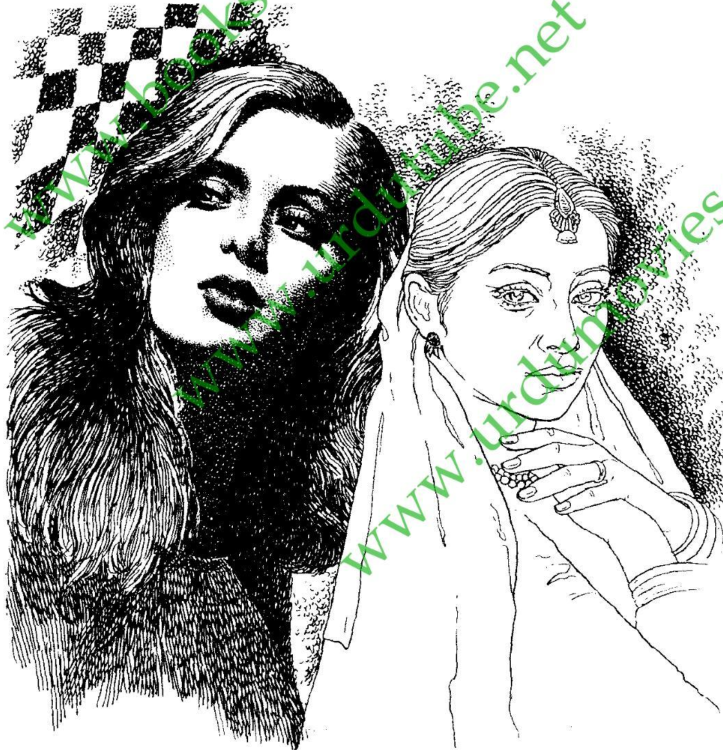
اس مشکل وقت میں جب بھی اپنے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، ایک دیور تھا اور دو جواں سال بھائی، مگر وہ اپنی بیویوں کی آنکھ کی جنبش پہ چلتے تھے کیوں کہ ان کی بیویوں کو بیوہ نند کے گھر آنا جانا پسند نہیں تھا، تو روزگار میں کیا مدد کرتے۔ اپنے پاس سے بھی ان کے علم میں لائے بغیر بہن کے ہاتھ میں کچھ رقم رکھ دیتے جس سے دو وقت کا چولہا جل سکتا تھا۔

وہ اسی پر شکر ادا کرتی کہ کبھی شکل تو دکھا جاتے ہیں نا۔ بہنوں کے دل بہت بڑے ہوتے ہیں جس میں بھائیوں کی ہر غلطی کو درگزر کرنے کی اہلیت ہوتی ہے چونکہ یہ مشورہ ماموں کا تھا کہ محلے میں سبزی کی کوئی دکان موجود نہیں ہے' تو کریانے کی دوکان کے بجائے اگر سبزی کی دکان ہوگی' تو زیادہ چلے گی اور شام تک فارغ بھی ہو جاؤ گی۔ روزی روٹی کا جو مسئلہ درپیش ہے وہ حل ہو جائے گا اور لوگوں کے گھروں میں کام بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ بھائی کہتے یہ بھی خدا کا شکر ادا کرو کہ اپنی زندگی میں تمہارا شوہر اپنا ذاتی مکان بنا گیا ورنہ کرایہ داروں کی تو کوئی زندگی ہی نہیں ہوتی۔ ان کے گھروں میں لوگ رشتے ناتے کرنے سے بھی گھبراتے ہیں۔'' ماموں جان کی مدد سے گھر کی گاڑی چل پڑی تھی۔

سبزی دکان پہ آتی اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتی اور وہ تین بجے فارغ ہو جاتی۔ پت جھڑ کے موسم' پھر نئی کونپلوں کے زمانے آتے رہے۔ موسموں کی آنکھ مچولی جاری وساری تھی۔ ہمسائے میں رہنے والی حمیدہ آپا بھی شمع کی امی کی بہت دلجوئی کرتی رہتی تھیں۔ وہ بہت اچھی اور پُرخلوص عورت تھی۔ شادی کے پندرہ سال بعد جب اولاد پیدا نہ ہونے پر مایوسی طاری ہونے لگی' تو خدا نے اس کی گود میں ناصر، سیماب اور زریاب دے دیے۔ یہ بچے ہی ان کا کل اثاثہ تھے وہ ان کو دیکھ کر جیتی تھیں۔

شمع کے گھر سیماب اور زریاب کا آنا جانا بہت زیادہ تھا۔ گھر میں جو بھی اچھا بنتا وہ بھاگی بھاگی شمع آپی اور زرقا کے لیے لے آتیں۔ یہ بھی ان کے بال سنوارتیں اور ان کو پڑھنے میں بھی مدد دیتی تھیں۔

جب ان کے گھر میں رزق آنے لگا اور دن بدن تنگدستی



کم ہونے لگی، تو وہ رشتہ دار جو باپ کے مرنے کے بعد دور ہو گئے تھے اب پھر قریب آنے کے خواہاں تھے۔ کچھ زرقا اور شمع کے جوان ہونے پر رشتے آنے شروع ہو گئے۔

ماسی برکتے نے زرقا کے لیے اپنی کزن کا بیٹا جو جنرل اسٹور چلاتا تھا اس کا انتخاب کیا۔ ماموں، دیور اور بھائیوں سے مشورہ کر کے رشتہ طے کر دیا گیا۔ شمع نے گھر کا سارا کام کاج اپنے سر لے لیا اور زرقا کو کم ہی کام کو ہاتھ لگانے دیتی۔ اسے بہن بہت عزیز تھی دونوں ہی تو بہنیں تھیں۔ ان کا کوئی بھائی نہیں تھا جو آنے والے وقت میں امید کا ستارہ بنتا۔ ماں کا دم کب تک تھا آنکھ بند ہوتے ہی وہ تنہا رہ جاتیں اور یہ سوچیں ان کے اندر تاریک سا دھواں بھر دیتیں، اور وہ اداس ہو جاتیں۔ پھر کتنے ہی سمے بیت جاتے چپ میں۔

گزرتے وقت نے اماں کو بہت بہادر بنا دیا تھا۔ اب وہ خود سبزی منڈی سے سبزی لانے لگی تھیں ان کا خیال تھا اگر عورت خود موقع نہ دے تو کوئی مائی کا لعل عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس روزگار میں سے کچھ رقم جمع کر کے انہوں نے جہیز بھی تیار کر لیا تھا۔

اپنی زندگی ہم خود ڈیزائن کرتے ہیں۔ دکھ سکھ رنگوں سے بنا وہ آرٹ کا شاہکار بھی ہو سکتی ہے اور بے ترتیبی کا نمونہ بھی۔

زرقا کے سسرال والے تو جلدی شادی کرنا چاہ رہے تھے مگر شمع کی امی اپنی بڑی بیٹی شمع کے رشتے کی وجہ سے پریشان تھیں کیوں کہ زرقا نے اپنے باپ کی تمام خوبصورتی چرا لی تھی۔ جبکہ شمع اپنی ماں کی طرح کم صورت تھی۔ تو اس کے لیے آنے والے لوگ دیکھ کر جاتے تو واپس لوٹ کر ہی نہیں آتے۔ شمع کی امی بہت پریشان رہنے لگی تھیں، جس کی وجہ سے ان کو اکثر و بیشتر ہائی بی پی کا مسئلہ بھی رہنے لگا تھا۔ آپا حمیدہ ان کی یہ حالت دیکھ کر انہیں اللہ پر بھروسہ رکھنے کے لیے کہتی تھیں۔ مگر ماسی برکتے کا دل مطمئن نہ ہوتا۔

............☆☆............

کئی دن بہت خاموشی سے گزر گئے۔ اچانک ایک دن آپا حمیدہ دوسرے محلے میں رہنے والے اسلم کا رشتہ شمع کے لیے لے آئی۔ وہ جہاں سے کپڑے لیتی تھیں، اسلم اس دکان دار کا دوست تھا، تو ان کے توسط سے یہ رشتہ آیا تھا۔ اسلم کا باپ بچپن میں ہی روڈ ایکسیڈنٹ میں چل بسا تھا، ان کی نظر تو پہلے ہی کمزور تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالات کی وجہ سے ان کی آنکھ کا نور جاتا رہا۔ اور اسلم کو اکلوتا ہونے کی وجہ سے ان کی دیکھ بھال کرنی پڑتی۔ ماں کی بڑی آرزو تھی کہ اپنے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھے مگر آج کل ہر کوئی اپنی بیٹی کا رشتہ کھاتے پیتے گھرانے میں کرنا چاہتا ہے۔

ماں اپنے بیٹے کے بسے ہوئے گھر کی رونق دیکھنے کی آرزو میں قبر میں جا سوئی تھی۔ اب وہ خود ہی حالات کی جنگ لڑ رہا تھا۔ فیکٹری میں معمولی ملازمت تھی جس سے کھینچ کھانچ کر گھر کا خرچہ چل رہا تھا۔ مالک مکان دو تاریخ کو گھر کا کرایہ لینے کے لیے سر پر سوار ہوتا۔ وہ پریشان ہو جاتا تو اپنے دوست کی دکان پر جا بیٹھتا۔ گپ شپ سے ذرا اس کا دل بہلتا تو گھر آ جاتا۔ دکان پہ ہی آپا حمیدہ کا اس سے سامنا ہوا تھا۔ دکان والا اسلم کا دوست ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ ایک دن ان سے اسلم کے رشتے کی بات کی تو آپا حمیدہ کو شمع کا خیال آ گیا اور وہ ماسی برکتے سے ذکر کر بیٹھی۔

پھر تو جیسے نصیب سے سب کچھ جلد سے جلد طے پایا۔ ماسی برکتے کو اسلم کی تابعداری اس قدر پسند آئی کہ اسے گھر داماد بنا لیا۔ اور پھر وہ اپنے مختصر سامان سمیت ماسی برکتے کا بیٹا بن کر ان کے گھر شفٹ ہو گیا۔

شمع کو اچھا شوہر ملا زرقا کو بہنوئی کے رشتے میں بھائی مل گیا۔ زندگی میں بہت آسانیاں ہو گئیں۔ شمع کی گود بھی بھر گئی۔ خوبصورت سی ننھی پری نے گھر کے در و دیوار کو رونق بخشی۔ زرقا اسے لیے لیے پھرتی کیوں کہ زرقا کی شادی بھی تو ان کے ساتھ ہی ہوئی تھی، مگر ہنوز گود خالی تھی۔ اوپر تلے چار بیٹیوں سے اسلم اب شمع سے کھنچا کھنچا رہنے لگا تھا۔ بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے یاسیت کا شکار ہونے لگا۔ ساس کافی سمجھاتیں کہ بیٹا یہ تو اللہ کی دین ہے، کسی کو بیٹیاں دے یا بیٹے۔ وہ تعویذ دھاگے والوں کے پاس بھی جاتی کہ شاید اولاد نرینہ مقدر بن جائے۔ شمع تو پہلے ہی کم صورت تھی اس پر اوپر تلے بیٹیاں پیدا کر کے اس کا چہرہ مرجھا گیا۔

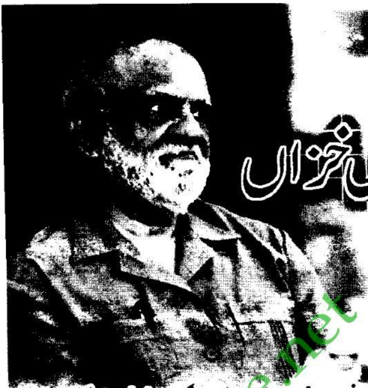
جوان ہوتی، کھلی کھلی سی زری کی آمد و رفت اسلم کی خوشی کا باعث بن گئی۔ اب شمع کی غیر موجودگی میں آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کی جاتیں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا جاتا اور محبت کا کھلا اظہار ہونے لگا تھا، تو شمع کے علم میں آنے سے پہلے ہی پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ انہی دنوں

جب پانچویں بیٹی نے جنم لیا تو شمع کی ماں نے سمجھایا۔
"اسلم اب زری کا پیچھا چھوڑ دو۔ اپنے گھر کی طرف توجہ دو۔" مگر اسلم زری کے عشق میں اندھا ہو چکا تھا۔ زری اسلم کے چکر میں اتنی دیدہ دلیر ہوگئی تھی کہ شمع اس کی منت کرتی۔
"زری میری بہن تم میرے شوہر کی جان چھوڑ دو۔ اسے اپنے گھر کی طرف توجہ دینے دو۔ بچوں کی سو ضرورتیں ہیں، وہ کون پوری کرے گا؟ ہم کہاں جائیں گے۔ بولو زری! میری بہن بتاؤ۔" اس کی بے بسی کو نظر انداز کر کے آنکھوں میں خمار بھر کے بولتی۔ "آ جائے اسلم، تمہاری شکایت کردوں گی۔" اور اب ایسا ہی ہونے لگا تھا۔ گھر میں شمع کا جینا مشکل ہوگیا تھا اگر شمع کی ماں کوئی بات کرتی تو وہ ایک نہ سنتا تھا۔ بد کلامی، بدزبانی کرتا۔ بچیوں کے ساتھ شمع گھٹ گھٹ کر، سہمی ہوئی زندگی گزار رہی تھی۔

☆☆☆

زریاب کی ماں چند سال پہلے ہی ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہو کر وفات پا گئی تھی۔ زریاب کی بہن سیماب کی شادی اپنی زندگی میں کر گئی تھیں۔ ناصر کی ماموں کے گھر منگنی کر رکھی تھی۔ زریاب کے رشتے آ رہے تھے اور اس کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار تھا تا کہ دونوں بہن بھائی اکٹھی شادی کر سکیں۔ زریاب کے جانے کے ساتھ ہی بہو بھی گھر آ جائے گی۔ گرمیوں کی ایک اداس شام تھی جو زری کو تو بالکل اداس نہیں کر رہی تھی۔ ابو اور ناصر بھائی کام کے سلسلے میں دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ تو جاتے ہوئے سیماب کے میاں کو فون کر گئے کہ آج رات کو ادھر آ کر سو جانا۔ زری گھر میں اکیلی ہے۔"
چونکہ وہ اسی شہر میں رہتے تھے۔ اس لیے وہ دونوں شام کو خوش خوش آ گئے۔ زری نے ان کے لیے خوش ذائقہ کھانا تیار کر رکھا تھا۔ کھانے کے بعد کمرے میں وہ دونوں مووی دیکھنے لگے اور دوسرے کمرے میں زری اپنی پلاننگ کے تحت مشین کا آئل اٹھا لائی تھی اور سیڑھیاں چڑھتے ہی جو پہلا کمرہ تھا اس کے دروازے کے قبضوں میں لگا دیا تا کہ دروازہ بے آواز ہو جائے۔ وہ تیاری مکمل کر کے مطمئن تھی لیکن دل ایک نئی لے پر دھڑک رہا تھا۔ محبوب سے ملنے کا نشہ سوار تھا۔ گھر کے آخری کمرے میں سیماب اور اس کا شوہر سو چکے تھے کہ وال کلاک نے بارہ کا الارم بجایا اور موبائل پر بجنے والی رنگ ٹیون نے اس کے جذبات کو ہوا دی۔ اس نے احتیاطاً اس کمرے کی طرف نظر دوڑائی، جہاں بہن بہنوئی محو خواب تھے۔ زری چار چار سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آ گئی اور دھیرے سے دروازہ کھولا اور اسلم کو اس کمرے میں لے آئی جس کے دروازے کے قبضوں میں آئل لگا چکی تھی۔
دروازہ بے آواز کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ دونوں کو خاندانوں کی عزت تک کا خیال نہ رہا۔ گھڑی نے چار بجائے تھے کہ اچانک دروازے کے تالے میں چابی گھومی ان دونوں کے سوچنے، سمجھنے سے پہلے دروازہ کھل گیا۔ ناصر کے پاس سارے گھر کی چابیاں موجود تھیں۔ ناصر ان دونوں کو دیکھ کر غصے سے پاگل ہو گیا۔ اسلم اور زری کی تو آنکھیں خوف سے پھیل کر رہ گئیں۔ خود کو چھپانا چاہا مگر بے لباسی میں ہی ناصر نے اسلم کو پکڑا اور پھر ناصر نے اپنا پستول نکال لیا۔ باپ بیٹے کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔
اسلم کے سینے میں جیسے ہی گولی اتری، تو وہ تڑپتا ہوا خون میں لت پت وہیں ڈھیر ہو گیا۔ زری نے باپ اور بھائی کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور معافی مانگی اور کہا۔
"بھائی ایک دفعہ تو خدا بھی بندے کو معاف کر دیتا ہے۔" مگر وہ اٹل فیصلہ کر چکے تھے۔ اور اس میں ترمیم کی گنجائش نہیں تھی۔
دونوں کا خاتمہ ہوا تو شور سے سیماب اور اس کا شوہر بھی پہنچ گئے۔
لاشوں پر بڑی بڑی چادریں ڈال دی گئی تھیں اسی دوران حادثہ کی اطلاع پا کر مقامی پولیس موقع پر پہنچ گئی۔ اس نے دونوں لاشوں کا پنچ نامہ بنا کر لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیں۔
پولیس نے ماسی برکتے کا بیان درج کیا اور اس کی درخواست پر پولیس نے ناصر اور اس کے باپ یاسر احمد کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کر کے انہیں آلہ قتل سمیت گرفتار کیا۔
پوچھ گچھ میں دونوں ملزمان نے اقبال جرم کر لیا۔
گرفتاری کے بعد پولیس نے ملزمان کو عدالت میں پیش کر کے انہیں جیل بھیج دیا۔ زریاب کے نفس کی آگ نے اپنے ہی گھر کو بھسم کر ڈالا تھا۔

☆☆☆☆☆



برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کی دعوت پر، عظیم صحافی اور شاعر محمود شام کے برطانیہ میں گزرے اُن لمحات کا ذکر جو اَمر ہو گئے

ایسا سفرنامہ جسے پڑھ کر قاری خود کو اُن ہی مناظر کا حصہ محسوس کرتا ہے

تیسرا حصہ

صدیوں پرانی غاریں

نہ جانے ہمارے ہاں کتنی ایسی دنیا ہیں، بلوچستان، سرحد، پنجاب، سندھ کے پہاڑی علاقوں میں انسانی سانسوں، مسکراہٹوں اور قہقہوں کی منتظر ہیں

یہ تیزی سے بہتی ہوئی ندیاں ٹراؤٹ فش کا شوق رکھنے والوں کو شہروں اور قصبوں سے آکر کنڈی ڈالنے پر مجبور کرتی ہیں۔ یہاں ٹراؤٹ فارم بھی ہیں۔ یہ تجارتی بنیادوں پر ہیں۔

یارک شائر ڈیل کو بجا طور پر وادیوں کی ملکہ بھی کہا جاتا ہے۔ سورج آج بھی ہم پر مہربان ہے۔ جون بار بار اس روشن صبح کی تعریف کر رہی ہے۔ انگلینڈ والوں کے لیے تو سردیوں کی دھوپ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ سورج ان کے لیے خوشحالی کا پیغام لے کر آتا ہے۔ ہمارے ہاں سورج اور دھوپ قہر اور مشکل سے تشبیہ پاتے ہیں۔

اب کچھ بنجر پہاڑ آ گئے ہیں۔ جہاں آج سے ایک ڈیڑھ صدی پہلے سیسے کی کانیں ہوتی تھیں۔ وہی سیسہ، جس کے لیے قوم سے کہا جاتا ہے کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاؤ۔ خود رہنمایان کرام کچھ اور پیتے رہتے ہیں۔ اور سب فریادوں، التجاؤں کے سامنے دیوار بنے رہتے ہیں۔ جون کا کہنا ہے کہ یہاں کانوں سے سیسہ نکالنے کا کام 1870ء میں بند ہو گیا تھا۔ سیسہ گرجا گھروں اور قلعوں کی تعمیر میں کام آتا تھا۔ یہ انتہائی کٹھن محنت تھی۔ کان کنوں کو مختلف بیماریاں لاحق ہو جاتی تھیں۔ ایک کان کن کی اوسط عمر 40 سال رہ گئی تھی اور مشکلات سے تنگ آ کر کان کنوں کی نئی نسلیں کوئلے کی کانوں میں کام کرنے لگیں۔ کانوں کے مالکان نے بھیڑیں پالنا شروع کر دیں۔ جو اچھا منافع بخش کام تھا۔

جون کا ارادہ ہمیں برطانیہ کی زیر زمین دنیا دکھانے کا ہے۔ کچھ برطانیہ والے تو اوپر کی دنیا فتح کرنے نکل جاتے تھے، کچھ زیر زمین دنیا کی مہم سر کر گئے تھے۔ پہاڑی چشموں نے بھی اپنے لیے جو راستے بنائے تھے۔ اب انسانوں نے انہیں کھود کر تلاش کیا ہے۔ اب یہ سیاحوں کی دلچسپی کے مقامات بن گئے ہیں۔

یہ علاقہ محققین کے مطابق لاکھوں سال پرانا ہے۔ یہاں کبھی پتھر کا زمانہ رہا۔ برف کا دور رہا۔ لاکھوں سال پرانا زمین کا سوراخ اب بھی اس علاقے میں موجود ہے۔

یہ علاقہ ایک عجیب وغریب تحیر کے عالم میں لے گیا ہے۔ جہاں چاروں طرف خشک پہاڑ ہیں۔ کہیں کہیں نوکیلی گھاس کے نیزے سر اٹھا رہے ہیں۔ ہلکی ہلکی خنک

ہوا چل رہی ہے۔ ہماری گاڑی کے علاوہ ایک آدھ گاڑی اور نظر آ رہی ہے۔ امریکی ویسٹرن فلموں والا منظر ہے۔ لگتا ہے ابھی کہیں سے ایسٹ کلنج وڈ گھوڑے پر سوار برآمد ہوگا۔ پھر دوسری طرف سے ولن آ جائے گا۔ اور یہ علاقہ گولیوں کی آوازوں سے گونج اٹھے گا۔

گاڑی رک گئی ہے۔ ہماری منزل آ گئی ہے۔ ''سٹمپ کراس کیورنز'' نام ہے۔ یہاں سے ہم زمین کے نیچے جائیں گے۔ اسے نمائشی غار بھی کہتے ہیں۔

برطانیہ میں غاروں کی دریافت اور زمین میں سوراخوں کی تلاش اٹھارہویں صدی سے ایک مشغلہ بھی ہے اور علمی تحقیق بھی۔ کان کنی کے ماہرین تجارتی بنیادوں پر ایسا کرتے رہے ہیں۔ ماہرین آثار قدیمہ تاریخی نشانیوں کی تلاش میں، جبکہ کچھ نوجوان صرف ایک شوق اور مشغلے کی خاطر۔ اب برطانیہ بھر میں نوجوانوں نے پاٹ ہول اور کیونگ کلب قائم رکھے ہیں۔ جو ایسی مہموں کی سرپرستی کر رہے ہیں اور نہ جانے کتنی حیرت انگیز دنیائیں انہوں نے ڈھونڈ لی ہیں جو دنیا بھر سے سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ اور زرمبادلہ کے حصول کا ذریعہ بھی۔

ہمارے ہاں نہ جانے کتنی ایسی دنیائیں۔ بلوچستان۔ سرحد۔ پنجاب سندھ کے پہاڑی علاقوں میں انسانی سانسوں، مسکراہٹوں اور قہقہوں کی منتظر ہیں۔ جن میں نہ جانے کیا کیا خزانے پوشیدہ ہیں۔

غار کے اوپر ایک باقاعدہ ریسٹوران اور شو روم ہے۔ چائے، کوفی، کھانا، حسب منشا، پتھر کی بنی ہوئی مختلف چیزیں، سوغاتیں، سوونیئر پکچر کارڈ بھی بک رہے ہیں۔

غار میں لے جانے کے لیے گائیڈ نے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ ہم سب کو سروں کے لیے ہیلمٹ مل گئے ہیں۔ لیکن چند قدم اترنے کے بعد سیڑھیاں ختم ہوگئی ہیں اور اب پتھروں پر چلنا ہے۔

انہی پتھروں پر چل کے کبھی آ سکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

غار تنگ ہو رہی ہے۔ ہمیں جھکنا پڑ رہا ہے۔ ورنہ سر پتھروں سے ٹکراتا ہے۔ غار میں مختلف موڑ آتے ہیں۔ ان کے نام بڑے خوبصورت رکھے گئے ہیں۔ جیول بکس (زیورات کا ڈبہ) سینڈ کیسلز (ریت کے قلعے) پولیس مینز ٹرنچن (پولیس مین کی خندق) ایک جگہ اوپر اور نیچے سے پیدا ہونے والی برف مل کر پتھر ہو گئی ہے۔ تو کئی ایک منزلہ کیک کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اس کا نام ویڈنگ کیک رکھا گیا ہے۔ ایک مقام پر استعدادِ زمانہ نے پتھروں کو سوئی ہوئی بلی کی طرح تراش دیا



برطانیہ کی پُراسرار غاریں، جو آج بھی سیاحوں کے لیے حیرت کدہ ہیں

ہے۔ اس لیے اسے سلیپنگ کیٹ قرار دے دیا گیا ہے۔ ایک جگہ ایک عمارت سی بن گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یسوع مسیح کے پیروکاروں کو یہ گرجا گھر ہی نظر آنا ہے۔ اس لیے اسے کیتھڈرل قرار دیا گیا ہے۔

غار کے آخر میں کافی سردی ہے۔ غار میں آکسیجن کا انتظام رکھا گیا ہے۔ تاکہ یہ غار آنے والوں میں سے کسی کی آخری آرام گاہ ہی نہ بن جائے۔ واپسی کا راستہ دوسرا ہے۔ اور ایک پروجیکشن روم پر ختم ہوتا ہے۔ جہاں ایک ویڈیو کے ذریعے اس غار کی تفصیلات بتائی جاتی ہیں۔

یہ غار ایک قدرتی چشمے کا راستہ تھا۔ جو ہزاروں سال پہلے خشک ہوگیا تھا۔ اور یہ ایک کم از کم ساڑھے چار

میل طویل غاروں کے سلسلے کا ایک حصہ ہے۔

ریستوران میں کچھ اور سیاح آ چکے ہیں جو غار میں جانے کے منتظر ہیں۔

پھر وہی تنگ سڑکیں، خشک پہاڑیاں۔

دور کچھ سبزہ، پیڑ، ہماری طرف بڑھ رہے ہیں یا ہم ان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ سبزے نے خشکی پر غالبہ پا لیا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف گھنا جنگل ہے۔ بڑے بڑے پتوں والے پیڑ ہم پر جھک رہے ہیں۔

لیجیے۔ یہ فاؤنٹین ایبے ہے۔ 1132ء میں تعمیر ہوا۔ یہ اس وقت یورپ کا سب سے بڑا روحانی کھنڈر ہے۔ اس کے ساتھ ہی دریائے سکیل خاموشی سے بہہ رہا ہے۔ صاف شفاف پانی، سیاحوں کے لیے ہر قسم کے انتظامات موجود ہیں۔ پارکنگ، داخلے کے لیے ٹکٹ ہیں، کھنڈرات کی حفاظت پر بھی کچھ نہ کچھ تو خرچ ہوتا ہے۔

یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔

خوبصورت چھوٹے چھوٹے گھر۔ ان کے سامنے پارکوں میں بنچوں پر برطانیہ کے سینئر شہری بیٹھے ہیں۔ 60 سال سے اوپر کے جوڑے آنکھوں کے بجائے عینکوں سے دیکھتے۔ سرخ چہروں پر جھریوں، ضعیفی کا غلبہ لیکن چہروں پر مسکراہٹیں۔ جون کا کہنا ہے کہ ستمبر اکتوبر کے مہینوں میں برطانیہ کے سینئر شہری مختلف علاقوں سے یہاں چھٹیاں گزارنے آتے ہیں۔

ان کی عمر کے مطابق ان کے لیے خصوصی انتظامات کیے جاتے ہیں۔ ایسے کئی راستے ہیں۔ جہاں صرف پیدل چلا جاتا ہے۔ سائیکل، موٹر سائیکلیں، گاڑی کچھ نہیں جا سکتا۔

نیشنل پارک کی حدود میں شامل سڑکوں پر پارک کے منتظمین خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ یہ بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ ان علاقوں کا رابطہ ملک کے دوسرے حصوں سے رہے لیکن یہ بھی کہ پارک کی حدود میں شامل سڑکوں میں اتنی زیادہ وسعت نہ ہو جائے کہ بہت زیادہ ٹریفک ان سڑکوں پر آ جائے یا بھاری ٹریفک آنے لگے، یارک شائر ڈیلز نیشنل پارک کمیٹی نے بڑی سوچ بچار کے بعد سڑکوں کا ایک نقشہ اور ترتیب تیار کی ہے جس پر متعلقہ اداروں اور افراد کے مشورے بھی حاصل کیے ہیں۔ جگہ جگہ بورڈوں پر ہدایات نصب ہیں۔ قدرتی حسن اور جنگلی حیات کو تحفظ دینے پر مامور ادارے یہ سمجھتے ہیں کہ ان علاقوں پر اگر ٹریفک بڑھنے دیا گیا تو حسنِ فطرت اور جنگلی زندگی دونوں کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

اس جنت ارضی میں تازہ ہواؤں میں دریاؤں کی قربتوں سے گزرتے ہوئے نگاہوں کو سبزے سے طراوت دیتے ہوئے ہم برنس آل گاؤں پہنچ گئے ہیں۔ گاؤں تو معمولی سا ہے۔ لیکن ایک اسکول سے نکلتے ہوئے ننھے منے معصوم بچے ہمیں رکنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ اسکول چرچ کے تحت قائم ہے۔ یہاں چار سے گیارہ سال تک کے بچے پڑھنے آتے ہیں۔ اسکول کی پرنسپل بھی ہماری دلچسپی دیکھ کر باہر آ گئی ہیں، بتا رہی ہیں کہ یہاں کل 37 بچے ہیں جو آس پاس کے دیہات سے پڑھنے آتے ہیں۔ اسکول کا وقت نو بجے سے ساڑھے تین بجے تک رہتا ہے۔ دوپہر کو کھانے کا وقت ملتا ہے۔ لنچ بچوں کو اسکول سے بھی قیمت پر مل سکتا ہے۔ بچوں کے لیے کتابیں زیادہ تر تصویری ہوتی ہیں۔ حروف سے زیادہ تصویروں پر زور دیا جاتا ہے۔

بچوں بچیوں کو لینے ان کی مائیں آئی ہوئی ہیں۔ اپنے بچوں کو اچھی سے اچھی جگہ تعلیم دلوانے کی خواہش ہر ماں کو ہوتی ہے۔ بچوں کے چہرے پر ایک دلفریب چمک ہے۔ رنگا رنگ کپڑے ہیں۔ یہ بچے بھی بالکل جنگل میں پھولوں کی طرح کھلے ہوئے ہیں۔ جون کو اب جلدی ہو رہی ہے۔

اسے ہیرد گیٹ واپس شام ہونے سے پہلے پہلے پہنچنا ہے کیوں کہ سیاحوں کی کوئی اور پارٹی بھی آنے والی ہے۔ پھر اس کی رہنمائی کے دن، کمانے کے دن ختم ہو جائیں گے اس لیے اکتوبر نومبر ہی اس کی زیادہ مصروفیت کے دن ہیں۔ واپسی کا راستہ تیزی سے کٹ رہا ہے۔

جون کو واپس ہیرد گیٹ چھوڑ کر ہم سکپٹن کی سمت گامزن ہیں۔ جہاں ہمیں رات گزارنی ہے۔ وادیوں پر دھوپ نرم پڑ رہی ہے۔

سکپٹن چھوٹا سا شہر ہے۔ چھوٹے چھوٹے بازار۔ زیادہ رونق نہیں ہے۔ شہر ہم چند منٹ میں ہی عبور کر لیتے

ہیں۔ ہوٹل رینڈل، شہر سے باہر کھلی فضا میں ہے۔ خالد عزیز گاڑی ہوٹل کی کشادہ پارکنگ لاٹ میں پارک کر رہے ہیں اور دور افق کی گود میں گرتا ہوا زرد سورج ہاتھ ہلا کر ہمیں شام بخیر کہہ رہا ہے کہ ابھی آرام کرو صبح کی کرنوں سے دستک دے کر جگاؤں گا۔

رینڈل میں تازگی اور کشادگی ہمارا استقبال کر رہی ہے۔ ہوٹل میں ابھی تزئین و آرائش کی گئی ہے۔ کمرے اتنے وسیع ہیں کہ عام ہوٹلوں کے تین کمرے اس میں سما سکتے ہیں۔ بیڈ بھی بہت بڑا ہے۔ کمرے کے اندر ایک صوفہ سیٹ بھی ہے جہاں پانچ سے سات مہمان بیٹھ سکتے ہیں۔ ڈریسنگ ٹیبل الگ، رائٹنگ ٹیبل الگ۔ ایک طرف چائے کی کیتلی اور برتن رکھے ہیں۔ آپ چائے خود تیار کریں جتنی بار مرضی پئیں۔ باتھ روم کمرے کی طرح کشادہ۔ بہت وسیع ٹب، بیسن۔

تفریحی مقامات پر یہ نیا رجحان چلا ہے کہ جو خاندان چھٹیاں گزارنے آتے ہیں اور کئی روز کے لیے ٹھہرنا چاہتے ہیں۔ انہیں گھر جیسی بلکہ گھر سے بھی زیادہ سہولتیں دی جائیں۔ تاکہ وہ چھٹیاں اطمینان سے گزار سکیں۔

بستر آرام دہ ہے۔ صبح سے غروب آفتاب تک اتنے نظارے آنکھوں میں در آئے ہیں کہ میں ان کی آغوش میں سر رکھ کر سو گیا ہوں۔ آنکھ کھلتی ہے تو کمرے کی کشادگی ایک بار پھر تحیر زدہ کر دیتی ہے۔ ہم سب کو عشائیے پر اکٹھا ہونا ہے یہاں ڈائننگ ہال کا راستہ بار سے ہو کر جاتا ہے۔

زیادہ تر مہمان کانفرنس وغیرہ کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ بار میں البتہ مقامی لوگ بھی ہیں۔ سکپٹن زیادہ بڑا قصبہ نہیں ہے۔ لیکن زندہ دل پھر بھی موجود ہیں لیکن ہلکی ہلکی موسیقی ابھر رہی ہے۔ سرور جام میں بھی ہے، سرور فضا میں بھی ہے۔

ایک گوشے میں حسن افرنگ موجود ہے۔ تین جواں سال خواتین۔ شاید کسی ایئر لائن کی فضائی میزبان۔ وہ بہت دیر سے بیٹھی لگ رہی ہیں۔ ان میں سے ایک تو عالم بالا کی سیر کرتی نظر آ رہی ہے۔

غالب یاد آ رہا ہے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہوٹل میں اسٹاف کا ہر ممبر خوش خلقی پر تلا ہوا ہے۔



ایک پُراسرار غار کا منظر۔ جو بھول بھلیاں کی یاد بھی دلاتا ہے

وسیع و عریض پارک شائر ڈیلز کی وادیوں میں یہ ہوٹل ایک دست حنائی میں ایک انگوٹھی کی طرح خوبصورت محسوس ہو رہا ہے۔ رینڈلز ہوٹل، کانفرنس اینڈ لیور سینٹر۔ کے ڈائننگ روم میں ہم ادھر جا کر بیٹھے ہیں جہاں سے دریچے ساتھ میں بہتی ندی پر کھلتے ہیں۔ رات میں ندی تو نظر نہیں آ رہی۔ لیکن اس کی سرگوشیاں سنائی دے رہی ہیں۔ وہ خاموشی سے گفتگو کر رہی ہے۔ نہ جانے کتنی صدیوں سے وہ اسی طرح بہہ رہی ہے لیکن جو پانی ایک مرتبہ اس ہوٹل کو چھوڑ کر گزر گیا وہ تو دوبارہ نہیں آتا۔

موجیں ایک سی لگتی ہیں۔ لیکن حقیقت میں ایک نہیں ہوتیں۔ یہ دنیا بھی آباد رہتی ہے۔ دور سے دیکھنے والے کو تو لوگ ایک سے ہی لگتے ہوں گے۔

دائم آباد رہے گی دنیا

ہم نہ ہوں کہ کوئی ہم سا ہوگا

ناصر کاظمی ایسا لازوال شعر کہہ کر چلا گیا۔ ناصر اب تو نہیں ہے لیکن ناصر کاظمی جیسے بہت ہیں۔

خاموشی سے بہتے ندی کے پانی کا احساس احمد مشتاق کی یاد دلا رہا ہے۔

یہ پانی خامشی سے بہہ رہا ہے
اسے دیکھیں کہ اس میں ڈوب جائیں

ساتھ کی میز سے ایک زوردار قہقہہ اور میری محویت ایک چھناکے سے ٹوٹ جاتی ہے۔

یہ کسی کانفرنس کے لیے آیا ہوا گروپ ہے۔ میٹنگ میں یقیناً کوئی اہم اور دیرپا فیصلے کر چکے ہیں اس لیے اس وقت بڑی دریا دلی سے قہقہے لگا رہے ہیں۔ ان کے قہقہوں کی بلند ہوتی آواز شاید مجید عباسی کو بھی اچھی لگتی ہے۔ اس لیے وہ بلاوجہ ایک زوردار قہقہہ لگا دیتے ہیں۔ ہم سب بھی بے ساختہ ہنس پڑتے ہیں۔ قہقہے لگانے والے افرنگی کالے لوگوں کو اتنی آزادی سے قہقہے لگاتے دیکھ کر چونکتے ہیں۔ ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔ پھر اپنی گفتگو میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مگر اب ان کے قہقہے مدہم پڑ جاتے ہیں۔

کھانے کا انتخاب ہر ہوٹل میں ایک مسئلہ ہے۔ سب سے آسان اور محفوظ ڈش مچھلی کی رہتی ہے۔ مشینی ذبیح یا حلال حرام کی پریشانی نہیں ہوتی۔

کھانوں سے زیادہ کھانا کھلانے والوں پر توجہ رہتی ہے۔ ان میں انتخاب نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جس کا میز ہے۔ وہی آتی ہے۔ وضعداری، میزبانی میں ان کی ادائیں بھی مشرق کے نزدیک جا پہنچی ہیں۔

رینڈل کے نرم اور کشادہ بستر پر نیند بڑی گہری آتی ہے۔ مگر صبح کھڑکیوں پر کرنوں کی نرم نرم دستک آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

میں نے ہلکے ہلکے پردے ہی کھڑکیوں پر رہنے دیے ہیں۔ دبیز پردوں سے روشنی کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس لیے صبح سویرے آنکھ کھل گئی ہے۔ اور سکیپٹن کی صبح کے احساس کو اپنی آنکھوں میں محفوظ کرنے کا موقع مل گیا ہے۔

آج جمعہ ہے۔

ہماری چھٹی کا دن ہے۔ یہاں اختتام ہفتہ شروع ہونے کا دن۔ اسکول بسیں دمکتے چہروں والے بچے لیے دوڑ رہی ہیں۔ بسوں میں لوگ اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔ ٹریفک بہت کم ہے۔

جوگنگ کرنے والے بھی کچھ کچھ نظر آ رہے ہیں۔ ہوا بالکل تروتازہ ہے۔ کثافت اور آلودگی کا احساس تک نہیں ہے۔

سکیپٹن شہر ابھی انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا ہے۔ ایک اجنبی کو اپنے درمیان پا کر اس قصبے کے لوگ اپنی حیرت کا اظہار گڈ مارننگ سے کر رہے ہیں۔

ہمیں آج آلٹن ٹاور کی طرف روانہ ہونا ہے۔ جو ہم سب کے لیے ایک نئی دنیا ہے۔ یہ کیسے ٹاورز ہیں۔ یہاں کیا مصروفیات رہے گی۔ کچھ علم نہیں۔ اتنا اندازہ ہے کہ یہ کوئی تفریح گاہ ہے۔ ڈزنی لینڈ کی طرح۔

ناشتے پر ہماری ملاقات طوطوں سے بھی رہتی ہے۔ طوطا اس وادی کا شاید خاص پرندہ ہے۔ ریستوران میں بھی چھوٹے بڑے طوطے لٹکے ہوئے ہیں۔ رات والی حسینا میں اس وقت اپنی یونیفارم میں ہیں۔ اب عالم ہی دوسرا ہے۔ کیا وہ بے خبری دنیا و مافیہا سے۔ ایک مستی۔ ایک کیف۔ کیا یہ سنجیدگی۔ رکھ رکھاؤ۔ یہی زندگی ہے۔ کام کے وقت کام۔ تفریح کے وقت تفریح۔

ہوٹل کی انتظامیہ کو علم ہو گیا ہے کہ ہم پاکستان سے آئے ہوئے ہیں اور برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کے مہمان ہیں۔ وہ ہمیں ہوٹل کی سہولتیں دکھانے کے لیے بے تاب ہیں۔

کرسٹوفر ہل ہوٹل کے نئے جنرل مینیجر ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کرس کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ وہ یارک شائر کے مختلف ہوٹلوں میں مختلف اوقات میں مینیجر رہ چکے ہیں۔ اس لیے اس مٹی کے مزاج سے وہ ہمیں سب سے پہلے بچوں کی نرسری میں لے آئے ہیں۔ رنگ رنگ لباسوں میں چھوٹے چھوٹے بچے کھیل رہے ہیں۔ چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ واکر لیے کھسک رہے ہیں۔ یہ نرسری ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے والدین کے بچوں کے لیے بھی ہے۔ جو خود وادیوں میں پیدل سیر کے لیے جانا چاہتے ہیں۔ بچے یہاں چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ شہر اور آس

پاس کے دیہات کی ایسی خواتین اپنے بچے یہاں چھوڑ دیتی ہیں۔ جو ملازمت پر جاتی ہیں۔
کرس کا کہنا ہے کہ مقامی والدین اس نرسری سے استفادہ کر رہے ہیں۔ بچوں کی نفسیات اور بچے کھلانے کی ماہر خواتین ان بچوں کو سنبھالتی ہیں۔
جنرل منیجر بتا رہے ہیں کہ ہم اسے ہوٹل کے بجائے رینڈلز کے گھونسلے کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جہاں ڈیلز کی وادیوں میں گھوم پھر کر تھک جانے والے آپ جیسے پرندے آرام کرنے آتے ہیں۔ یہ مقامی پتھروں سے تعمیر ہوا ہے۔ تین ستاروں والے اس آشیانے میں مہمانوں کے 61 پُر تعیش کشادہ بیڈ رومز کے علاوہ کئی ریستوران ہیں، بار ہیں، ضیافت گاہیں ہیں۔ کانفرنس کے لیے بڑا ہال اور چھوٹے کمرے بھی ہیں۔ ہال میں 400 افراد کی نشست کا اہتمام ہے۔ جبکہ چھوٹے کمروں میں افراد کی نشست کی گنجائش ہے۔
مہمانوں کے مزید آرام کے لیے اور صحت کی بہتری کے لیے گرم پانی کا حوض ہے۔ اسکوائش کورٹ ہے، جمنا زیم ہے۔ معذور مہمانوں کے لیے ان کی سہولتوں سے مزین کمرے ہیں۔
ایسے پُر فضا تفریحی علاقے میں اور دور دراز سے آئے ہوئے مہمانوں کو جن سہولتوں کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے ان کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ شادی کرنے والے اپنی شادی کا استقبالیہ بھی دے سکتے ہیں۔ ہنی مون کے لیے بھی آ سکتے ہیں۔ اپنی شادی کی سالگرہ بھی منا سکتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کی پارٹی کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔
کرس کہہ رہے ہیں آپ لوگ دوبارہ آئیں تو آپ کو مزید رعایت مل جائے گی۔ اپنے طور پر قیام کریں تب بھی۔ پاکستان سے اور لوگ آئیں۔ تو آپ انہیں ہمارا حوالہ ضرور دیجیے گا۔
ہوٹل کے اس دورے کے بعد اب ہم آلٹن ٹاورز کی تلاش میں روانہ ہو رہے ہیں۔ ان جانے راستے۔ نادیدہ منزلیں۔

☆......☆......☆

آلٹن ٹاورز کی حیرتیں

اندھیرے میں بجلی کوندتی ہے۔
ایک بڑے چمگادڑ آپ پر ٹوٹنے کو بھی بڑھتی ہے۔
کہیں دیواروں میں شگاف پڑ رہے ہیں۔

شاہ بلوط کے پیڑ ہمیں پھر اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ عشق پیچاں کی بیلیں بھی فرش راہ ہوئی جا رہی ہیں۔
ہمیں ذیلی شاہراہ A59 پر سفر کرنا ہے۔ A59 اب دونوں طرف ہے۔ اب کدھر جائیں۔ ہم کافی دور پھر بھٹک گئے ہیں۔ فاروق معین پھر غلطی کا احساس دلا رہے ہیں۔ کئی کلو میٹر آگے جا کر ہمیں واپسی کا راستہ ملتا ہے۔ اب ہم سیدھی راہ پر چل پڑے ہیں۔ سڑک پھر



آلٹن ٹاورز کے ہنگامے

تنگ ہو رہی ہے۔ پہاڑ بلند ہو رہے ہیں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ۔

آلٹن ٹاورز سے پہلے ہمیں ایک شہر اسٹوک آن ٹورینٹ پہنچنا ہے۔ اس کے کہیں آس پاس ہی آلٹن ٹاورز ہے۔ وادیوں میں سبز رنگ کو اگر تنوع ملتا ہے۔ تو چتکبری گایوں سے یا بھیڑیوں سے۔ کہیں کہیں گھوڑے کے فارم بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ٹوڑی کی گانٹھیں تو سب سے زیادہ ترتیب اور مشینی زراعت کا احساس دلاتی ہیں۔

اب ہمارے ساتھ کوئی گائیڈ نہیں ہے۔ ہم سب اس دیار میں اجنبی ہیں۔ ہمارے ڈرائیور خالد عزیز بھی، عظمت انصاری بھی، فاروق معین بھی، مجید عباسی بھی۔ آج ہم سب کرسٹوفر کولمبس کی راویت پر عمل کر رہے ہیں۔ ہمیں بھی اک نئی دنیا تلاش کرنا ہے، جس کا نام آلٹن ٹاورز ہے۔ کبھی وسیع شاہراہوں، کبھی تنگ سڑکوں، بلندیوں اور پستیوں سے ہوتے ہم ایک بڑے شہر کے باہر پہنچ چکے ہیں۔ یہ اسٹوک آن ٹورینٹ ہے۔ دریاؤں کے کنارے آباد کارخانوں، بلند عمارتوں سے بڑی شاہراہوں سے سجا ہوا ایک آباد اور بھرپور شہر۔ شہر کے باہر لگے ہورڈنگز سے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہاں مٹی کے برتنوں کا کاروبار زیادہ ہے۔ یہ کمہاروں کا علاقہ ہے۔ یہاں کوئی سوہنی اور کوئی مہینوال بھی ضرور ہوگا۔ دریا ہے تو کچا گھڑا بھی ہوگا۔

آلٹن ٹاورز کا ایسے تو کوئی پتا لگنے کا نہیں۔ اس لیے ہم ٹورسٹ سینٹر کی تلاش میں ہیں۔ جہاں سے ہمیں صحیح سمت اور فاصلے کا علم ہو سکے۔

اسٹوک آن ٹورینٹ پر ویک اینڈ (اختتام ہفتہ) کا اثر نظر آ رہا ہے۔ شہر میں ٹریفک بہت کم ہے۔ اس لیے اس اجنبی شہر میں ڈرائیونگ میں مشکل پیش نہیں آ رہی ہے۔ ہم سب خالد عزیز کے لیے شکر گزاری کا اظہار کر رہے ہیں کہ انتہائی مشکل راستوں اور اجنبی دریاؤں میں بھی انہوں نے ہمت نہیں ہاری ہے اور وقت پر ہم ہر جگہ پہنچ رہے ہیں۔

شہر میں جگہ جگہ ظروف کی پبلسٹی ہو رہی ہے۔ برتنوں کو پکانے میں صراحی نما بھٹیوں کے ہورڈنگ نیون سائن جگہ جگہ ہیں۔

ٹورسٹ سینٹر پر موجود عمر رسیدہ خواتین نے بڑی وضاحت سے ہمیں آلٹن ٹاورز کا پتا سمجھایا ہے جو ابھی یہاں سے کہیں دور ہے۔ واپس ہمیں پھر اسی شہر آنا ہے۔ جہاں ایک ہوٹل میں رات کا قیام ہے۔

ہم شہر سے باہر نکل گئے ہیں۔ پھر وہی خوبصورت وادیاں تنگ سڑکیں۔

اردو غزل کے محبوب کی کمر کی طرح بل کھاتی سڑکیں ہمیں جنگلوں اور گھاٹیوں میں لے جا رہی ہیں۔ بار بار یہ خدشہ بھی ہوتا ہے کہ کہیں ہم بھٹک نہ جائیں۔ آگے نہ نکل جائیں۔ جنگل کے عین درمیان ایک پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس ہے۔ گھنٹی بجاتے ہیں تو انٹر کام سے بات ہوتی ہے۔ اسی غائبانہ بات چیت سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہم صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔ دونوں طرف دیوار کے اونچے اونچے درخت ہیں۔ بڑی صاف ستھری سڑک بالکل ہموار زندگی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ اسٹوک آن ٹورینٹ آلٹن ٹاورز 14 میل دور بتایا گیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم سینکڑوں میل طے کر چکے ہیں۔ گھنے جنگل سے ایک موڑ ہمیں ایک دم آلٹن ٹاورز کے سامنے لے آیا ہے۔ ہمارے تصورات سے کہیں زیادہ مختلف ہے یہ۔ جنگل میں منگل۔ ہم A52 اور پھر A522 کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہمیں منزل تک پہنچا دیا ہے۔ گاڑی پارکنگ کا مرحلہ طے کرنے کے بعد اب ہمیں اس عظیم تفریح گاہ کے دفتر کی تلاش ہے۔ جہاں ہمارے ٹکٹ اور پریس کٹ (معلومات) ہماری منتظر ہونی چاہیے۔

ٹکٹ ہم سے کہہ رہا ہے کہ، آلٹن ٹاورز، جہاں حیرتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں، برطانیہ کی سب سے زیادہ طلسماتی دنیا میں خوش آمدید۔ آلٹن ٹاورز کی مختلف سواریاں اور دلکشیاں ہر روز نومبر تک دستیاب رہتی ہیں۔ داخلے کی فیس آپ نے ادا کر دی ہے اب یہاں موجود ہر سواری سے، ہر تماشے سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ صرف کھانے پینے کی اشیاء یا آپ جو شاپنگ کریں اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔

ٹکٹ لے کر ہم مقامات داخلہ سے اندر جا رہے ہیں۔ جہاں ایک عالم عجائبات ہمارے خیر مقدم کے لیے

بے تاب ہے۔شاپنگ ایریا۔ بھوک لگی ہے یا پیاس۔سب انتظامات ہیں۔رنگ رنگ کے کپڑے پہنے بچوں کی تعداد زیادہ ہے۔والدین بچوں کو آوازیں دے رہے ہیں وہ آزادی کا لطف اٹھا رہے ہیں۔

آلٹن ٹاورز فراہم کی گئی معلومات کے مطابق کم از کم ایک ہزار سال پرانا ہے۔آٹھویں صدی عیسوی میں شاہ مرشیا نے اپنا قلعہ یہاں تعمیر کروایا تھا۔ بعد میں یہ مقام مختلف بادشاہوں اور خاندانوں کو منتقل ہوتا رہا۔اور آس پاس باغات، جھلیلیں،نمو پاتی رہیں۔1787ء میں چارلس ٹالبرٹ نے یہاں سب سے زیادہ دلچسپی لی اور بہت سرمایہ صرف کیا۔1827ء میں چارلس کی موت کے بعد اس کے بھتیجے جان نے جو سولھواں ارل بھی تھا اس نے اپنے چچا کی یاد میں ایک مینار استوار کیا۔اور اس پر یہ کندہ کرایا۔

''اس نے صحرا کو مسکراہٹ بخشی۔''

یہ پہلے آلٹن جاگیر کہلاتی تھی۔پھر اسے آلٹن الیبے کا نام دے دیا گیا۔جان نے اسے الیبے آلٹن ٹاورز کا نام دیا۔اس زمانے میں کئی ماہرین تعمیرات نے یہاں جائزے لیے۔ڈیزائن وضع کیے اور اس کے حسن میں اضافہ کیا۔سولھواں ارل اپنی بیگم اور بیٹیوں کے ساتھ امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے یہاں قیام پذیر رہا۔پھر وہ تاریخی لمحہ بھی آیا۔جب شہزادی (جو بعد میں ملکہ بنی) وکٹوریہ نے اپنی والدہ کے ساتھ آلٹن ٹاورز کا دورہ کیا۔شہزادی اس سے بہت متاثر ہوئیں۔اس نے اپنی ڈائری میں اس کا تفصیل سے ذکر کیا۔

آلٹن ٹاورز بعد میں باہمی مقدمہ بازی کا موجب بھی بنا۔1860ء میں جب نئے ارل کو اس کی ملکیت میں قانونی فتح حاصل ہوئی تو اس نے اس تاریخی موقع کو جشن کے لیے موزوں سمجھا۔اور وہ ایک جلوس کی شکل میں یہاں داخل ہوا۔ تاریخ کے اوراق اس عظیم جلوس کی جھلکیاں بتاتے ہیں۔ایک میل تک یہ جلوس پھیلا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ تقریباً چالیس ہزار افراد جمع ہوگئے تھے۔ان میں سے کم از کم 25 ہزار کے لیے دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا گیا۔ یہ ارل ہنری جان چیٹ ونڈ ٹالبوٹ تھے۔انہی کے دور میں یہ باغات عام لوگوں کے لیے کھولے گئے۔

اس کے بعد سال بھر میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ آتے تھے۔ مختلف کرتب دیکھتے تھے۔ شیروں کو سدھارنے ہاتھیوں کو قابو کرنے، آتش بازی اور



آلٹن ٹاورز کا ایک خوبصورت منظر

دوسرے مظاہرے 700 سال تک یہ جاگیر امرائے شریوسیری کے پاس رہنے کے بعد ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔اور چند مقامی تاجروں کے گروپ نے اسے باقاعدہ تفریحی مقام بنانے کے لیے حاصل کرلیا۔

1924ء میں جب گروپ نے یہ علاقہ خریدا۔اس میں ایک صاحب ولیم اسٹیفورڈ بیگ شا تھے۔اس نے باقی تاجروں سے بھی حصص خرید کر اپنے بیٹوں کو ساتھ ملایا۔اس خاندان نے ان باغات اور زمینوں پر بہت سرمایہ کاری کی اور بڑی دلچسپیاں اضافہ کیں۔ دوسری جنگ عظیم کے درمیان برطانوی فوج نے ٹاورز حاصل کر لیے اور یہاں آمیز کریڈٹ ٹریننگ یونٹ قائم کیا گیا۔ آلٹن ٹاورز 1951ء تک فوج کی تحویل میں رہے۔اس کے بعد ہی یہ کمپنی کو واپس ملے۔

فوج کی تحویل کے دوران ٹاورز کو بہت نقصان پہنچا۔

بہت زیادہ مرمت کی ضرورت تھی۔ وزارتِ دفاع سے معاملات طے بھی ہوئے لیکن اس سے ملنے والی رقوم نا کافی تھیں۔ پھر ایک نئی کمپنی آلٹن ٹاورز کا قیام عمل میں آیا۔ جس نے کافی سرمایہ خرچ کیا۔ اور اس میں نئے دور کے تقاضوں کے مطابق نئی تفریحات کا اضافہ کیا گیا۔ اب یہاں ہزاروں تماشائی روزانہ آنے لگے۔ یہاں خوبصورت باغات بھی تھے۔ سواریوں کے لیے مختلف کھٹولے، جھولے، خودکار ٹرینیں، چھوٹی چھوٹی جھیلوں اور نہروں کے انجنوں سے چلنے والی کشتیاں، کیبل کار سسٹم۔

کنٹرولنگ شیرز اب تک بیگ شا خاندان کے پاس تھے۔ 1980 کے بعد جان بروم نے زیادہ دلچسپی لی۔ اور اس میں انقلابی تبدیلیاں لے آیا مہمانی علاقوں میں اضافہ ہوا۔ رولر کوسٹر لگے۔ قزاقوں کا جہاز، سائن 2000 کا اضافہ بھی اسی دور میں ہوا۔ یورپ کا سب سے بڑا فاسٹ فوڈ ریستوران ٹالبوٹ 1982 میں قائم ہوا۔

اب تک ان تفریحات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

بچوں کے لیے ایک الگ سلطنت ہے، جس کا نام کیڈیز کنگ ڈم ہے۔

1991ء سے تساد گروپ نے آلٹن ٹاورز کی توسیع اور تزئین کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اور دس ملین پونڈ سے تین نئے مقامات کا اضافہ کیا۔ جس میں ایک افریقی گاڑی، رن وے مائن ٹرین، اور ایک دنیا کا سب سے بڑا بھوت گھر بھی۔ جس میں جدید ترین ٹیکنالوجی سے خوف اور حیرت کی لہریں پیدا کی جاتی ہیں۔

اب اس 500 ایکڑ کے پارک میں ہم پانچ پاکستانی بھی موجود ہیں۔ جہاں ہر سال 20 لاکھ افراد تماشا کرنے آتے ہیں۔ ٹکٹ کے ذریعے دیکھے جانے والے تفریحی مقامات میں لندن کے بعد یہی سب سے بڑی جگہ ہے۔

اس عالمِ عجائبات میں دیکھنے کو اتنا کچھ ہے کہ ہم بھی سوچ سوچ کر پریشان ہیں کہ کیا دیکھیں کیا نہ دیکھیں۔ آلٹن ٹاورز میں سب کچھ دیکھنے کے لیے تو کئی دن چاہیے ہیں۔ ہم تو کئی گھنٹے بھی لے کر نہیں آئے۔

ہزاروں لوگ چل رہے ہیں، گھوم رہے ہیں۔ کچھ ٹرین میں بیٹھ رہے ہیں۔ کچھ کشتیوں میں زندگی سے بھرپور قہقہے لگا رہے ہیں۔ یہ بجلی کے جھولے۔ انہیں کیا نام دیا جائے۔ تیز رفتاری سے سیکڑوں سواریوں کو چکر لگواتے ہیں۔ چشمِ زدن میں اِدھر سے اُدھر۔ پانی تیزی سے ایک کھال میں بہہ رہا ہے۔ اس میں ربڑ کی کشتیاں مسافروں کو لیے لہروں کے رحم و کرم پر تیر رہی ہیں۔

آپ ابھی سوچ ہی رہے ہیں کہ کس سواری سے لطف اندوز ہوں۔ آپ کے سر پر سے ایک کیبل کار گزر جاتی ہے۔ ہم یہ سب کچھ صرف ایک گوشے میں کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ نہ جانے ایسے کتنے گوشے اس آلٹن ٹاورز میں موجود ہیں۔ ٹاورز کی کامیابی کا راز اس میں نظر آتا ہے کہ یہاں خاندان کے تمام افراد بیک وقت محظوظ ہو سکتے ہیں۔ بچے اپنی تفریحات میں چلے جائیں۔ خواتین کی دلچسپی کے بھی بہت سے مقامات موجود ہیں۔ بزرگوں کے لیے بھی بہت کچھ ہے۔

ہمارے وہاں ایسی جاگیریں کئی نامور خاندانوں کے پاس ہیں۔ پنجاب میں بھی، سندھ میں بھی۔ سرحد میں بھی۔ لیکن ان کی تنگ نظری نہ تو انہیں عام لوگوں کے لیے کھولنے دیتی ہے نہ انہیں کچھ دولت کمانے کی طرف آنے دیتی ہے۔ ایسے خاندان ہیں جو کئی پہاڑوں، دریاؤں اور باغات کے مالک ہیں۔ اگر وہ لوگوں کی تفریح کے لیے جدید ٹیکنالوجی کا سہارا لیں۔ تو اور نامور بھی ہو سکتے ہیں اور دولت مند بھی۔ صرف سوچ بدلنے کی ضرورت ہے۔

یہی سب کچھ ہمارے ہاں بھی ہے۔ فطرت کا حسن فراواں، سرسبز وادیاں، آسمان چومتی پہاڑیاں، گھنے پیڑ، آلٹن ٹاورز میں وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ تبدیل ہوا ہے۔ بہت سی نئی دلچسپیاں شامل ہوئی ہیں۔ اس کے استقبالیہ کے ساتھ ہی شروع ہونے والی سلور رائڈ مونو ریل کو دیکھیں تو لگتا ہے ہم کسی فلائی اسٹیشن پر پہنچ گئے ہیں۔ الگ الگ علاقوں میں الگ الگ موضوع اور مزاج کے مطابق تفریحات ترتیب دی گئی ہیں۔ اسی لیے اسے تھیم پارک یا موضوعی باغات کہا جا رہا ہے۔ ٹاورز اسٹریٹ، سپریٹینا فارم، کڈیز کنگ ڈم، ٹالبوٹ اسٹریٹ، فیسٹیول پارک، تھنڈر ویلی۔ گلومی وڈ کا لنگا کینین آ گوشے میں اپنی نوعیت کی سواریاں ہیں،

تفریحات ہیں، ریستوران ہیں شاپنگ کے مواقع ہیں۔
مختلف قسم کی سواریوں کی تعداد 125 کے قریب ہے۔ جن میں زمینی، فضائی اور دریائی سب کچھ شامل ہے۔ جب آپ یہ سب کچھ دیکھ کر تھک جائیں اور بھوک محسوس کریں۔ تو آپ کے لیے سات بہت اچھے، بھرپور خاندانی ریستوران ہیں۔ اور کوئی تیس کے قریب کھوکھے موجود ہیں۔ یہاں پر مزاج کی تسکین کا سامان دستیاب ہے۔

جہاں ہر روز ہزاروں افراد آتے ہیں جن میں سیکڑوں بچے بھی شامل ہوتے ہیں وہاں سیکورٹی بھی ناگزیر ہے اور صفائی بھی۔ صفائی کے لیے ہر وقت نوجوان مرد عورتیں مصروف کار دکھائی دیتے ہیں۔ سیکورٹی کے لیے باقاعدہ اطلاعی مراکز ہیں۔ گمشدہ بچوں کے لیے بھی، گمشدہ والدین کے لیے بھی۔

ہم سب بھوت گھر دیکھنے والوں کی ایک لمبی قطار میں شامل ہوگئے ہیں۔ بل کھاتی ہوئی یہ قطار درختوں میں سے گزرتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ ہم جہاں کھڑے ہیں وہاں سے بھوت گھر کا مرکزی دروازہ بس چار فٹ پر ہی ہے۔ لیکن ہمیں اسی قطار میں سے ہوکر جانا ہے۔ جس میں کالے بھی کھڑے ہیں۔ گورے بھی، ایشیائی بھی امریکی بھی، یورپین بھی، افریقی بھی، بچے بھی بڑے بھی، قطار کو جس پگڈنڈی سے گزرنا ہے۔ اس کے دونوں طرف بھی کچھ حیرت اور خوف پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں قبر بنائی ہے۔ کتبہ درج ہے۔ کوئی خاتون نو عمری میں مرگئی، کسی نے خودکشی کرلی۔ کسی کے کتبے میں اس سے زیادہ بھی ہولناک اندراجات ہیں۔ آپ جب تک انتظار کی زحمت اٹھارہے ہیں اس وقت تک کے لیے یہ تاریخی آثار آپ کو مصروف رکھتے ہیں اور آپ کا دل حزن و ملال کی گرفت میں آتا رہتا ہے۔ اور جب تک آپ بھوت گھر کے دروازے پر پہنچتے ہیں آپ خود دکھی انسانیت بن چکے ہوتے ہیں۔

یہ آسیب زدہ گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپ ایک کھلی ٹرین میں بیٹھ جاتے ہیں، جو آپ کو دہشت اور خوف اور ہولناکی کے سفر پر لے کر چل پڑتی ہے۔ اندھیرے میں بجلی کوندتی ہے۔ ایک بڑی چمگادڑ آپ پر ٹوٹنے کو بڑھتی ہے۔ کہیں ایک خوفناک کھوپڑی آپ کے عین سر پر آموجود ہوتی ہے۔ آسمانی بجلی کڑکتی ہے۔ دیواروں میں شگاف پڑرہے ہیں۔

ٹرین میں سواریاں شور مچا رہی ہیں۔ خواتین کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ بچوں کے قہقہے۔ دل دہلا دینے والے مناظر واقعتاً تخلیق کیے گئے ہیں۔ یہ انسانی تخیل اور جدید ترین ٹیکنالوجی کا امتزاج ہے۔

ٹرین رک گئی ہے۔ سواریاں اتر رہی ہیں۔ ابھی اسی بھوت گھر کے اندھیروں سے گزرنا ہے۔ فوٹوگرافر موجود ہے۔ آپ اپنی تصویر لینا چاہیں تو پیسے جمع کروا دیں۔ ایڈریس دے دیں۔ تصویر پہنچ جائے گی۔

بھوت گھر واحد تفریح ہے۔ جس پر ہم پانچوں پاکستانی سیاحوں کا اتفاق ہوا ہے۔ دوسرے جھولوں، کشتیوں، ٹرین پر سب جانے کو تیار نہیں ہیں۔ کوئی ریل پر جانا نہیں چاہتا کہ یہ بچوں کے لیے مناسب ہے۔ کشتی پر اس لیے نہیں بیٹھنا کہ کپڑے گیلے ہو جائیں گے حالانکہ یہ سب اسی ٹکٹ میں ہے جو ہم خرید چکے ہیں۔

بات یہ ہے کہ ہماری دلچسپی، اور ذوق و شوق آلٹن ٹاورز کی تلاش میں صرف ہوچکا ہے۔ جب ہم عجائبات اور تفریحات کی اس دنیا میں پہنچے ہیں، اس وقت تک ہماری توانائیاں جواب دے چکی ہیں۔ سب کے اعصاب کا تقاضا یہ ہے کہ ہوٹل چلا جائے اور کچھ آرام کیا جائے۔ ویسے یہ بدذوقی کی انتہاء ہے۔

ٹرین ہمیں دعوتِ لطف اندوزی دے رہی ہے۔ کیبل کار بڑے پیار سے بلا رہی ہے۔ پہاڑیوں میں سے بہتا ہوا تیز رفتار دریا ہماری مہم جوئی کو آواز دے رہا ہے۔

ہم سب نظارے اسی طرح چھوڑ کر ہوٹل کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔ ہم سے ایک صاحب کہہ رہے ہیں کہ اگر یہاں ماریا ہوتی تو ہم میں سے کوئی بھی اتنا جلد یہاں سے جانے کو تیار نہیں ہوتا۔ اصل بات یہی ہے کہ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔

☆......☆......☆

(آلٹن ٹاورز کی حیرتوں کے بعد ہم اگلے ماہ نائٹ کلب کے ویک اینڈ سے ہوتے ہوئے پھر لندن کی رنگین خزاں میں موجود ہوں گے)

ناول

کاشی چوہان

زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک
ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ
یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

اسرار کی نئی دنیا میں لے جانے والے، پُراسرار سلسلے کی دوسری قسط

لڑکی کا نام صنوبر تھا اور وہ بلے کو دیکھ کر چیخ رہی تھی.... سلمان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کرے اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ لڑکی اسے دیکھ کر اس طرح خوفزدہ ہو جائے گی اور چیخیں مارنے لگے گی۔ اس نے تو سوچا تھا کہ وہ اسے ایک عام گھروں میں گھومنے والی بلی سمجھ کر نظر انداز کر دے گی یا پھر جیسا بڑے گھروں میں ہوتا ہے یہ لوگ انسانوں سے زیادہ کتے اور بلیوں سے پیار کرتے ہیں تو لڑکی بھی بلی کو دیکھ کر اس سے پیار سے پیش آئے گی۔ لڑکی اگر پیار سے پیش آ جاتی تو سلمان کے من کی مراد بر آتی اور وہ اسی بہانے لڑکی سے قریب ہو جاتا، جو اس کا اصل مقصد تھا۔ پتا نہیں یہ خوبصورت حسین لڑکی کہیں بلیوں سے ڈرتی نہ ہو۔ سلمان نے سوچا... مشکل یہ تھی کہ وہ کچھ اور بن بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ انسانوں کی دنیا میں بلیوں کے علاوہ کوئی جانور ایسا نہ تھا جو یوں آزادانہ گھروں میں آ جا سکتا ہو۔ کتا بننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کوئی کتا اس طرح یوں اچانک کسی لڑکی کے سامنے کیسے آ سکتا ہے۔ پرندوں میں کوئی بھی پرندہ وہ جان بوجھ کر نہیں بنا تھا کہ کوئی پرندہ ایسا نہیں ہوتا جسے انسان اتنی آسانی سے پکڑ سکتے ہوں۔ مچھر اور مکھی وہ خود سے نہیں بنا تھا کہ ان اڑنے والے کیڑوں سے انسان محبت نہیں نفرت کرتے ہیں۔ ویسے بھی رات میں پرندے کہاں ہوتے ہیں۔ سب اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے جاتے ہیں اور جس گھر میں بھی یہ غلیظ اڑنے والے مچھر اور مکھی ہوتے ہیں وہاں انھیں فوراً ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ ایک پرندہ وہ بن سکتا تھا اور وہ بن کر شاید اسے لڑکی کی ہمدردی حاصل ہو ہی جاتی۔ وہ کبوتر بن سکتا تھا اور وہ بھی زخمی کبوتر، جسے دیکھ کر شاید لڑکی کے دل میں رحم آ جاتا اور وہ اسے دیکھ کر ایسے چیخیں بھی نہ مارتی۔ سلمان مسلسل اپنے ان ہی خیالات کی ادھیڑ بن میں مصروف تھا۔ پر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو وہ بلا بن چکا تھا اور لڑکی اسے دیکھ چکی تھی تو اب وہ یوں اس کے سامنے ہی سامنے کبوتر کیسے بن سکتا تھا۔ اب تو جو بھی ہو اسے بلا ہی رہنا تھا لیکن چیختی ہوئی لڑکی کو کیسے چپ کرائے؟ یہ اس کی سمجھ میں فوری طور نہیں آ رہا تھا۔ آخر اس نے وہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کیا اور ایک دیوار کے کونے سے چپ چاپ نیچے اترنے لگا۔

لڑکی یہ دیکھ خود بخود خاموش ہو گئی... لیکن ایسا کرنے سے سلمان کی وہ مشکل اپنی جگہ ہی قائم رہی کہ اب وہ اتنی رات میں کہاں جائے اور کس طرح اپنی رات گزارے۔ یہ سوچتا ہوا وہ نیچے بیٹھا رہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس بار جب وہ اپنی ماں سے مل کر آئے گا تو اپنے تعلیمی ادارے کا رستا ہی بھول



جائے گا.....

کچھ دیر تک وہ اسی طرح ایک دیوار کے ساتھ بیٹھا رہا۔ پھر اس کے ذہن میں کچھ خیال آیا اور اس نے دوبارہ اس لڑکی کے پاس جانے کا سوچا...اس نے سوچا اگر اس بار بھی لڑکی نے اسے دیکھ کر چیخیں ماریں تو اسے یہاں سے جانا ہوگا۔ وہ دھیرے سے اسی جگہ سے پھر چڑھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ لڑکی آنکھیں بند کیے۔ کسی سوچ میں گم ہے۔ وہ چپکے سے بنا آواز کیے وہیں بیٹھا اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ اندر جانے والا سلائڈنگ ڈور بند تھا اس لیے وہ اگر اندر چلا بھی جاتا تو اِس کا مطلب ہوتا کہ اس نے اپنے لیے ایک اور مصیبت کو دعوت دے دی ہے۔ پہلے تو لڑکی اس کے بارے میں کسی شک میں پڑ سکتی تھی کہ جب وہ اس کے سامنے سے دیوار سے اتر کر نیچے گلی میں چلا گیا تھا تو پھر اندر اس کے گھر میں کیسے آیا.....اور اگر وہ اسے گھر کے اندر سے نکال دے گی تو پھر سمجھو یہ دنیا کی حسین ترین لڑکی کبھی اس کو بلے کے روپ میں قبول نہیں کرے گی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ آخر اتنی رات گئے اپنے بستر میں چین کی نیند سونے کے بجائے یہ لڑکی یہاں بالکونی میں بیٹھی سوچ کیا رہی ہے؟ کیا وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے؟ اسے کیا پریشانی ہوسکتی ہے۔ ایک لمحے کو اسے اپنی شکتیوں کے استعمال کا خیال آیا۔ وہ چاہتا تو لڑکی کی پریشانی کو اپنی شکتی سے جان سکتا تھا کیوں کہ اسے انسانوں کے ذہن پڑھنے کی قابلیت ورثے میں ملی تھی مگر وہ ایسا کرتے ہوئے خود ایک پریشانی کا شکار تھا۔ اس نے اپنے باپ ابراہیم سے وعدہ کیا تھا کہ انسانوں کی دنیا میں رہتے ہوئے وہ اپنی ایسی کسی شکتی کا استعمال نہیں کرے گا اور خود کو کسی دوسرے روپ میں بھی اس وقت تک نہیں ڈھالے گا جب تک ایسا کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہو۔ اس کے باپ نے اس سے یہ وعدہ بھی لیا تھا کہ وہ کبھی ایسا کچھ نہیں کرے گا جس سے کسی بھی انسان پر اس کا یہ راز عیاں ہوجائے کہ وہ انسان نہیں جن ہے۔ اور یوں بھی انسان بننے کے لیے وہ ایسا بیتاب ہوا جاتا تھا کہ اس وقت اگر اس کا باپ اس سے اور بھی کوئی بات منواتا تو وہ اسے بھی بلا چوں چرا مان لیتا..... مگر اب کیا کرے...

پتا نہیں لڑکی جب اسے دوبارہ دیکھے گی تو اس کا کیا ردعمل ہوگا۔ یہی سوچ کر وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا اور اوپر والے نے اس کی دعا جیسے سن لی اور پوری بھی کردی۔

لڑکی نے اس بار آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو، وہ چیخیں مارنے کی بجائے اس کی طرف انسیت اور ہمدردی سے دیکھنے لگی۔ اسے لگا جیسے یہ بلی ضرور بھوکی ہے یا کسی مشکل میں ہے تب ہی یوں دوبارہ اس کے سامنے آگئی ہے۔ لڑکی دھیرے سے اٹھی اور سلائڈنگ ڈور سرکا کے اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک پیالہ تھا۔ اس پیالے میں دودھ بھرا ہوا تھا۔ اس نے دودھ بلے کے آگے رکھ دیا اور اسے کہنے لگی....

''پی لو تمہیں شاید بھوک لگی ہے۔!''

لڑکی کی آواز سن کر سلمان کو لگا جیسے کسی نے اس کے سماعت کے راستے حلق تک مٹھاس انڈیل دی ہو۔ اس کی آواز میں ایسا جادو تھا جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں سنا تھا۔ لڑکی کی آواز سن کر وہ جیسے مدہوش ہونے لگا اور اسے یہ یاد نہیں رہا کہ لڑکی اسے دودھ پینے کا کہہ رہی تھی۔ لڑکی نے جب یہ دیکھا کہ بلا دودھ نہیں پی رہا تو وہ اس کے قریب آئی اور بولی۔

''کیا چاہیے! دودھ کیوں نہیں پی رہے؟''

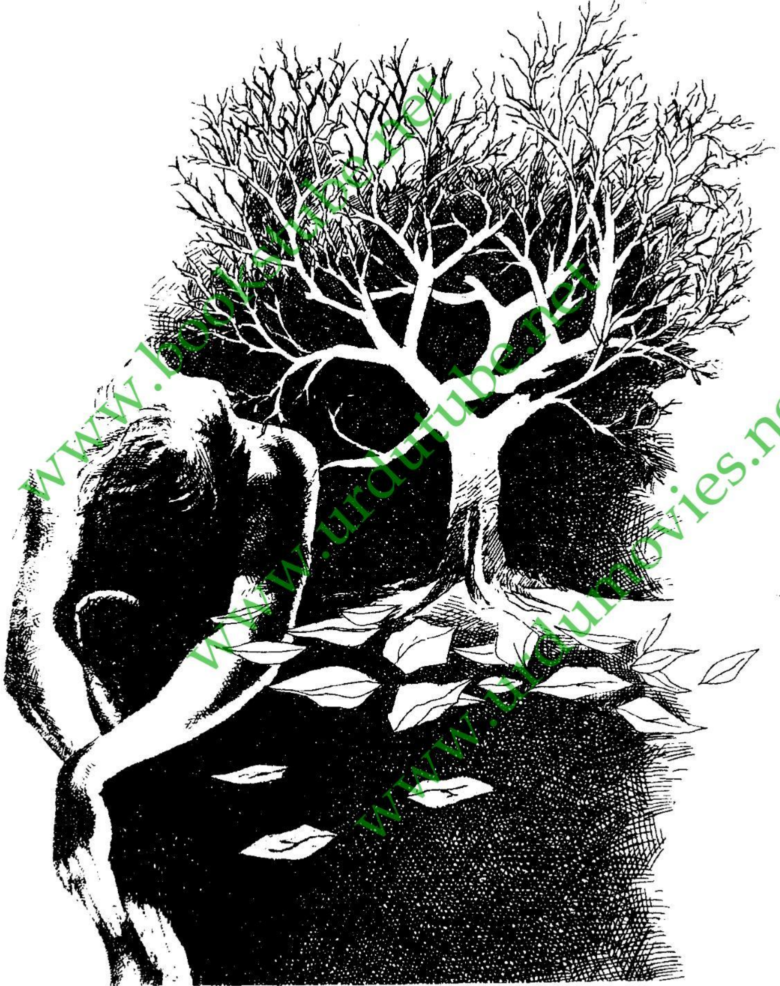
سلمان اس کی آواز سن جیسے ایک دم سے ہوش میں آگیا اور اس ڈر سے کہ کہیں لڑکی اس کی طرف جس ہمدردی اور محبت سے متوجہ ہوئی ہے اس کی وہ ہمدردی اور توجہ واپس نہ چلی جائے۔ جلدی جلدی لپڑ لپڑ دودھ پینے لگا۔ لڑکی کو اس کا یوں دودھ پینا جیسے اچھا لگا اور وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''مجھے پتا تھا تم بھوکی ہو؟'' ایک نظر سلمان نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے لڑکی کے چہرے پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ اتنی زیادہ بھلی معلوم ہوئی کہ اسی وقت اس کا دل چاہنے لگا لڑکی کا منہ چوم لے...مگر اسی اثنا میں اسے یہ بھی یاد آگیا کہ وہ بلے کے روپ میں اس کا منہ نہیں چوم سکتا اور بلے کیا انسانی روپ میں بھی وہ یہ نہیں کرسکتا تھا۔ انسانوں میں ایسی حرکتیں سخت ناپسندیدہ ہوتی ہیں اور سلمان کو ایک بات فوری طور پر سمجھ میں آگئی تھی کہ اسے کوئی بھی

کام ایسا نہیں کرنا جس سے لڑکی کی اس ہمدردی سے محروم ہونا پڑے جو خدا کی رضا سے اس کے دل میں غیر متوقع طور پر پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے دودھ پی لیا اور لڑکی نے دیکھا کہ وہ دودھ پی چکا ہے مگر اب بھی وہیں اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا ہے تو وہ پھر بولی۔

''اب کیا ہے۔ دودھ تو پی لیا اب جاؤ یہاں سے؟''

سلمان کو یہ سن کر فوری طور ایک ٹیس سی اپنے سینے میں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر جو بات سمجھ میں آئی، جس



سے اس لڑکی کو اپنی بات کا جواب مل سکتا تھا۔
اس نے "میاؤں میاؤں" کی اور وہیں لوٹنے لگا۔ لڑکی یہ دیکھ کر ایک لمحے کو حیران ہوئی، اسے لگا یہ بلی اس کی بات سمجھتی ہے۔ رات کے اس اندھیرے میں جب ہلکی ہلکی روشنی چاند سے اتر رہی تھی یا پھر برابر کے گھر میں جلنے والے بلب کی کچھ روشنی اس بالکونی میں آ رہی تھی تو لڑکی یہ اندازہ نہیں لگا سکتی تھی کہ وہ بلا ہے یا بلی۔ سچ پوچھو تو لڑکی دن میں بھی یہ اندازہ لگانے کی کوشش بھی نہ کرتی اور معمول کے مطابق وہ اسے ایک بلی ہی سمجھتی رہتی۔ کچھ دیر تک وہ خاموش رہی اور پھر اپنی سوچوں میں چلی گئی۔ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ یہ جاننے کی سلمان کو کافی بے چینی تھی لیکن اپنے باپ سے کیے ہوئے وعدے کی وجہ سے وہ یہ نہیں جان سکا کہ لڑکی کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔
لڑکی سوچ رہی تھی کہ اس بلی کی وجہ سے وہ اپنی پریشانی بھول چکی ہے ورنہ اس بلی کے یہاں آنے سے پہلے وہ کافی پریشان تھی اور اب وہ اپنی پریشانی سے کسی قدر نجات حاصل کر چکی تھی۔ یہ اس کی توجہ کے بٹ جانے کی وجہ سے ہوا تھا یا اس کی کوئی اور وجہ تھی، اسے بہر حال کا بلی یہاں رکنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ پھر سے اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی اور بلا بدستور لوٹیں لگا تا رہا اور یہ سلمان کی مجبوری تھی کیونکہ اسے لگا کہ لڑکی اسے لوٹیں لگا تا دیکھ کر محظوظ ہو رہی ہے اور اسی لیے وہ اب جانے کا نہیں کہہ رہی تھی۔ لیکن کب تک... وہ کب تک لوٹیں لگا سکتا تھا۔ اس لیے وہ تھم گیا اور ہولے ہولے چلتا ہوا لڑکی کے قریب اس کے پیروں کے نزدیک جا کے بیٹھ گیا۔ اس کا دل چاہنے لگتا کہ وہ لڑکی کے پیروں کو چوم لے... اور اپنی زبان سے اس کے پیروں کو چاٹ کر اپنی محبت کا اظہار کرے... مگر اسے یہ جھجک بھی تھی کہ لڑکی کہیں اس کے اس عمل سے پھر سے ڈر جائے اور ڈر کے چیخیں مارنے لگے تو اس کی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا جو وہ اتنی دیر سے لڑکی کے قریب رہنے اور اس کی ہمدردی کو قائم رکھنے کے لیے کر رہا تھا۔ اسی لیے وہ ایک ٹک ٹکی سی باندھ کر اس کے بے پناہ حسین پیروں کو دیکھنے لگا۔
لڑکی پھر سے اپنی محویت سے چونکی اور اس نے دیکھا کہ بلی اپنی جگہ پر نہیں ہے تو اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ سلمان کو یہ بات معلوم ہوگئی اس لیے اس نے میاؤں کر کے جلدی سے لڑکی کو اپنی موجودگی کا پتا بتایا۔ لڑکی نے جو اسے یوں اپنے قریب دیکھا تو اس بار اسے بلے کو دیکھ کر کوئی ڈر محسوس نہیں ہوا اور وہ اسے دیکھ کر دھیرے سے مسکرائی اور اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے اس کی پیٹھ سہلانے لگی۔ سلمان کو اس کے ہاتھوں کا لمس جیسے ہی ملا تو یوں اسے لگا کہ اُسے کائنات کی سب سے بڑی دولت مل گئی۔ وہ خوشی سے جھومنے لگا اور ایک سرمستی سی اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکا ہے۔ لڑکی نے اسے اس طرح پیار سے سہلایا تو اس نے لڑکی کے پاؤں کو پیار کرنا شروع کر دیا۔ اب یہ بات، یہ احساس خود لڑکی بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ بلی کے اس کے پاؤں کو چھونے سے اسے ایک عجیب سا نشہ کیوں آنے لگا تھا۔ یہ یقیناً سلمان کی وہی جناتی جبلت کی وجہ سے تھا۔
لڑکی اس کے لمس سے پیدا ہونے والی جادوئی کیفیت میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ تو کیا اسے بھی سلمان سے محبت ہو رہی ہے.... سلمان نے بے صبری سے سوچا پھر وہ دل ہی دل میں ہنسنے لگا اگر ایسا ہو بھی رہا ہے تو اسے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ تو ایک لڑکی کو بلی سے ہونے والی ہمدردی یا محبت ہوگی، اس سے سلمان کو اپنی منزل کیسے ملے گی اور لڑکی تک پہنچنے کے لیے اس نے جس بیتابی کا مظاہرہ کیا تھا اس وقت تو یہ بات اس کے ذہن و دل میں بالکل نہیں آئی تھی کہ اگر لڑکی بلی سے یا بلے سے مانوس ہوگئی تو کیا سلمان کو ساری زندگی اس لڑکی کی محبت میں بلا ہی بنے رہنا ہوگا۔ اگر ایسا ہوا تو پھر یہ منزل کے قریب نہیں بلکہ دور بہت دور ہو جانے والی بات تھی کیونکہ بعد میں جب بھی سلمان کو بلے سے سلمان بننے کی ضرورت پڑے گی تو لڑکی کی پیدا ہونے والی اس پریشانی کو کیسے دور کیا جا سکے گا کہ وہ جس بلی سے محبت کرتی ہے وہ اچانک کہاں چلی گئی....
سوچ کی لہریں کچھ اور بپھریں تو سلمان کو یہ بھی خیال آیا کہ وہ اگر لڑکی کی محبت میں مجبور ہو کر اسی طرح کچھ دن یا جتنے بھی عرصے تک اسے بلا بنا رہنا پڑا تو اس کی تعلیم کا کیا ہوگا؟ وہ اتنے دن تک مدرسے سے غائب نہیں رہ سکتا تھا۔

اگر اس نے مدرسہ چھوڑا تو اس کے والد ابراہیم کو پتا چل جائے گا اور تب اس کی ساری محنت ضائع ہو جائے گی... کیونکہ پھر اسے انسانی دنیا کو چھوڑ کے جانا ہوگا اب اسے کیا کرنا چاہیے...

یہ سب سوچتے ہوئے وہ بھول گیا کہ وہ لڑکی کے پیروں سے پیار کر رہا تھا اور لڑکی اس نشے میں مدہوش ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے لڑکی کے پیروں کو چاٹنا بند کیا تو کچھ ہی دیر میں لڑکی کو ہوش آ گیا اور وہ اٹھ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے گھر کے اندر جانے لگی... سلمان تیزی سے اس دروازے سے اندر داخل ہو گیا جس دروازے میں لڑکی نے ابھی اپنا ایک ہی پاؤں رکھا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے وقت بھی اس نے دماغ سے نہیں بلکہ دل میں پیدا ہونے والی عجلت سے کام لیا تھا... اور اب وہ پھر ایک اور مصیبت اپنے لیے کھڑی کر چکا تھا۔ سچ ہے محبت اندھی ہوتی ہے اور جس کسی کو بھی محبت ہوتی ہے اس کے لیے یہ لازم ہے اس کی عقل اور دماغ دونوں کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اس وقت سلمان کی عقل نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا....

گھر میں داخل ہونے کے بعد سلمان نے دیکھا کہ یہ ایک کافی عالیشان گھر تھا یعنی لڑکی بہت امیر تھی۔ ایک طرف وسیع ڈرائنگ روم تھا اور درمیان میں ایک بہت ہی خوبصورت امریکن اسٹائل کا کچن بنا ہوا تھا اور اس کے پیچھے کئی کمرے تھے جو ایک لمبی سی راہداری سے گزرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ گھر مخصوص انداز سے ڈیزائن کرایا گیا ہے۔

سلمان نے بھی اتنا بڑا اور خوبصورت گھر نہیں دیکھا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ انسان کیسی زبردست عیاشی اور سہولت سے زندگی گزارتے ہیں، جن جاتی تو اس سارے اہتمام کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ پتا نہیں شاید اسی لیے انسانوں کو اشرف المخلوقات بنایا گیا ہو۔ لڑکی کچن میں پانی پینے گئی تو وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی چلا آیا اور لڑکی اسے دیکھ کر بس دھیرے سے مسکرائی رہی پھر بولی۔

''کیا اور دودھ پیو گے؟''

سلمان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اب اس بات کا کیا جواب دے... بلا بنے ہونے کی وجہ سے وہ کتنا بھی میاؤں میاؤں کرتا لڑکی اس کی بات کبھی نہ سمجھ پاتی اور اس بے چاری کو اس کے لیے پھر سے دودھ پیالے میں نکال کر اس کے سامنے رکھنا پڑتا۔ سلمان کو اس پیالے سے منہ پھیر کر کچن سے باہر جانا ہوگا تب کہیں جا کر اسے پتا چلے گا کہ اسے اب مزید بھوک نہیں لگی اور وہ دودھ پینا نہیں چاہتا۔ مگر اس سب میں اس لڑکی کو اس کے لیے دودھ پیالے میں نکالنے کی جو محنت کرنا پڑے گی سلمان اسے اس سے بچانا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ جلدی سے کچن سے باہر جا کر کھڑا ہو گیا... اور لڑکی یہ بات سمجھ گئی کہ اسے مزید دودھ نہیں چاہیے۔

لڑکی پانی پیتے ہوئے اسے دیکھتے ہوئے مسلسل یہ سوچ رہی تھی کہ اس بلی کو اس کی بات، اس کی زبان کیسے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ یہ دوسری بار ہے جب بلی نے اس کی بات سمجھتے ہوئے اپنے ردعمل کا مظاہرہ کیا ہے... لیکن اتنی جلدی لڑکی کسی حتمی رائے پر نہیں پہنچ سکی اور اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔ سلمان کے لیے یہی ضروری تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ ساتھ اس کے کمرے میں جائے جیسا کہ وہ اب تک کرتا رہا ہے۔ کوئی اور نارمل بلی یا بلا ہوتا تو وہ شاید ایسا نہ کرتا لیکن یہ تو ایک جن زادے کا ایک انسان اور نسوانیت سے بھرپور لڑکی کے عشق کا مسئلہ تھا اور عشق بھی ایسا جو سلمان کے ہوش اڑا چکا تھا۔ اسے دنیا کی ہر بات بھولتی جا رہی تھی اور وہ ہر حالت میں اس حسین مہ جبیں کے قریب رہنا چاہتا تھا۔ جب سلمان لڑکی کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے تک جانے لگا تو راہداری سے گزرتے ہوئے اسے خود یہ احساس ہو رہا تھا کہ لڑکی شاید اسے اپنے کمرے میں داخل نہیں ہونے دے گی اور پہلے کی طرح یہاں وہ طریقہ بھی کارگر ثابت نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ جلدی سے ڈور اوپن ہوتے ہی لڑکی سے بھی پہلے اندر چلا جائے۔ راہداری میں خاموشی سے لڑکی کے پیچھے چلتے ہوئے اس نے پہلی بار دیکھا کہ لڑکی نے ایک ڈھیلا ہلکے ہرے رنگ کا ٹراؤزر اور ایک سفیدی مائل کرتا پہنا ہوا تھا۔ پتا نہیں یہ اس کے سونے کا لباس تھا یا نہیں تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر جیسے ہی لڑکی نے دروازہ کھولا سلمان نے فوراً اپنی میاؤں کے ذریعے سے اسے بتایا کہ اسے بھی اندر آنا ہے۔ لڑکی نے چونک کر اسے دیکھا اور

بولی۔

''کیا مطلب ہے! گھر میں تو آ گئے ہو اب کیا میرے کمرے میں بھی آؤ گے؟''

سلمان نے جلدی سے اس کا پاؤں چاٹنا شروع کر دیا اور لڑکی کو پھر سے وہی مزے دار سا نشہ یاد آ گیا اور اسی بے خودی میں لڑکی نے کمرے کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا اور سلمان جلدی سے مگر بے صبری ظاہر نہ ہو کچھ دھیرے سے کمرے میں چلا آیا۔ لڑکی نے اس پر اب کچھ اور طرح سے توجہ دینا شروع کر دی تھی اور یہ اس کے پاؤں چاٹنے کا اثر تھا لڑکی کو مزا لگ چکا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ چاہنے لگی تھی کہ اسے یہ مزا ملتا رہے۔ لیکن لڑکی اب تک بھی یہ بات نہیں سمجھ پائی تھی کہ یہ مزا صرف اس مخصوص بلی کے چاٹنے سے پیدا ہو رہا ہے یا ساری بلیوں کے چاٹنے سے ایسا ہی لطیف اور میٹھا میٹھا احساس جسم و جاں میں سرسرایا کرتا ہے کیونکہ لڑکی کو آج سے پہلے کبھی بلی سے اس طرح ہمدردی کرنے اور ہمدردی کو بڑھاوا دیتے ہوئے پاؤں چٹوانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس لیے اسے سب کچھ بہت عجیب اور انوکھا لگ رہا تھا۔ کسی انوکھے کام میں اگر مزا بھی آنے لگے تو انسان کا اس سے دل نہیں بھرتا اور عورت اس معاملے میں مرد سے مختلف ہوتی ہے۔ اس کے احساس میں کوئی چیز ہلچل مچائے، اسے گدگدی کرے تو وہ اس سے کہیں زیادہ لطف اندوز ہوتی ہے اس لیے لڑکی نے ان ہی لمحوں کو طویل کرنے کے لیے، بلے کو اندر بلا لیا۔ دوسری طرف بلے کو کیا چاہیے تھا؟ جو چاہیے تھا وہ اسے مل رہا تھا۔ مخلوق کو کبھی یہ نہیں پتا چلتا کہ خالق نے اس کے وجود میں کون کون سی طاقتیں اور کامیابیاں جمع کر دی ہیں اسی لیے ہر مخلوق کو ہر زمانے میں کچھ نیا پتا چلتا ہے جس سے دنیا کے آگے بڑھنے کا عمل جاری رہتا ہے اور مخلوق کو جینے میں مزا آتا رہتا ہے۔ ویسے بھی اگر کسی مخلوق کو اپنے ساری صلاحیتوں اور خوبیوں کا کسی ایک زمانے میں پتا چل جائے تو سمجھ لیجے دنیا اسی لمحے اتنی بے کیف ہو سکتی ہے کہ مخلوق اور خالق کا آپس میں رشتا ہی منقطع ہو جائے اور جینے اور دنیا کا عمل آگے بڑھنے کا عمل ہی ختم ہو جائے۔ اس کا مطلب ہوا دنیا کا خاتمہ....

اور کوئی نہیں جانتا کہ خالق اس دنیا کو کب صفحۂ ہستی سے مٹانے والا ہے۔ جیسے موت کا ایک دن مقرر ہے لیکن کسی کو نہیں معلوم کہ اس کی موت کب اور کیسے آنے والی ہے اسی... جس نے انسان اور دوسری سب مخلوقات کو زندہ دلی سے جینے اور جینے سے مزا لینے پر مجبور کیا ہوا ہے... مخلوقات کی دنیا میں یہ شاید ایک ہی ایسی مجبوری ہے جس کا کسی مخلوق کو احساس تک نہیں ہے اور وہ امیدوں کے پل پہ پل باندھ کر بے خیالی جیے جاتے ہیں۔ جینا ہی زندگی کا اصل مقصد اور رازوں کے کھلتے رہنے کا اشارا ہے۔ کون کیسے جی رہا ہے کیسے جینا چاہتا ہے زندگی کی ساری دلکشی اسی ایک بات میں پوشیدہ اور مضمر ہے....

سلمان لڑکی کے کمرے میں اندر آ گیا اور وہ بہت خوش تھا کہ اسے پہلی ہی رات اپنی محبوبہ کے پہلو میں گزارنے کا موقع نصیب ہو چکا تھا۔ ساری دنیا میں وہ شاید پہلا انسان تھا.... جسے اس طرح پہلی ہی رات اپنی محبوبہ کے ساتھ بتانے کا موقع مل رہا تھا۔ ہر چند کہ اس وقت وہ ایک بلا تھا اور بلے کے روپ میں وہ زندگی کی وہ مٹھاس، وہ رس اور وہ امرت کبھی نہیں چکھ سکتا تھا جو انسان کے روپ میں اسے میسر آتیں تو اس کی خوشی دیوانگی سے بھی کہیں بڑھ جاتی لیکن... یہ بھی کوئی کم تو نہیں تھا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ اس کے کمرے میں تنہا تھا جس سے اسے پہلی ہی نظر میں محبت ہو چکی تھی۔

لڑکی نے اس کی طرف ایک ادائے دلربائی سے دیکھا اور باتھ روم میں چینج کرنے چلی گئی۔ سلمان سمجھ گیا کہ وہ سونے کے لیے کپڑے تبدیل کرنے گئی ہے اور اس وقت اس کے من میں ایک لطیف خیال نے شرارت سے انگڑائی لی کاش وہ اسے کپڑے بدلتے ہوئے بھی دیکھ سکتا... مگر یہ ان باقی دو دروازوں کی طرح کا دروازہ نہیں تھا جسے کھلوانے کے لیے وہ لڑکی کو اپنی میاؤں سے متوجہ کرتا اور وہ اسے باتھ روم میں بھی بلا لیتی... ظاہر ہے وہ اگر ایسا کرتا تو لڑکی کیسے ہی نشے میں کیوں نہ ہوتی اسے کتنا ہی مزا کیوں نہ آ رہا ہوتا وہ یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہو سکتی تھی کہ یہ بلا دنیا کا سب سے کمینہ اور خبیث بلا ہے جو اسے بنا کپڑوں کے بھی دیکھنا چاہتا ہے، اسی لیے سلمان کمرے کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھ گیا اور لڑکی کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی اثنا میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں

کمرے کا جائزہ لینے لگیں اور اس نے دیکھا کہ کمرا نہایت قیمتی چیزوں سے آراستہ تھا۔ یہ تو سلمان کو گھر میں داخل ہوتے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ لڑکی کسی بہت ہی امیر کبیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے مگر جیسے جیسے وہ لڑکی کے قریب ہوتا جا رہا تھا اسے لڑکی کی ثروت کا اندازہ مزید ہوتا جا رہا تھا۔ قیمتی نوادرات اور پینٹنگز سے سجا ہوا یہ کمرا لڑکی کے نفیس ذوق کا بھی ترجمان تھا۔ یہ لڑکی اس کے مقابلے میں زیادہ پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہے، اس نے دل میں سوچا۔ اور شاید اس کا فنونِ لطیفہ سے کوئی تعلق ہے۔ نہیں بھی ہے تو اسے ایسی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے اور اس کا ذوق بہت اعلیٰ ہے۔

کمرے کی دیواریں ہلکے پرپل (جامنی) رنگ کی تھیں اور ان پر جگہ جگہ آویزاں پینٹنگز میں ایک ناقابلِ بیان خوبصورتی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایک طرف مونالیزا کی ایک پینٹنگ بھی لگی ہوئی تھی مگر اس کو ایک کونے میں لگایا گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں قدرتی نظاروں اور مرد اور عورت کی محبت سے رنگی ہوئی پینٹنگز کہیں زیادہ تھیں۔ ایک طرف ایک بک شیلف بھی تھا جس میں کچھ اردو اور کچھ انگریزی کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں... ایک طرف ریکارڈر بھی تھا اور بہت سی سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز کا ایک بھاری کلیکشن سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ ابھی سلمان ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے لڑکی کی ذہنی اور تصوراتی سطح کا اندازہ لگا ہی رہا تھا کہ باتھ روم کا دروازہ کھلا اور لڑکی باہر آ گئی۔ اس نے سلیپنگ سوٹ پہن لیا تھا اور اپنے گورے گورے پاؤں کسی ایسے خوشبودار لکوڈ سے دھوئے تھے کہ اس کے پیروں سے اٹھنے والی خوشبو کمرے میں بکھر گئی، جس سے سلمان کو ایک عجیب سے سرور کا احساس ہونے لگا۔ لڑکی نے جیسے بلے کو فراموش کر دیا تھا اور وہ پھر سے ان ہی سوچوں کے حوالے خود کو کر چکی تھی جن سوچوں کی وجہ سے اسے رات گئے تک نیند نہیں آ رہی تھی اور وہ بالکونی میں بیٹھی ہوئی ان ہی سوچوں میں گم تھی۔

سلمان کو اس کے ذہن میں چلنے والی سوچوں کے بارے میں جاننے کا بہت شدت سے تجسس ہوا اور اس کے دل میں ایک بے چینی سی ہلچل مچانے لگی۔ اسے اتنی خوبصورت لڑکی کو اس طرح سوگوار دیکھ کر خود بھی دکھ ہونے لگا آخر اتنی کم عمر اور ایسی امیر لڑکی جس کے پاس زندگی کی وہ ساری تعیشات اور رنگینیاں ہیں، جن کا کوئی بھی انسان ساری زندگی پیچھا کرتا ہے تو کیا وجہ ہے ہو سکتی ہے کہ یہ لڑکی بار بار ایک انجانے دکھ میں مبتلا ہو جاتی ہے، ہو نہ ہو اس کا ضرور کسی نے دل دکھایا ہے۔ کہیں اسے عشق و محبت نے تو نہیں دکھی کیا ہوا؟ اگر ایسا ہوا تو سلمان کو اپنا پتا کٹتا ہوا محسوس ہونے لگا اور وہ اندر سے ایک دم جیسے کسی ویران دشت میں پیاس سے کلبلاتا ہوا انسان بن گیا۔

اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ اے خدا ایسا نہ ہو اور وہ اس لڑکی کے دل میں محبت کا احساس جگانے والا وہ ہی پہلا انسان ہو... ''انسان....'' یہ خیال آتے ہی وہ اور بھی اداس ہو گیا کیونکہ اسے یاد آیا کہ وہ انسان نہیں بلکہ جن ہے اور جنوں کو انسانوں سے محبت کرنے کا حق ہوتا ہے نہ اجازت۔ اس کے ماں باپ نے اسے انسانوں کے ساتھ پڑھنے کی اجازت اور آزادی ضرور دی تھی مگر وہ جانتا تھا اسے کسی لڑکی سے محبت کرنے کی اجازت اور حق کبھی نہیں مل سکتا کیونکہ یہ اس کا حق تھا ہی نہیں... حق تو وہ ہوتا ہے جو.... خدا نے اپنی کسی مخلوق کو مرحمت کیا ہو اور جنات کو انسانوں سے دور رہنے کا حکم ہے۔ اگر ان کے قریب جانے کی اجازت بھی ہے تو ان سے محبت کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور ایک لڑکی سے ایک جن کی محبت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا....

مدرسے کے مدرس کے پاس ایسے کیس اکثر آتے تھے جن میں کوئی ماں اپنی کسی لڑکی یا لڑکے کے بارے میں یہ آ کر بتاتی تھی کہ اس کی جوان لڑکی پر کسی جن کا اثر ہے یا کوئی جن اس کی بیٹی کے وجود میں حلول کر گیا ہے اور اسے بھگانے یا نکال پھینکنے کی وہ التجا کیا کرتی تھی۔ مدرس اسے کچھ قرآنی آیات کا وظیفہ دے کر کہتے تھے کہ اس عمل سے جن چلا جائے گا۔ عام طور سے یہ وظیفہ تین مہینوں سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔

سلمان کو ایسے کیسز کے بارے میں معلوم ہوتا تو وہ دل ہی دل میں ہنسا کرتا تھا کہ کسی کے جسم میں جن حلول کیسے کر سکتا ہے۔ ضرور یہ کوئی اور معاملہ ہے جسے ان پڑھ اور کمزور عقیدے کے لوگوں نے جنات کے اثر سے تعبیر کیا ہوا ہے۔ یہ کوئی بیماری ہو سکتی ہے کیونکہ سلمان ایک جن تھا اور اسے یہ بات معلوم تھی کہ ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن ایک دن جب اس نے اپنے مدرس سے اس بارے میں سوال کیا تو پہلے تو انھوں نے اسے گھور کے دیکھا اور بولے...

''تم کیا کرو گے جان کر۔ بہتر ہوگا تم اپنی تعلیم پر توجہ دو۔ ابھی یہ سب جاننا تمہارے لیے کسی کام کا نہیں ہے کیونکہ اس کا تمہاری تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' سلمان کو مزید سوال کرنے کی ہمت نہیں پڑی مگر اس کی کچھ دیر کی موجودگی کو مدرس نے یہ سمجھا کہ وہ اس سوال میں الجھ چکا ہے اور اگر اس کا ذہن اس بارے میں صاف نہ کیا گیا تو اس کی پڑھائی پر اثر پڑ سکتا ہے تب جو کچھ اسے مدرس نے بتایا وہ سب جان کر سلمان کو ایک قسم کی حیرانی ہوئی تھی کیونکہ یہ سب معلومات اس کے لیے نئی تھیں۔ مدرس نے کہا تھا۔

''جنات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو نیک ہوتے ہیں اور آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اپنی حدود پہچانتے ہیں اور خدا کو مانتے ہیں۔ اس کے بتائے ہوئے راستے سے آگے نہیں جاتے اور اسی کو مان کر اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو شیطانی ہوتے ہیں اور شیطان کی پوجا کرتے ہیں۔ ایسے جنات انسانوں سے سیکس کرنا چاہتے ہیں اور انھیں سیکس کی بیماری ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ انسانوں کے ذہن میں بھی سیکس کے ذریعے داخل ہوتے ہیں اور پھر وہاں اس طرح بسیرا کر لیتے ہیں کہ ایسے انسان کو ہر وقت سیکس ستاتا رہتا ہے۔ وہ کسی بھی انسان کو سیکس کی بیماری میں مبتلا کر دیتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ لڑکیوں کو جن اپنے قابو میں کر لیتے ہیں اور ان کا جینا محال کر دیتے ہیں۔ وہ جب ان کا دل چاہتا ہے ایسی لڑکیوں کو اپنی سفلی خواہشات کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اور انھیں بے چین رکھتے ہیں۔ عام حالات میں نہ تو کسی لڑکی کو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے اور نہ ہی کوئی بھی انسانی طریقہ ایسا موجود ہے جو اس بات کا کھوج لگا سکتا ہو لڑکی کے ساتھ کیا ماجرا ہو گیا؟ اس کے برعکس کوئی انسان کسی لڑکی کے ساتھ سیکس کرے تو میڈیکل سائنس اس کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اگر یہ زبردستی کیا گیا سیکس ہے، جسے مذہب میں زنا بالجبر کہا جاتا ہے تو اس کی سزا مقرر ہے اور وہ اس مجرم اور گناہ گار کو دی جاتی ہے جو اس فعل بد کا مرتکب ہوتا ہے مگر جنات کے معاملے میں یہ کھوج صرف روحانیات کے ماہر ہی لگا سکتے ہیں حقیقی دنیا اس کا پتا چلانے میں ناکام رہتی ہے۔ ایک اور بات... ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ لڑکی کی عجیب حالت کی وجہ اس پر جن کا آ جانا ہو۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ لڑکیاں ایسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں جنھیں پوشیدہ بیماری کہا جاتا ہے۔ جیسے ہسٹریا کا مرض ہوتا ہے لیکن چونکہ عام انسان اس قسم کے علوم سے بہرہ ور نہیں ہوتے تو ان کا سب سے پہلے دھیان اسی ایک بات پر جاتا ہے کہ لڑکی پر کسی نے کچھ کرا دیا ہے جس سے وہ کسی جن کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ اب ایسی لڑکی کو بھی جن اتارنے والے ایسے عاملوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو اس علم کا الف بھی نہیں جانتے۔ وہ اپنے فضول اور غلط طریقوں سے لڑکی کا برا حال کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایسے کیسز میں اکثر لڑکیاں مر جاتی بھی ہیں۔ مگر وہ شفایاب نہیں ہو پاتیں۔ کیونکہ ان کے اندر جن ہوتا ہے نہ اس کا اثر۔ اگر ہوتا بھی ہے تب بھی جن کا نکالنا ہر کسی کو نہیں آتا مگر بدقسمتی سے حریص انسانی دنیا میں ایسے جعلی عاملوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو اس راستے سے اپنی دکانیں چمکاتے ہیں اور معصوم اور سادہ دل لوگوں سے پیسے اینٹھتے رہتے ہیں۔''

سلمان مدرس کی باتیں سن کر جیسے بھونچکا رہ گیا اور اسے ان کی باتوں کا یقین نہیں آیا چنانچہ اس بار جب وہ اپنے گھر گیا تو اس نے بابا ابراہیم کو سارا قصہ سناتے ہوئے پوچھا کہ اس میں سچائی کتنی ہے اور انسانوں کا وہم کتنا ہے تب ابراہیم نے اس سے کہا۔

''میں نے تمہیں اس مدرسے میں اسی لیے داخل کیا تھا اس کا مدرس بہت پہنچا ہوا اور عامل باعمل انسان ہے اس نے جو کچھ بھی تمہیں بتایا ہے وہ سب سچ ہے۔'' یہ سن کر پہلی بار سلمان کو پتا چلا کہ جنات میں شیطان صفت بھی ہوتے ہیں اور وہ انسانوں کو اکثر نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔ اس نے یہ سب سوچنے کے بعد سوچا کہیں اس خوبصورت اور حسین لڑکی کو بھی تو کسی ایسے ہی جن نے اپنے قبضے میں نہیں کیا ہوا؟

پھر اس نے خود ہی اپنے اس خیال کو رد کر دیا کیونکہ جس قسم کی لڑکیاں مدرس کے پاس لائی جاتی تھیں اور وہ جیسی عجیب عجیب حرکتیں کیا کرتی تھیں، اس لڑکی میں ایسی کوئی جھلک موجود نہیں تھی۔ وہ اپنے بستر پر کچھ دیر تک ٹانگیں لٹکا کے بیٹھی رہی اور اس بلے کو دیکھتی رہی اچانک سلمان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس نے فوراً لڑکی

کے پیروں کو چومنا اور چاٹنا شروع کر دیا۔ لڑکی کو مزا آنے لگا۔ سلمان کو یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ لڑکی یہ نہیں چاہتی کہ سلمان اس کے بستر پر چڑھ کر یہ کام کرے اس لیے وہ اس وقت تک پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی جب تک نیند نے اسے آ کر پکڑ نہیں لیا۔

باقی رات وہ چین اور سکون کی نیند سوتی رہی اور سلمان پوری رات اس کے سامنے بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ وہ جب کروٹ تبدیل کرتی تو سلمان چل کے دوسری طرف چلا جاتا اور اس سوئی ہوئی بے پناہ حسین لڑکی کو وہ بنا پلک جھپکائے دیکھنے میں مگن رہا، وہ بھی ساری رات۔ اب یہ تو کوئی سلمان سے ہی پوچھے کہ اسے اس عمل میں کیسا لطف اور لذت مل رہی تھی۔ محبوب کے دیدار سے محب کو کیا ملتا ہے، یہ کوئی ایسا انسان کبھی نہیں بتا سکتا جس نے کبھی کسی سے محبت نہ کی ہو ورنہ... دنیا کے سارے عاشقوں نے صرف محبوب کے دیدار کی خاطر ایسے کشٹ نہ جھیلے ہوتے اور اتنی تکلیفیں نہ اٹھائی ہوتیں اور ایسی سزائیں نہ پائی ہوتیں جن کو سن کے روح تک لرز اٹھتی ہے۔ جیسے انار کلی کا زندہ دیوار میں چنوا دینا۔ خیر یہ انار کلی کو محض دیدار کی وجہ سے تو نہیں مگر محبت کرنے کی سزا دی ضرور دی گئی تھی۔ سلمان اس وقت ان سزاؤں کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ کوئی بھی عاشق محبت کرتے وقت سزاؤں کے بارے میں نہیں سوچتا سوچ بھی لے تب بھی عشق کرنے سے باز نہیں آ سکتا کیونکہ عشق میں دنیا کی ساری نشہ آور چیزوں سے زیادہ نشہ ہوتا ہے۔ اس نشے کے بارے میں بھی کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کا لطف و لذت کیسی اور کتنی ہوتی ہے۔ لڑکی کا ناقابلِ بیان حسن کا بے مثال نمونہ تھی۔ اس کے چہرے پر جیسے جنت کا نور برس رہا تھا علاوہ آنکھیں جھیل جیسی گہری اور جادو اثر تھیں۔ اس کی گھنی اور لانبی پلکوں کے اندر جیسے سمندر ہلکورے لیتا تھا۔ اس کے گالوں پر ایسی رونق تھی کہ اندھیرے میں بھی چمکتے تھے اور اس کے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں سے زیادہ نازک تھے۔ اس کے پیروں کی بناوٹ سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ قدرت کا تراشا ہوا ایک ناقابل بیان شاہکار تھی اور اس سے بھی زیادہ لطف انگیز اور قابل فخر بات یہ تھی کہ وہ آج کل کی امیر اور پیسوں والی لڑکیوں کی طرح مغربی طور اطوار میں لپٹی ہوئی نہیں نظر آتی تھی۔ اس کا حسن اور جوانی اور اس کا رکھ رکھاؤ صدیوں پر محیط اس مشرقی حسن و خوبصورتی کا نمونہ تھا جس نے کتنی ہی لازوال اور عشقیہ داستانوں کو جنم دیا تھا۔ وہ کوئی ایسی لڑکی نہیں تھی جس کی ساری شخصیت کو اگر لفظوں میں بیان کر دیا جائے تو اس کے حسین و رعنائی کا حساب لگایا جا سکتا ہو۔ ہرگز نہیں وہ ہر دم بدلتی ہوئی لہروں کی طرح بل کھاتی ہوئی ایسی نازنین اور گلبدن تھی کہ اس کے حسن کا نقشہ کوئی مصور، کوئی سنگتراش بھی اپنی ساری زندگی کی فنی مہارت سے اپنے تخلیق کیے ہوئے فن پاروں میں سمونا چاہے تو اسے بھی ناکامی ہو سکتی تھی... مگر یہ سب تو سلمان کی سوچوں کا عکس تھا اور دنیا کے ہر عاشق کی طرح سلمان بھی اس طرح سوچ رہا تھا ورنہ دنیا والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ لیلیٰ جو عشق کی اقلیم کی اماں ہوا ہے وہ کوئی حسین عورت نہیں تھی اب اس لڑکی کو کوئی اور دیکھے اور اس کا تخیل سلمان کے تخیل سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو اسے شاید خوبصورت نہ بھی کہا جائے مگر یہ حقیقت ہے کہ اسے سلمان کی نظروں سے الگ کر کے دیکھا جائے تب بھی وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی اچھی بھلی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کی عمر بمشکل کوئی انیس یا پھر بیس برس رہی ہوگی اور دیکھنے میں بھی وہ اتنے کی ہی لگتی تھی تاہم اس کا نازک اندام جسم کسی کے لیے بھی ایسی کشش اور دعوتِ دل رکھتا تھا جس کو ماننا پڑتا ہے۔ اب لیلیٰ کو حسین نہ ماننے والے بھی یہ تو مانتے ہی ہیں کہ لیلیٰ سے ایک دوسری ریاست کا شہزادہ بھی شادی کرنے کو مچلا پڑتا تھا اور یہ تو ثابت ہے کہ اس شہزادے کو لیلیٰ سے اس طرح کا عشق ہوا بھی نہیں تھا جس طرح کے عشق میں قیس لیلیٰ کے لیے مجنوں بن چکا تھا۔ پھر بھی شہزادہ ہر قیمت پر لیلیٰ کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس نے حاصل کر بھی لیا تھا تو اس کی وجہ لیلیٰ کے جسم کی کشش ہی تھی... لیکن وہ لیلیٰ کے دل اور اس کی روح سے قیس کا نام الگ کرنے میں ناکام رہا۔ اب یہاں ہم لیلیٰ اور مجنوں کی نہیں بلکہ سلمان اور اس لڑکی کی کہانی بیان کر رہے ہیں جس کا نام ابھی تک سلمان کو معلوم نہیں تھا اور سلمان کے عشق کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ خود تھا کیونکہ سلمان ایک جن زادہ تھا اور لڑکی ایک انسان تھی۔ انسان اور جن میں نہ شادی ہو سکتی ہے اور نہ ہی انسانوں کی طرح کا عشق ہو سکتا ہے اس کے باوجود سلمان کو اس لڑکی سے ایک رات میں ایسا عشق ہو چکا تھا جو صدیوں کا سفر طے کر چکا ہوتا ہے۔

ساری رات سلمان لڑکی کو دیکھتا رہا اپنی ہری اور نیلی آنکھوں کی چمکتی روشنی سے اور یہ بھی بھول گیا کہ وہ کون ہے اور اس وقت یہاں اس اجنبی لڑکی کے کمرے میں کیا کر رہا ہے۔ دو ایک بار اسے ہوش بھی آیا تو اس نے اس ہوش میں بھی بے ہوشی کا ہی کام کیا اور لڑکی کے تلووں کو اپنی زبان سے چاٹنے لگتا۔ اس چاٹنے میں کیسی مٹھاس اور کیسا سرور تھا سلمان کی جگہ کوئی دوسرا ہوتو وہ بتا سکتا ہے اگر عشق نے اسے اس طرح ہوش حواس سے بے گانہ نہ کیا ہوتا تو وہ کم سے کم ایک بار تو ضرور انسانی روپ میں آ کر اپنی آنکھوں کی پیاس بجھالیتا اور اپنے ہاتھوں سے اس کا نازک بدن چھو لیتا لیکن اس کے ہوش حواس پتا نہیں کس نے چھین لیے تھے اور وہ ساری رات اسی بے خودی میں بس بلا ہی بنا رہا اور ان ہی آنکھوں سے لڑکی کو دیکھتا رہا جو اسے بلا بننے سے ملی تھیں۔

............☆☆............

صبح ہوگئی سورج کی روشنی ریشمی پردوں کے پیچھے سے اپنی موجودگی کا احساس کرانے لگی اور لڑکی ایک کافرانگڑائی لے کر بیدار ہوگئی۔ ابھی اس کی انگڑائی درمیان میں ہی تھی کہ اس کی نظر بلی پر پڑی اور لڑکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اسے رات کی بات یاد نہیں تھی اس لیے اس نے بلی کو انجان نظروں سے دیکھا اور سوچنے لگی کہ یہ بلی اس کے کمرے میں کیسے آئی۔ ابھی سوچ نے اس کے دماغ میں ہلچل مچائی ہی تھی اور عجب نہیں تھا کہ وہ کوئی چیخ مارتی کہ بلے نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس کے سامنے رکھی ہوئی میز پر ایک فریم میں لگی ہوئی لڑکی کی تصویر پر اپنی زبان پھیرنا شروع کر دی۔ لڑکی کو یہ منظر دیکھ کر رات کی ساری بات یاد آ گئی اور اس کی حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھوں میں ایک دم ہی ہمدردی اور جانوروں کے لیے پیدا ہونے والی انسیت در آئی۔ اس نے بلی کو دیکھ کر اپنی کھنکتی رسیلی آواز میں کہا۔

''اوہ! تو تم رات سے یہاں ہو۔'' پھر اس نے ایک ادائے بے نیازی سے بلی کو نظر انداز کیا اور اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ باتھ روم سے فارغ ہو کر اس نے اپنے کپڑے تبدیل کیے اور آئینے میں اپنے سراپے اور حسن کا جائزہ لیا معمول کے مطابق جس قدر میک اپ وہ کیا کرتی تھی اس کا استعمال کیا اور کچھ فائیلیں اٹھا کر کمرے سے باہر نکلی تو اس کے ساتھ ساتھ بلا بھی نکل گیا۔ وہ راہداری سے گزر کر ایک ڈائننگ روم میں پہنچی جو کچن سے ملحق ہی تھا اور اپنے لیے ناشتا بنانے لگی۔ ابھی وہ کچھ چیزوں کی تلاش میں ہی مصروف تھی کہ ایک نوکرانی آ گئی اور آتے ہی بولی۔

''ارے چھوٹی بی بی آپ اتنی جلدی کچن میں آ گئیں۔ کیا بھوک لگی ہے؟''

نوکرانی ادھیڑ عمر کی ایک قبول صورت عورت تھی، جس کی عمر کوئی چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے ساڑی باندھی ہوئی تھی، جس کا مطلب تھا کہ نوکرانی کا تعلق بنگال سے ہے۔ ان دنوں بنگال سے تعلق رکھنے والی نوکرانیاں آسانی سے نہیں ملتی تھیں لیکن یہ بنگالن ضرور کسی وجہ سے اب تک اس ملک میں تھی اور اپنے ملک واپس نہیں گئی تھی۔

''اچھا کیا وقت ہوا ہے؟'' لڑکی نے حیرانی سے پوچھا مگر یہ معمول کی حیرانی تھی۔ اس میں کوئی بڑا اچنبھا نہیں تھا۔

''ابھی تو جی سات بھی نہیں بجے...'' نوکرانی نے جواب دیا۔ ''آپ چل کر بیٹھیں میں ناشتا لگاتی ہوں۔'' نوکرانی نے مزید کہا...

''اس کا مطلب ہے ابھی پاپا اور ماما بھی سو رہے ہیں؟''

لڑکی نے نوکرانی سے کہا

''جی'' نوکرانی نے جواب دیا۔

''اچھا پھر تو سلمان بھی نہیں جاگا ہوگا۔'' بلے نے جیسے ہی سلمان کا نام سنا تو اس کے کان کھڑے ہو گئے اور اسے فوراً ہی یہ بات معلوم ہوگئی کہ اس گھر میں بھی کوئی سلمان نام کا انسان موجود ہے۔ اس کے علاوہ لڑکی کے ماں اور باپ بھی ہیں جنھیں اس نے ماما اور پاپا کہا۔ لیکن وہ کہاں ہیں، سلمان نے سوچا۔ یقیناً ان ہی کمروں میں ہوں گے جن کے قریب سے لڑکی گزر کے آئی تھی لیکن سلمان کی یہ سوچ پوری طرح درست ثابت نہیں ہوئی کیونکہ تھوڑی دیر بعد

ایک باوقار سی عورت جس کے چہرے مہرے سے اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں تھا کہ وہ ہی لڑکی کی ماں ہے اور ایک بارعب مگر قدرے کمزور صحت کا حامل آدمی جو اس عورت کے مقابلے میں زیادہ دلکش اور خوبصورت تھا۔ ٹھیک سے دیکھا جائے تو لڑکی اپنی ماں سے زیادہ اپنے باپ پر گئی تھی اور اس کے باپ کو دیکھ کر جوانی میں ضرور اس کے ساتھ کے لڑکے اور دوست یہ کہہ کر چھیڑا کرتے ہوں گے کہ یار تمہیں تو اللہ نے لڑکی بناتے بناتے درمیان سے ارادہ بدل کر آدمی بنا دیا۔'' کیسے مشکل سے کٹتی ہے ایسے لڑکوں کی جوانی مگر جس کلاس اور امارت کے جس خانوادے سے اس آدمی کا تعلق تھا یہاں اتنے مسائل نہیں ہوتے۔ مسائل تو ہر قسم کے غریبوں کے لیے بنائے جاتے ہیں اور غریب ان مسائل کا بوجھ ساری زندگی اٹھا اٹھا کے ادھ مرے ہو جاتے ہیں۔ قبروں میں پاؤں پسار لیتے ہیں لیکن مسائل پیچھا نہیں چھوڑتے۔ سلمان ایک کونے میں کچھ اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اس پر کسی نظر نہیں پڑ رہی تھی اور لڑکی تو جیسے اسے بھول ہی چکی تھی۔

''سلمان کو تو آج یونیورسٹی جلدی جانا تھا اسے کوئی کام ہے۔ اسے اب تک اٹھ جانا چاہیے تھا۔ میں جاتی ہوں، اسے اٹھاتی ہوں۔'' عورت نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔ سب کچھ ہو رہا تھا وہ ایک بات نہیں ہو رہی تھی جس کا انتظار سلمان کو تھا یعنی اس مہ جبیں لالہ رخ کا نام لے کر اب تک کسی نے نہیں بلایا تھا اور سلمان کی بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اسے یہ ملال بھی تھا کہ لڑکی اسے اتنی جلدی بھول گئی اور اس کی رات بھر کی تپسیا ایک پل میں رائیگاں چلی گئی۔ عورت کچھ دیر میں واپس آ گئی اور ساتھ ہی اس نے سلمان کی بے تابی کو مہمیز دی اور بولی۔

''ہنی تم آج اتنی صبح کیوں اٹھ گئیں۔ لگتا ہے رات کو ٹھیک سے سوئی نہیں؟'' اس نے لڑکی سے کہا تو سلمان کو بہت اچھا لگا مگر وہ اتنی بات جانتا تھا کہ اس کی ماں نے اسے محبت سے ہنی کہا ہے، یہ اس کا نام نہیں ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی سلمان کو انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے اتنا وقت گزر چکا تھا کہ وہ یہ بات اچھی طرح جان چکا تھا کہ ہنی وغیرہ ٹائپ الفاظ امیر لوگوں میں پیار سے بولے جاتے ہیں... اس نے انسانوں کی بہت سی کہانیاں سنی اور پڑھ رکھی تھیں حالانکہ مدرسے کے طالب علموں کو کہانیاں یا کسی بھی دوسرے علم کے بارے میں جاننے اور پڑھنے کی ممانعت تھی لیکن سلمان کا تجسس اتنا زیادہ تھا کہ وہ مدرس اور نگرانوں سے چھپ کر یہ کام کر سکتا تھا اور یہ اس کے لیے یوں بھی کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ چاہتا تو کسی سے بھی چھپ کر کوئی بھی کام کر سکتا تھا کیونکہ وہ ایک غیر مرئی مخلوق تھا یعنی دکھائی نہ دینے والی مخلوق۔ تو اس لیے وہ کوئی بھی کام کر سکتا تھا اور کسی کو اس کی خبر تک نہ ہوتی۔ اپنے باپ سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق اس کے کسی بھی عمل سے نہ تو کسی کو یہ پتا چلنا چاہیے کہ وہ انسان نہیں جن ہے اور نہ ہی اس کے کسی بھی فعل سے کسی بھی معصوم انسان کو کوئی نقصان پہنچنا چاہیے۔ ان باتوں کا سلمان نے اب تک بڑی ہوشیاری سے خیال رکھا ہوا تھا ورنہ کئی بار اس سے یہ غلطی ہو چکی تھی کہ مدرسے کے ہوسٹل میں جس لڑکے عمران کے ساتھ وہ رہا کرتا تھا جو اس کا روم میٹ تھا اکثر سوتے وقت منہ پہ چادر کھینچتے ہوئے وہ سلمان سے کہتا ''یار لائٹ تم بند کر دینا'' اور سلمان اس کے چادر میں چھپے ہوئے منہ کا فائدہ لے کر اپنے ہاتھ کو کئی گز لمبا کرتا اور لیٹے لیٹے ہی لائٹ بجھا دیتا تھا یہ بات عمران کو کبھی معلوم نہیں ہو سکی کہ سلمان نے لائیٹ کیسے بجھائی تھی۔

کچھ دیر بعد سلمان آ گیا۔ یہ اس لڑکی کا بھائی سلمان تھا اور لڑکی کے مقابلے میں وہ بہت عام سی شکل کا نوجوان تھا۔ یقیناً وہ اپنی ماں پر زیادہ پڑا تھا۔ اس نے آتے ہی لڑکی کو اس کے نام سے پکارا۔ ''کیسی ہو صنوبر؟''

''صنوبر!'' شہزادیوں جیسے نام والی یہ لڑکی اپنے نام کی طرح صنوبر ہی لگتی تھی۔ چلتی تو ایسی تمکنت اور دلربائی اس کی چال میں ہوتی کہ لگتا تھا صنوبر کے درخت کی شاخیں مچل اٹھتی ہوں۔ اس کا چہرہ کسی بھی پھول کو شرماتا تھا۔ صنوبر نے سلمان کا نام لیے بغیر کہا۔ ''میں ٹھیک ہوں تم سناؤ تم کیسے ہو؟''

''میں تو ٹھیک ہوں۔ پر تم ٹھیک نہیں ہو؟'' سلمان نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا یہ نوجوان جو اس لڑکی سے بمشکل ایک ڈیڑھ سال ہی بڑا رہا ہو گا شکل سے بھلے ہی کوئی زیادہ خوبصورت دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن اس کے چہرے میں مجموعی طور پر ایک عجیب سی کشش تھی جو اس کی دلچسپیوں میں بڑی مددگار ثابت ہوتی

ہوگی۔ اس کی آنکھیں گہری اور سیاہ تھیں، بھنویں ایک دوسرے الگ اور اس کے چہرے کو خوبصورت بناتی ہوئی تھیں۔

''تم کیا کہنا چاہتے ہو سلمان؟'' اس بار اس آدمی نے پوچھا جو ان دونوں کا باپ تھا۔ سلمان نے ایک نظر صنوبر کی طرف دیکھا جیسے وہ کچھ بھی کہنے سے پہلے اس کی اجازت مانگ رہا ہو۔

''بولتے کیوں نہیں کیا مطلب ہے اس بات کا؟'' اس آدمی نے جس کا نام آصف کریم تھا، اپنے بیٹے سلمان سے پھر پوچھا۔ آصف کریم کی آواز میں ایک خاص قسم کا بھاری پن تھا، اگر اس نے جوانی میں گلوکاری سے بھی شوق فرمایا ہوتو یہ اس کی آواز میں موسیقی کے حوالے سے ایک قسم کی بیس تھی حالانکہ آصف کریم کی آواز اس کے جثے پر زیادہ جچتی نہیں تھی لیکن اگر اسے قدرت نے یہ آواز نہ دی ہوتی تو شاید یہ ان دونوں نوجوان لڑکے اور لڑکی کا باپ کم اور بڑا بھائی زیادہ معلوم ہوتا۔ سلمان کے پاس اب بولنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا اور وہ اپنی چھوٹی بہن صنوبر کی آنکھوں میں جھانکنے کے بعد یہ بات فوری طور پر سمجھ چکا تھا کہ صنوبر چاہتی ہے اس کے بارے میں ایسی کوئی بات نہ کی جائے جس سے اس کے والدین کو اس کے لیے تشویش پیدا ہو جائے، چنانچہ سلمان نے بات بنائی اور وہ بولا۔

''وہ پاپا صنوبر رات بھر کچھ سوچتی رہی ہے اس لیے میں نے ایسا کہا۔''

''کیوں بیٹے صنوبر کیا سلمان ٹھیک کہہ رہا ہے؟'' اس بار ان دونوں کی ماں نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ماں کا نام در شہوار ہے اور اس کے چہرے سے پتا چلتا ہے کہ وہ کوئی زیادہ ذہین عورت نہیں ہے مگر اس کا غصہ اور طنطنہ اور اس کی انا اسے ایک ایسی عورت کے روپ میں پیش کر سکتی ہے جن کی اپنے سرکل اور اپنے گھر میں حکومت چلتی ہو۔ ایسا ہی اس گھر میں بھی تھا۔ اس کا دیر سے گفتگو میں حصہ لینے کا یہ مطلب تھا کہ وہ ابھی پوری طرح نیند سے غلبے سے باہر نہیں نکلی تھی اس لیے کچھ دیر اس نے سچویشن کو آبزرو کیا اور اب جیسے وہ پوری طرح جاگ چکی تھی۔

''میں ایک پروجیکٹ میں الجھی ہوئی ہوں، اسی کے بارے میں سوچتی رہی ہوں اور یہ کوئی قابل تشویش بات نہیں ہے'' صنوبر نے سلمان کے جھوٹ کی وضاحت کرتے ہوئے دونوں ماں باپ کو مطمئن کر دیا اور اسی وقت بلے کو یہ خیال آیا کہ اب تو میں ساری بات جان چکا ہوں اور یہ بھی سمجھ چکا ہوں کہ یہ لڑکی صنوبر ضرور کسی مشکل میں ہے اور اپنی مشکل کو وہ اپنے والدین سے اخفاء رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن بلے کی پریشانی یہ تھی کہ اسے اپنے آپ کو کیسے ظاہر کرنا چاہیے یا اسے یہ کیسے بتانا چاہیے کہ رات بھر سے وہ ان کے گھر میں موجود ہے خاص طور سے وہ یہ بات صنوبر کو بتانا چاہتا تھا جو کچھ ہی دیر بعد اپنے تعلیمی ادارے کے لیے نکلنے والی تھی اور وہ چلی گئی تو اس کا کیا ہوگا۔ کیا اسے اس کے ساتھ جانے کی مہلت اور اجازت ملے گی؟ ظاہر ہے نہیں ملے گی۔ اس لیے اس نے اب خود کو ظاہر کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس وقت یہاں موجود چاروں نفوس نے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا جب انہیں بلی کی میاؤں میاؤں سنائی دی۔

باقی تین لوگوں کی حیرت کو فوری طور پر صنوبر نے یہ کہہ کر دور کر دیا کہ ''ارے میں تو بالکل ہی بھول گئی۔ رات جب میں بالکونی میں تھی اور اپنے پروجیکٹ کے بارے میں سوچ رہی تھی تو یہ بلی اچانک کہیں سے آگئی اور اس نے میرے ساتھ بہت سا وقت گزارا۔ میں نے اسے دودھ بھی پینے کو دیا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت چمکیلی اور خوبصورت ہیں۔'' صنوبر نے تفصیل سے بتایا اور اسی وقت بلا ان سب کے سامنے تھا اس کی آنکھوں کی خوبصورتی تو یقیناً دیکھنے لائق تھی مگر وہ خود نہایت سیاہ اور کالا تھا۔ انسانوں میں کالی بلی سے ایک قسم کا خوف اور اس کا سامنے سے گزر جانا ایک قسم کی منحوسیت سمجھا جاتا ہے۔

''مجھے تو یہ بہت منحوس معلوم ہوتی ہے؟'' سلمان نے کہا اور پھر اس کے قریب جا کے اسے دیکھنے لگا۔ بلے کو اس کی بات یقیناً بری لگی تھی مگر وہ اس بات کے جواب میں کیا کر سکتا تھا۔ اگر وہ کوئی ناپسندیدہ ردعمل بھی ظاہر کرتا تو یہ اپنے لیے راستے میں روڑے بچھانے جیسا تھا کیونکہ یہ نوجوان صنوبر کا بھائی تھا اور صنوبر اس کے لیے کیا تھی یہ تو ابھی تک صرف وہ خود ہی جانتا تھا۔

سلمان کریم نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ''صنوبر یہ بلی نہیں بلکہ بلا ہے۔'' صنوبر کو اس بات

نے جیسے لمحے بھر کو چونکا دیا اور اسے بلے کا رات بھر کمرے میں رہنا یاد آیا اور اس سے پہلے کہ وہ بلے کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتی اسی وقت اس کی ماما درشہوار نے اپنا سارا وزن بلے کی طرف داری والے پلڑے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو یہ بہت اچھا اور خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ میں اسے گھر میں رکھنا چاہوں گی۔''

''مگر ماما یہ کوئی فارن ریٹرن بلا نہیں ہے۔ یہ تو کوئی دیسی اور بے قیمت گلیوں اور گھروں میں گھومنے والا بلا معلوم ہوتا ہے۔'' سلمان کی بات سن کر بھی درشہوار نے بلے کو اپنے گھر میں رکھنے کے ارادے کو نہیں بدلا اور بولی۔

''اگر اس نے مجھے زیادہ پریشان کیا تو میں اسے جانے کے لیے کہوں گی بلکہ خود چھوڑ آؤں گی۔ لیکن اگر اس نے مجھے تنگ نہیں کیا تو میں اسے بالکل غیر ملکی بلیوں کی طرح بہت ٹھاٹھ سے رکھوں گی۔''

صنوبر نے ماں کی بات کی تائید کرتے ہوئے انھیں یہ بھی بتایا کہ یہ رات بھر سے میرے ساتھ ہے اور اس نے مجھے ذرا بھی تنگ نہیں کیا۔ بہت ہی معصوم اور شریف نسل سے تعلق ہے اس کا۔'' صنوبر کی بات سن کر اس کی ماں فوراً بلے کے پاس پہنچی اور اسے گود میں اٹھاتے ہوئے بولی۔

''اگر یہ رات بھر سے یہاں ہے تو اب اسے ضرور بھوک لگی ہوگی۔'' قریب ہی رکھے ہوئے فرج سے اس نے مرغی کے گوشت کے کچھ ٹکڑے نکالے اور بلے کے سامنے ڈال دیے۔ سب ہی اس کی طرف توجہ سے دیکھ رہے تھے اور اس وقت سب کی حیرانی دوچند ہوگئی جب بلا ان ٹکڑوں کے قریب جانے کے بجائے ان سے کچھ دور جاکے بیٹھ گیا اور اپنی آنکھوں سے صنوبر کو دیکھنے لگا... صنوبر نے جیسے اس کی بات سمجھ لی اور بولتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی۔

''ماما لگتا ہے یہ صرف دودھ پیتا ہے۔'' اس بات نے سلمان کریم کو سب سے زیادہ چونکایا اور وہ بولا۔

''ایسا تو کوئی بلا نہیں ہوتا جو صرف دودھ پیتا ہو۔ یہ کس نسل کا بلا ہے؟'' ماں نے اسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا۔

''اگر یہ دودھ پیتا ہے تب بھی ہم اسے اپنے ساتھ ضرور رکھیں گے۔''

''لیکن درشہوار کیا تمہیں یہ بات پریشان نہیں کر رہی کہ کوئی بھی بلا یا بلی گوشت نہ کھاتا ہو اور صرف دودھ پیتا ہو؟'' آصف کریم نے درمیان سے کہا۔

''ہاں میں بھی یہی سوچ رہی ہوں....'' اتنی دیر میں صنوبر نے بلے کے سامنے دودھ لاکر رکھ دیا اور وہ بڑے اشتیاق سے دودھ پینے لگا۔ کچھ دیر کی بحث اور سوچ بچار کے بعد چاروں اس بات پر متفق ہوگئے کہ اگر کوئی بلا گوشت نہیں کھاتا اور صرف دودھ پیتا ہے تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر ہم اپنے دن بھر کی مصروفیات کو ترک کرکے اس پر سر دھنتے رہیں۔

سب سے پہلے آصف کریم نے کہا کہ مجھے تو ابھی تیار بھی ہونا ہے اس لیے میں چلتا ہوں۔''

چاروں ناشتا ختم کر چکے تھے۔ سلمان نے جلدی جلدی لپڑ جھپڑ دودھ ختم کرلیا، اسے یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ کہیں صنوبر چلی نہ جائے، ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ صنوبر اگر چلی بھی گئی یا وہ جہاں نہیں بھی جا رہی ہے تو وہ اس کے ساتھ کیسے جا سکتا ہے...کوئی ایسا طریقہ نہیں تھا جو وہ خود کو صنوبر کے ساتھ رکھ سکتا تھا اس لیے اسے یہ فیصلہ کرنا ہی پڑا کہ صنوبر کے ساتھ جانے کے لیے اسے اپنی جناتی صلاحیتوں کا سہارا لینا ہی ہوگا۔

صنوبر اور سلمان کریم ایک ہی گاڑی میں جاتے تھے۔ سلمان صنوبر کو اس کے آرٹ اسکول ڈراپ کرتے ہوئے خود یونیورسٹی چلا جاتا تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور صنوبر ایک آرٹ اسکول میں فائن آرٹ کے شعبے میں لاسٹ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ جیسے گھر سے باہر جانے والے تینوں افراد نے گھر سے باہر قدم نکالا تو سلمان بھی فوری طور پر ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا اور اب وہ گاڑی کی چھت پر بیٹھ کر صنوبر کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔

رات اور اب تک اس کی جو کتھا آپ جان چکے ہیں اس میں فرق یہ تھا کہ رات کو وہ صنوبر کو نظر آ رہا تھا اور اب وہ کسی کو بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

............☆☆............

آصف کریم کو اپنے آفس جانا تھا۔ ان کا بہت بڑے پیمانے پر پھیلا ہوا الیکٹرونک کا بزنس تھا۔ سارے ملک میں ان کی کمپنی سے بنائے ہوئے گھریلو اپلائینسس استعمال ہوتے تھے اور وہ ایک قابل اعتماد کمپنی کے مالک تھے، جس کی شاخیں ملک کے کئی بڑے شہروں میں قائم تھیں۔ ہر سال ان کا منافع بڑھتا ہی جا رہا تھا اور ان کی دولت میں دن دوگنا رات چوگنا اضافہ ہو رہا تھا۔ اتنی کم عمری میں کوئی بھی شخص اتنا دولت مند کیسے ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ بزنس آصف کریم کو اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا اور ان کے باپ شہروز کریم ایک جانے مانے بزنس مین تھے۔ انہوں نے ضرور اس بزنس کو بڑھانے میں اور اس کا ایک معیار قائم کرنے میں دن دگنی اور رات چوگنی محنت کی تھی۔ اسی محنت کا پھل اب آصف کریم اور اس کی اولادیں اور ان کی اولادیں پتا نہیں کب تک کھانے والی تھیں۔

صنوبر شہر کے سب سے مہنگے اور سب سے مشہور آرٹ اسکول میں پڑھتی تھی۔ سلمان کو جیسے گاڑی رکنے کا احساس ہوا تو اس نے جلدی سے نیچے چھلانگ لگائی اور وہ اپنے اصل روپ میں آ گیا اب وہ ایک انسان تھا اور اس کا رنگ و روپ دنیا کے کسی بھی انسان سے زیادہ پرکشش اور دیکھنے لائق تھا حالانکہ جو سلمان مدرسے میں پڑھا کرتا تھا اس کی شکل وصورت تو یہی تھی جو اس وقت جن سلمان کی تھی مگر اس کی سیاہی مائل رنگت میں اس کی خوبصورتی چھپی رہتی تھی اور اب اس نے اس خوبصورتی کو پوری طرح عیاں کر دیا تھا۔

صنوبر اسکول کے اندر چلی گئی اور سلمان کریم نے گاڑی آگے بڑھا دی، اسے اپنی یونیورسٹی جانا تھا۔ سلمان کے لیے اب مشکل یہ تھی کہ اگر وہ صنوبر کے اسکول میں داخل بھی ہو جائے تو کیا اسے سارا وقت خود کو اسی طرح چھپا کے رکھنا ہوگا یا وہ خود کو صنوبر پر ظاہر کر دے۔

اس کا بے چین دل تو یہ چاہتا تھا کہ ابھی کے ابھی صنوبر پر خود کو ظاہر کر دے مگر اس کے دماغ کو جس نے اب سلمان کی حفاظت کرنا شروع کر دیا تھا یہ منظور نہ تھا اور اس نے سلمان سے کہا کہ ایسی غلطی نہ کرنا اگر صنوبر کو یا کسی کو بھی اس کی موجودگی کا پتا چلا تو وہ کسی بھی طرح خود کو نہ تو اس ادارے کا اسٹوڈنٹس ثابت کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے ہونے کی کوئی اور ایسی دلیل ہو سکتی ہے جو اسے گلوخلاصی کی وجہ بن سکتی ہو۔ اس لیے سلمان نے خود کو پوشیدہ اور مخفی رکھنا ہی بہتر سمجھا وہ سارا وقت اس کلاس میں رہا جہاں کوئی ٹیچر اسٹوڈنٹس کو تصویروں کے بارے میں نئی تھیوریاں سمجھا رہا تھا۔

ابن سلمان نے تو خود کو صنوبر کے قریب رکھنے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا اور اس وقت جو بات اس نے سوچنے تک کی زحمت نہیں کی تھی وہ یہ کہ اس کی اپنے مدرسے میں آج حاضری ضروری تھی۔ جتنے دن کی چھٹی لے کر وہ گیا تھا وہ دن کل پورے ہو چکے تھے اور اس وقت اسے مدرسے میں ہونا چاہیے تھا۔ اسے معلوم تھا مدرسے سے غیر حاضری کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ مدرسے کا نگراں بال کی کھال نکالتے ہوئے ایک ایک بات پوچھے گا اور اس بات کی تصدیق کے لیے اس کے ماں باپ یا اس کے گارجین سے بھی رابطہ کرے گا۔ کیسا ہی قابل اعتماد طالب علم کیوں نہ ہو، مدرسے سے چھٹی اتنی ہی کر سکتا تھا جتنی منظور کی گئی ہو۔ زیادہ چھٹی کرنے والا کوئی بھی طالب علم جھوٹ نہیں بول سکتا تھا کیونکہ جھوٹ بولنے کی صورت میں پکڑے جانا یقینی تھا اور پکڑے جانے کی صورت میں صرف ایک بار معافی دی جاتی تھی، دوسری بار مدرسے سے نام خارج کر دیا جاتا تھا۔

اور سلمان کو یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ اگر اس کا نام خارج ہو گیا تو اسے مدرسے میں نکالے جانے کی صورت میں انسانوں کی دنیا سے بھی واپس جانا ہوگا۔ پتا نہیں کتنی دیر تک وہ صنوبر کی محبت میں یہ سب سے اہم بات بھولا رہا لیکن جیسے ہی اسے یہ بات یاد آئی اس نے فوری طور پر وہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کیا اور دل میں سوچا کہ رات کو واپس آ جاؤں گا تاکہ مدرسے سے بھی نام خارج نہ ہو اور صنوبر کے حسن کے دربار کی بھی غیر حاضری نہ ہو۔ بہت زیادہ خود کو مجبور پاتے ہوئے سلمان نے وہاں سے واپسی کا قصد کیا اور واپس جاتے ہوئے اس نے آخری بار صنوبر کی طرف دیکھا وہ جدید انداز کی اس کرسی پر بیٹھی ہوئی کافی بے آرام لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے سوگواریت جھلک رہی تھی۔ آخر اسے کیا غم ہے۔ وہ کیوں اتنی پریشان ہے۔ رات بھی اس نے اسی پریشانی میں گزاری تھی۔ وہ نہ ہوتا تو وہ جانے کب تک بالکونی میں بیٹھی رہتی اور اپنی الجھن سے الجھتی رہتی اس کی موجودگی اور

اس کا زبان سے اس کے پیروں کو چاٹنے سے جو نشہ پیدا ہوا تھا اس کی وجہ سے وہ اپنا غم بھول گئی اور اس نے سونے کا فیصلہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ اس کے کمرے میں نہ جاتا تو صنوبر شاید رات بھر نہ سو سکتی اور جانے کب تک کروٹیں لیتی رہتی لیکن اس کی موجودگی اور اس نشے نے صنوبر سے وہ سب کچھ کروا دیا جو وہ اس کے نہ ہونے پر بھی نہ کرتی یوں سمجھیے اس وقت اس بلے کی موجودگی صنوبر کیلیے ایسی شراب ثابت ہوئی تھی جس نے وقتی طور پر اس کے غم کو فراموش کرا دیا تھا اور کسی حد تک وہ صبح بھی اپنے اسی غم کی گرفت میں تھی لیکن جیسے ہی اسے بلے کی موجودگی کا خیال آیا تو وہ پھر سے اپنا دکھ بھول گئی تھی مگر یہ سب وقتی تھا۔ اب وہ پھر اسی کیفیت میں گرفتار ہو چکی تھی بلکہ پہلے سے زیادہ غمگین اور اداس نظر آتی تھی، ورنہ ایسی اداسی تو اس کے چہرے پر رات کو بھی نہیں دکھائی دی تھی جیسی اس وقت طاری تھی۔

سلمان کو یہ بات فوراً سمجھ میں آ گئی کہ ہونا ہو اس اداسی کا تعلق یہیں، اسی اسکول سے ہے اور صنوبر کو اداس کرنے اور پریشان کرنے والا یہیں کہیں موجود ہے۔ مگر کیا ضروری ہے اس کے غم کی وجہ کوئی انسان ہی ہو؟ سلمان نے سوچا اور پھر یکا یک اسے خیال آیا کہ اگر وہ اسی طرح سوچوں کی لہروں پر بہتا رہا تو اس کا مدرسے جانا محال ہو جائے گا۔ اس نے کسی طرح اپنے دل پر پتھر رکھا اور وہ مدرسے کی طرف چل دیا۔ رہ رہ کر اسے یہ خیال آتا رہا کہ اگر صنوبر کی اداسی کی وجہ اس اسکول میں ہے تو وہ اس وجہ کو شاید کل بھی نہ جان سکے اور اس طرح اس کا دل مچلتا اور پریشان ہوتا رہے گا کیونکہ جن اوقات میں صنوبر اپنے آرٹ اسکول آتی تھی انہی اوقات میں وہ بھی اپنے مدرسے میں بہت زیادہ پڑھائی میں مصروف ہوتا تھا۔ سہ پہر چار بجے کے بعد جب اسے فرصت ملتی تھی تو اس وقت یقیناً صنوبر بھی اپنے گھر جا چکی ہوتی ہو گی۔ اس سے زیادہ دیر تک نہ کوئی اسکول کھلا رہتا تھا اور نہ ہی تعلیم دینے والا کوئی بھی اور ادارہ۔ تو کیا وہ صنوبر کی پریشانی کے بارے میں کبھی نہیں جان سکے گا۔ اس سوال نے اس کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے۔

اس کی سمجھ نہیں آیا کہ کیا کرے مدرسے جائے یا نہ جائے۔ نہ جانے کی صورت میں اسے مدرسے سے نکال دیا جائے گا اور اگر ایسا ہوا تو اس کے لیے انسانوں کی دنیا میں رہنا دشوار ہو گا۔ اس کا باپ جس نے اسے قبیلے کے سردار کی ناراضگی مول لے کر انسانوں کے ساتھ پڑھنے کی اجازت اور آزادی تھی، وہ اس سے واپس لے لی جائے گی۔ اس لیے اس نے پھر سے خود سے بات کی اور یہ فیصلہ کیا کہ اسے فی الحال اسے مدرسے چلا جانا چاہیے اور صنوبر کی پریشانی کو بعد میں کسی اور طرح جاننے کی کوشش کرنی چاہیے، ہر چند کہ عشق کرنے والے جس طرح سوچتے ہیں اس میں وہ ایسے سب معاملے فراموش کر جاتے ہیں جہاں سے دنیا والے ان پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہیں، سو سلمان کو بھی یہ یاد نہیں رہا کہ اس نے بلا بن کر جو وقت صنوبر کے ساتھ یا اس کے گھر میں گزارا تھا اس کے بعد وہ جس طرح وہاں سے غائب ہوا تھا۔ اس بات نے اب اس کے لیے اس گھر میں دوبارہ جانا کتنے سوالوں کو جنم دینے والا تھا اور اس کے نتیجے میں اس کے راستے میں کتنی مشکلات آنے والی تھیں۔ اس نے اس بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا اور وہ دل پر پتھر رکھ کر مدرسے چلا گیا۔

............☆☆............

مدرس سے پہلے اسے نگراں کا سامنا کرنا پڑا۔ کلاس کا ٹائم پہلے ہی لیٹ ہو چکا تھا اوپر سے یہ نگراں... ویسے بھی سب ہی لڑکوں کو یہ سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ چھٹیوں سے واپس آنے کے بعد پہلے نگراں کے پاس اپنی حاضری لگوائیں گے تاکہ ان کی موجودگی کے مطابق ان کے رہنے اور کھانے پینے کا بندوبست کیا جا سکے ہوسٹل اور مدرسے کا انتظامی ادارہ ایک ہی تھا اس لیے نگراں بھی ایک ہی تھا البتہ اس کے ساتھ بہت سا عملہ اس کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے پر مامور تھا اور اس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ نگراں کے ادارے میں پہنچ کر اس نے اپنے آنے کی اطلاع دی تو نگران کے مقرر کردہ آدمی نے رجسٹر دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم تو کل آنے والے تھے؟''

''جی وہ بس ایک دن زیادہ ہو گیا جس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں۔'' سلمان نے لجاجت سے کہا تو مقرر آدمی نے جس کا نام کامل تھا قدرے درشتی سے کہا۔

''یہاں اس طرح معافی نہیں ملتی، تمہیں اگلی بار جب تم گھر جاؤ گے تو اپنے والد سے اس چھٹی کی درخواست لکھوا کر لانی ہوگی۔'' کامل نے کہا تو سلمان کو اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اس کی بات پر صاد کرے اور اپنی حاضری لگا کر وہاں سے جلد سے جلد کلاس میں پہنچ جائے۔

مدرس نے اسے کلاس میں داخل ہونے کی اجازت تو دے دی مگر آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے گھور کے دیکھا کہ وہ آج پہلی بار اتنی تاخیر سے کیوں آیا۔ اس کا سیدھا مطلب یہ تھا کہ اسے کلاس ختم ہونے کے بعد رکنا ہے اور مدرس کے سوالوں کا جواب بھی دینا ہے۔

''کیا بات ہے آج تم تاخیر سے آئے ہو اور کل غیر حاضر تھے کیوں؟'' مدرس نے کلاس ختم ہونے کے بعد اس سے پوچھا۔ پہلے تو وہ گڑبڑا گیا کیونکہ اسے مدرس کی اندر تک جھانکنے والی صلاحیتوں کا علم تھا کہ ان کے سامنے جھوٹ بولنا مہنگا پڑ سکتا ہے وہ اکثر لڑکوں کا بولا ہوا جھوٹ موقع پر ہی پکڑ لیا کرتے تھے اور پھر جھوٹ بولنے والے لڑکے کو زبردست شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا اس کے علاوہ مدرس کا موڈ خراب ہوتا تو وہ اسے سزا بھی دیا کرتا تھا... لیکن سلمان کی تاخیر اور غیر حاضری کی جو وجہ تھی وہ چاہتا بھی تو یہ بات مدرس کو نہیں بتا سکتا تھا۔ ایک بات جس کے بارے میں خود سلمان کو بھی اب تک نہیں معلوم تھا کہ ایک دن پہلے وہ مدرسے کا راستا کیوں اور کیسے بھول گیا تھا اور آج اسے وہ راستا کیسے ملا اور کیوں ملا۔

سلمان نے مدرس کی طرف ایک نظر دیکھا اور کہا ''میری ماں چاہتی تھیں کہ میں ایک دن اور ان کے پاس رک جاؤں اس لیے تاخیر اور غیر حاضری ہوئی استاد جی'' مدرس نے ایک نظر میں اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کا اندازہ لگایا اور اسے جانے کو کہا۔

''ابھی سفر سے تھکے ہوئے ہو اس لیے فی الحال جاؤ بعد میں بات کریں گے۔'' اس کا مطلب تھا مدرس نے اسے چھوڑ کے بھی نہ چھوڑا تھا اور اسے ابھی مدرس کی نظروں اور سوالوں کا ابھی اور سامنا کرنا تھا۔ سلمان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سچویشن میں پھنسنے کے بعد وہ کیسے اپنے عشق اور اپنے دل کی رکھوالی کر سکتا ہے۔ اس کا دل اب بھی بے طرح تڑپ رہا تھا۔ اسے صنوبر کی یاد آ رہی تھی اور اس سے بھی زیادہ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان تھا کہ آخر صنوبر کے سوگوار حسن کے پیچھے کیا راز ہے۔ وہ اتنی اداس کیوں ہے۔ وہ کس کے لیے راتوں کو جاگتی ہے۔ اس کا مسئلہ ہے کیا۔ اسے یقین تھا کہ ہو نہ ہو صنوبر کو جو روگ لگا ہوا ہے اس کی جائے پیدائش اس کا اسکول ہے کیونکہ اسکول پہنچ کر وہ رات والی کیفیت سے بھی زیادہ ملول دکھائی دیتی تھی۔

سارا وقت وہ اسی کسی قسم کی ادھیڑ بن میں مصروف رہا پھر جیسے تیسے رات ہوگئی اور اب اسے یہاں سے نکل کر صنوبر کے پاس پہنچنے کی بے چینی نے اور زیادہ شدت سے پکڑ لیا اور وہ اپنے روم میٹ عمران کے سوالوں سے جان چھڑانے اور اس کے جلدی سے جلدی سونے کا انتظار کرنے لگا اسی لیے وہ اس کے ہر سوال کا جواب بس ہوں ہاں کر کے دے رہا تھا۔

''تم اس بار ایک دن زیادہ رہے اپنے گھر۔ کیا وجہ رہی، ورنہ تم تو کبھی ملی ہوئی اجازت سے زیادہ چھٹیاں نہیں کرتے؟'' عمران نے پوچھا۔

''اس سوال کا جواب اب تک میں دو لوگوں کو دے چکا ہوں۔ ایک مدرس کو اور دوسرے نگراں کو۔ اب تم سو جاؤ کل بات کریں گے۔'' سلمان کے لہجے کی الجھن کو عمران نے بھانپ لیا اور وہ اس کے باوجود چپ نہ ہوا۔ شاید انسانی فطرت یہی ہے کہ جب اس کے علم میں کوئی ادھوری بات آ جاتی ہے تو اس کا تجسس پوری بات جاننے کو بے تاب ہو جاتا ہے۔ سلمان کا یہ کہنا کہ کل بات کریں گے عمران کے تجسس کو ہوا دینے کے لیے کافی تھا۔ اس لیے وہ پھر بولا۔

''لگتا ہے تم کچھ پریشان ہو؟''

''ہاں پریشان تو ہوں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں اور تم مجھے سونے نہیں دے رہے۔ کیا ہم کل بات نہیں کر سکتے۔'' سلمان نے جیسے اسے اخلاقیات کا دامن نہ چھوڑتے ہوئے چپ

ہوجانے کی تلقین کی اور اس بار عمران خاموش ہوگیا۔
سلمان اس کے سامنے سوتا ہوا بن گیا اور عمران یہ کہہ کر آنکھیں بند کر کے لیٹ رہا کہ ''اچھا چلو تم آرام کرو کل بات کریں گے۔'' سلمان تو اس بات پر بھی حیران تھا کہ مدرس نے اسے اپنے حجرے میں نہیں بلوایا تھا ورنہ مدرس کا معمول تھا کہ وہ بلاوجہ بھی سلمان سے کہہ دیا کرتے تھے کہ رات کو آنا پھر بات کریں گے۔ اس کی زیادہ بڑی وجہ تو سلمان کا شوقِ علم تھا اور یہ بات مدرس اچھی طرح جانتا تھا کہ باقی لڑکوں کے مقابلے میں سلمان ایک الگ قسم کا طالب علم تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ علمی مسائل اور سماجی رابطوں کو جاننے کا اشتیاق تھا۔ خود سلمان اکثر مدرس کے پاس چلا جایا کرتا تھا اور ان سے ان کے دن میں آنے والے ایسے لوگوں کی روداد ذوق وشوق سے سنا کرتا تھا جن کے مسائل مدرس اپنے علمی اور عمل سے حل کیا کرتے تھے۔ ضرور آج مدرس زیادہ الجھے ہوئے اور زیادہ تھکے ہوئے تھے، اس لیے انھوں نے اس کے باوجود سلمان کو نہیں بلوایا کہ آج تو وہ خود سلمان سے یہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ غیر حاضر کیوں تھا اور کلاس میں دیر سے کیوں آیا تھا۔
سلمان نے ایک طرح اس کے لیے خدا کا شکر ادا کیا تھا کیونکہ وہ جلد از جلد یہاں چلے جانا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے دیکھا کہ عمران سو چکا ہے اور اب اسے یہاں سے نکلنا تھا اور جلد سے جلد صنوبر کے پاس پہنچنا تھا۔ اس نے آہستگی سے چہرے سے چادر ہٹا کر عمران کی طرف دیکھا وہ بے خبر سو چکا تھا۔ سلمان دبے پاؤں اٹھا اور کمرے سے اس طرح نکلا کہ دروازہ اندر سے ہی بند تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی اپنی اس صلاحیت کو استعمال نہیں کیا تھا کیونکہ ذراسی بھی چوک سے اس کے پکڑے جانے اور یہ راز کھلنے کا ڈر رہتا تھا کہ کسی کو پتا نہ چل جائے کہ وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے اور اسی لیے اس نے نہ صرف اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا بلکہ اپنے والد سے کیے ہوئے وعدے سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر خود کو انسانوں کی دائرہ قدرت سے باہر جانے پر روکے رکھا۔ جو کام مدرسے کا کوئی بھی طالب علم نہیں کر سکتا تھا، وہ کام سلمان نے بھی اس کے باوجود کبھی نہیں کیا تھا کہ وہ ایسا کر سکنے کی صلاحیت اور قدرت رکھتا تھا مگر آج وہ مدرسے بھی اس طرح نکلا کے خود صدر دروازے کو بھی اس کے جانے کی خبر نہیں ہوئی۔
جیسے ہی وہ صنوبر کے گھر کے سامنے پہنچا تو حسب توقع صنوبر اسی بالکونی میں اسی طرح آنکھیں موندے آرام دہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا حسن آج کل سے بھی زیادہ کول اور فرشتوں جیسی ملاحت اور نرمی سے معمور تھا لیکن آج وہ کل کے مقابلے میں زیادہ شانت نظر آتی تھی۔ جیسے دکھ سہہ سہہ کر کوئی دکھ کو بھی اپنی زندگی اور اپنے وجود کا حصہ ماننا شروع کر دے۔
سلمان نے اسی طرح بلا بن کر اس کی بالکونی کی دیوار سے چڑھ کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔ رات کی تاریکی اور دور دور تک پھیلی ہوئی ویرانی میں تو وہ بلے کے بجائے شیر کا روپ بھی دھار لیتا تو بھی کسی کو پتا نہ چلتا یوں بھی یہ علاقہ امیروں کا تھا اور یہاں غریبوں کے علاقوں کی طرح کی چہل پہل اور رونق نہیں رہتی دن میں بھی سارا علاقہ سائیں سائیں کرتا رہتا ہے یہ تو پھر رات کا وقت تھا... صنوبر کو اس کی موجودگی کا اندازہ نہیں ہوا تھا وہ اسی طرح ساکت وجامد بیٹھی رہی بلا دھیرے دھیرے آگے بڑھا اور اس نے صنوبر کے پیروں سے اپنی چہرہ مس کیا صنوبر ایک دم سے چونکی اور اسے دیکھ کر جیسے حیران رہ گئی۔
''ارے تم....تم کہاں تھے؟'' بلے کا دل چاہا اسے جواب دے مگر اس وقت وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ ایک ہلکی سی سیاؤں کر کے چپ ہو رہا۔ اور پھر باقی کا سارا منظر کل رات جیسے منظر جیسا ہی تھا لیکن اس وقت بلے کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں رہی جب صنوبر کی ماں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔
''یہ بلا نہیں کوئی جن یا بھوت ہے؟؟؟''
سلمان کی ٹانگیں کانپیں اور اسے لگا اس کی چوری پکڑی گئی ہے اور اب اس کی حقیقت کا پردہ چاک ہو جائے گا اور وہ صنوبر کے ساتھ نہیں رہ سکے گا!!!

(اسرار بھری دنیا کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے)

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت سامان
دل سوز تحریریں، جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی

کوئی ملال نہیں



جاوید راہی

پیشہ ور نوسر بازوں کی فتنہ گری سے آراستہ وہ جرم کہانی
جسے پڑھ کر آپ بھی دوسروں سے ہوشیار ہو جائیں گے

ایک شور مچا ہوا تھا پورے صدر بازار میں کئی دوکاندار اُن تینوں کو مار پیٹ رہے تھے۔ میرے قدم اُن کی مار پیٹ پر رُک گئے۔ وہ دونوں ہم عمر اور خاصی پرکشش پرسنیلٹی کی مالک تھیں اور ہاتھ میں بڑے بڑے شاپر اُٹھائے کھڑی عورت جوان کی نوکرانی لگ رہی تھی۔ یہ ساری کاروائی دیکھنے کے بعد پتا چلا کہ وہ تینوں چور تھیں۔ بڑے بڑے شاپروں میں قیمتی سوٹ، جرسیاں، بچوں کے ملبوسات، جوتیاں، جیولری وغیرہ بھری ہوئی تھیں۔

میں نے مداخلت کرتے ان کو لوگوں سے چھڑایا اور قریبی جیولر کی شاپ میں ان کو پناہ دلوائی۔ ابھی پچھلا کام ختم نہیں ہوا تھا اور دوکاندار اپنا اپنا مال اکٹھا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اسی اثناء میں اُس جیولر نے جس کی دوکان میں ان تینوں کو لوگوں سے بچا کر پناہ دلوائی تھی اس نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا کہ ان میں سے ایک لڑکی نے پچھلے سال میری شاپ سے ایک سیٹ چرایا تھا۔ یہ لڑکی اور ایک اس کی ساتھی اپنے ہمراہ ایک آدمی کو لے کر زیور خریدنے آئی تھی انہوں نے کئی ڈیزائن کے سیٹ نکلوائے تھے اور جب یہ دوکان سے صرف ایک انگوٹھی خرید کر چلے گئے تو ہمیں علم ہوا سیٹ کی چوری کا۔ اُس سیٹ کی مالیت سوا دو لاکھ تھی۔ کیمرے میں اس کی فوٹیج بھی ریکارڈ ہے۔''

''ٹھیک ہے اگر اس کی فلم بنی ہوئی ہے، تو اس سے چوری برآمد کرواتے ہیں۔''

اے ڈویژن کے انسپکٹر ملک طارق اعوان کو اُسی وقت فون کیا گیا۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد پولیس وین میں ملازموں کے ساتھ آ گئے۔ جو روزمرہ کی گشت پر کہیں قریب ہی تھے۔

اور پھر ان تینوں کو پولیس وین میں بیٹھا کر وہ تھانہ اے ڈویژن لے گئے۔ کرامت جیولرز کا مالک کرامت علی اس بات پر بضد تھا کہ اس کی شاپ پر سے سونے کا سوا دو لاکھ والا سیٹ اس لڑکی نے ہی چرایا تھا۔

شام کو میں تھانہ اے ڈویژن کے انسپکٹر ملک طارق اعوان صاحب کو ملا، جس نے مجھے ان تینوں سے ملنے کی اجازت دے دی جن کو انہوں نے محرر کے پچھلے کمرے میں بٹھایا ہوا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبل نے باہر لگی کنڈی ہٹاتے مجھے کمرے میں بیٹھی ان تینوں وارداتی خواتین کے پاس بھیج دیا۔ وہ تینوں بے فکری سے چارپائی پر بیٹھی کسی بات پر بحث کر رہی تھیں مجھ پر نظر پڑتے وہ خاموش ہو گئیں۔

میں نے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھتے، ان کو اپنی طرف متوجہ کرتے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو ان کی



ساتھی جو دونوں میں ذرا تیز تھی بولی۔

''دیکھیں آپ نے وہاں ہماری مدد کی۔ ہم آپ کی شکرگزار ہیں۔ مگر وہ جیولر خوامخواہ اپنا رٹا ڈال کر بیٹھ گیا ہے۔ چھوٹی موٹی چیزیں چرانا ہمارا پیشہ ہے مگر اتنی بڑی واردات کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔''

''مگر وہ تو آپ کی فوج کی بات کر رہا ہے۔'' میں نے دوسری لڑکی کو مخاطب کرتے کہا۔

''ایک بار انگوٹھی ضرور خریدی تھی اس کی دوکان سے، مگر مجھے کیا معلوم کہ اس نے اپنی دوکان میں کیمرہ لگا رکھا ہے۔'' اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''کون تھی تمہارے ساتھ۔'' پہلی والی نے اُس سے پوچھا۔

''نسرین اور اس کا میاں تھا۔'' یہ بتا کر وہ خاموش ہوگئی۔

''جی آپ کا نام؟'' میں نے اس تیز طرار لڑکی سے پوچھا۔

''حلیمہ!'' اس نے مختصر جواب میں اپنا نام بتایا۔

''اور ان کا؟''

''ناہید اور یہ ہماری ملازمہ رشیدہ ہے۔''

''یہ رشیدہ بھی آپ کے ساتھ یہی دھندا کرتی ہے۔''

''نہیں اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ کسی جگہ ہم اس کو بٹھا کر خود دوکانوں پر نکل جاتی ہیں، جب دو چار چیزیں قابو ہوئیں اس کے سپرد کر کے ہم پھر چل پڑتی ہیں۔'' حلیمہ نے واردات کرنے کے بارے میں مجھے بتایا۔

''آپ یہ سب کچھ کب سے کر رہی ہیں؟''

چند منٹ خاموشی رہی پھر وہ ناہید کی طرف دیکھتے بولی۔

''آپ یہ جان کر کیا کریں گے یہ

بہت اُلجھا ہوا معاملہ ہے۔ اگر میں سب سنانے بیٹھ گئی تو آپ سن نہیں سکیں گے۔'' حلیمہ کا لہجہ یکدم اُداسی میں تبدیل ہو گیا۔

''نہیں میں نے آپ کی مدد کے حوالے سے بات کی تھی۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

''آپ بیٹھیں تو سہی۔'' میں دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہم پیشہ ور لوگ ہیں۔ ہمارے گھروں میں عورتوں سے دو کام ہی لیے جاتے ہیں یا تو ان سے دھندا کروایا جاتا ہے یا پھر ہیرا پھیری، چوری چکاری۔ ہمارے مرد بہو بیٹیوں کی کمائی پر عیش کرتے ہیں۔ ہم پڑھنے دیتے ہیں۔ ہم اگر کوئی کالج تک پہنچ بھی جاتی ہیں تو اُسے مرد پھانسنے کی بھی تربیت دی جاتی ہے۔ میں میٹرک تک ہی پڑھی ہوں۔ ناہید نے ابھی فسٹ ائیر کے ہی پیپر دیئے ہیں۔'' اس نے ناہید کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہم دونوں آپس میں کزن ہیں۔ ہمارے گھروں کی سرپرستی بڑے بڑے وڈیرے کرتے ہیں، جن کے ساتھ ہماری راتیں بسر ہوتی ہیں۔ ہم نے اپنے گھر والوں کو اطلاع کر دی ہے۔ شام تک ہم ہر حالت میں اپنے گھر پہنچ جائیں گی۔'' یہ بتا کر وہ رُک گئی۔

حلیمہ کے منہ سے نکلی باتوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اُس کی باتوں کی کم از کم تصدیق تو کروں۔ میں نے حلیمہ سے اُس کا نمبر لیا اور اُٹھ کر باہر آ گیا۔

ملک طارق اعوان اپنے آفس میں دو فریقین کی لڑائی کی روداد سن رہے تھے۔ رش لگا ہوا تھا ان کے آفس میں اس لیے میں اجازت لے کر تھانے سے باہر آ گیا۔

دوسرے دن تھانے فون کرنے پر پتا چلا کہ کرامت علی کی ان لڑکیوں کے ورثا سے کوئی بات ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی رپورٹ غلط ہی میں ڈال دی۔ دوسرا کوئی بھی ان کے بارے میں شکایت یا چوری کی درخواست والا سامنے نہ آیا اس لیے پولیس کو انہیں فارغ کرنا پڑا۔''

میں روزمرہ کے کاموں میں اُلجھ گیا۔

☆☆

ایک دن حلیمہ کی طرف سے مجھے کال موصول ہوئی اور خیر خیریت کے بعد اس کی زبانی معلوم ہوا کہ کرامت علی نے ناحق دو لاکھ روپے ہم سے وصول کیے اور اوپر والے خرچے الگ برداشت کرنے پڑے تھے۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتوں سے بعد پتا چلا کہ ناہید دوبئی گئی ہے۔ کسی پروموٹر کے ساتھ۔ وہاں مہینہ بھر رہے گی۔''

''اُس کے ساتھ کوئی بھائی وغیرہ گیا ہے کیا؟'' میرے سوال پر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں۔ میں نے آپ کو اُس دن تھانے میں بتایا تھا کہ ہمارے گھر والے ہم سے دھندا اور چوری چکاری کرواتے ہیں۔ اس لیے ہم ہر جگہ اکیلے ہی آتی جاتی ہیں، چاہے وہ اس ملک میں ہو یا دوسرے ملک میں۔''

''حلیمہ میں تم سے مل سکتا ہوں کیا؟''

''ہاں کیوں نہیں! جب چاہو ہمارے گھر تاندالہ آ جاؤ۔'' اُس کی آواز میں شوخی کا عنصر غالب تھا۔

''ٹھیک ہے میں ایک دو روز بعد تمہیں فون کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی کال کاٹ دی۔ یہ بات میں نے اُس سے یوں ہی کہہ دی تھی۔ ورنہ ایسی فضولیات کا وقت کہاں تھا میرے پاس جبکہ اس نے کھلے لفظوں میں یہ بتا دیا تھا مجھے کہ ہم پیشہ ور لوگ ہیں۔ بات آئی گئی ہوئے کئی ماہ ہو گئے تھے۔

☆☆

مجھے ایک قیدی کو ملنے فیصل آباد جانا پڑا۔ سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں بیٹھے سامنے والی کھڑکی سے باہر دیگر عورتوں کے ساتھ میری نظر حلیمہ پر پڑی جو دیوار کے سائے میں بیٹھی درس قرآن لے رہی تھی۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے حلیمہ کی بابت پوچھا۔

انہوں نے اس طرف دیکھتے مجھے بتایا کہ وہ دو ماہ پہلے قتل کے کیس میں اپنے بھائی اور ماموں کے ساتھ جیل میں آئی ہے۔'' اتنا بتا کر وہ دوبارہ اپنے سامنے رکھی فائل کے کاغذات دیکھنے لگے۔ اسی درمیان میں زاہد جس کی ملاقات کے لیے میں یہاں آیا تھا وہ آ گیا۔ جسے میرے ہمراہ دوسرے کمرے میں بٹھانے کے لیے انہوں نے اپنے اردلی کو حکم دیا۔ وہ ہمیں لے کر ان کے آفس سے باہر آ گیا اور ایک کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے مجھے اور زاہد کو بٹھا کر خود باہر کرسی پر جا بیٹھا۔

جس کیس پر میں کام کر رہا تھا اس کی معلومات کے بارے میں کوئی گھنٹہ بھر میں اُس سے بات چیت کرتا رہا پھر دوبارہ اس سے فارغ ہو کر سپرینڈنٹ صاحب کے آفس میں باہر جانے کی اجازت کے لیے آ گیا۔

انہوں نے دوپہر کے کھانے کی پیشکش کی مگر میں نے معذرت کرتے حلیمہ کے کیس اور متعلقہ عدالت کا ان سے لکھوایا اور پھر کسی روز آنے کا وعدہ کیا اور کھانے کی دعوت کا بھی یہ کہہ کر کہ جب آؤں گا تو آپ کے جیل کچن کا کھانا ضرور کھاؤں گا۔''

میں یہاں بتاتا چلوں کہ چاروں صوبوں کی جیلوں میں آنے جانے اور جیل کچن کھانے کھاتے مجھے کئی سال ہو چکے ہیں۔ ہر جیل میں قیدیوں کے لیے کھانوں کا معیار انتہائی بہتر پایا ہے۔ باہر کے لوگوں کی افواہوں پر ہنسی آتی ہے۔ جیل قانون کے ضابطوں سے گزر کر میں جیل سے باہر آ گیا۔

تمام راستے میں حلیمہ کے بارے میں طرح طرح کے وسوسوں میں کھویا رہا کہ جس جیل کہانی پر میں کام کر رہا تھا اس سے فارغ ہو کر میں نے متعلقہ عدالت میں حلیمہ کی ملاقات کے لیے درخواست گزاری اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ درخواست میں میں نے جو موقف بیان کیا اس کے مطابق جو گفتگو میری حلیمہ اور ناہید سے تھانہ اے ڈویژن میں ہوئی تھی، اسی کو بیس بنا کر جیل کہانی کی وساطت سے معاشرتی اصلاح اور عوام انفارمیشن کو بنیاد بنایا تھا۔

میں اگر چاہتا تو سپرینڈنٹ جیل سے حلیمہ کی ملاقات مانگ سکتا تھا مگر میں نے اصولی اجازت کو ترجیح دی تھی۔ کئی دن کے انتظار کے بعد مجھے ملاقات کی اجازت کا لیٹر موصول ہو گیا۔

میں نے فون کر کے فیصل آباد جیل سپرینڈنٹ صاحب کو بتایا کہ مجھے حلیمہ سے ملاقات کی اجازت مل گئی ہے انہوں نے بھی جیل اوقات میں مجھے جب دل چاہے ملاقات کی اجازت دے دی۔

میرا بیٹا طارق جاوید زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں پی۔ایچ۔ڈی کر رہا تھا۔

............☆☆............

میں نے سوچا اس کو بھی ملتا آؤں گا اور حلیمہ سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔

ایک دن میں پروگرام بنا کر فیصل آباد پہنچ گیا۔ طارق صاحب کو یونیورسٹی ملا پھر اس سے فارغ ہو کر جیل چل پڑا۔

سپرینڈنٹ صاحب لاہور تھے آئی جی آفس ڈپٹی صاحب بڑی محبت سے پیش آئے اور لیٹر دیکھ کر حلیمہ کو ملاقات کے لیے بلا بھیجا۔ اس کے آنے تک میں چائے سے فارغ ہو چکا تھا۔ ملازم نے بتایا کہ حلیمہ 302 ڈیوڑھی میں آ چکی ہے۔ یہ بتاتے وہ ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے راہی صاحب آپ اس سے ملاقات کر لیں۔''

''جی بہت شکریہ۔'' یہ کہتے میں ان کے کمرے سے باہر آ گیا۔ ملازم کے ساتھ میں نے زنانہ حصہ کی طرف آتے جالی سے دوسری طرف کھڑی حلیمہ کو دیکھ لیا تھا جو بڑی حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ قریب آتے ہی میں نے اسے مخاطب کیا۔

''سنائیں حلیمہ آپ کیسی ہیں۔'' جواب میں وہ پھیکی سی مسکراہٹ میں بولی۔

ٹھیک ہوں۔ آپ کو کیسے پتا چلا میرا۔'' اس کا لہجہ تذبذب میں ڈوبا ہوا تھا۔

''بس اتفاق ہی جانیں۔ میں کچھ دن پہلے فیصل آباد جیل آیا تھا کسی کام کے سلسلہ میں۔ سپرینڈنٹ صاحب کے کمرے میں بیٹھے آپ پر نظر پڑ گئی۔ جب آپ درس قرآن لے رہی تھیں۔ پھر آپ کے بارے میں پتا چلا کہ آپ اپنے ماموں اور بھائی کے ہمراہ قتل کے جرم میں جیل آئی ہیں۔ مل تو میں آپ کو اُس وقت بھی سکتا تھا مگر میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا۔ بہر حال آپ سے ملاقات کا باقاعدہ آرڈر لیا ہے فاضل عدالت سے۔'' یہ بتاتے میں نے ملازم کی لائی چیئر کھینچ کر جالی کے قریب کر لی اور اسی اثناء میں حلیمہ بھی دوسری طرف پتھر کی بنی بینچ پر بیٹھ چکی تھی۔

''دیکھو حلیمہ میں کئی سال سے مختلف اخبارات کے لیے کہانیاں تحریر کر رہا ہوں، جس کا مطلب تشہیر نہیں بلکہ

ایسے افراد کی دل شکنی کرنا میرا مقصد ہے جو ایسے حالات سے گزر کر اپنی زندگیاں داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اب رہا سوال تمہیں ملنے کا تو میں یہی جاننا چاہتا ہوں کہ تم لوگوں نے قتل کیوں کیا۔ تمہاری ایف آئی آر میں نے دیکھی ہے جس میں پولیس انتظامیہ کے مطابق تم نے اپنے بھائی اور ماموں سے مل کر ایک لڑکے کو زہر دے کر قتل کر دیا۔'' گہری پریشانی کے بعد وہ گویا ہوئی۔

''جب ہم نے کرامت جیولرز والوں کو دو لاکھ کی ادائیگی کی اور اوپر بھی خرچ ہوا جو اِدھر اُدھر سے پکڑ کر ہم نے کھڑے پیر دیا۔ اس کی واپسی بھی ضروری تھی۔ ناہید کو ایک لاکھ کے عوض بھجوایا تھا، اس کے گھر والوں نے۔ وہ اس پر دموٹر کے ساتھ ہی سیٹ ہو گئی اور اس نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔ وہی ایڈوانس کے پچاس ہزار پلے پڑے تھے جو ناہید کو جانے سے پہلے ملے تھے۔ اب قرض کی رقم اتارنی تھی جس کے لیے ہاتھ مارنے کی ضرورت پیش آئی۔ میرا ماموں، بشیر بھائی نیاز اور میں روز تیار ہو کر نکل پڑتے مگر کسی جگہ کوئی بات بنتی نظر نہ آرہی تھی۔

میرا ماموں نوسر بازی اور ہیرا پھیری میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس نے حیدر آباد کے ایک بیوپاری جو فیصل آباد غلہ منڈی سے مکئی خرید کر حیدر آباد بھجواتا ہے۔ واقفی گانٹھ لی کیونکہ ماموں بشیر جیب تراشی کا بھی ماسٹر تھا اور اکثر سبزی منڈی، غلہ منڈی اور مویشی منڈی جہاں خرید وفروخت کرنے والوں کا رش ہوتا ہے، وہ پہنچ جاتا۔ مکئی کے ڈھیر پر بولی ہو رہی تھی کہ وہ بھی پہنچ گیا اور ایک دوبار اُس نے بولی دی۔ جیسے وہ بھی مکئی کا خریدار ہے۔ اسی دوران حیدر آباد کے بیوپاری علی اختر سے واقفیت ہو گئی یوں ہی اِدھر اُدھر ڈھیروں پر پھرتے علی اختر سے ماموں نے ہماری تاندالہ منڈی کی تعریف کر دی کہ وہاں مکئی خشک اور تھوڑے کم ریٹ پر مل جاتی ہے۔ اس کی باتوں میں آ کر علی اختر نے میرے ماموں کے ساتھ جانے کی حامی بھر لی۔ جس ہوٹل میں وہ ٹھہرا ہوا تھا، میرے ماموں کو کھانے کے لیے وہ ساتھ لے گیا۔ کافی دیر تک ماموں نے اُسے سبز باغ دکھائے پھر اجازت لے کر وہ واپس گھر آ گیا۔ جاتے ہوئے اپنا نمبر اور گھر کا ایڈریس علی اختر کو دیتا آیا تھا۔

واپس گھر آ کر ماموں بشیر نے مجھ سے علی اختر کو پھانسنے کی بات کی۔ میرے لیے یہ کون سا مشکل کام تھا۔ بطخ کا بچہ تو انڈے سے نکلتے ہی تیرنے کی مہارت رکھتا ہے۔ میں نے حامی بھرتے اسے کہا کہ ایک بار اُسے گھر تک لے آؤ، باقی مجھ پر چھوڑ دینا۔ دوسرے دن علی اختر کی کال آئی جو ہمارے پاس آنے کے لیے تیار تھا۔ ماموں نے کھانے کا سامان لا دیا۔ میں گھر والوں کے ساتھ صفائی وغیرہ اور کھانا بنانے میں لگ گئی کہ ماموں کی (محنت) آرہی ہے محنت ہم اس کو کہتے ہیں جس کو لوٹنا ہوتا ہے۔ دوپہر کو اس کی کال آئی کہ میں بس اسٹینڈ پر پہنچ گیا ہوں۔ میرا ماموں موٹر سائیکل پر اسے لینے چلا گیا تھوڑی دیر بعد اس کے ہمراہ ایک پینتیس چالیس سال کا آدمی ہمارے گھر آ گیا، جسے ماموں بیٹھک میں بٹھا کر اندر آیا اور چائے وغیرہ کے لیے کہا اور مجھے تیار ہو کر چائے لانے کا کہہ کر پھر بیٹھک میں واپس چلا گیا۔ میں خوب بن سنور کر چائے کے برتن اٹھائے دستک دیتی بیٹھک میں داخل ہوئی۔ بڑی نزاکت سے میں نے چائے کے برتن میز پر رکھتے بالوں کو جھٹکا دیتے پیچھے ہٹایا اور علی اختر کو سلام کرتے کپوں میں چائے ڈالنے لگی۔

''جی چینی۔'' میں نے براہِ راست علی اختر کی آنکھوں میں جھانکتے پوچھا۔

اس نے بھی برجستہ میری بات کے جواب میں کہا۔ ''ایک چمچ دوبار۔''

''جی!'' کہتے میں نے دو چمچ چینی ڈالتے کپ اس انداز میں اس کے ہاتھ میں دیا کہ میرے ہاتھ کا لمس وہ محسوس کر سکے۔

میرے ماموں نے علی اختر کو مخاطب کرتے بتایا میری بھانجی حلیمہ میرے سارے کاروبار کا حساب رکھتی ہے یعنی میری اکاؤنٹنٹ ہے۔ میں جانے لگی تو میرے ماموں نے مجھے مخاطب کرتے کہا کہ علی اختر صاحب بھی ہماری طرح مکئی کا کام کرتے ہیں۔ حیدر آباد میں ان کا کارخانہ ہے، جہاں بیسن، اور ونڈا بنتا ہے۔ یہ مختلف منڈیوں سے مکئی خرید کر حیدر آباد بھجواتے ہیں۔ میری

ان کی ملاقات فیصل آباد منڈی میں مال دیکھتے ہوئی تھی۔" ماموں بشیر اس طرح بات کر رہے تھے جیسے وہ سچ مچ کے بیوپاری تھے۔ "یہ رات ادھر ہمارے مہمان ہیں۔ کھانے کا بندوبست کریں ان کے لیے۔"

"جی ماموں۔" کہتے میں کمرے سے باہر نکل گئی۔ اندر آ کر میں نے اپنے بھائی نیاز سے کہا کہ اب تم بھی علی اختر کو مل آؤ مگر باہر سے آنا ٹھیک ہے۔" یہ کہتے وہ دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے انٹری ماری۔ بیٹھک میں آتے ہی اس نے سلام کیا۔ میں دروازے کے قریب آ گئی اور اس کی اداکاری کا جائزہ لینے لگی۔

"ماموں یار اوکاڑا کی منڈی تو بہت تیز ہے۔ بس پھیرا ہی پڑا ہے۔" اس نے یہ باور کروایا دونوں کو جیسے وہ مکئی کے لیے ہی غلہ منڈی اوکاڑا گیا ہوا تھا۔ ماموں نے علی اختر کو بتایا کہ یہ بھی میرے ساتھ ہی کام کرتا ہے اجناس کا۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہ تینوں ہماری مقامی غلہ منڈی جانے کے لیے گھر سے نکل گئے۔ شام کو جب واپس آئے تو مجھے پتا چلا دو ڈھیریاں علی اختر نے خرید کر لی تھیں اور رقم بینک کے تھرو ہو گئی آڑھتی کو جس نے مال حیدر آباد اپنی نگرانی میں بھجوایا تھا۔ فیصل آباد منڈی سے ہماری منڈی نرم تھی جس پر علی اختر میرے ماموں کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ تاندالہ نہ آنے پر پشیمان ہے۔

باری باری ماموں نے سارے گھر والوں کا تعارف کروایا۔ علی اختر سے رات کے کھانے کے بعد چائے ہم نے اکٹھے پی۔ اس دوران میں نے علی اختر کو کافی حد تک قابو کر لیا تھا۔ ایک دو بار میں نے اُسے یہ احساس دلا دیا کہ میں اُس میں دلچسپی لے رہی تھی۔ اس نے بھی مسکرا کر میری دلچسپی کو قبول کرنے کا کاشن دے دیا مجھے۔

اس کا بستر بیٹھک میں ہی لگا دیا گیا تھا۔ رات گئے تک بھائی اور ماموں اُسے شیشے میں اُتارتے رہے پھر سونے کے لیے اُسے تنہا چھوڑ کر اندر آ گئے۔ ماموں مجھے پیار سے حمیا کہتے تھے۔

رائٹر لوگ

جو رائٹر لوگ ہوتے ہیں بڑے حساس ہوتے ہیں
بہت ذہین ہوتے ہیں، رمز شناس ہوتے ہیں
بھولے بھالے ہوتے ہیں مگر دل والے ہوتے ہیں
بے بصیرت لوگوں میں آنکھوں والے ہوتے ہیں
بڑے مظلوم ہوتے ہیں اور مغموم ہوتے ہیں
خیام کی رباعی کا صد مفہوم ہوتے ہیں
کسی کو گھائل کرتے ہیں کسی پہ گھائل ہوتے ہیں
عشق کے معاملے میں یہ ہمیشہ سائل ہوتے ہیں
محبت میں محب کو اپنی اُنگلی پہ نچاتے ہیں
کبھی فریب دیتے ہیں، کبھی فریب کھاتے ہیں
شعر و شاعری کرتے ہیں، غزلیں گنگناتے ہیں
افسانے کی اوڑھ کے چادر روٹھے یار مناتے ہیں
جنونِ عشق میں یہ لوگ بے مثال ہوتے ہیں
دل کے معاملے میں جی آ مالا مال ہوتے ہیں

عبدالعزیز جی آ۔ چکوال

"لو حمیا بیٹا اب تم سنبھالو اسے۔"

"ٹھیک ہے ماموں فکر نہ کرو۔" یہ کہتے میں اپنے اوپر والے کمرے میں چلی گئی سونے کے لیے۔

میں اکثر رات کو ٹراؤزر اور ہاف بازو والی شرٹ پہن کر سوتی تھی، وہ میں نے پہنی اور نیچے آ کر دودھ کا گلاس تیار کیا اور بیٹھک کے دروازے پر دستک دی۔ علی اختر نے دروازہ کھولا اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ میرے جسم کے تمام خطوط اس کے سامنے کھلے پڑے تھے۔ اور وہ بے باکی سے ان کو پڑھنے میں محو تھا۔ میری آواز پر وہ بری طرح چونکا۔

"جی آپ کے لیے دودھ۔" یہ کہتے میں نے گلاس گرتے گرتے سنبھالا۔

"آئیں بیٹھیں۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔ میں بیٹھک میں آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے دودھ کے دو گھونٹ بھرے اور خالص ہونے کی تصدیق کر دی۔

"علی جی آپ کو یہاں ہر چیز حتیٰ کہ محبت بھی

خالص ملے گی۔''

''آپ تو شرماتے بھی ہیں؟''

''جی ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس آپ کی باتیں بہت پیاری ہیں۔'' اس نے حوصلہ پکڑتے میری تعریف کر دی۔

''آپ بھی تو پیارے ہیں۔'' اس بار میں نے اُٹھنے کی ایکٹنگ کی۔

''گھر والے تو مائنڈ نہیں کریں گے آپ کو یوں میرے پاس بیٹھے دیکھ کر۔''

''میرے گھر والے بڑے کھلے دل کے مالک ہیں۔ اگر میں آپ کے بستر پر بھی لیٹ گئی تو کوئی اس کا برا نہیں منائے گا۔'' یہ بتاتے میں اس کے قریب جا بیٹھی۔ وہ اچانک حملہ کے لیے تیار نہیں تھا فوراً گڑ بڑا گیا۔ اس کی حالت سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اب اور برداشت نہیں کر پائے گا۔ میں اُسے اور تڑپانا چاہتی تھی، اس لیے میں جاتے جاتے اسے اپنا دروازہ کھلا رکھنے کا کہتے اُٹھی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

کوئی آدھا گھنٹہ میں نے جان بوجھ کر ٹالا اور پھر نیچے اُتر کر بیٹھک کی طرف آ گئی۔ بتی بند تھی مگر دروازہ ادھ کھلا تھا، جسے میں نے آہستگی سے اندر کی طرف کرتے آہستہ سے اُسے آواز دی۔

''علی سو گئے کیا؟''

وہ بستر پر بیٹھا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

''کس کم بخت کو نیند اور ہوش ہے۔'' یہ کہتے وہ تیزی سے میری طرف آیا اور مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ دیوانہ وار مجھ کو جکڑے ہوئے تھا۔ میرے لیے یہ سب کچھ نئی بات نہیں تھی۔ یہ ڈرامہ میں متعدد بار دہرا چکی تھی۔ دروازہ تو لگا لو کوئی گھر والا نہ ادھر آ جائے۔ میں نے اُسے ڈرانے کے لیے ہوا میں تیر اُچھالا۔

''او سوری!'' کہتے اُس نے بڑھ کر بیٹھک کی کنڈی اندر سے چڑھائی۔ میں نے مکمل اس پر قابو پا لیا تھا۔ صبح فجر سے پہلے میں اُسے سینکڑوں فریب دیتی اُٹھ کر بیٹھک سے نکل کر اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔ دن چڑھنے تک میں اوپر اور وہ نیچے بیٹھک میں پڑا سوتا رہا۔ میری والدہ نے ڈرتے ڈرتے مجھے جگایا۔ کیونکہ گھر میں ہر کسی کو میرا احترام کرنا پڑتا تھا کیونکہ میں سب کے لیے کمائی کا واحد ذریعہ تھی اب۔

میں نے اُٹھ کر خود کو بنا سنوار کر ناشتے کا بندوبست کیا۔ دوسری طرف ماموں اور میرا بھائی علی اختر کے پاس بیٹھا اُسے گانٹھ لینے میں لگا ہوا تھا۔ ناشتے کے لیے میں نے نیاز کو آواز دی۔ جس نے اندر آتے ہی خوشخبری سنائی کہ وہ ہم سے مل کر مکئی کا کاروبار کرنا چاہتا ہے۔ ہم خریداری کریں گے اور آڑھتیوں کو ادائیگی بذریعہ بینک ہوا کرے گی۔

''اگر بینک کے تھرو پیمنٹ ہو گی تو ہمیں کیا فائدہ۔'' میں نے ناشتے کی ٹرے اُسے پکڑاتے حیرت سے پوچھا۔

''ہمیں وہ ٹھہرا بیوپاری بڑا چالاک ہے۔ اُسے ابھی تک ہم پر مکمل اعتبار نہیں ہوا۔ جب لین دین چاہے بینک کے تھرو ہو گا تو راستے میں کوئی تو سیڑھی ہو گی نا، اوپر جانے کے لیے۔''

''اچھا تم جاؤ یہ لے کر میں چائے کا سامان تیار کرتی ہوں۔'' کہتے میں نے اسے ناشتا دیتے بیٹھک میں بھیج دیا۔ خود کچھ دیر بعد میں حشر سامانی کے ساتھ چائے والے برتن اُٹھائے بیٹھک کے دروازے پر آئی اور دستک کے بعد جب میں بیٹھک میں داخل ہوئی تو میں نے شرماتے ہوئے گڈ مارننگ کہتے چائے کے برتن ٹیبل پر رکھتے علی اختر کی آنکھوں میں دیکھتے نظریں جھکا لیں۔ میری اس ادا پر وہ دل تھام کر رہ گیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر اِدھر اُدھر کی باتوں میں ہم لوگ کھو کر رہ گئے۔ اس دوران علی اختر نے واپس حیدرآباد جانے کیلئے کہا جس پر بھائی نیاز اور ماموں بشیر نے بڑی اپنائیت کا اظہار کرتے ہوئے اسے یہ یقین دہانی کروائی کہ اس گھر کو اور اس گھر کے ہر فرد کو اپنا سمجھو۔ جب دل چاہے آؤ اور ہم مل کر اجناس کا کام کریں گے۔'' پھر وہ اُٹھ کر واش روم میں تیار ہونے چلا گیا۔

میں نے سب کو اشارتاً سمجھا دیا کہ جب وہ نہا کر تیار ہو جائے اور باہر نکلے تم مجھے موقع دے دینا۔ وہ دونوں سمجھ گئے میں اُٹھ کر برتن سمیٹتی کچن میں آ گئی۔

جب وہ تیار ہو کر بیٹھک میں آ بیٹھا تو ماموں بشیر نے نیاز بھائی سے کہا کہ تم ویگن میں سیٹ کا بندوبست کر و فیصل آباد کیلئے۔ میں اور اختر علی تمہارے پیچھے اسٹینڈ پر آتے ہیں۔ ''جی اچھا۔'' کہتے وہ باہر نکل گیا۔

ماموں بہانا بناتے اوپر چلا گیا اور مجھے اشارہ کر گیا۔ میری ایکٹنگ شروع ہو گئی اور میں اپنے چہرے پر یاست کے بادل لہراتی بیٹھک میں آ گئی۔ میری آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھ کر وہ تڑپ گیا۔

میں بے اختیار ہو کر اس کے سینے میں منہ چھپاتے سسک اُٹھی۔

''حمیا! خود کو سنبھالو۔ میں تمہارے رابطے میں ہوں جو رشتہ آپ سے استوار ہو گیا ہے میں اس کی ہمیشہ قدر کروں گا۔'' اس نے پہلے سے رکھے نوٹ جیب سے نکالے اور زبردستی میرے ہاتھ میں دیتے خود کو سنبھالنے کا کہا۔ ابھی وہ مجھے اسی پوزیشن میں لیے کھڑا تھا کہ اچانک ماموں نے انٹری ماردی۔

بیٹھک میں ہم دونوں جس پوزیشن میں کھڑے تھے بلکہ میں زبردستی اس سے لپٹی کھڑی تھی ماموں بشیر نے شاندار ایکٹنگ کرتے مجھے ڈانٹا اور کھینچ کر اس کے سینے سے مجھے الگ کر دیا اور قہر بھری نظروں سے علی اختر کی طرف دیکھتے کہا۔

''اچھا صلہ دیا ہے علی اختر صاحب آپ نے میری سادہ دلی کا۔ ایک ہی رات میں آپ کے ہاتھ میری عزت تک جا پہنچے۔ حمیا! تمہیں ذرا بھی میری عزت کا جنازہ نکالتے شرم نہیں آئی۔ دل چاہتا ہے کہ تیرا گلا دبا دوں۔ اگر تیری یہ بے حیائی کا تماشا تیرا بھائی دیکھ لیتا تو تم دونوں کو ابھی گولیوں سے چھلنی کر دیتا۔ علی اختر صاحب میری بھانجی تو ابھی بچی تھی اُسے دنیا کی ہوا کا تو ابھی پتا بھی نہیں چلا تھا کہ آپ نے یہ کیا کر دیا۔''

اسی دوران میں نے تڑپ کر اپنے ماموں کو مخاطب کیا۔ ''ماموں جی! آپ ان کو کیوں ڈانٹ رہے ہیں۔ سارا قصور میرا اپنا ہے۔ میں جی لوں گی گھٹ گھٹ کر آپ بھائی کو یہ سب کچھ نہ بتانا۔ ورنہ وہ میرا سر کاٹ دے گا۔''

ہمارا ڈرامہ عروج پر تھا اور وہ بے حد ڈرا سہما کھڑا کانپ رہا تھا۔ میری طرف سے حوصلہ پا کر وہ اس صورتِ حال سے باہر نکل آیا۔

''بشیر صاحب! جو بھی ہوا وہ ٹھیک نہیں ہوا۔ میں ہر طرح کی سزا کیلئے تیار ہوں۔'' اختر علی نے شرمندگی سے سر نیچے جھکاتے میرے ماموں کو مخاطب کیا۔

''ٹھیک ہے جو ہوا سو ہوا۔ اب میری حمیا یہاں ہمارے پاس تمہاری امانت بن کر رہے گی۔'' اس فیصلہ پر وہ یکدم گھبرا گیا۔

اسی اثنا میں نیاز جو شاید باہر کھڑا سب کچھ سن رہا تھا بڑے نپے تلے انداز میں اندر آتے بولا۔ ''جلدی کریں بڑی مشکل سے سیٹ کروائی ہے۔'' مگر ہم تینوں کو اس طرح خاموش کھڑے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ پہلے ماموں کی طرف اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

''کیا ہوا حمیا؟'' میں کچھ بولے بغیر رونے لگی۔

''مجھ سے پوچھو یہ اپنی کرتوت کیا بتائے گی۔''

''کیا مطلب ہے ماموں جی؟'' اس نے برجستہ پوچھا۔

''تمہاری بہن نے اپنا ور خود پسند کر لیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے کچھ نا سمجھنے والے انداز میں ہماری طرف دیکھتے پوچھا۔

''بس بیٹا جو ہونا تھا ہو گیا اگر او نچا بولو گے تو جگ ہنسائی ہو گی۔ اب تو ہماری عزت علی اختر صاحب کے ہاتھ میں ہے۔'' ماموں نے جال پھینکا جو سیدھا علی اختر کے سارے جسم پر پھیل گیا۔

''آپ جو بھی کہتے ہیں میں ہر ہرجانہ سہنے کے لیے تیار ہوں۔'' نیاز بھائی نے بلا کی ایکٹنگ کرتے خود کو دیوار سے جا ٹکرایا۔

''علی اختر بھائی یہ کیا کر دیا آپ نے۔ کون شادی کرے گا میری معصوم بہن سے؟''

''میں ابھی تیار ہوں، آپ نکاح کا بندوبست کریں۔'' علی اختر نے جوش میں آتے دونوں کو مخاطب کیا، اتنے میں گھر کے سارے لوگ اپنے اپنے حصہ کا کردار نبھاتے بیٹھک میں پہنچتے گئے۔ دبی زبان میں بیٹھک مچھلی مارکیٹ بن گئی۔ اب بازی میرے ہاتھ میں تھی اور شو کارڈ باقی تھا۔

''اب آپ لوگ چپ کریں گے۔'' میں نے آواز میں رقت پیدا کرتے ان کو مخاطب کیا۔ وہ سب خاموش ہو گئے۔

''علی آپ آج نہیں جائیں گے۔''

''جی!'' علی اختر نے مختصراً کہا اور چار پائی پر بیٹھ گئے۔

''آپ سب لوگ اندر جائیں، میں نے ان سے کوئی بات کرنی ہے۔''

''کیا بات کرنا باقی رہ گئی ہے اب؟'' نیاز نے پھنکار کر میری طرف دیکھا۔

''ماموں جان آپ ان سب کو اندر لے جائیں۔'' میں نے التجا آمیز انداز اپناتے ماموں بشیر کو مخاطب کیا۔ ماموں کے اشارے پر وہ سارے لوگ بیٹھک سے باہر چلے گئے تو ماموں نے مجھے یہ کہتے علی اختر کی طرف دیکھا۔

''بیٹی یہ سب میرا قصور تھا۔ نہ میں کسی غیر مرد کو گھر لاتا اور نہ میں سب کی نظروں میں ذلیل ہوتا۔'' اتنا کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

میں اور علی اختر اکیلے رہ گئے تو میں نے اس کی طرف دیکھتے پوچھا۔

''علی! آپ مجھے مجبوری سے اگر نکاح میں لے رہے ہیں تو مت کرو یہ سب کچھ۔ میں اپنے گھر والوں کو خوب جانتی ہوں۔ یہ لالچی لوگ ہیں۔ ان سے لین دین کی بات کر لو۔''

میری بات سن کر وہ تھوڑا سا مطمئن ہو گیا اور اس نے بغیر کوئی حیل حجت کے پانچ لاکھ دینے کی حامی بھر لی۔

''ٹھیک ہے میں ماموں کو بلاتی ہوں۔'' میں نے اس کے قریب کھڑے کھڑے اپنے ماموں کو آواز دی۔ وہ لوگ شاید باہر کھڑے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ ماموں فوراً اندر آ گیا۔ میں نے بڑی بیچارگی کا مظاہرہ کرتے علی اختر کی بات دہرائی۔ وہ چند پل کھڑا سوچنے کی ایکٹنگ کرتا رہا پھر اس نے میری طرف دیکھتے کہا۔

''خادم سے نکاح کر لو گی؟ جسے تم پسند نہیں کرتی ہو۔ میں اس بات کو یہیں پی جاؤں گا۔''

''ماموں آپ کو پتا ہے نہ کہ آپ کا بیٹا نشئی اور آوارہ ہے۔ وہ مجھے کیسے سنبھال پائے گا۔''

''بیٹا وہ خود کو ٹھیک کر لے گا۔ یہ جو ہرجانہ ادا کر رہے ہیں اس سے اس کا علاج اور چھوٹا موٹا کاروبار کروا دیں گے اور یہ بھی آتے جاتے رہیں گے۔ بیوی تم اس کی کہلاؤ گی اور تعلق واسطہ ان سے ہی رکھنا۔ جب میں نے خود کو کنجر مان لیا ہے تو کیا فرق پڑے گا مجھے ان کے آنے جانے پر۔''

''کیوں علی ماموں کی بات منظور کرتے ہو آپ؟''

''ہاں مجھے قبول ہے۔'' کہتے اس نے اپنا موبائل نکالتے حیدر آباد اپنے بڑے بھائی کو فون کیا کہ صبح پانچ لاکھ آن لائن کروا دیں۔ میں نے یہاں مکئی کا سودا کر لیا ہے۔ مجھے مال بہت وارے کا مل گیا ہے۔ کہتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی۔

شام تک گھر کا سارا ماحول بدل گیا۔ میں نیاز اور علی اختر باہر بھی گئے۔ اس نے نیاز کو اور مجھے پندرہ بیس ہزار روپے کی شاپنگ بھی کروائی۔ رات گئے تک گھر کے سارے لوگ اکٹھے ہی بیٹھے رہے۔ میں سب کی موجودگی میں اسے اوپر اپنے کمرے میں لے گئی اور اسے یہ احساس دلا دیا کہ میں اب تمام عمر تمہاری ہوں۔

علی اختر کو بٹھا کر میں نیچے آئی اور سب کو خبر دار کیا کہ کہیں یہ رات کو یہاں سے بھاگ نہ نکلے اس لیے اندر سے تالا لگا دینا اور بیٹھک میں ماموں اور امی کو سُلا دینا۔ میں نے وہ تمام رات علی اختر کے نام کر دی۔

صبح ناشتے سے فارغ ہو کر وہ تینوں بینک گئے۔ حیدر آباد سے رقم آ گئی تھی جو وعدے کے مطابق علی اختر نے میرے ماموں کے سپرد کر دی۔ سارا دن وہ خوش و خرم میرے ساتھ گھر میں رہا۔ اس کے چہرے پر ذرا برابر بھی ملال دکھائی نہیں دے رہا تھا بلکہ اپنی طرف سے مجھے بار بار یقین دلا رہا تھا کہ حمیا میں آپ کو ہمیشہ سچے دوست کی طرح ملتا رہوں گا۔

یہ رات بھی میں نے اس کے ساتھ بسر کی تا کہ وہ واپس جا کر دی ہوئی رقم کا کوئی ریٹہ نہ ڈال لے۔ پھر وہ چلا گیا کئی روز تک ہم نے اس کی رقم سنبھالے رکھی جب یقین ہو گیا کہ مکمل طور پر میرے بس میں ہو چکا ہے، ہم

نے مل کر اپنا اپنا حصہ بانٹ لیا۔

ناہید کے فیصلے نے ہمارے دل میں اس پر موٹر وسیم گڈو کے لیے جو نفرت کا الاؤ بھڑکا رکھا تھا اس کو سرد کرنے کے لیے میرے دل میں ایک خیال ابھرا کہ اسے اپنے جال میں پھانس لوں۔ ہاتھ کھلا ہو چکا تھا اور میں نے کوشش کر کر کے ناہید کا نمبر حاصل کر لیا۔ پہلے وہ فون نہیں اٹھا رہی تھی، جب اس نے کال اٹینڈ کر لی تو میں نے اسے یقین دلا دیا کہ میں تو خود تمہارے پاس آنے کا سوچ رہی ہوں۔ تم گڈو سے میری بات کرو۔ میرے پاس آنے کا خرچہ بھی ہے اور تمہیں تو علم ہے میں ڈانس بھی بہت اچھا کر لیتی ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں بھی خوش حال ہو سکتی ہوں۔ آخر کار ہم دونوں بہنیں تو ہیں مگر ہماری دوستی بھی تو پکی ہے نا۔"

"اچھا میں وسیم سے بات کروں گی۔ اس نے پاکستان آنا ہے اگلے ماہ۔ اگر وہ مان گیا تو تم سے بات کر لے گا۔" ناہید نے وعدہ کر لیا۔

اسے کیا پتا تھا کہ میرا اصل پلان کیا ہے۔ ناہید نے وعدے کے مطابق وسیم کو منا لیا۔ اس کی طرف سے فون آ گیا پہلے تو اس نے اپنے کیے پر مجھ سے معافی مانگی۔ میں نے اس کو یقین دلا دیا کہ جو بھی ہوا اچھا ہوا، بہرحال اب تم پر فرض بنتا ہے کہ مجھے بھی کام دلاؤ۔"

"ٹھیک ہے، میں اگلے ماہ آتا ہوں۔ اتنے میں تم اپنا پاسپورٹ بنا رکھنا۔"

"نہیں۔ میں نے کچھ بھی نہیں کرنا۔ تم خود آ کر سب کچھ کرو گے۔" میں نے بڑے رعب سے اسے شیشے میں اُتارا۔

"ٹھیک ہے اب تو آپ سے میرا رشتہ مضبوط بن چکا ہے۔" اس نے اتراتے ہوئے مجھے جواب دیا۔

پھر گاہے بگاہے میری دونوں سے بات ہونے لگی اس دوران علی اختر بھی میرے ساتھ چل رہا تھا۔ ایک دو بار اس نے مجھے حیدر آباد سے موبی لنک سے پیسے بھی بھیجے تھے، بعد میں پتا چلا کہ وہ اچھا خاصا کھاتا پیتا کاروباری بندہ تھا جو میرے چکر میں آ گیا۔

ناہید کی زبانی پتا چلا کہ گڈو دو دن بعد پاکستان آ رہا تھا۔ اس نے واپسی پر دو اور لڑکیوں کے ہمراہ مجھے بھی دوبئی ساتھ لانا تھا۔ میرے اندر کی نفرت کو بے چینی لگ گئی۔ میں نے اپنے ماموں اور نیاز کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وسیم کو نہیں چھوڑنا چاہیے کچھ بھی ہو جائے۔ جب وہ آئے تو اس سے کوئی بھی ایسی بات نہ کی جائے جس سے وہ الرٹ ہو جائے باقی کام میرا۔" وہ دونوں راضی ہو گئے۔

"وسیم نے آ کر مجھ سے رابطہ کیا کہ میں فیصل آباد پہنچ چکا ہوں تم میرے پاس کسی کو ساتھ لے کر کل آ جاؤ پہلے تمہارا پاسپورٹ بنوانا ہے ارجنٹ۔"

"ٹھیک ہے میں صبح پہلے ٹائم پر پہنچ جاتی ہوں اپنے بھائی کے ساتھ۔"

رات میری ناہید سے بھی بات ہو گئی جس کو میں نے خوب مطمئن کر دیا۔ صبح سویرے میں نیاز کو لے کر فیصل آباد کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔

فیصل آباد پاسپورٹ آفس کے باہر فون کرنے پر وسیم ہمارے پاس آ گیا۔ بڑا تیز طرار لڑکا تھا پہلی نظر میں مجھے یقین ہو گیا کہ ناہید جیسی لڑکی اس کی باتوں میں پھنس کر پھسل گئی ہو گی۔ ہم دونوں بہن بھائی اس سے بڑے پیار سے ملے اور ناہید کے بارے کوئی بھی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا بلکہ اس کو یقین دلایا کہ تم نے جو بھی کیا بہت اچھا کیا۔

اس نے اپنے کسی پاسپورٹ ایجنٹ دوست سے پہلے ہی بات کر رکھی تھی جس نے میرے تمام کوائف وغیرہ اور بینک فیس گھنٹہ بھر میں کرا کے رسید ہمارے سپرد کر دی۔

وسیم نے بہت اچھے ہوٹل میں ہمیں کھانا کھلوایا اور وہاں اپنے فون پر ناہید سے بات بھی کروائی، ناہید سے نیاز نے بھی بات کی۔ میں اس کے چہرے سے محسوس کر رہی تھی کہ وہ کس کرب سے گزر رہا تھا۔ پھر ہم لوگ واپس آ گئے۔ راستے میں ایک دو بار وسیم کی طرف سے کال آئی تھی جو مجھ پر واضح کرنے کے چکر میں تھا کہ وہ بڑا ملنسار اور کام آنے والا شخص ہے مگر اسے کیا معلوم کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

گھر آ کر میں نے اپنے ماموں کو بتایا کہ پہلا قدم کامیاب گیا ہے۔

''اب کرنا کیا ہوگا؟'' ماموں بشیر نے مجھ سے پوچھا۔

''کرنا یہ ہے کہ اس کو چائے وغیرہ میں گولیاں ڈال کر پلانی ہیں۔ پھر اگلا اقدام تو آپ جان گئے ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے یہ بھی کیا یاد کرے گا کیسے کسی کے اعتماد کو ٹھیس لگائی جاتی ہے۔''

رات کو اس کی کال آئی اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ ناہید سے چوری مجھ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش میں ہے تا کہ میں بھی اس کے جھانسے میں آ کر اس کے لیے کمائی کا ذریعہ بنوں۔ میں نے بھی پینترا بدلا اور اسے موقع فراہم کر دیا کہ وہ مجھ سے ہر طرح کی بات کر سکتا ہے۔

آخرکار اس کے دل کی بات منہ پر آ گئی اور اس نے مجھے اکیلے ملنے کی آفر کر دی اور دوبئی کا سارا خرچہ بھی خود برداشت کرنے کا کہہ دیا۔ یہ تو میں نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ ناہید کے ساتھ اس کے رشتے پر ہمارے گھر میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ بس ملتے ملاتے رہنا تم دونوں۔ آخرکار اس کی شادی ایک دن کرنا ہی تھی نا۔ مگر وہ ہمارے پاس آنے کے لیے تیار نہ تھا۔ شاید ناہید نے اسے منع کر رکھا تھا یا خود ڈر رہا ہوگا۔

میں نے اپنے ماموں اور بھائی کو ساری کارروائی سنائی کہ وہ اس بات پر رضامند نہیں ہو رہا کہ ہمارے گھر آئے۔

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' ماموں بشیر نے اپنے دل کا درد چھپاتے، جس کی بیٹی کو اس نے ہاتھ پہ ہاتھ مارتے اپنے بس میں کر لیا تھا کس طرح کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔

''میں ایک کام کرتی ہوں اس کو فیصل آباد ہی جا کر ملتی ہوں۔ اس کو گولیاں پلانا میرا کام ہے۔ بس جب وہ بے ہوش ہو جائے تو تم دونوں وہاں پہنچ جانا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہوں گے۔ میں تم سے رابطہ میں رہوں گی۔''

''ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے۔'' میرے ماموں نے میری بات کی تائید کی۔ وسیم مجھ سے اکیلے میں ملنے کے لیے بے چین تھا اور میں اس کی بے چینی کو مزید بڑھانے میں لگی ہوئی تھی تا کہ اس کی ہر چالاکی دم توڑ دے اور وہ صرف مجھے حاصل کرنے کے چکر میں پڑا رہے۔ اسی پلان کے تحت میں نے رات اس کو فون کیا کہ میں صبح تمہیں ملنے کے لیے آ رہی ہوں اکیلی۔ مجھے بس اسٹینڈ سے لے لینا۔ میری طرف سے اس کو یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کافی دیر تک میں اس سے بات کرتی رہی۔

صبح اس کی طرف سے کال آئی کہ چل پڑی ہو؟ میں نے کہا بس تیار ہونے لگی ہوں۔ چلتے وقت تمہیں فون کر کے بتا دوں گی تا کہ تم اس حساب سے بس اسٹینڈ پر آ جانا، مجھے ریسیو کرنے۔ ٹھیک ہے اس کا لہجہ خوشی میں ڈوبا ہوا تھا کہتے اس نے فون بند کر دیا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد دوبارہ اس کی طرف سے کال آئی تو میں نے آج نہ آنے کا بہانہ بناتے بات دو دن پر ڈال دی۔

میرا تیر نشانے پر لگا اور وہ بے چین ہو گیا۔ پھر میری باتوں میں اُلجھ کر اس نے نہ آنے کا سبب پوچھا تو میں نے ماں کے گرنے کا کہتے اسے مطمئن کر دیا۔

اپنا خیال رکھنے کا کہتے ہوئے اس نے اجازت لیتے کال منقطع کر دی۔

ماموں نے گولیوں کو پیس کر پوڈر بنا دیا تھا جس کو میں نے حفاظت سے اپنے پاس رکھ لیا۔ دو دن تک میں اس کی پیاس بڑھاتی رہی، پھر اسے حتمی طور پر ملنے کا پروگرام ڈن کر دیا۔

ہم تینوں گھر سے تیار ہو کر فیصل آباد چل پڑے اور اسے تاکید کر دی کہ کہیں یہ نہ ہو کہ میں کھڑے انتظار کرتی رہوں۔

''نہیں۔ آپ بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ جب قریب پہنچ جاؤ تو مجھے بتا دینا میں گھر سے نکل جاؤں گا۔''

وہ دونوں پچھلے اسٹاپ پر اُتر گئے اور میں نے اسے فون کر کے بتا دیا کہ میں آدھے گھنٹہ تک پہنچ رہی ہوں۔

''ٹھیک ہے میں بھی نکل رہا ہوں۔'' بتا کر وہ مجھے تاکید کرنے لگا کہ میں تمہیں ویٹنگ روم میں ملوں گا، سیدھی اُدھر ہی آ جانا۔

''ٹھیک ہے۔'' کہتے کال کا سلسلہ کٹ گیا۔

بس اسٹینڈ پر آ رکی اور میں اُتر کر ویٹنگ روم کی طرف آ گئی۔ وسیم باہر کھڑا میرا بے چینی سے انتظار کرتا ملا۔ مسکرا کر اس نے میرا خیر مقدم کیا اور مجھے ساتھ لے کر اسٹینڈ سے باہر آ گیا۔

ایک آٹو روک اس نے کسی ہوٹل کی بات کی اور ہم دونوں بیٹھ گئے۔ ہوٹل درمیانے درجے کا تھا۔ میں نے اس کا نام اور ایڈریس یاد کر لیا۔ کمرے میں آتے ہی میں نے خود کو مسہری پر ایسے گرا دیا جیسے مجھے بڑی پیاس تھی وسیم کی۔ اس نے بھی مجھے بے صبری سے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ پھر میں نے واش روم جانے کا کہتے اسے چائے منگوانے کا کہا اور خود واش روم میں آ کر پہلے وہ پڑیا سنبھالی جو میرے پرس میں تھی۔ پھر فون پر اپنے بھائی اور ماموں کو کمرہ نمبر اور ہوٹل کا نام و ایڈریس بتایا اور واش روم سے نکل آئی۔

وسیم ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہا تھا۔ میں سیدھی چلتی ہوئی اس کے پاس آ گئی۔ کچھ دیر کے لیے میں یہ بھول گئی کہ میرا مشن کیا ہے۔

باہر دستک ہوئی وسیم نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ بیرا چائے کی ٹرے سنبھالے کھڑا تھا اندر آ کر اس نے برتن ٹیبل پر رکھے اور باہر نکل گیا۔

میں نے مسہری سے اُٹھ کر چائے کے برتن اپنے سامنے کیے اور چائے بنانے لگی۔ وسیم چینی دو چمچ کہتے ہوئے چینل بدلنے لگ گیا۔ یہی موقع تھا میرے پاس، میں نے آنکھ بچا کر وہ پڑیا اس کے کپ میں ڈالتے چینی اور دودھ وغیرہ ملاتے کپ اس کی طرف بڑھایا اور اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

میرا دِل بری طرح دھڑک رہا تھا کہ دیکھیں گولیوں کے پوڈر کا کیا رزلٹ نکلتا ہے؟ میں نے دلربا انداز سے وسیم کو اپنی طرف مخاطب کیا۔

''پسند آئی آپ کو میرے ہاتھ کی بنی چائے؟'' اس نے بڑا سا گھونٹ لیتے کہا ''نائس''۔

میں بھی اپنا کپ اُٹھاتے اس کے قریب آ بیٹھی اور ناہید کے بارے میں اس سے سوال کیا کہ اُسے اکیلی وہاں کس کے پاس چھوڑ کر آئے ہو۔''

''اس کی ساری ذمہ داری ہوٹل انتظامیہ پر ہے۔'' اس نے آخری گھونٹ اپنے حلق میں اُتارتے مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ مجھے انتظار تھا اس کے مدہوش ہونے کا اور میں اس کی حالت پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اس کے جذبات اس کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں پھر وہ غنودگی میں ڈوب گیا۔ اُسے میں نے بار بار جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کی مگر وہ بے خبر پڑا ہوا تھا۔

میرے فون پر نیاز کی کال آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ لڑھک گیا ہے تم لوگ فوراً ہوٹل پہنچو۔

''ٹھیک ہے، ہم قریب ہی ہیں۔'' کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ ماموں اور نیاز باہر کمرے کے دروازے پر آ موجود ہوئے۔ میں نے احتیاط سے دروازہ کھولا اور وہ دونوں اندر آ گئے۔ اچھی طرح یقین کر لینے کے بعد کہ کسی کو ہمارے پلان کی کوئی خبر نہیں ہوئی تو میں نے دونوں کو وقت ضائع کیے بغیر اشارہ کیا اور ہم نے اپنا کام شروع کر دیا۔ میں نے اور ماموں بشیر نے اس کی ٹانگیں اور بازو قابو کیے اور نیاز نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔

وسیم کا جسم تھوڑی دیر مچلا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ جب ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ مر چکا ہے تو ہم باہر کا تالا لگا کر ہوٹل سے کھسک گئے۔

وقت ضائع کیے بغیر ہم ویگن اسٹینڈ پر آئے اور واپس جانے کے لیے تیار کھڑی ویگن میں سوار ہو گئے۔

دو دِن بعد ناہید کی طرف سے خدشات کے بل بوتے پر وسیم کے لواحقین نے پولیس سے رابطہ کرتے مجھے، میرے ماموں بشیر اور بھائی نیاز کو گرفتار کروا دیا۔ تفتیش میں ہم تینوں نے وسیم گڈو کو قتل کرنے کا اعتراف کر لیا۔ بتا کر وہ بینچ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور میں حق ودق اُس قاتل حسینہ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ جا چکی تھی۔ میں جیسے کسی ٹرانس سے باہر آیا تھا۔ چہرے اس طرح بھی دھوکہ دیتے ہیں میں سوچتا رہ گیا۔ اور پھر کسی دوسری کہانی کی تلاش میں مجھے وقت کی پکاریں واضح سنائی دے رہی تھیں۔

☆☆☆

اسٹیشن پر جنم لینے والی کہانیاں ....
جن میں جدائی اور ملن کی وصل بھی شامل ہے

ملے کیوں، جب بچھڑنا تھا

ممتاز احمد

پلیٹ فارم پر انجام پانے والی، ایک لازوال محبت کی
لہو رلاتی داستان، جس کے کردار آج بھی زندہ ہیں

میرا نام نعمان ہے۔ جب میں نے بی ایس سی کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تو اس وقت سرگودھا میں ماسٹرز کی کلاسز نہیں ہوا کرتی تھیں اس لیے MA یا MSC کرنے کے لیے لاہور یا راولپنڈی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا پڑتا تھا۔ چنانچہ میرا ایڈمیشن راولپنڈی میں ہوگیا۔ ان دنوں سرگودھا سے راولپنڈی اسلام آباد کا سفر خاصا دشوار تھا۔ نان اے سی بسیں چلتی تھیں۔ جو سرگودھا سے براستہ خوشاب، کٹھ، کلر کہار، چکوال راولپنڈی جاتی تھیں۔ پہاڑی سفر تھا۔ لگ بھگ سات آٹھ گھنٹوں کا تکلیف دہ سفر تھا۔ ہاں البتہ ٹرین کا سفر نسبتاً آسان تھا۔

یونیورسٹی کی کلاسز شروع ہونے سے پہلے ایک دن میں نے اپنا سامان بستر بند، سوٹ کیس وغیرہ لیا اور سامان سمیت پلیٹ فارم پر آ گیا۔ ٹرین پورا ایک گھنٹہ لیٹ تھی تو میں وہیں بینچ پر بیٹھ کر ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی دس منٹ گزرے ہوں گے ایک فیملی میرے سامنے والے بینچ پر آ کر بیٹھ گئی۔ میاں بیوی کے علاوہ ایک جوان لڑکی، ایک تیرہ یا چودہ سال کا لڑکا، اور پھر ایک چھوٹی لڑکی جس کی عمر بارہ سال تھی۔ فیملی کے سربراہ ایک پچاس سال کے وضع دار اور بارعب شخصیت کے مالک انسان تھے۔ ان کی بیوی اور ایک بڑی بیٹی نے برقعے پہن رکھے تھے۔ تھوڑی دیر تو خاموشی رہی پھر ان صاحب نے بڑبڑانا شروع کر دیا کہ ریلوے والوں کا تو حال ہی کوئی نہیں ہے۔ ہر ٹرین ہی لیٹ ہوتی ہے۔ مسافروں کا تو خیال ہی نہیں ہے۔" تو میں نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور ریلوے کی کارکردگی پر روشنی ڈالنے لگا۔ تو وہ بھی میرے خیالات کی تائید کرنے لگے۔ اسی طرح باتوں باتوں میں تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ اُن صاحب کا نام حامد ہے اور وہ راولپنڈی کے رہائشی ہیں۔ سرگودھا اپنے رشتے داروں کے ہاں شادی مین سرکت کرنے کے لیے بمعہ فیملی آئے تھے اور ایک ہفتہ رہنے کے بعد واپس راولپنڈی جا رہے ہیں۔

حامد صاحب ایک سرکاری محکمے میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے اور اسی محکمے کی رہائشی کالونی کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ الغرض ٹرین کے آنے تک ہمارے درمیان اجنبیت کی دیوار گر چکی تھی۔ اسی اثناء میں دور سے ٹرین آتی نظر آئی تو سب مسافر کھڑے ہوگئے اور اور پلیٹ فارم پر ہلچل شروع ہوگئی۔

جب ٹرین آ کر رکی تو میں نے اپنے سامان کے ساتھ اس فیملی کا سامان بھی ڈبے میں رکھا اور ہمیں آمنے سامنے والی سیٹیں بھی مل گئیں اور ہم بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر رکنے کے بعد ٹرین اپنی منزل کی طرف چل پڑی۔ رسمی

تعارف تو ہمارا ہو چکا تھا اب ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد ایک بوتلیں بیچنے والا آیا تو میں نے سب کے لیے کولڈ ڈرنک کی ایک ایک بوتل لی۔ حامد صاحب نے نہ نہ کرنے اور منع کرنے کے باوجود میرے اصرار پر بوتل پکڑ لی۔ میرے سامنے والی سیٹ پر حامد صاحب کی فیملی بیٹھی ہوئی تھی جب کہ میرے ساتھ حامد صاحب بیٹھے تھے۔ جب بوتل پینے کے لیے حامد صاحب کی بڑی بیٹی نے برقعے کا نقاب اٹھایا تو ایسے لگا جیسے کالے سیاہ بادلوں کی اوٹ سے چودھویں کا چاند نکل آیا ہو۔ گورا نکھڑا، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، لمبی پلکیں، ہونٹ ایسے جیسے گلاب کی پنکھڑیاں، تیکھا ناک، کشادہ پیشانی، تو میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے دلکش حسن میں کھو گیا۔ حامد صاحب کچھ زیادہ ہی باتونی ثابت ہوئے۔ جب وہ بولتے تو نان اسٹاپ بولنا شروع ہو گئے۔ میں سعادت مندی سے ان کی گفتگو سنتا رہا۔ تو ان کی بڑی بیٹی جس کے حسن شباب نے مجھے گھائل کر دیا تھا۔ تو وہ کن اکھیوں میں مجھے دیکھ کر زیرلب مسکرا رہی تھی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے کہہ رہی ہو بچو اب آئے ہو نا قابو میں''

تھوڑی دیر بعد حامد صاحب کی بیوی جو کہ شادی کے ہنگاموں کی وجہ سے تھکاوٹ کا شکار تھیں اوپر برتھ پر جا کر سو گئیں۔ اب میں نے بھی گفتگو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ہلکے پھلکے لطیفے سنانا شروع کیے تو خوب ہنسی مذاق میں سفر کٹنے لگا۔

اب رفتہ رفتہ بے تکلفی شروع ہوئی تو مجھے حامد صاحب کی بڑی بیٹی کا نام معلوم ہوا۔ اس کا نام نازیہ تھا۔ لڑکے کا نام شاہد اور چھوٹی لڑکی کا نام سعدیہ تھا۔ جب حامد صاحب کو معلوم ہوا کہ میں ایم ایس سی کرنے کے لیے راولپنڈی جا رہا ہوں اور میرا سابقہ تعلیمی کیریئر بہت شاندار ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ پھر باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ سعدیہ میتھ کے سبجیکٹ میں کمزور ہے تو میں نے اسے پڑھانے کی آفر کی تو حامد صاحب نے قبول کر لی۔ نازیہ بی اے کر چکی تھی اور اس کا مزید پڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔۔ سرگودھا سے راولپنڈی کا ٹرین کا سفر چھ گھنٹے کا تھا اور گاڑی دن کے گیارہ بجے سرگودھا سے چلی تھی۔ دوپہر کے لنچ کے لیے امی نے مجھے بریانی، شامی کباب بنا کر دیے تھے۔ تقریباً دو بجے کے قریب سب کو



بھوک محسوس ہوئی اور نازیہ کی امی بھی جاگ گئیں اور برتھ سے آ کر سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ کچھ کھانا وہ بھی ساتھ لے کر آئی تھیں۔ تو چنانچہ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ راولپنڈی پہنچنے تک میں ان سے گھل مل گیا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے میں ان کی فیملی کا ممبر تھا۔

شام پانچ بجے ٹرین راولپنڈی پہنچی، میں نے اپنے سامان کے ساتھ ان کا سامان ٹرین سے اتارا اور ریلوے اسٹیشن سے باہر آ گئے۔ حامد صاحب اور ان کی بیوی میرے حسن اخلاق، شرافت اور سعادت مندی سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر کا ایڈریس دیا اور گھر آنے کا کہا پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر چلے گئے۔ اور میں نے رکشہ پکڑا اور اپنے ہاسٹل پہنچ گیا۔

☆......☆......☆

چند دن بعد میں شام کو حامد صاحب کے گھر پہنچا تو سب گھر والوں نے میرا استقبال کیا۔ خوب باتیں ہوئیں۔ نازیہ بہت ہنس مکھ لڑکی تھی۔ وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ وہ نہ صرف مجھے اچھی لگتی تھی بلکہ سچ تو یہ ہے وہ میرے دل میں اتر گئی تھی۔

رات کا کھانا ان کے اصرار پر حامد صاحب کے گھر کھایا اور پھر واپس اپنے ہاسٹل آ گیا اور اگلے دن سعدیہ کو میتھ پڑھانے کے لیے ان کے گھر جانا شروع کر دیا۔

پڑھائی کے دوران نازیہ بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ جاتی۔ اسی طرح وقت گزرنے لگا مجھے پتا بھی نہ چلا اور میں نازیہ کی محبت میں مبتلا ہو گیا جب نازیہ نے بھی مجھ سے اپنی محبت کا اقرار کیا تو میں ہواؤں میں اڑنے لگا اور نازیہ کی محبت پا کر بہت خوش اور مسرور ہو گیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے دو سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ ان دو سالوں میں ہماری پاکیزہ محبت خوب پروان چڑھی۔

☆......☆......☆

میرے ایم ایس سی کے فائنل ایگزام ختم ہوئے تو میں حامد صاحب کے گھر ان سے ملنے گیا۔ حامد صاحب میرے بہت ممنون و مشکور تھے کہ میرے پڑھانے کی وجہ سے سعدیہ پڑھائی میں بہت تیز اور ذہین ہو گئی ہے اور میتھ میں 100/100 نمبر لے رہی تھی۔ جب میں واپس آنے لگا تو نازیہ کی آنکھوں میں آنسو اور التجا تھی جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ بھول نہ جاؤ۔'' بہرحال بوجھل دل کے ساتھ میں واپس سرگودھا آ گیا۔ مگر مجھے نازیہ کی بہت یاد ستاتی تھی۔

ایم ایس سی کا رزلٹ آنے کے بعد فوراً مجھے حکومت پاکستان کے سرکاری مرکزی محکمے میں گریڈ 17 کی ملازمت مل گئی اور میری پوسٹنگ لاہور ہو گئی۔ اب میں گزیٹڈ آفیسر تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی امی کو نازیہ کے بارے میں بتا دیا کیوں کہ امی ابو میری شادی کرنا چاہتے تھے اور رشتے کی تلاش میں تھے۔

جب انہیں معلوم ہوا میں نازیہ کو پسند کرتا ہوں تو وہ کچھ دن بعد میرا رشتہ مانگنے راولپنڈی حامد صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ مگر وہ وہاں سے ناکام اور مایوس ہو کر واپس آئے کیوں کہ حامد صاحب نے میرا رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وجہ یہ بتائی کہ نازیہ کے دادا نے بچپن میں ہی نازیہ کا رشتہ اس کے تایازاد ناصر سے طے کر دیا تھا۔ گویا اب نازیہ کے دادا زندہ نہیں مگر حامد صاحب نے کہا وہ اپنے باپ کے طے کیے ہوئے رشتے کے مطابق نازیہ کی شادی اپنے بھتیجے ناصر سے ہی کریں گے۔

نازیہ کے رشتے کے انکار سے میرے دل پر گہری چوٹ لگی کیوں کہ میری محبت کا تاج محل ٹوٹ گیا۔ میری دنیا ویران ہو گئی میں نے نازیہ سے سچے دل سے پاکیزہ محبت کی تھی اور اس کو اپنا جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کیا تھا مگر میرا یہ خواب چکنا چور ہو گیا۔ میری نئی نئی نوکری تھی۔ چنانچہ میں نے اپنی پوری توجہ اپنی نوکری پر مرکوز کر دی تھی۔ نازیہ سے پہلے بھی کوئی ٹیلیفونک یا بذریعہ خطوط رابطہ نہ تھا۔ میں اس کو جتنا بھلانے کی کوشش کرتا وہ مجھے اتنا ہی یاد آتی میں اپنے آپ کو کام میں بہت مصروف رکھتا۔ مگر مجھے ہر طرف نازیہ ہی نظر آتی۔

بقول شاعر:

وہ ایک شخص جو مل کر بچھڑ گیا مجھ سے
ہر ایک چہرے پہ اس کا گمان ہوتا ہے

ادھر میرے والدین کا مجھ پر شادی کا دباؤ تھا۔ مگر میرا دل بجھ گیا میں کسی کو اپنی شریک حیات بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ ٹال مٹول کرنے لگا۔ انہی دنوں میری چھوٹی بہن جو مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ اس کا ایک بہت اچھا رشتہ آیا کچھ ہی دنوں میں وہ رشتہ منظور کر لیا گیا تھا

میرے والدین کی خواہش تھی کہ ہم دونوں بہن بھائی کی اکٹھی شادی کریں مگر میں نے اپنی سرکاری مصروفیات کا بہانہ بنایا اور اپنی شادی سے فی الحال منع کر دیا۔ میرے والدین سمجھ گئے کہ میرے دل پر گہری چوٹ لگی ہے سنبھلنے میں کچھ ٹائم لگے گا۔ اس لیے وہ خاموش ہو گئے۔ میری بہن کی شادی کر دی گئی اور میں نازیہ کی یادوں کو دل میں بسائے اپنی ڈیوٹی میں مصروف رہا اور دو سال کا عرصہ گزر گیا۔

☆......☆......☆

پھر ہماری محکمانہ ٹریننگ آ گئی۔ ٹریننگ کا دورانیہ چھ ماہ تھا جو کہ کراچی میں ہونا تھی۔ چنانچہ میں ٹریننگ کے لیے کراچی چلا آیا۔ ابھی ٹریننگ شروع ہوئے ایک ماہ ہوا تھا ایک دن ہمارا کولیگ جو کہ آٹو رکشہ پر ٹریننگ اکیڈمی آ رہا تھا اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا جب ہمیں اطلاع ملی تو ہم بھاگم بھاگ اسپتال پہنچے۔ جیسے ہی میں ایمرجنسی میں پہنچا تو وہاں مجھے نازیہ نظر آئی جو کہ حسرت و یاس کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا قبل اس کہ میں اس کے پاس جاتا وہ ایک نرس اور عورت کے ہمراہ دوسری طرف چلی گئی۔ پتا چلا آپریشن تھیٹر کی طرف گئی ہے۔ میں نے اپنے کولیگ کو تلاش کیا وہ مل گیا اللہ کا شکر ہے وہ بچ گیا تھا کوئی گہری چوٹ نہیں آئی تھی۔ اس کی ضروری مرہم پٹی کر کے ادویات دے کر فارغ کر دیا گیا اور میرے باقی ساتھی اسے لے کر ہاسٹل چلے گئے۔ میں نے نازیہ کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مجھے آپریشن تھیٹر کے باہر بنچوں پر بیٹھی مل گئی۔ وہ اس وقت اکیلی تھی۔ اس کے قریب جا کر میں نے اس کا نام لے کر پکارا تو وہ ایک دم چونک گئی اور حیران پریشان مجھے دیکھنے لگی پھر ایک دم سے میرے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ میں نے اسے تسلی دی اور اسپتال آنے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ ایک بم بلاسٹ میں اس کا شوہر ناصر شدید زخمی ہو گیا ہے اور آپریشن تھیٹر میں اسے آپریشن کے لیے گئے ہیں۔''

نازیہ بہت پریشان تھی چنانچہ میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور حوصلہ دینے لگا۔ نازیہ نے بتایا کہ جب میرے والدین نازیہ کا رشتہ مانگنے آئے تھے اور انکار پر واپس چلے گئے تو وہ بہت روئی تھی۔ بہت تڑپی تھی۔ پھر چند ماہ بعد اس کی شادی ناصر سے کر دی گئی۔ کچھ عرصہ بعد ناصر اپنے کاروبار کے سلسلے میں کراچی شفٹ ہو گیا تھا۔ نازیہ کی ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ جس مارکیٹ میں ناصر کی دوکان تھی وہاں کل رات شدید بم بلاسٹ ہوا، جس کے نتیجے میں وہ شدید زخمی ہو گیا تھا اور اب اس کا آپریشن ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک نرس باہر آئی اور اس نے بتایا کہ بہت زیادہ خون بہہ جانے اور گہری چوٹوں کی وجہ سے ناصر جانبر نہیں ہو سکا اور وہ آپریشن سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے سر توڑ کوشش کی مگر وہ بچ نہ سکا۔''

یہ سن کر نازیہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ میں نے اسے بہت سنبھالا۔ تھوڑی دیر کے بعد نازیہ کے دیگر رشتہ دار بھی اسپتال پہنچ گئے۔ ناصر کے والدین راولپنڈی میں ہی رہتے تھے، تو سب رشتہ داروں کی صلاح مشورے کے بعد ناصر کی تدفین راولپنڈی میں کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس طرح نازیہ اپنے شوہر کی میت کے ساتھ راولپنڈی چلی گئی۔

کچھ دنوں بعد میں نے تین چھٹیاں لیں اور بائی ایئر راولپنڈی پہنچ گیا۔ حامد صاحب کے پاس جا کر تعزیت کی، وہ بھی میرے گلے لگ کر بلک بلک کر روئے۔ نازیہ عدت میں تھی۔ پھر میں سرگودھا اپنے بہن بھائیوں والدین سے ملا۔ نازیہ کے شوہر ناصر کی موت کا بتایا اور پھر اگلے دن لاہور سے بذریعہ جہاز کراچی پہنچ گیا۔ ٹریننگ مکمل ہونے کے بعد میں واپس اپنی ڈیوٹی پر آ گیا۔ کچھ مہینے گزرے تو میں نے اپنے والدین سے کہا کہ ایک بار پھر نازیہ کا رشتہ مانگنے جائیں کیوں کہ اب اس کی عدت پوری ہو چکی تھی اور اب رشتے سے انکار کی کوئی وجہ نہیں تھی نازیہ اب ایک لڑکی نہیں ایک بیوہ تھی۔

چنانچہ اس بار میرا رشتہ قبول کر لیا گیا اور شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ نازیہ کے والدین میری سچی محبت پر حیران اور خوش تھے کہ میں نے نازیہ کے پیار میں اب تک شادی نہیں کی تھی۔

☆......☆......☆

میں اپنی بچھڑی اور کھوئی ہوئی محبت پا کر بہت خوش ہوا اور ہنسی خوشی وقت گزرنے لگا اسی دوران اللہ پاک نے دو بیٹے اور دو بیٹیوں کی شکل میں اولاد کی نعمت سے نوازا۔ میں نے نازیہ جسے اب میں پیار سے ناز کہتا تھا کے ساتھ اپنے والدین کے ہمراہ حج کی سعادت حاصل کی۔ نازو نے اپنے

پیار سے گھر کو جنت بنا دیا تھا۔ وہ بہترین پیار کرنے والی بیوی ثابت ہوئی، میں نے اپنے والدین کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ نازو جی جان سے میرے والدین کی خدمت کرتی۔

پھر یکے بعد دیگرے میرے والدین کا انتقال ہو گیا سب بہن بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں اور وہ سب اپنے اپنے گھر بار والے ہو گئے۔

میری اب گریڈ 19 میں ترقی ہو چکی تھی اور میری ٹرانسفر ملتان ہو گئی میری شادی کو پندرہ سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ ہمارا ہر دن عید اور رات شب برات کی طرح گزرتی۔

☆......☆......☆

نازو کے دو چچا اور ایک ماموں کراچی میں رہتے تھے۔ تو تین چار شادیاں اکٹھی آ گئیں۔ نازو ان شادیوں میں ہر صورت شرکت کرنا چاہتی تھی چنانچہ میں نے ایک ہفتے کی چھٹیاں لیں اور ہم پوری فیملی بائی ایئر کراچی پہنچ گئے۔ شادیوں میں خوب ہلا گلا رہا۔ سب نے مل کر بہت انجوائے کیا۔ بچوں کو کراچی کی سیر کروائی۔ جب میری چھٹیاں ختم ہو گئیں اور واپسی کا ٹائم آیا تو نازو نے کہا ایک لمبے عرصے کے بعد سب رشتے دار اکٹھے ہوئے ہیں تو وہ مزید ایک ہفتہ ساتھ رہنا چاہتی ہے تو اس کی خوشی کو دیکھتے ہوئے میں نے اسے مزید ایک ہفتہ دس دن کراچی رہنے کی اجازت دے دی۔ مگر میرا ڈیوٹی پر واپس آنا بہت ضروری تھا۔ دوسرا بچوں کے فائنل ایگزام بہت قریب تھے۔ چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ میں چاروں بچوں سمیت واپس ملتان چلا جاتا ہوں، نازو ایک ہفتہ مزید کراچی رہنے کے بعد اپنے رشتے داروں اور بہن بھائیوں جو کہ راولپنڈی میں رہتے تھے کہ ہمراہ بذریعہ ٹرین واپس آ جائے گی۔ لہٰذا اگلے روز میں چاروں بچوں کے ہمراہ ملتان آ گیا۔

میں اپنی ڈیوٹی اور بچے اپنی پڑھائی میں مگن ہو گئے۔ چار دن بعد مجھے ڈیوٹی کے سلسلے گھوٹکی جانا پڑا۔ وہاں میرا چار دن کا STAY تھا۔

نازو نے واپسی کا بتایا کہ وہ تیرہ تاریخ کو بذریعہ ٹرین اپنے رشتے داروں کے ہمراہ آ رہی تھی۔ ابھی تیرہ تاریخ میں دو دن باقی تھے کہ میں گھوٹکی میں اپنے سرکاری فرائض میں مصروف تھا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ تیرہ کو ہی میری واپسی ہے اور جس ٹرین پر نازو کراچی سے آ رہی ہے تو وہ ٹرین گھوٹکی میں بھی رکتی ہے تو کیوں نہ میں بھی اسی ٹرین میں واپس جاؤں اور نازو کو زبردست سرپرائز دوں۔ چنانچہ میں نے گھوٹکی سے ملتان تک کا ٹرین کا ایئر کنڈیشنڈ سلیپر بک کروالیا کہ میں اپنی نازو کے ساتھ گھوٹکی تا ملتان سفر کروں گا۔ اور اسے بتاؤں گا کہ نازو کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی تو اسے ریسیو کرنے گھوٹکی آ گیا۔ مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تیرہ تاریخ کا وہ منحوس دن جب ریلوے کی تاریخ کا ایک اندوہناک اور ہولناک حادثہ ہوا۔ وہ ٹرین جس میں میری چند جان، میری محبت، میری شریک حیات نازو آ رہی تھی گھوٹکی ریلوے اسٹیشن پر حادثے کا شکار ہو گئی۔ مجھے حادثے کی اطلاع ملی تو میں گھوٹکی ریلوے اسٹین پہنچا۔ جہاں ایک قیامت کا منظر تھا ہر طرف چیخ پکار تھی میں دیوانہ وار نازو کو ڈھونڈنے لگا تو پلیٹ فارم پر نازو کی لاش پڑی تھی۔ میں اپنی نازو سے لپٹ گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا کہ میری نازو تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ نازو کے دیگر رشتے داروں کی میتیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔

مجھ پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے مجھے نازو سے الگ کیا۔ پھر مجھے نہیں پتا چلا کب نازو کی میت کو اسپتال لے جایا گیا۔ کاغذی کاروائی کب ہوئی۔ مجھ پر تو نازو کے بچھڑنے کا صدمہ تھا۔ نازو کی میت گھر لائی گئی اور پھر اپنے ہاتھوں سے اپنی نازو کو لحد میں اتارا اور سپرد خاک کر دیا۔

نازو کے بچھڑنے کے دکھ مجھے اندر ہی اندر کھانے لگا تھا۔ نازیہ کی موت کہ بعد میں نے دوبارہ شادی نہیں کی بس اب دن رات نازو کی یادیں ہیں اور میں ہوں۔ بچے بھی نازو کو بہت یاد کرتے ہیں۔ میں باقاعدگی سے فجر کی نماز کے نازو کے قبر پر پھول چڑھاتا ہوں اور بہت دیر بیٹھ کر اپنی نازوں سے باتیں کرتا ہوں۔

مجھے سرگودھا ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم یاد آتا ہے جہاں میں نے نازو کو پہلی بار دیکھا تھا اور پھر گھوٹکی کے پلیٹ فارم کا وہ منظر یاد آتا ہے جہاں میری نازو مجھ سے بچھڑی تھی تو میں بہت روتا ہوں اور میرے دل سے یہ آہ نکلتی ہے کہ نازو جب تم نے بچھڑنا ہی تھا تو ملی کیوں تھیں......؟

☆......☆......☆......☆

پہلی مرد کہانی

پیر جی!

اقبال بانو

ملتان سے اُس مرد کی کتھا، جس نے محبت کی خلش
کو پورا کرنے کے لیے مکروہ طریقہ اپنالیا مگر......

''پیر جی کوئی ایسا تعویذ دیں کہ میری بیٹی کی کسی اچھی جگہ شادی ہوجائے۔'' اُس نے بارلیش سرخ آنکھوں والے پیر جی کے پاؤں چھوتے ہوئے نہایت ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

پیر جی جن کا اصل نام قربان شاہ تھا۔ اس گاؤں میں نئے نئے آئے تھے۔ اِردگرد کے گاؤں سے بے شمار لوگ ان کے پاس آتے اور تعویذ لے جاتے۔ صبح شام اُن کے پاس عورتوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ پیسے اس طرح آتے جیسے بارش ہورہی ہو۔ کہا جاتا ہے کہ جس بات کی شہرت کروانی ہو اُسے عورت سے کہہ دیا جائے، پھر کسی لاؤڈ اسپیکر کی ضرورت نہیں رہتی۔ منٹوں میں وہ بات پھیل جاتی ہے۔ پیر جی کی شہرت میں بھی ایک عورت کا ہاتھ تھا۔ ایک روز وہ اپنے حجرے کے باہر ٹہل رہے تھے کہ مائی جنت کو جو گاؤں ہی کی عورت تھی۔ بچھو نے کاٹ لیا۔ اُس کا گھر پیر جی کے حجرے کے قریب ہی تھا اور ان کی چیخیں پیر جی تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے خدمت گار سے پوچھا۔

''شیدے یہ کیسی آواز ہے؟''

''لگتا ہے کوئی عورت بہت تکلیف میں ہے۔''

''چلو اُس کو مصیبت سے نجات دلائیں۔'' پیر جی تیزی سے آگے بڑھے شیدا بھی اُن کے ساتھ تھا۔ وہ لوگ بغیر دستک دیے ہی مائی جنت کے گھر میں داخل ہوگئے۔

وہ منظر دل دہلا دینے والا تھا۔

جنت کچے آنگن میں درد سے لوٹ پوٹ ہورہی تھی۔ اُس کا میاں حیران پریشان کھڑا بیوی کو تڑپتے دیکھ رہا تھا۔ پیر جی نے اُس سے پوچھا۔

''کیا ہوا......؟''

''پتا نہیں جی بس کہتی ہے، یوں لگتا ہے جیسے کوئی ران میں ڈنک مار رہا ہے۔'' وہ گھبرا کر بولا۔

تب پیر جی تیزی سے نیچے جھکے اور جنت کے دونوں پاؤں تھام لیے اور اپنے گھٹنے پر رکھ کر تیزی سے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے۔ جوں جوں وہ پڑھ رہے تھے۔ جنت کے درد میں کمی آتی جارہی تھی۔ وہ پرسکون ہوتی جارہی تھی۔ پھر وہ تڑپ ختم ہوگئی۔ اور چند لمحے بعد ہی اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ جنت پر غنودگی طاری ہوگئی۔

پیر جی اور جنت کے شوہر کریمو نے اُسے اٹھا کر چارپائی پر ڈالا۔ پیر جی اب بھی قرآنی آیات پڑھے



جارہے تھے۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد جنت نے آنکھیں کھول دیں۔ اور پیر جی اور اپنے شوہر کو دیکھ کر مسکرائی۔

''اب درد ہے؟'' پیر جی نے پوچھا۔

''نہیں جی، بالکل بھی پتا نہیں چل رہا......'' جنت بولی۔

''پاؤں پر سوجن آرہی ہے۔ آج تم گرم پتھر سے سکائی کر لینا، انشاء اللہ آرام آجائے گا۔'' یہ کہہ کر پیر جی اٹھ کھڑے ہوئے۔

''بیٹھیں جی کوئی روٹی وغیرہ کھالیں۔'' کریمو کو ایک دم خیال آیا۔

''نہیں مہربانی...... پھر سہی......'' یہ کہہ کر پیر جی شیدے کے ساتھ چلے گئے۔

اور پھر اس واقعہ کو دو روز ہی گزرے تھے کہ ان کا حجرہ عورتوں سے بھرا رہنے لگا۔ تعویذ لکھ لکھ کر ان کے ہاتھ دکھ جاتے، مگر آنے والے جوق در جوق آتے ہی رہتے۔ شروع میں وہ تعویذ مفت دیتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ مقبولیت میں اضافے کے ساتھ وہ پیسے لینے لگے۔ آمدنی اچھی ہونے لگی تو انہوں نے دو کمرے حجرے کے ساتھ ہی بنوا لیے ایک خواتین کے لیے اور ایک مردوں کے لیے۔

مرد تو کم ہی آتے مگر عورتیں بے تحاشا آتیں، بعض مرتبہ تو کمرے میں جگہ نہ رہتی۔ شیدا ایک ایک عورت کو کمرے میں بھیجتا رہتا۔ کوئی بیٹی کے اچھے رشتے کی تمنائی بن کر آتی۔ کوئی پیر جی سے چاہتی کہ ان کے تعویذ کے طفیل اس کا میاں صرف اس کا ہو کر رہ جائے۔ اپنی ماں کی جانب دیکھے بھی نہیں۔

عورت کی ازلی و ابدی خواہش کہ اُس کا پورا پورا حق اس کے میاں پر رہے۔

کوئی جوان لڑکی محبوب کو قدموں میں دیکھنا چاہتی تو کچھ عورتیں یہ خواہش لے کر آتیں کہ ان لڑکوں کی کہیں شادیاں نہ ہو سکیں جنہوں نے ان کی بیٹیوں کو شریک حیات بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ کوئی آکر کہتا پیر جی رمضو کے کھیت میں گندم زیادہ ہوتا ہے ہمارے ہاں نہیں ہوتا۔ ایسا تعویذ دو کے رمضو کے کھیت میں سیم پیدا ہو جائے اور پیر جی چار تعویذ دے دیتے۔ کھیت کے چاروں کونوں میں دبا دینے کے لیے تا کہ رمضو کا کھیت تباہ ہو جائے۔ اور ان کا تعویذ کارگر بھی ثابت ہوتا۔ کھیت بنجر ہوتا اور پیر جی کی عقیدت کا پودا ان کے عقیدت مند کے دل میں اور جوان ہو جاتا۔

کسی عورت کا مرد دوسری عورت کے چکر میں ہوتا تو وہ آکر روتی پیٹتی۔ ''پیر جی میرے بچے رل جائیں گے۔ کسی طرح اُس چڑیل کے چنگل سے میرے میاں کو چھڑائیں۔'' اور پیر جی ایسا تعویذ دیتے کہ میاں کھٹ بیوی کا مرید ہو جاتا۔

قصہ مختصر پیر جی کی دکان بہت چمک رہی تھی۔ کوئی بھی خالی ہاتھ نہ جاتا۔ اور مزے کی بات تو یہ تھی کہ ہر ایک کا کام ہو جاتا تھا۔ اب تو دوسرے شہروں اور گاؤں سے بھی لوگ ان کی شہرت سن کر آنے لگے تھے۔ چاروں جانب پیر جی کی دھوم مچی ہوئی تھی اور سب اُن سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ کسی کو یہ غرض نہ تھی کہ پتا چلائے کہ پیر جی کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ سب کو اپنے کام سے غرض تھی اور پیر جی ہر ایک کا کام کر دیتے تھے۔

............☆☆............

پیر جی یعنی قربان شاہ کا بارہ برس قبل نام تھا قربان علی۔ وہ ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ وہیں ایک زمیندار کی بیٹی کے سامنے اونچے قد کاٹھ کے قربان علی اپنا آپ ہار بیٹھے۔ دونوں طرف آگ برابر لگی۔ شاداں بھی اُن کے فراق میں آہیں بھرنے لگی۔

راتوں کو وہ چھپ چھپ کر ملنے لگے۔

چاندنی راتیں اور سرسبز کھیت اُن کی محبت کے گواہ تھے۔ شاداں اُن کے ساتھ ہوتی تو وہ سب کچھ بھول جاتے۔ یہ بھی بھول جاتے کہ شاداں زمیندار کی بیٹی ہے اور وہ اس زمیندار کے مزارعے ہیں۔ یہ تو کسی صورت بھی ممکن نہ تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہو پاتے۔ دونوں کے درمیان سونے چاندی کی ایسی دیوار تھی کہ جسے کوئی بھی پار نہیں کر سکتا تھا اور آخر کار دونوں نے گاؤں سے بھاگنے کا ارادہ کر لیا۔

اور ایک رات جب سب خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے اور شاداں کا باپ چودھری نور الٰہی شہر گیا

ہوا تھا۔ انہوں نے گاؤں چھوڑ دیا۔

وہ دونوں گاؤں سے خاصے دور نکل آئے تھے۔ شاداں کا مارے تھکن کے بُرا حال تھا۔ رات بھر چلتے رہنے سے اُس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ آخر سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو انہوں نے گنّے کی کھیت میں پناہ لی۔ تا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ پورا دن وہ کماد میں چھپے رہے۔ گھر سے فرار ہوتے وقت شاداں اپنے ہمراہ میٹھی ٹکیاں لیتی آئی تھی۔ وہی دونوں نے کھائیں اور ندی سے پانی کر اپنی بھوک مٹائی۔ جونہی رات نے شام کو سیاہی کا لبادہ اُڑھایا وہ دونوں پھر کماد کے کھیت سے نکلے اور چل پڑے۔ دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ ان کی منزل کون سی ہے۔ وہ تو محبت کے بندھن میں جکڑے بس چلے جا رہے تھے۔ لیکن شاید ان کے ستارے اچھے نہ تھے کہ شاداں کے پیروں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ زمیندار کی نازوں پلی بیٹی تھکن سے چُور تھی۔ اُس نے قربان علی سے کہا کہ ہم کب تک یونہی کھیتوں میں چھپتے گزرتے رہیں گے۔ کیوں نہ کوئی لاری پکڑ لیں اور آرام سے شہر چلیں۔ مگر قربان علی کو ایک غیر محسوس اندیشے نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس نے شاداں کو بہت سمجھایا مگر شاداں یہ کہہ کر کہ تم ابھی سے میری بات نہیں مان رہے ہو تو آئندہ کیا امید رکھوں؟'' زار و قطار رونے لگی اور وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

قربان نے اُسے بہت سمجھایا مگر شاداں اب مزید ایک قدم بھی آگے چلنے کو تیار نہ تھی۔ آخر قربان اپنی محبوبہ کے آنسو دیکھ کر سچ مچ ہی قربان ہو گیا اور چند لمحے بعد اُس نے کچی سڑک پر آتی ہوئی ایک جیپ کو ہاتھ دے دیا۔ جیپ اُن دونوں کے پاس آ کر رُک گئی۔ قربان اور شاداں سہم گئے۔ کیونکہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ کر اُن کی سانسیں اُلجھنے لگیں۔

وہ چودھری نور الٰہی تھے۔

''ہوں تو شیر خود بخود کچھار میں آ گیا ہے۔'' وہ مونچھ کو مروڑتے ہوئے بولے۔

قربان علی کی تو زبان تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔

''اوئے نتھو اور بخشو دیکھ کیا رہے ہو ڈھالو اسے۔''

انہوں نے اپنے نمک خواروں کو کہا جو پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ آنِ واحد میں نقشہ بدل گیا۔ چودھری نور الٰہی تو شاداں کو جیپ میں بٹھا کر ہوا ہو گئے اور ان کے کارندوں نے قربان علی کو مار مار کر تقریباً ادھ موا کر دیا اور بے ہوش قربان علی کو مردہ سمجھ کر واپس چلے گئے۔

قربان علی کو ایک کھولی میں ہوش آیا جہاں ایک باریش بزرگ موجود تھے۔ ان کے گلے میں ڈھیروں مالائیں تھیں۔ میلے کچیلے لباس میں انگلیوں میں تسبیح گھماتے ہوئے وہ سرخ سرخ آنکھوں سے قربان علی کو گھور رہے تھے۔

''آ گئے ہوش میں۔'' باریش بزرگ نے کہا۔

''جی...... جی!'' قربان علی نے اُٹھنا چاہا مگر جسم کی چوٹوں نے بے حال کر رکھا تھا۔ وہ صرف کراہ کر رہ گیا۔

بزرگ نے انہیں پانی پلایا اور بولے ''کیا ہوا تھا؟''

تب قربان علی نے ہولے ہولے سب کچھ بتا دیا۔

''ہوں......'' انہوں نے قربان علی کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''اب کیا ارادہ ہے؟''

''میں واپس گاؤں جانا نہیں چاہتا۔'' قربان علی نے جواب دیا۔

''میرے ساتھ رہو گے؟''

''ہاں جی......!'' قربان علی بولے۔ ''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''اس جگہ کا کوئی نام نہیں ہے۔ یہ جنگل ہے اور میں یہاں عبادت کرتا ہوں۔ بس تم بھی خدا سے لَو لگا لو...... اُس سے عشق کرو، دُنیا اور آخرت میں دونوں جگہیں ہی بھلا ہو گا۔'' باریش بزرگ نے کہا۔

''آپ...... آپ کھاتے کہاں سے ہیں؟'' قربان علی کو ایک دم خیال آیا۔

''وہ بے نیاز ہے جو ایک کیڑے کو پتھر میں بھی رزق پہنچاتا ہے۔ وہ مجھے بھی رزق دیتا ہے۔ ہفتے پندرہ دن میں ایک بار شہر جاتا ہوں اور سامان لے آتا ہوں۔ کبھی کبھی کوئی یہاں آ جاتا ہے۔ دعا کر دیتا ہوں وہ کچھ نہ کچھ دے جاتا ہے۔ وقت گزر رہا ہے۔'' وہ بزرگ نہایت بے پروا سے بولے گئے۔

"پیر جی مجھے اپنی غلامی میں لے لیں۔" قربان علی نے منت کے انداز میں کہا۔

"ایک شرط ہے!"

"مجھے ہر شرط منظور ہے!"

"واقعی؟" بزرگ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے!" قربان علی نے کہا۔

"پہلے تم ٹھیک ہو جاؤ پھر تمہیں بتاؤں گا شرائط۔" بزرگ بولے۔ اور قربان علی انہیں دیکھتے رہ گئے۔

پھر پورا ایک ہفتہ بیت گیا۔ قربان علی کی چوٹیں ٹھیک ہو گئیں۔ پیر جی نہ جانے کہاں سے دودھ لے آتے تھے اور پھر پھٹکری اور ہلدی، دودھ میں پھینٹ کر قربان علی کو پلاتے۔ قربان علی سوچتے میرے اپنے والدین بھی بھلا میری اس قدر خدمت کرتے جتنی یہ کرتے ہیں؟ یہ سوچ کر ان کے بارے میں اس کی محبت اور عقیدت میں اضافہ ہو جاتا۔

ہر جائی وقت پَر پھیلائے اُڑنے لگا۔ قربان علی، پیر جی کے رنگ میں رنگتے گئے۔ پیر جی انہیں وظائف سکھاتے۔ رات کو پچھلے پہر وہ تہجد پڑھتے آہستہ آہستہ وہ شاداں کو بھی بھول گئے جو کہ اُن کے دل کی آخری اور پہلی پسند تھی۔ جس کی خاطر انہوں نے گاؤں اور والدین چھوڑ دیے تھے۔ اب جبکہ انہوں نے خدا کی طرف لَو لگالی تھی تو وہ یاد ہی نہ آتی تھی۔ کبھی خیال ہی نہ آتا تھا کہ جوانی ...... میں کیا حرکت سرزد ہو چکی ہے۔

پیر جی نے انہیں بہت سے علوم سکھا دیے۔ قربان علی کو پیر جی کے پاس رہتے ہوئے پورے سات برس بیت گئے تھے اور ایک روز جب قربان علی فجر کی نماز اور وظیفے کے بعد فارغ ہو کر پیر جی کے حجرے میں گئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پیر جی اپنے مصلے پر نہیں تھے اور کمرہ بھی خالی تھا۔

قربان علی کئی روز تک اپنے مرشد کا انتظار کرتے ہر آہٹ پر چونک پڑتے۔ مگر پیر جی کو نہ آنا تھا نہ آئے۔ آخر قربان علی نے رختِ سفر باندھا۔ پھر وہ گاؤں گاؤں شہر شہر پھرتے رہے۔ جہاں جاتے لوگوں کا ہجوم لگ جاتا۔ یونہی پھرتے پھراتے وہ اِس گاؤں میں آ کر سکونت پذیر ہوئے تھے۔ قریہ قریہ گھومتے پھرتے انہیں شیدا مل گیا تھا۔ جیسے کہ ایک بار وہ پیر جی کو راہ میں بے ہوش پڑے مل گئے تھے۔ اور آج اِس مقام پر تھے۔ پیر جی نے سب کچھ انہیں سکھا دیا تھا۔ مگر ساتھ ہی یہ عہد لیا تھا کہ کبھی تم سے کسی کو نقصان نہ پہنچے۔ کبھی کسی کا ناجائز کام مت کرنا۔ صرف جائز کام کے لیے دعا کرنا۔ زن، زر، زمین، تینوں ہی فساد کی جڑ کہے جاتے ہیں۔ مگر پیر جی نے قربان علی پر زور دیا تھا کہ وہ عورت میں کبھی دلچسپی نہ لینا یہ فساد کی جڑ ہے۔ تباہ و برباد کر دیتی ہے۔

قربان علی جو کہ اب قربان شاہ بن گئے تھے۔ انہوں نے شروع میں تو پیر جی کی باتوں پر عمل کیا۔ مگر آہستہ آہستہ ان باتوں کو بھلاتے چلے جا رہے تھے۔ دین سے زیادہ اب وہ دنیا کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ جائز و ناجائز اب ان کے نزدیک کوئی قید نہ تھی۔ اب کوئی فریادی ان کے پاس سے مایوس نہ لوٹتا تھا۔ تین سال میں ان کا حجرہ شاندار حویلی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ رات کے پچھلے پہر سے صبح فجر تک کا وقت عبادت میں گزارتے۔ اچھی سے اچھی عورتوں کو بھی دیکھ کر ان کا ایمان نہ ڈگمگایا تھا اور وقت گزرتا رہا۔

............☆☆............

وہ بھی عام دنوں جیسا ایک دن تھا۔ جب وہ ان کے حجرے میں آئی اور گلوگیر آواز میں بولی۔ "پیر جی ایسا تعویذ دیں کہ مجھے موت آ جائے ......!"

قربان شاہ جو آنکھیں بند کیے تیزی سے تسبیح ہلا رہے تھے اس آواز پر چونک گئے اور بند آنکھیں کھول کر انہوں نے موت کی تمنائی اس عورت کو دیکھا۔

اس عورت کا رنگ زرد اور گال پچکے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور آنکھوں میں اِس قدر ویرانیاں تھیں کہ قربان شاہ کا دل تڑپ اٹھا۔ انہوں نے اُس کے الجھے ہوئے بالوں پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"موت کیوں چاہتی ہو......!"

"سکون کے لیے پیر جی...... یا تو سکون مل جائے یا پھر موت آ جائے۔ ان دو کاموں میں سے ایک کام ہو جائے۔" یہ کہہ کر اس کی ویران آنکھوں سے آنسو

گرنے لگے۔

''کب سے سکون نہیں ملا؟'' قربان شاہ نے اُس کی نم آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ سوچوں کے صحرا میں دُور تک نکل گئی۔ آخر قربان شاہ نے ہی خاموشی کو توڑا اور کہا۔

''شاید تب سے تمہیں سکون نہیں ملا۔ شاداں جب سے قربان علی سے جدا ہوئی ہو؟''

''جی..... جی.....'' اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ واقعی وہ شاداں تھی۔

''پیر جی..... پیر جی تمہیں کیسے پتا چلا.....؟'' شاداں نے اُن کا ہاتھ تھام کر اپنی برستی ہوئی آنکھوں سے لگالیا۔''

''مجھے سب پتا ہے۔ تمہارے باپ نے تمہاری شادی کر دی تھی۔ مگر تمہارا دل قربان علی میں ہی اٹکا رہا۔'' قربان شاہ نے کہا۔

''ہاں جی..... بالکل سچ ہے.....'' شاداں نے کہا۔ ''مگر پیر جی جب میرے ہاں پہلا بچہ ہوا تو میں اپنے مقدر پر شاکر ہوگئی مگر میرے مرد کو مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ بات بات پر مجھے مارتا ہے۔ کسی ملازم سے بات کر لیتی ہوں تو روئی کی طرح دھنک دیتا ہے۔ وہ مجھ پر طرح طرح کے الزامات لگاتا ہے اور پرلے درجے کا شکی ہے۔ حالانکہ پیر جی خدا گواہ ہے کہ میں نے قربان علی کے بعد کسی مرد کو نہیں چاہا۔ چاہے قربان علی ملازم تھا یا کمی تھا جو کچھ بھی تھا بس وہی میری پہلی اور آخری پسند تھا۔ میں تو اب تک اپنے پانچ بچوں کے باپ کو بھی نہیں چاہ سکی۔ قربان علی تو میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ میرے دل کے آنگن میں پہلی بار اُس کا نام گونجا تھا۔ میں نے اُسے دل و جان سے چاہا تھا۔ پیر جی اب تو میں سمجھتی ہوں کہ سب مقدر کے کھیل ہیں پھر مجھے سکون کیوں نہیں ہے۔ دولت ہے، بچے ہیں، باہر عزت ہے۔ مگر پھر بھی سکون کیوں نہیں ہے؟'' شاداں یہ کہہ کر بُری طرح رو رہی تھی۔ اُس نے اپنے دل کی ہر بات قربان شاہ کو بتادی تھی۔

''مجھے کوئی ایسا تعویذ دیں پیر جی کہ میں مر جاؤں مجھے سکون مل جائے!'' شاداں نے اپنے آنسوؤں سے تر چہرے کو اٹھا کر پیر جی کی طرف دیکھا۔

''شاد.....!'' پیر جی کے منہ سے نکلا۔ شاداں حیرانگی سے انہیں دیکھنے لگی۔ اُس کے ذہن میں ایک خواب سا اُبھرا۔

''قربان بھی تو اسی طرح بلاتا تھا..... شاد.....''

کتنا شہد آگیں لہجہ ہوتا تھا۔ شاداں نے غور سے قربان شاہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ گھنی سیاہ داڑھی اور مونچھوں کی وجہ سے پہچان نہ پارہی تھی۔ مگر آنکھوں نے اُسے سب کچھ بتادیا۔ یہی تو وہ آنکھیں تھیں جنہیں وہ کبھی نہ بھلا پائی تھی۔

وہی آنکھیں..... نثار ہوتی آنکھیں۔

کچھ کہتی..... جذبے لٹاتی آنکھیں۔ راز عیاں کرتی آنکھیں۔

''قر..... قر..... با..... ن۔'' شاداں کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے.....!

''ہاں..... ہاں شاد.....''

''یعنی یعنی..... تم نقلی پیر ہو؟'' شاداں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں نقلی نہیں ہوں شاد..... بہت مصیبتیں کاٹی ہیں۔ مہینوں چلّے کاٹے ہیں۔ ہفتوں پیٹ پر پتھر باندھا ہے۔ ٹھنڈے پانی میں ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر چھ ماہ تک وظیفہ کیا ہے۔ پھر بھلا کیسے نقلی پیر ہوا میں.....؟''

قربان شاہ نے شاداں کا ہاتھ تھام لیا۔ اُن کے دل میں ایک دم ہی پرانی محبت انگڑائی لے کر بیدار ہوگئی تھی۔

محبت کی وہ چنگاری جو کہ دل کی تہوں میں دبی ہوئی تھی۔ شاداں کے قرب کی ہوا سے وہ بھڑک اٹھی اور قربان شاہ اپنا مرتبہ اور اپنے مرشد سے کیے گئے عہد و پیمان بھول کر پھر وہی پندرہ برس پہلے والے قربان علی بن گئے جن کے دل کی دھڑکن شاداں تھی۔

''قربان..... تم پیر کیوں بن گئے؟''

''تمہاری خاطر.....'' قربان شاہ نے پندرہ برس بعد پہلا جھوٹ بولا۔ جیسے ہی محبوب ملا اُن کے دل کی دنیا اُتھل پتھل ہوگئی۔ ایمان لڑکھڑا گیا اور محبت دل کے آنگن میں لڈی ڈالنے لگی۔

''شاد تمہیں یہاں آکر کیسا لگا؟'' انہوں نے محبت

سے چُور لہجے میں پوچھا۔

''بہت سکون مل رہا ہے مجھے قربان!'' شاداں کی دھواں دھواں آنکھیں کسی احساس سے چمک اٹھیں۔ اتنے عرصے بعد محبوب کو جو دیکھا تھا۔

وہی محبوب جس کی خاطر اتنی مصیبتیں سہی تھیں اور اب تک سہتی چلی آ رہی تھی۔ محمد بخش اس کے شوہر کو اس کی محبت کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے محمد بخش کو ہمیشہ شاداں کے کردار پر شک ہی رہا اور اب تک وہ شک کرتا تھا۔ آنکھوں دیکھی مکھی نگل لی جائے تو جی متلاتا ہی رہتا ہے۔ بس یہی حال محمد بخش کا تھا۔ پہلے تو وہ جوش میں شاداں سے بیاہ رچا بیٹھا تھا۔ کیونکہ شاداں اُس کی ٹھیکیرے کی مانگ تھی اور ملکوں میں یہ بڑے شرم کی بات تھی کہ وہ اپنی مانگ کو چھوڑ دیں اور محمد بخش نے اُس شرم سے بچنے کے لیے ساری زندگی کے لیے ایک پھانس سینے میں گاڑ لی تھی جس کی چبھن نے اُسے کبھی چین نہ لینے دیا تھا۔ وہ کبھی بھی شاداں کو خوش نہ رکھ سکا۔ حالانکہ شاداں نے قسمیں کھا کر اُسے یقین دلایا تھا کہ قربان سے اُس کا کوئی جسمانی تعلق نہ تھا۔ مگر وہ مرد تھا، اُسے یقین نہ آیا وہ کہتا تھا۔

''جوان عورت ایک آگ ہوتی ہے۔ ایسی آگ جس کے قریب پہنچتے ہی مرد پگھلنے لگتا ہے۔ موم کتنا سخت ہوتا ہے۔ مرد بھی موم کی طرح سخت ہوتا ہے مگر موم آگ کی ہلکی سی تپش سے پگھل جاتا ہے، یہی حال مرد کا بھی ہوتا ہے۔''

محمد بخش کو کبھی بھی شاداں کی بات پر اعتبار نہ آیا اور جو عورت ایک بار اپنا اعتبار کھو دے پھر کبھی اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور شاداں بھی بے اعتبار تھی۔

یہی بے اعتباریاں تھیں، یہی شک کے ڈستے ناگ تھے جو ہر لمحہ اُسے ڈنک مارتے رہتے۔

اُس کے ذہن میں سیکڑوں وسوسے رینگتے رہتے اور وہ مضطرب رہتی۔ سکون کی تلاش کرتے کرتے اب وہ موت کی خواہش کرنے لگی تھی۔ کئی بار اس نے خودکشی کی کوشش بھی کی۔ مگر ڈاکٹروں کی بروقت مدد نے اُسے موت کے منہ سے چھڑا لیا تھا۔

اور آج جب وہ موت کا تعویذ لینے پیر جی کے پاس چلی آئی تھی۔ اور وہی شخص اُس کے روبرو تھا۔ جس نے جوانی میں نوخیز ارمانوں کی کونپلیں اُس کے دل میں بوئی تھیں۔ جس کی محبت میں ڈوب کر اُس نے اپنے والدین اور گھر بار کو چھوڑ دیا تھا۔ مگر قسمت اُسے بہت جلد جدائی کے موڑ پر لے آئی تھی اور ملک نور الٰہی نے ایک ماہ کے اندر اندر اُس کی شادی محمد بخش سے کر دی تھی۔ وہ دلہن بن کر گئی تھی مگر اپنے محبوب سے بچھڑنے کا غم وہ کبھی نہیں بھلا پائی تھی۔ محمد بخش کی بیوی بننے کے بعد اس کی زندگی سے سُکھ کی گھڑیاں رخصت ہو گئی تھیں۔

............☆☆............

شاداں اب روزانہ پیر جی کی حویلی میں آنے لگی۔ بھری دوپہر میں جب کوئی نہ ہوتا۔ شاداں آ جاتی اور پھر وہ گھنٹوں ایک دوسرے میں کھوئے رہتے۔ عصر کے بعد تعویذ لینے والوں کا رش ہونا شروع ہو جاتا تو قربان شاہ، جی نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی خوابگاہ سے باہر آتے اور شاداں حویلی کے پچھلے دروازے سے نکل جاتی۔ محمد بخش ان دنوں زمینوں پر جھنگ گیا ہوا تھا اور اس بات سے بے خبر تھا کہ ان دنوں، شاداں کیا کر رہی ہے۔ شاداں کے رنگ ڈھنگ بدل گئے تھے۔ اتنے عرصے بعد محبت ملی تو وہ بالکل ہی بدل گئی۔ آنکھوں میں خمار انگڑائیاں لیتا۔ لب مسکاتے رہتے۔

پورے تین ماہ بعد جب محمد بخش لوٹا تو شاداں کا نیا روپ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے شاداں کا چاند چہرہ تاریک گھٹا سے نکل آیا ہے۔ اور پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے۔ اب کے دل میں شاداں کے لیے گہری محبت کا جذبہ بیدار ہوا۔ اور اُس نے سوچا۔ 'میں پندرہ سال سے شاداں کو آزما رہا ہوں۔ اب وہ جوان بچوں کی ماں ہے۔ جوانی میں جو غلطی اُس سے ہوئی تھی۔ مجھے چاہیے کہ اب اُسے صدقِ دل سے معاف کر دوں۔ بے چاری محبت کو ترسی ہوئی ہے۔ وہ محبت جو انتقام اور حسد کی آگ میں جل کر، میں آج تک اسے نہ دے سکا تھا۔ اور ان پندرہ برسوں میں اپنی ازدواجی زندگی میں پہلی بار اُس نے شاداں کا ہاتھ تھام کر محبت سے کہا۔

''شاد مجھے تجھ سے محبت ہے۔''

شاداں محمد بخش کے اس جملے پر چونکی۔ کیونکہ بالکل اسی طرح تقریباً روز یہی جملہ قربان شاہ کے منہ سے ادا ہوتا تھا۔ اور شاداں مدہوش ہوجاتی تھی۔ اب جبکہ یہی جملہ محمد بخش نے کہا تو وہ پھٹی پھٹی نظروں سے محمد بخش کو دیکھنے گئی۔

''پگلی تجھے اعتبار نہیں آرہا۔'' محمد بخش نے اُس کا ہاتھ ہونٹوں سے لگالیا۔ ''مجھے یقین ہے اب تُو بہت اچھی ہوگئی ہے۔ بلکہ تُو نے کبھی مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ شادی کے بعد تُو نے پاکدامنی کی زندگی گزاری ہے۔ اور اب تُو اتنے بچوں کی ماں ہے۔ اب کہاں بھٹکے گی۔ بس اس دل میں رانی بن کر رہ۔'' محمد بخش نے اُس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر شوخی سے کہا تو شاداں کی حیرانگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

اُس کے دل میں حشر برپا ہوگیا اور دل کہہ رہا تھا۔

'محمد بخش اب تجھے میری پاکدامنی کا احساس ہوا ہے جبکہ میں واقعی پاکدامن نہیں رہی، اب تو وہی لٹیرا پیر جی کے روپ میں آگیا ہے۔ شاداں کے دل نے قربان شاہ کو ایک دم لٹیرا کہہ دیا۔

شاداں نے محمد بخش کے ہاتھ میں سے ہاتھ چھڑایا اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ محمد بخش بھی ہنستا ہوا پیچھے آگیا۔ اور لگا چکور کی مانند اُس کے آگے پیچھے چکر لگانے لگا۔ حالانکہ اُس وقت شاداں کا جی چاہ رہا تھا کہ محمد بخش سے کہہ دے۔

''مجھے تنہا چھوڑ دو۔'' مگر وہ ایسا نہیں کہہ سکتی تھی۔ ایک دم ہی وہ محبوبہ سے بیوی بن گئی تھی۔ ایسی عورت جو مرد کی وفادار ہوتی ہے۔ جو شوہر کی امانت ہوتی ہے۔ اور شاداں سوچ رہی تھی۔

'کاش محمد بخش صرف چند ماہ پہلے تُو مجھ سے اتنی محبت سے پیش آتا تو میں تیری امانت میں خیانت تو نہ کرتی۔'

پہلے میں بُری نہیں تھی اور تُو مجھے بُری کہتا تھا۔ آج جبکہ میں بُری ہوگئی ہوں تو تُو مجھے اچھی کہہ رہا ہے۔ یا خدا یہ کیا اسرار ہے؟' شاداں نے اپنا چکراتا سر نزدیک بیٹھے محمد بخش کے کندھے سے ٹکا دیا اور محمد بخش کی بانہوں کا حصار اُس کے گرد تنگ ہونے لگا۔

☆☆

شاداں تو محبت کی بھوکی تھی اور جب یہ محبت اُسے ملی تو خود ہی سکون مل گیا۔ گھر میں اُسے خوشی ملی تو قربان شاہ پھر پسِ پشت چلے گئے۔ اسے قربان شاہ نے جو سکون دیا تھا وہ صرف چند گھنٹوں کا تھا جب وہ قربان شاہ کی محبت بھرے جملوں کی آبشار تلے ہوتی تھی اُس کا تن من اُس آبشار سے بھیگتا رہتا اور جب وہ گھر آتی تو در و دیوار اُسے کاٹ کھانے کو دوڑتے مگر اب یہی در و دیوار اُسے گلے لگاتے۔ اُسے اسی چہار دیواری میں تحفظ کا احساس ہونے لگا۔ موت کا تو خیال ہی دل میں نہ آتا۔ محمد بخش نے ان چند دنوں میں اُسے اتنی محبت دی تھی کہ پندرہ سال کی زیادتیوں کا ازالہ ہوگیا تھا۔ مگر شاداں بعض مرتبہ بجھ جاتی۔

'کاش محمد بخش تم جھنگ جانے سے پہلے یہی محبتیں میری جھولی میں ڈال دیتے تو میں پھر دوبارہ قربان علی کے ہتھے تو نہ چڑھتی۔'

اُس کی آہیں دل میں گھٹ کر رہ جاتیں۔ شاداں کو علم تھا کہ اگر اُس نے اپنی چادر پر لگے داغوں کو محمد بخش کو دکھا دیا تو وہ اُسے زندہ گاڑ دے گا۔ ابھی وہ کچھ اور دن اس کی محبت کے سائے تلے گزارنا چاہتی تھی۔

اُدھر قربان شاہ بہت پریشان تھے پورا مہینہ ہونے کو آیا تھا اور شاداں نہ آئی تھی۔ ان کے اندر کے تقاضے بڑے منہ زور ہوگئے تھے۔ جذبوں کا منہ زور اژدھا منہ پھاڑے سامنے کھڑا تھا۔ اور اب انہیں شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ بغیر عورت کے زندگی کچھ نہیں ہے۔ اس گاؤں میں شادی کے لیے کہتے تو کس کو، سب انہیں بڑی عزت و احترام سے دیکھا کرتے تھے۔ لوگوں کا اُن پر سے اعتبار اُٹھ جاتا۔ حالانکہ شرعی حیثیت سے وہ بیوی کے حقدار تھے۔ مگر ماں بہنیں تو تھی نہیں جو کہ ان کا کہیں رشتہ لگاتیں اس لیے دل مسوس کر رہ جاتے۔

اور پھر ایک دم ہی ان کے اطوار بدل گئے۔

وہ قربان شاہ جو ہر عورت سے نظریں نیچی کیے بات کرتے تھے۔ اُن کی بپتا سنتے اور تعویذ دیتے تھے۔ اب ہر آنے والی کو بالکل اسی طرح نظروں میں تولنے لگے جس طرح قصائی بکرے کو ٹٹولتا ہے۔

آخر انہیں حسبِ منشا ایک لڑکی مل ہی گئی۔

وہ اپنی ملازمہ کے ساتھ دوسرے گاؤں نعمت پور سے آئی تھی۔ گول چہرے، گندمی رنگت، سیاہ آنکھوں گھنیری پلکوں پیازی گالوں اور گلابی ہونٹوں والی یہ بُوٹے سے قد کی پچی کچنار قربان شاہ کو بہت اچھی لگی اور دل اس کی تمنا کرنے لگا۔ وہ اور قربان شاہ اس وقت کمرے میں تنہا تھے اور وہ سر جھکائے کہہ رہی تھی۔

''پیر جی کوئی ایسا تعویذ دیں کہ میری شادی عطا محمد سے نہ ہو......!''

''کیوں؟ کیا کسی اور کو چاہتی ہو؟'' قربان شاہ زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے بولے۔ حالانکہ پہلے کبھی کسی لڑکی یا عورت سے انہوں نے ایسی بات نہ کہی تھی۔

''نہیں میں کسی اور کو نہیں چاہتی۔'' لڑکی نے رسان سے جواب دیا۔

''عطا محمد میں کیا بُرائی ہے۔ کیوں نہیں کرنا چاہتی شادی؟''

''آپ سے کیا پردہ پیر جی...... اصل بات یہ ہے کہ عطا محمد میرے ماموں کا بیٹا ہے اور زیادہ تر زمینوں پر رہتا ہے۔ وہاں اُس نے شادی بھی کر رکھی ہے اپنی مرضی سے اور اُس نے مجھے خود بتایا ہے۔ وہ خود نہیں چاہتا مجھ سے شادی کرنا مگر ہماری بچپن کی منگنی ہوئی تھی۔ اب کوئی ایسا تعویذ دیں کہ میرا بابا انکار کردے!'' لڑکی نے پوری تفصیل بتائی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' قربان شاہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

''نظیر......!'' وہ بولی۔

''تمہارا باپ زمیندار ہے؟''

''جی ہاں...... پورے پندرہ مربعے ہیں۔'' نظیر نے جلدی سے کہا۔

''اچھا......'' قربان شاہ نے ہنس کر کہا اور پھر تعویذ لکھنے لگے۔

''یہ تعویذ تم اپنے کمرے میں بھاری صندوق کے نیچے رکھنا اور یہ دوسرا تعویذ تم اپنے بابا کو دودھ میں گھول کر رات کو سوتے وقت پلا دینا۔ دودھ تو پیتے ہیں نا؟'' قربان شاہ نے اُسے تعویذ دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... ہاں بابا اور اماں روز گرم دودھ پی کر سوتے ہیں۔'' نظیر نے معصومیت سے کہا اور پھر اس نے پلو میں بندھے ہوئے روپے کھول کر قربان شاہ کی طرف بڑھائے۔

''رہنے دو......!'' انہوں نے شہد آگیں لہجے میں کہا۔

نظیر نے یہ سمجھ کر کہ شاید پیر جی کی نظروں میں رقم تھوڑی ہے کہا۔ ''پیر جی یہ کم ہیں مگر میرا کام ہو جائے تو میں آپ کو خوش کردوں گی۔''

''ہاں مجھے ایک عمل اور بھی کرنا ہے اور اس کے لیے تمہارے سر کے بالوں کی ضرورت ہے۔ بس ایک لٹ کاٹ کر دے دو۔'' قربان شاہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولے پھر اٹھ کر طاقچے سے قینچی اُٹھا کر نظیر کو دی۔ نظیر نے چند لمحے کچھ سوچا اور پھر اپنے گھنے بالوں کی چوٹی کھولی اور ایک لٹ کاٹ کر قربان شاہ کو دے دی اور جب وہ اپنے بال دے رہی تھی۔ قربان شاہ نے دیکھا اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے، بال تو عورت کی شان ہوتے ہیں اور اُس نے اپنی شان قربان شاہ کو دے دی تھی۔ پھر وہ چلی گئی...... اس کے جانے کے بعد کئی عورتیں آئیں۔ مگر قربان شاہ کا دل و دماغ نظیر میں اٹکا رہا۔ رات کو جب وہ وظیفہ کرنے کے ارادے سے بیٹھے۔ تو آج مدتوں بعد انہیں اپنے پیر و مرشد مرحوم کا بھی خیال آیا اور ان سے کیے گئے عہد و پیمان بھی۔ اُن کے دل نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''یہ کیا کر رہے ہو قربان...... وہ معصوم لڑکی آج ہی تو گئی ہے۔ کیوں اس کی زندگی تباہ کرتے ہو۔ یہ تمہاری شان نہیں ہے تم شاداں کو بلوالو......!''

تب انہوں نے نظیر کے بال اٹھا کر طاق پر رکھے اور وظیفہ کیے بغیر سو گئے۔

دوسرے روز خلافِ معمول وہ چہل قدمی کے لیے کھیتوں میں خاصی دُور تک چلے گئے اور ان کی نظر شاداں پر پڑی۔ وہ تیر کی سی تیزی سے اُس کی طرف لپکے اور بولے۔

''شاداں تم آئی نہیں......؟'' ان کے لہجے میں بے قراریاں سمٹی ہوئی تھیں۔

شاداں، قربان کی اچانک آمد سے گھبرا گئی اور بولی۔

''میں آؤں گی......!'' اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ قربان شاہ ہاتھ مسلتے کھڑے رہ گئے۔ ان کا دل تو چاہ رہا تھا کہ آگے بڑھ کر اُسے بازوؤں میں لے لیں مگر وہ تو بادِ صبا کی طرح جا چکی تھی۔ وہ بھی واپس آ گئے۔

☆☆

قربان شاہ روز شاداں کا انتظار کرتے مگر وہ بھلا کیسے آتی۔ وہ تو اب پوری کی پوری محمد بخش کی بن گئی تھی۔ اُس کی محبت کے نشے میں مدہوش تھی۔ اُسے کیا ضرورت تھی کہ قربان شاہ کے پاس چند گھنٹوں کی محبت لینے جاتی۔ پورے دو ہفتے قربان شاہ نے کروٹیں بدل بدل کر گزارے۔ مگر شاداں نہ آئی۔ تب ایک رات انہوں نے طاق میں سے نظیر کے بال اٹھا کر زمین پر رکھے اور زمین پر گول دائرہ بنایا اور اس کے قریب بیٹھ کر وظیفہ پڑھنے لگے۔ آنکھیں بند کیے وہ پڑھے جا رہے تھے۔ وظیفہ پڑھتے ہوئے انہیں تقریباً تین گھنٹے بیت گئے اور پھر دھڑ سے دروازہ کھلا انہوں نے بند آنکھیں کھول کر دروازے کی سمت دیکھا تو ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پہلی بار میں ہی عمل کامیاب ہو گیا تھا۔

نظیر کی بُری حالت تھی۔ یوں لگتا تھا کہ سوئی ہوئی تھی اور کسی کے کہنے پر اُٹھ کر آ گئی ہو۔ قربان شاہ منہ ہی منہ میں کچھ اور پڑھنے لگے۔ نظیر ماہی بے آب کی طرح تڑپی اور دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔ اُسے تو کچھ ہوش نہ تھا اور نہ ہی اُسے پتا چلا کہ روشن کمرا ایک دم کیسے تاریک ہو گیا ہے۔

☆☆

دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ جب ماں کے جھنجوڑنے پر نظیر اٹھی۔

''کیا بات ہے نظیر آج تو بہت سوئی۔ جی تو اچھا ہے نا؟'' بخت جہاں نے محبت سے پوچھا۔

''ہاں ماں پتا نہیں کیا بات ہے۔ بہت نیند آئی ہے......'' نظیر نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''نا معلوم کیا نحوست چھائی ہوئی ہے۔ تمہارے بابا کو بھی یہی محویت ہے کہ شروع رات سوتے ہیں اور دن چڑھے آنکھیں کھلتی ہیں۔ ان کی فجر کی نماز بھی قضا ہو جاتی ہے، یہی میرا حال ہے۔'' بخت جہاں فکر مند لہجے میں بولیں۔ ''اچھا تُو اُٹھ کھانا کھا لے دن بہت ہو گیا ہے۔'' ماں نے کہا اور چلی گئی۔

نظیر نے اپنے جسم سے چادر اتاری تو وہ بُری طرح چونک گئی۔ اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

اُس کے گورے گورے پاؤں مٹی میں لت پت تھے حالانکہ وہ ہر رات اچھی طرح پاؤں دھو کر بستر میں جاتی تھی۔ شلوار کا پائینچہ ادھڑا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے بازو پر دیکھا تو بے شمار خراشیں تھیں۔

''ہائے یہ کیا ہو گیا ہے؟'' نظیر جلدی سے سنگھار میز کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ آئینے میں اسے اپنا آپ عجیب سا لگا۔ ''شاید سوتے میں کھجا لیا ہو!'' اُس نے سوچا۔

بہر حال اُس نے جلدی سے لباس بدلا۔ اُس کا ذہن اس گتھی کو سلجھانے میں اُلجھا ہی جا رہا تھا۔ کہیں مجھے سونے میں چلنے کی عادت تو نہیں ہو گئی؟ اُس نے سوچا۔

پھر تو ہر تیسرے چوتھے دن اس کے ساتھ یہی کچھ پیش آنے لگا۔ جب وہ اپنے بستر سے صبح اُٹھتی تو پاؤں مٹی گارے میں لت پت ہوتے۔ جسم کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا ہوتا۔ مگر اسے علم نہ ہوتا کہ رات کیا ہوا تھا۔

اُس غریب کو کیا علم تھا کہ قربان شاہ نے اُسے ایسے تعویذ دیے تھے کہ وہ حسبِ منشا جب چاہے اُسے بلا سکتا تھا۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ پیر جی کے تعویذ اس لیے ہیں کہ اُس کی شادی عطا محمد سے نہ ہو۔ اس لیے وہ اماں اور ابا دونوں کو دودھ میں تعویذ گھول کر پابندی سے پلا رہی تھی۔

اُدھر قربان شاہ رات کو عمل پڑھتا اور نظیر کا ذہن اپنے قبضے میں کر لیتا حتیٰ کہ چند گھنٹوں کی کوشش کے بعد اس کا جسم بھی قربان شاہ کا ہو جاتا۔ اور نوخیز کلی کو مسل کر صبح ہونے سے پہلے ہی اپنے عمل سے واپس حویلی بھیج دیتا۔ نظیر باقاعدہ اس سے محبت بھری باتیں

کرتی۔ اپنے عمل کے ذریعے جو چاہتے نظیر سے کہلواتے نظیر کی زبان، دماغ، جسم سب قربان شاہ کے قبضے میں ہوتا تھا۔

یونہی تقریباً ڈیڑھ ماہ بیت گیا۔ نظیر اپنے آپ سے بے زار نظر آتی۔ اُس کی آنکھیں کچھ کھوجتی رہتیں۔ وہ ہنستی مسکراتی لڑکی ایک دم گم صم ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک ایسی ہی رات تھی جب قربان شاہ نے نظیر کو اپنے عمل کے زور سے بلا لیا تھا اور شہد آگیں لہجے میں نظیر کے کانوں میں امرت ٹپکاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''نظیر میں بہت جلد تجھے یہاں سے لے جاؤں گا۔ پھر ہم شہر جاتے ہی شادی کر لیں گے۔''

''اچھا......!'' نظیر کھلکھلا کر ہنسی۔

انہیں پتا بھی نہ چلا کہ کوئی دبے پاؤں کمرے میں آ گیا ہے۔ نظیر نے قربان شاہ کے سینے پر سر رکھا ہوا تھا اور اس کی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی۔ جبکہ قربان شاہ اس کے رخساروں پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

''بس کسی روز ہم یہاں سے بھاگ چلیں گے۔'' قربان شاہ نے کہا۔

''اچھا تو اب اسے بھی وہی پٹی پڑھا رہے ہو جو ساڑھے پندرہ برس پہلے مجھے پڑھائی تھی۔'' بلی کی غراتی آواز قربان شاہ کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھے جبکہ نظیر کے سکون میں فرق نہ آیا یوں لگ رہا تھا جیسے کہ نظیر نے کچھ سنا ہی نہ ہو اور حقیقت بھی یہی تھی۔ نظیر نے واقعی کچھ نہ سنا تھا۔ اس وقت وہ پوری کی پوری قربان شاہ کے قبضے میں تھی۔

''تم...... تم شاداں......!''

''ہاں میں...... اور تم ایک اور لڑکی کو شاداں بنانا چاہتے ہو۔ مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ قربان شاہ...... کمی کمینے میں نہیں چاہتی کہ کوئی اور لڑکی اپنی جوانی سکون کی تلاش میں گزار دے۔ میں تجھے ختم کر دوں گی......'' شاداں نے اپنی چادر میں چھپا گنڈاسا نکالا اور قربان شاہ کے سینے پر وار کر دیا۔ اسی سینے پر جہاں چند لمحے پہلے نظیر نے سر رکھا ہوا تھا۔ نظیر قریب ہی کھڑی قربان شاہ کے سینے سے ابلتے خون کو دیکھ رہی تھی۔

''نظیر...... اِدھر آؤ......'' قربان شاہ کے لب ہلے۔ نظیر تیزی سے آگے بڑھی۔ شاداں چیخی۔

''رک جاؤ نظیر......'' مگر نظیر کا ذہن تو قربان شاہ کے قبضے میں تھا۔ شاداں نے قربان شاہ کی گردن پر گنڈاسے کا بھرپور وار کیا اُس کی گردن تن سے جدا ہو گئی اور شاداں پر جنون طاری ہو گیا۔ اُس نے قربان شاہ کی گردن کا قیمہ بنا دیا۔ آنکھیں الگ کر دیں، زبان کاٹ لی اور پھر خون میں لت پت نہایت سکون سے اپنے گھر چلی گئی۔

خون آلود کپڑے تبدیل کیے نہا دھو کر آرام سے لیٹ گئی اور صبح اپنے خونی لباس کو اس نے تنور میں جھونک دیا۔

..........☆☆..........

صبح کے وقت جب نظیر کی ماں بخت بی بی اُسے حسبِ معمول جگانے آئی تو نظیر کمرے میں موجود نہیں تھی۔ نوجوان لڑکیوں کے بارے میں ماؤں کے دل میں جو اندیشے سر اٹھاتے ہیں۔ انہوں نے ایک لمحے کو بخت بی بی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے بخت بی بی نے جیسے خود ہی سے شرمندہ ہوتے ہوئے ان اندیشوں کو دور کر دیا کہ اس کی معصوم اور بھولی بھالی بیٹی ایسا نہیں کر سکتی۔ شاید آج نظیر جلدی اٹھ گئی ہو۔ اُس نے اپنے دل کو ڈھارس دیا۔ اور پھر باورچی خانے میں اور گھر کے دوسرے کمروں میں نظیر کو تلاش کرتی ہوئی آخر تھک کر اپنے بستر پر گر پڑی۔ وہ اس حقیقت کا سامنا کرنے سے گریز کر رہی تھی کہ اس کی بیٹی گھر میں موجود نہیں تھی۔ وہ اصل حقیقت حال سے بے خبر تھی کہ عمل کے زور سے اپنے معمول کو واپس گھر بھیجنے والا تو آج اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

اسی وقت نظیر کے باپ ملک رحیم قریشی کو اطلاع دی گئی۔ وہ ڈیرے سے بھاگے ہوئے آئے اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے حویلی کے نوکروں کو ڈانٹنا شروع کر دیا جو نظیر کی حفاظت نہ کر سکے تھے۔ سب دم بخود تھے اور بخت بی بی کو غش پر غش آ رہے تھے۔ بخت بی بی کو تسلی دلاسہ دے کر ملک رحیم قریشی دوبارہ ڈیرے

پر آئے اور چاروں جانب نظیر کی تلاش کے لیے اپنے آدمی دوڑا دیے۔ ڈیرے پر سناٹا اور اداسی طاری تھی۔ ملک رحیم قریشی جن کے قہقہے ڈیرے میں گونجتے رہتے تھے۔ نڈھال اور چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔

☆☆☆

سہ پہر کا وقت تھا جب شاداں، نظیر کو لے کر ملک رحیم قریشی کی حویلی میں پہنچی۔ ملک کا وہ آدمی جو نظیر کی تلاش میں شاداں کے گاؤں پہنچا تھا۔ ملک رحیم کو بیٹی کی واپسی کی اطلاع دینے چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں ملک رحیم بھی حویلی میں پہنچ گئے۔ ان کے ہمراہ ان کا بھتیجا عطا محمد بھی تھا۔ ملک رحیم غصے میں بے قابو ہو رہے تھے۔ نظیر کو دیکھ کر ان کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ نظیر اپنے ہوش و حواس میں نہ تھی۔ اُس کے بال الجھے ہوئے اور کپڑے خون آلود تھے۔

''عطا محمد گاڑ دے اس کو قبر میں......'' ملک رحیم قریشی کی غیظ و غضب میں ڈوبی ہوئی آواز حویلی میں گونجی۔ بخت بی بی نے بڑھ کر ملک رحیم قریشی کے پاؤں پکڑ لیے۔ یوں لگتا تھا کہ نظیر پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ وہ بے تعلقی سے کھڑی ہوئی تھی اور اپنے باپ کی غضب ناک آواز سن کر خوفزدہ ہونے کے بجائے مسکرا دی۔

''ٹھہریں ملک جی یہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔'' شاداں نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' ملک جی نے ذرا نرم لہجے میں پوچھا اور بخت بی بی نے بھی پر امید نظروں سے اپنا سر اٹھا کر شاداں کی جانب دیکھا۔

''آپ کی بیٹی معصوم ہے ملک جی......!'' پھر شاداں نے سارا قصہ ملک جی کو سنا دیا۔ ''اسے ایک شیطان نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔''

''آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ نظیر، قربان شاہ کی خواب گاہ میں ہے۔'' عطا محمد نے پوچھا۔

شاداں کے چہرے پر حجاب کی ایک لہر آئی۔ وہ شرما کر خاموش ہوگئی۔ اس کی خاموشی ہی اس کا جواب تھی کہ وہ قربان شاہ کی خواب گاہ میں کیوں گئی تھی۔ شاداں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد سر جھکائے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''میں نے دیکھا کہ قربان شاہ نظیر کو فرار ہونے کا مشورہ دے رہا تھا۔ قربان شاہ وہ میرا جو کچھ بھی تھا میں برداشت نہ کر سکی کہ وہ ایک اور لڑکی کی زندگی تباہ و برباد کر دے۔ میں گنڈاسا لے کر گئی اور اُس کا سر قلم کر دیا۔ آج اگر ملک جی کا آدمی تلاش کرتا ہوا جلدی ہمارے گاؤں نہ آجاتا تو معاملہ کھل جاتا۔ نظیر شاید پولیس کے قبضے میں ہوتی۔ نظیر کی گمشدگی کی خبر پاتے ہی میں دوبارہ وہاں گئی اور اس کو لے آئی۔ نظیر ابھی تک وہیں اُس کی لاش کے ساتھ دنیا جہاں سے بےخبر بیٹھی ہوئی تھی۔ قربان شاہ عصر سے پہلے کسی سے ملاقات نہیں کرتا۔ اس لیے ابھی تک اس کے انجام کے بارے میں کسی کو اطلاع نہیں تھی۔''

''مگر یہ قربان شاہ تک کیسے پہنچی؟'' ملک رحیم قریشی نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔ عطا محمد کے دل میں برچھی سی لگی۔ وہ وہی جانتا تھا کہ نظیر کس لیے پیر قربان شاہ کے پاس گئی تھی۔ مگر وہ اس کا اظہار ملک رحیم قریشی کے سامنے نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اصل حال کو جانے بغیر وہ اتنی سی دیر میں نظیر کے کردار پر جو بدگمانیاں اس کے دل میں پیدا ہوئی تھیں۔ اس پر اسے شرمندگی ہونے لگی۔ اس خاموشی کو شاداں کی آواز نے توڑا۔ جو ملتجیانہ انداز میں ملک رحیم قریشی سے کہہ رہی تھی۔

''ملک جی اس بات کا کسی کو پتا نہ چلے۔ میرے بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اور ہم عزت دار لوگ ہیں۔''

''نہیں بہن جی بالکل نہیں۔ آپ تو ہماری محسنہ ہیں۔'' ملک رحیم قریشی نے شاداں کا ہاتھ آنکھوں سے لگا لیا اور شاداں کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

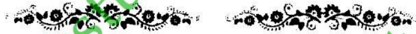
قربان شاہ کی موت کو کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ اس کی موت کا معمہ حل نہیں ہو سکا۔ پولیس نے ناکام ہو کر قربان شاہ کی فائل بند کر دی۔ پولیس کو شبہ ہے کہ قربان شاہ کو کسی ایسے شخص نے قتل کیا ہے جس کی مراد وہ پوری نہ کر سکا۔

☆☆☆

عہدِ وفا نبھایا ہے

ڈاکٹر محمود الرحمٰن

گجرات کے اُس انمول رتن کی زندہ کہانی، جو آج بھی
بابائے قوم، محمد علی جناحؒ سے کیے گئے وعدے کو نبھا رہا ہے



یوں تو پاکستان کا چپا چپا تاریخی عظمت، ماضی کے جاہ و جلال اور دورِ رفتہ کی ایک دلآویز تصویر ہے، لیکن شہر گجرات اپنی منفرد خصوصیات کی بدولت تاریخِ عالم کا ایک منور و درخشاں صفحہ ہے جس کی جلوہ ریزیاں آنکھوں کو خیرہ اور دلوں کو تسخیر کیے دیتی ہیں۔

گجرات اور اس کے نواحی علاقے جہاں زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت کے شعبوں میں شہرت دوام کے حامل ہیں وہاں علم و فن کے میدان میں بھی اپنا ایک انفرادی مقام رکھتے ہیں۔ اور اس انفرادی مقام کو ہمہ گیریت عطا کرنے والی ایک ایسی بے لوث، محنتی، انسان دوست اور علم پرور شخصیت ہے جسے ہم بلا شبہ ایک انمول ہیرا قرار دے سکتے ہیں۔ اور اس دُرِ بے بہا کا نام نامی ہے مرزا شوکت علی!

یہ وہ شخصیت ہے جس نے چالیس کی ابتدائی دہائی میں جبکہ شباب کا ولولہ انگیز زمانہ تھا، اپنا تن من دھن تحریک پاکستان کے لیے وقف کر دیا اور عین نوجوانی میں جذبۂ بے پایاں کے تحت برصغیر کے شہرۂ آفاق رہنما حضرت قائداعظم محمد علی جناح کو خط لکھا کہ وہ گجرات آئیں اور یہاں کے رہنے والوں کو ولولہ انگیز تقریر سے سرفراز فرمائیں اور اپنے بے لوث سرایے کے دیدار کا موقع عنایت کریں۔



گجرات کا انمول رتن، مرزا شوکت علی

نوجوان مرزا شوکت علی نے جس جذبۂ خلوص سے بانی پاکستان، قائداعظم محمد علی جناح کو خط لکھا تھا، اسے دنیا کی عظیم و جلیل شخصیت کی نگاہِ عمیق نے آنِ واحد میں محسوس کر لیا اور پاکستان کے قدیم شہر گجرات آنے کا

وعدہ فرما لیا۔

قائداعظم کی تشریف آوری کی یہ نوید سولہ سالہ مرزا شوکت علی کے لیے مژدۂ جاں فزا سے کم نہ تھی۔ انہوں نے وقت کے عظیم لیڈر' شہرۂ آفاق مقرر اور نامور قانون دان کے استقبال کے لیے اپنا اکلوتا سرمایہ .... یعنی سائیکل بیچ دی۔ اور اسی رقم سے سٹیج تیار کیا۔ سبز جھنڈیوں سے سارے پنڈال کو آراستہ کیا۔ مہمان، خصوصی کے لیے کرائے پر مرصع کرسی حاصل کی۔ سامعین کے لیے دریوں کا فرش بچھایا۔ اور مین گیٹ پر سبز ہلالی پرچم آویزاں کر دیا۔ وہ پرچم جو 1906ء میں سب سے پہلی مرتبہ آل انڈیا مسلم لیگ کے یوم تاسیس کے موقع پر ڈھاکہ میں آویزاں کیا گیا تھا۔

جب قائداعظم کار سے اترے تو انہیں خیر مقدم کرنے کے لیے منحنی' کمزور اور چشمہ لگائے ہوئے نوجوان......یعنی ہمارے ممدوح مرزا شوکت علی آگے بڑھے۔ قائداعظم اس خیر مقدمی منظر سے بہت خوش ہوئے' اس لیے کہ انہیں بچوں' نوجوانوں اور طالب علموں سے بے حد محبت اور حد درجہ پیار تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھے' ہاتھ اٹھا کر مرزا کو سلام کیا۔ سر پر دست شفقت رکھا اور پوچھا:

''تمہاری زندگی میں سب سے زیادہ اہم اور عزیز چیز کیا ہے؟''

گجرات کے اس نوجوان نے دنیا کے عظیم سیاست داں اور شہرۂ آفاق قانون دان کو نہایت عزم و حوصلے کے ساتھ یہ جواب دیا:

''ایک تو پاکستان' دوسرے علم کا حصول اور اس کی ترویج و ترقی۔''

اس جواب سے قائداعظم کی آنکھیں چمک اٹھیں' چہرے پر دلآویز مسکراہٹ چھا گئی اور شفقت کا سمندر موجزن ہو گیا۔ آپ نے سرزمین پنجاب کے ایک نوجوان و نوخیز طالب علم سے فرمایا:

''بیٹے! میں پاکستان تو تمہیں ہر صورت میں بنا کر دے دوں گا۔ لیکن اس پاکستان میں تعلیم کو فروغ تمہیں دینا ہو گا۔''

قیام پاکستان سے تقریباً تین سال قبل' قائداعظم نے مرزا شوکت علی سے جو وعدہ سرزمینِ گجرات پر کیا تھا' اس کی لاج پروردگار عالم نے رکھ لی اور 14 اگست 1947ء کو نئی مملکت اسلامیہ عالم وجود میں آ گئی۔ نہ پوچھیے کہ اس روز شوکت علی کو کتنی بے پایاں خوشی حاصل ہوئی تھی۔ وفورِ مسرت سے ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور لب پر ''اللھم انی اشکرک'' کے الفاظ جاری تھے۔

............☆☆............

حصولِ آزادی کے اس پُرمسرت موقع پر نوجوان کو بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا یہ جملہ رہ رہ کے یاد آ رہا تھا:

''اس پاکستان میں تعلیم کو فروغ تمہیں دینا ہو گا۔''

مرزا صاحب نے قائد سے کیے ہوئے وعدے کو وفا کرنے کا پختہ عزم کر لیا۔ بی' اے کا امتحان زمیندار ڈگری کالج گجرات سے درجۂ اول میں پاس کیا۔ گھر کی اقتصادی حالت پتلی تھی کہ مرزا شوکت علی کو حکومت میں آفیسر آبادکاری کے طور پر ملازمت کرنا پڑی۔ لیکن.... ضمیر انہیں مسلسل کچوکے لگا رہا تھا......

''کہاں گیا تمہارا وہ وعدہ جو قائداعظم کے ساتھ کیا تھا۔ انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور تمہیں پاکستان بنا کر دے دیا۔ لیکن تم کہ ٹھاٹ باٹ والی نوکری کرنے لگے۔ چہ خوب مرزا شوکت علی۔''

ضمیر کی طرف سے یہ سرد جنگ مسلسل جاری رہی۔ قلب کے اندر جوار بھاٹے موجزن ہوتے رہے۔ اور ابھی پُرتعیش ملازمت کرتے ایک سال نہیں ہوا تھا کہ ایک دن بیس سالہ شوکت علی نے متعدد سہولتوں سے پُر اپنی افسری کو تیاگ دیا اور گجرات کے پبلک ہائی اسکول نمبر1 میں بہت ہی قلیل تنخواہ پر تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا۔

اب مرزا شوکت علی کو دلی سکون مل گیا تھا۔ ان کا ضمیر مطمئن تھا۔ ان کی روح پاتال تک خرم و شاداں تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ قائداعظم کی روح؛ اس اسکول ٹیچر کو شاباش دے رہی تھی جو نئی مملکتِ پاکستان میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے کمر بستہ ہو چکا تھا۔

متذکرہ بالا اسکول میں مرزا جی نے اس عزم و

حوصلے اور محنت و مشقت سے طالب علموں کو پڑھایا کہ وہ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو ہو کر مختلف کالجوں، یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے پہنچتے رہے اور بالآخر عملی زندگی میں شریک ہو کر اپنے پیارے وطن پاکستان کی خدمت میں شب و روز مصروف رہے۔

مرزا صاحب کی اعلیٰ کارکردگی کا اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کو پبلک ہائی اسکول نمبر ا گجرات کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا۔ اس حیثیت سے موصوف نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ پورے علاقے میں قابلِ ستائش بن گئے۔

مرزا صاحب نے محض گریجویشن کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ ایم' اے کی امتیازی ڈگری بھی حاصل کی۔ نیز کئی بیرونی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے تعلیم کے فروغ کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔ بچوں کو پڑھانا اور انہیں زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا ان کے نزدیک عبادت کے مترادف تھا۔

اسکول میں چھٹی کے بعد ان کے گھر کا دروازہ کھلا رہتا۔ طلبا ہر شام' بعد مغرب آتے...... مگر ٹیوشن کے لیے نہیں! مرزا شوکت علی کے یہاں تو 'ٹیوشن' کا تصور ہی نہیں تھا۔ وہ ایک شفیق باپ اور مہربان استاد کی حیثیت سے گھر پر آنے والے ہر طالب علم کو اپنے بحرِ علم سے فیضیاب کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ پبلک اسکول نمبرا گجرات کے لاتعداد طلباء نے پاکستان میں اہم اہم پوزیشنیں سنبھالیں۔ دنیا میں مرزا صاحب کے شاگردوں نے بڑا نام پیدا کیا اور اپنے وطنِ عزیز کا نیک نام بنایا۔

مرزا شوکت علی مسلسل سینتیس (37) سال تک درس و تدریس سے منسلک رہنے کے بعد 1987ء میں بہ حیثیت ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہوگئے۔ یہاں بھی ان کا جذبہ خدمتِ نو جواناں برقرار رہا۔ یعنی اسکول سے ملنے والی پرووڈینٹ فنڈ کی یکمشت رقم کو قوم کی امانت سمجھا اور اس رقم سے اور کچھ خاندانی جائیداد کو فروخت کر کے شوکت ماڈل اسکول قائم کیا۔ اپنے وافر تجربے اور بانیٔ پاکستان سے کیے ہوئے وعدے کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے موصوف نے اس اسکول کو واقعتاً ماڈل اسکول بنا دیا۔ یہاں بچوں کی تعلیم و تربیت کا اعلیٰ ترین انتظام ہے جس کا ہر کس و ناکس معترف ہے۔ شوکت ماڈل اسکول میں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے علیحدہ علیحدہ انتظامات کیے گئے۔

لیکن شوکت ماڈل اسکول ان کی آخری منزل نہ تھی۔ موصوف نے اپنے لائق بیٹے پروفیسر ڈاکٹر مرزا برجیس بیگ جو بیرونِ ملک اپنی خداداد صلاحیتوں اور والد کی گراں قدر تربیت و تعلیم کی بدولت وطن کا نام روشن کر رہے ہیں اور دیگر احباب کے تعاون کے نتیجے میں ایک قطعۂ اراضی خرید لیا اور شوکت ایجوکیشنل اکیڈمی قائم کی۔ اس ادارے کے تحت لڑکیوں کے دو ہائی اسکول' لڑکوں کا ایک ہائی اسکول اور ایک ہائر سیکنڈری اسکول قائم ہیں، جو فروغِ تعلیم میں 'نہ نفع نہ نقصان' کی بنیاد پر مخلصانہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

☆☆☆


مرزا شوکت علی کے فرزند پروفیسر ڈاکٹر مرزا برجیس بیگ

شوکت ایجوکیشنل اکیڈمی' پاکستان، ہی نہیں' دنیا کی واحد تنظیم ہے جہاں 80 سالہ مگر جوانوں جیسے پُرجوش چیئرمین جناب مرزا شوکت علی کے شانہ بہ شانہ ایک سو (100) سے زیادہ اساتذہ سارا سال بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کرنے کی گراں بہا قومی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ سب سے بڑی



پروفیسر ڈاکٹر مرزا برجیس بیگ اپنے والد مرزا شوکت علی کے ساتھ کل اور آج کی یادگار تصویر میں

اہم بات یہ کہ شوکت ایجوکیشنل اکیڈمی میں کوئی چھٹی نہیں ہوتی۔ اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ خود مرزا صاحب قطعاً ان الفاظ سے نا آشنا ہیں:

☆ تعطیل ☆ آرام ☆ چھٹی......

وہ قائداعظم کے اس مقولے کے قائل ہیں۔

کام۔ کام اور صرف کام! اور یہ ہے بھی ضروری! بھلا وہ شخص جو سولہ سال کی عمر میں بانی پاکستان سے 'پاکستان' میں فروغ تعلیم کا وعدہ صمیم قلب سے کرے وہ کس طرح آرام کر سکتا ہے' چھٹی لے سکتا ہے اور تعطیلات گزار سکتا ہے جبکہ اسے بخوبی علم ہے کہ خود قائداعظم نے بیماری کے باوجود' بڑھاپے کے باوجود' اضمحلال جسم کے باوجود' نہ آرام کیا' نہ چھٹی کی اور نہ تعطیل سے بہرہ ور ہوئے۔ اس گجراتی ماہر تعلیم کو یہ حقیقت بھی معلوم ہے کہ جب محمد علی جناح کی بہن فاطمہ جناح نے بھائی کو آرام کا مشورہ دیا تھا تو انہوں نے برملا ان سے کہا تھا:

''کیا کوئی جرنیل میدانِ جنگ میں چھٹی کرتا ہے؟''

اور یہ امر مسلمہ ہے کہ 'محمد علی' کے مخلص اور بے لوث پیروکار ''شوکت علی'' بھی میدان جنگ میں جہالت کے خلاف گذشتہ ساٹھ (60) برسوں سے ایک 'پُرجوش جرنیل' کی طرح معرکہ آرائی میں مصروف ہیں:

جس دن سے چلا ہوں میری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں سے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

صورت حال یہ ہے کہ مرزا صاحب تقریباً سات ہزار (7000) طلباء و طالبات کو جہالت' نادانی اور لاعلمی کے اندھیروں سے نکال کر علم و فن کے دائرہ نور میں لا رہے ہیں۔ یقیناً قائداعظم کی روح اپنے اس بے لوث' مخلص' وفا دار اور 'وعدے' کا پاس رکھنے والے پیروکار کی گراں قدر کارروائیوں کو دیکھ کر خوش ہو رہی ہوگی۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو پھر شہر گجرات کا سفر کرتے' اسی (80) سالہ شوکت علی اپنی اکلوتی سائیکل (جو آج ان کی واحد ملکیت ہے اور جس پر سوار ہو کر بعد نماز فجر وہ اکیڈمی جایا کرتے ہیں) کو فروخت کر کے 'مہمان گرامی' کے شایانِ شان استقبالیہ کا انتظام کرتے اور قائداعظم پنڈال میں پہنچتے ہی 'منحنی' کمزور اور ناتواں بوڑھے کے سر پر ایک 'باپ' کی حیثیت سے دست شفقت رکھتے ہوئے کہتے:

'' شوکت علی! آج میں بہت خوش ہوں۔ تم نے میرے بنائے ہوئے پاکستان کو علم کی روشنی سے منور کر دیا ہے۔ کاش میری قوم بھی میرے خوابوں کی تعبیر اس 'پاکستان' کو اپنی بے لوث خدمات سے اُجالا دیتی۔ مگر افسوس.....!''

☆☆☆

تیسری مرد کہانی

کرچیاں

صالحہ نفیس

ناآسودہ خواہشات کی ستم گری لیے، ایک اکلوتے کا ماجرا، کراچی سے



اماں بتاتی ہیں کہ اس کی پیدائش پر یہ بڑے بڑے لڈو بٹے تھے۔ ابا کی خوشی کا گویا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ مانو جیسے کوئی بہت بڑا خزانہ ہاتھ آ گیا ہو۔

جب ہی ابا نے خوش ہو کر اس کا نام نوید رکھ دیا۔ اور فخریہ انداز میں بولے۔ ''یہ ہے میرا اصلی وارث...... میرا بیٹا!''

نوید سے پہلے ابا کی تین بیٹیاں تھیں مگر وہ نوید کی پیدائش کے بعد ہی اپنے آپ کو صاحبِ اولاد سمجھنے لگے اس سے پہلے تو وہ بس بے چارے تھے۔

نوید کی پیدائش کے تین سال گزرے کہ اماں سے پھر بچے کی پیدائش کی امید کی جانے لگی کہ جب تک بیٹیاں ہو رہی تھیں تو سال کے سال مگر بیٹے کی پیدائش کے بعد اب یہ وقفہ کیوں؟ ہو سکتا ہے اب بیٹوں کی باری ہو...... مگر جب یکے اور دیگرے دو بیٹیاں اور ہو گئیں تو اماں ابا نے بھی ضعیف الاعتقاد مسلمان کی طرح قسمت کا لکھا جان کر آخر میں صبر کر لیا اور پانچ بیٹیوں اور ایک بیٹے کی پرورش میں جت گئے۔

ماہ سال گزرنے کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے بیٹیاں جوان ہوتی گئیں، اماں ابا کی فکر و پریشانی بھی جوان ہوتی گئی۔ اماں چاہتی تھیں کہ صحیح وقت پر بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ یہ سوچ آکاس بیل کی طرح ایسی چمٹی کہ اماں ان سب میں نوید کو بھول گئیں۔ نوید کے معاملے میں وہ کچھ زیادہ ہی خوش فہم تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ پہلے بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کی ہو جائیں پھر نوید کے سر پر سہرا سجائیں اور اپنی باقی ماندہ زندگی بہو سے خدمت کراتے، نوید کے بچوں کو کھلاتے گزار دیں۔

☆☆

مگر جب ایک دن عنبرین نے نوید سے ماں باپ کو اپنے گھر بھیجنے کی بات کی تو نوید ایسے چونکا جیسے کوئی نیند سے اچانک جاگ جائے۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اماں ابھی بھی اس کی شادی کی بات اس کی بہنوں سے پہلے نہیں کریں گی۔ اور ابھی تو صرف دو بہنوں کی شادی ہوئی تھی۔ جب کہ تیسری بہن کی شادی تیار تھی جو کہ اگلے چند ماہ میں انجام پذیر ہونا تھی۔ اماں آج کل اسی کی تیاریوں میں جتی ہوئی تھیں۔

بڑی دونوں بہنوں کی شادی اماں کی کفایت شعاری کی بنا پر بہت احسن طریقے سے ہو گئی تھی۔ مگر تیسری بہن کی شادی تک اماں بھی تہی دست ہو چکی تھیں۔ ابا کے ساتھ ساتھ اسے بھی اپنے آفس سے ایڈوانس لینا پڑا تھا۔ مگر ابھی دو چھوٹی بہنیں گویا تیار کھڑی تھیں۔ ایسے میں وہ اماں ابا سے اپنی شادی کی بات کیسے کرتا۔

ادھر عنبرین کوئی بھی عذر سننے کو تیار نہ تھا۔ جب کہ عنبرین کو دیکھ کر اس کا دل اس کا نہ رہتا بالکل ایک ضدی بچہ بن جاتا۔ اس کی اپنی آنکھیں بس عنبرین ہی کے چہرے کی متلاشی رہتیں، جنہیں کوئی اور صورت جچتی نہ تھی۔

اس کے کانوں کو عنبرین کی آواز میں موسیقی کی وہ لہر محسوس ہوتی جو اس کی روح کو سرشار کر دیتی۔ وہ بہت مجبور تھا، اپنے آپ سے اور اپنے آپ سے سمجھوتا کرنا ہی ایک بہت بڑا عمل ہوتا ہے۔ ایک بڑا تیاگ کرنا پڑتا ہے۔ دل بھی روٹھ جاتا بھی من جاتا۔ جب ہی تو وہ اپنے آپ سے مجبور تھا۔ پھر بھی اس نے عنبرین کو بہت سمجھایا اپنی محبت کے واسطے دیے۔ اور یہ وعدہ بھی کیا کہ اپنی تیسری بہن کی شادی کے بعد وہ ضرور اماں ابا سے بات کرے گا۔ عنبرین مان گئی۔

☆☆

خدا خدا کر کے شادی کے دن نزدیک آئے اور بہن کی رخصتی پر عنبرین نے شرکت کر کے گویا اسے اپنے ہونے کا احساس دلایا۔

اماں بہت خوش تھیں کہ ایک اور بیٹی کا فرض ادا ہو گیا ان کی زبان مالک حقیقی کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھی اور ابا بقایا جات کی ادائیگی کی فکر میں حساب کتاب میں مصروف۔ ایسے میں سوچ سوچ کر پریشان کہ کون سا موقعہ ملے جو وہ اپنی شادی کا ذکر چھیڑے۔ وہ اماں ابا کے سامنے رہتا مگر انہیں نظر نہ آتا اور بہنیں گھر کے کونے میں دبکی ہوئی بھی نظروں کا شہتیر بنی رہتیں......

اب عنبرین کا تقاضا دوبارہ شروع ہو گیا کہ والدین کو بھیجو۔ آخر تم میرے بارے میں بھی تو سوچو کہ میں بھی ایک لڑکی ہوں۔ میرے والدین بھی چاہتے ہیں کہ میری شادی بھی وقت پر ہو جائے۔''

نوید آج جب گھر لوٹا تو وہ اپنے آپ کو پوری طرح تیار کر کے آیا تھا کہ ضرور اماں سے عنبرین کی بات کرے گا۔ مگر آج جب گھر پہنچا تو اسے گھر میں غیر معمولی چہل پہل نظر آئی۔ وہ سمجھا کہ حسب عادت کوئی بہن گھر آ گئی ہو گی اپنے کسی سسرالی رشتہ داروں کے ساتھ کہ اماں اس کے کمرے میں داخل ہوئیں اور اسے بتایا کہ تمہاری چھوٹی بہن کے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔ لڑکے والوں نے شادی پر اسے دیکھا تھا اب رشتہ مانگ رہے ہیں۔ وہ چٹ منگنی پٹ بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔ شریف اور خاندانی لوگ لگ رہے ہیں۔'' اماں کی خوشی دیدنی تھی۔

نوید اماں کی خوشی میں اپنے دل کی بات، اپنے دل میں ہی دبا کر روایات نبھانے لگا۔ ایسے میں بھلا وہ کیسے اپنی شادی کی بات کرتا۔ ادھر عنبرین تھی کہ بار بار پوچھ رہی تھی کہ اس نے بات کی یا نہیں۔ وہ جب بھی اماں سے اپنی شادی کی بات کرنے کا سوچتا تو اماں اس کی بات کرنے سے پہلے حسرتوں کو زبان دے دیتیں۔ اماں نے ہی اسے بتایا کہ وہ لوگ منگنی پر زور دے رہے ہیں۔ ابا سے بات ہوئی ہے انہیں بھی وہ لوگ پسند ہیں اور تو اور اس کی بڑی بہن کے سسرالی رشتہ دار بھی ہیں گویا انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب تو منگنی کی تیاریاں کرتی ہیں۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ سب ہو جائے گا۔'' نوید نے اپنا مدعا بیان کرنے سے پہلے ہی تمہید باندھی۔

اماں خوش ہو کر اسے دعائیں دینے لگیں کہ بیٹا سدا خوش رہو۔ پوتوں پھلو دودھوں نہاؤ۔

''اماں پوتوں تو جب پھلوں گا نہ جب میری شادی ہو گی۔''

''تمہاری شادی! اے بیٹا وہ تو میں ایسی کروں گی کہ ساری دنیا دیکھے گی بس ذرا بیٹیوں کے فرض سے فارغ ہو جاؤں۔ پھر تم دیکھنا میں کیسے کیسے دل کے ارمان نکالوں گی اماں کی آنکھوں کی چمک بڑھنے لگی۔

اس بڑھتی چمک کی روشنی میں نوید کے دل کے ارمان حسرتوں کی کوٹھڑی میں دفن ہونے لگے۔ اسے عنبرین کا خوبصورت چہرہ اندھیرے میں مدغم ہوتا محسوس ہوا۔ اس کا دل و دماغ مفلوج ہونے لگا دل میں ایک خواہش اٹھی اور اپنا جسم بے دم و بے جان لگنے لگا۔

............☆☆............

اس کی چھوٹی بہن کی منگنی کا دن تھا۔ گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ اماں بولائی بولائی اِدھر سے اُدھر پھر رہی تھیں جہاں سے گزرتیں کسی نہ کسی کو کوئی کام سونپ جاتیں۔ نوید کو تلاش کرتی اس کے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہاں ٹھٹھک کر رُک گئیں۔ کمرے سے نوید کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ سچ مچ۔''

''کھاؤ قسم!''

''ہاں ہاں! قسم خدا کی! تم بہت معصوم اور دلکش ہو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''شادی کیوں نہیں کر لیتے مجھ سے۔''

''شادی...... ہا ہا ہا......'' نوید کا بلند قہقہہ بلند ہوا۔ ماں دروازے کے باہر ہکا بکا کھڑی سن کی سن رہ گئی تھی۔ یہ دوسری آواز کس کی تھی۔ کون تھا نوید کے ساتھ؟ ماں سوالیہ نشان بنی دروازے کے ساتھ کھڑی تھی مگر دروازے کھولنے کی ہمت خود میں نہ پا رہی تھی۔

''لو! کر لو شادی! کرونا۔ میری اماں آج ڈولی میں تم کو بھی بٹھا دیں گی۔'' ہا ہا ہا...... آخر کار ماں نے دھڑ سے دروازہ کھول دیا اور اندر آ گئیں۔ اندر کا منظر اُن کی روح فنا کرنے کو کافی تھا۔

دیکھتیں ہیں کہ نوید دلہن کا جوڑا۔ پہنے گلے میں ہار پہنے آئینے کے سامنے کھڑا ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا رہا تھا۔ جو ہی اماں کی نظر آئینے پر پڑی تو وہ اپنے سینے پر دو ہتڑ مارتی زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔

☆......☆......☆......☆

ناگن

اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے، جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ ''ناگن۔'' آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا، نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کردے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا، زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں، آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

آخری قسط

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پردادا کو اس کے گرو نے مرتے سے شیش ناگ کا جوڑا دان کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور آنکھوں میں سنہری روشنی۔ آنکھوں کی سنہری روشنی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ سانپ ہیں۔ اگر یہ سو سال تک زندہ رہ گئے تو یہ نہ صرف انسان کے روپ میں آجائیں گے، بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں چھپے خزانے





ان کی دسترس میں ہوں گے اور اس وقت یہ جس کے قبضے میں ہوں گے یہ اسی کے حکم کے غلام ہوں گے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہر ساون میں اماوس کی رات ناگ دیوتا کے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی قربانی دی جائے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے پرکھوں نے ان ناگوں کو ناز و نعم سے پالا تھا اور نگہبانی کا یہ عمل اب جوگی مہاراج کے حصے میں آچکا تھا۔ وہ رات بھی اماوس کی رات تھی اور ان ناگوں کی عمر کے سو سال مکمل ہونے جا رہے تھے۔ جوگی مہاراج نے یہ کہانی بیس سال سے ساتھ رہنے والے چیلے صابو کو سنائی تو اس کی نیت میں کھوٹ آنے لگا۔ گرو مہاراج ہاتھ میں خنجر تھامے ناگ منتر کا جاپ کر رہے تھے اور صابو انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھ کر زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ جاپ مکمل کر کے جوگی مہاراج نے بلی کا عمل مکمل کیا۔ دونوں ناگ اور ناگن انسانی خون میں اشنان کر رہے تھے اور سرخ زبانیں نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج بیٹھے یہ منظر غور سے دیکھ رہے تھے، یہ ہی وہ لمحہ تھا جس کا صابو کو انتظار تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں خنجر کا وار مہاراج کی گردن پر کیا اور گرو مہاراج پتھرائی آنکھوں سے اپنے چیلے کو دیکھتے رہ گئے۔ صابو لاش ٹھکانے لگا کر جب کمرے میں آتا ہے تو پٹاری والی جگہ ایک خوب صورت نوجوان مرد اور سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی موجود تھے۔ صابو انہیں کہتا ہے کہ تم میرے غلام ہو۔ وہ ان کے نام ارجن اور شکنتلا تجویز کرتا ہے۔ تب ارجن اور شکنتلا اسے بتاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ صابو ان کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چیلا ہے۔ تب صابو کے خون سے شیش ناگ کا یہ جوڑا اپنی پیاس بجھا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔ لوگ اسے دیکھ لیتے ہیں اور اس پر تیل ڈال کر آگ لگا کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر شکنتلا غصے میں آجاتی ہے اور کہتی ہے۔ ''ارجن کے قاتلوں! تم نے میرے ناگ کی ہتھیا کر کے برا کیا، تم ناگن کی طاقت اور انتقام سے واقف نہیں، شکنتلا تمہاری زندگیوں میں زہر گھول دے گی۔ میں اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی، تم موت مانگو گے لیکن موت بھی تم سے روٹھ جائے گی۔ ایک ایک کو تڑپا تڑپا کر ماروں گی میں پھر آؤں گی اور تمہارے لیے قیامت بن کر آؤں گی۔'' شکنتلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگتی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تابانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے قافلے تک جا پہنچتی ہے۔

مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اسے اپنی کنیز بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ مہارانی ماریہ مہاراجہ رام ناتھ کو بتاتی ہے کہ شکنتلا ناگن ہے اور انسانی روپ میں انہیں بے وقوف بنا رہی ہے اور اس کے لیے وہ چاہیں تو شاہی پنڈت گرو نرائن سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ مہاراج اس سے کہتے ہیں کہ اگر شکنتلا ناگن ہوئی تو اس کو آگ میں جلا دیا جائے گا اور اگر یہ الزام جھوٹا ثابت ہو گیا تو ماریہ کو اسی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک ہجوم شکنتلا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے۔ مہارانی ماریہ اپنے لباس میں چھپا کر لایا جانے والا آئینہ اچانک شکنتلا کے سامنے کر دیتی ہے جس میں ایک بڑی سی ناگن لوگوں کو نظر آتی ہے۔ یہ سالار بلگرام شکنتلا کے بجائے راجہ رام ناتھ کو گرفتار کر لیتا ہے۔ سامری، شکنتلا، بلگرام اور پریہ تابانہ کی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو سکتا تھا۔ ہر طرف ظلم کا راج تھا۔ شکنتلا جاپ کے ذریعے کالی ماتا کی مہان شکتی کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شکنتلا اب صرف ناگن نہ تھی بلکہ جادوگرنی بھی بن چکی تھی۔ شکنتلا سبز آنکھوں اور گھنگریالے بالوں والے نوجوان کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتی ہے۔ وہ شکنتلا کو بتاتا ہے کہ وہ جنات کے بادشاہ خسکران کا بیٹا شکران ہے اور تمہارا کوئی جادو مجھ پر کارگر نہیں ہوگا۔ شکنتلا خسکران کو دوست بنانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ وہ بھی اس کا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ سامری گرو نرائن کو منڈل جاپ سے باز رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے گرو شداد کی روح سے مدد طلب کرتا ہے۔ سامری جادوگر کی ملاقات خسکران سے ہوتی ہے۔ شکنتلا، شکران اور سامری تینوں گرو نرائن کے منڈل کے پاس جا پہنچتے ہیں لیکن گرو نرائن اپنا جاپ مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ شکنتلا کی ساری شکتیاں معطل ہو گئی تھیں اب وہ بالکل ایک عام سی کمزور بے بس لڑکی تھی۔ گرو نرائن شکنتلا سے کہتا ہے کہ چھٹکارے سے بولو کہ آئندہ تمہیں مالکن نہ کہے بلکہ براہِ راست میرا حکم مانے۔ ادھر پریہ حیران تھی کہ کئی دن گزر گئے نہ شکنتلا واپس آئی اور نہ سامری یا خسکران۔ پریہ کو پتا تھا گرو نرائن شکنتلا کو غلام بنانا چاہ رہا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ شکنتلا کا غلام بن جانا اس کے حق میں بہتر ہے تاکہ وہ حکومت پر قبضہ کر کے ملکہ بن جائے تب اچانک خسکران آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ گرو نرائن تیرتھ جاپ میں کامیاب ہو کر شکنتلا کے جسم و جان اور اس کی تمام شکتیوں پر قابض ہو گیا ہے اور سامری بھی اس کے پاس قید ہو گیا ہے، یہ سن کر وہ خوش ہو جاتی ہے۔ سامری کو ہوش آتا ہے تو سامنے گرو نرائن اور لکشم ناتھ موجود تھے۔ تب وہ اپنے دیوتا کا رتیکا کو اپنی سہائتا کے لیے پکارتا ہے، گرو نرائن منتر پڑھتا ہے اور نیلی آگ کے شعلے سامری اور شکنتلا کو گھیر لیتے ہیں۔ شکنتلا گرو نرائن کو بھی اس آگ میں کھینچ لیتی ہے اور ان کے جسم جلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب شکنتلا کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ ایک ویران اور بنجر جگہ پر موجود تھی۔ اس کا جسم بری طرح جلا ہوا تھا اور زخموں میں پیپ پڑ چکی تھی، اسی حالت میں شکنتلا تڑپتی سسکتی آبادی تک پہنچتی ہے جہاں اس پر کتے حملہ کر دیتے ہیں اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ جب اس کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک گھر میں موجود ہوتی

ہے ایک نوجوان لڑکا، لڑکی اور ادھیڑ عمر عورت اور مرد موجود تھے۔ علاج اچھی خوراک اور مکمل آرام سے اس کے زخم بھرنے شروع ہو چکے تھے۔ لڑکی سندری شکنتلا کی دوست بن گئی ہے۔ شکنتلا دیکھتی ہے کہ سندری کا بھائی گگن رات گئے چپکے سے روز باہر نکل جاتا ہے۔ شکنتلا کو خود میں خون کی کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ چمتکار کو یاد کرتی ہے۔ وہ اس وقت حیرت زدہ رہ جاتی ہے جب چمتکار کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتی ہے، وہ سوچتی ہے کہ اس کو کھوتی ہوئی شکتیاں واپس مل گئی ہیں۔ شکنتلا کھوئی ہوئی شکتیاں پا کر کھلکھلا اٹھتی ہے۔ گاؤں کے کھیتوں سے نوجوان کی لاش ملتی ہے جس کی شہ رگ کاٹ کر اس کا خون پی لیا گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس بات سے بہت خوف زدہ ہوتے ہیں۔

دلاور نامی شخص جس کو سادھو کوٹھاری نے اپنے بس میں کیا ہوا تھا۔ کوٹھاری دلاور سے کہتا ہے کہ تمہارے ذریعے ایک جن میرے قبضے میں آئے گا جو میرے تمام کام پل بھر میں کر دے گا۔ پھر تو بھی کوٹھاری کا چیلا بن کر عیش کرنا۔ پریہ خسکران اور دونوں کی مدد سے حکومت کر رہی تھی اور دونوں کو خوش رکھتی تھی۔ تب ایک روز خسکران شکنتلا کی تلاش میں نکلتا ہے اور پھر واپس نہیں آتا اور پھر ایک روز وہ بلگرام کو بھی قید خانے میں ڈال دیتی ہے جہاں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ کر بلگرام بھی بے بسی کی موت مارا جاتا ہے۔ شکنتلا کو چمتکار بتاتا ہے کہ سندری کے بھائی گگن کو ایک چڑیل خوب صورت لڑکی بن کر اپنے جال میں قید کر چکی ہے اور روزانہ تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا خون پیتی ہے۔ چمتکار شکنتلا کو اس جگہ لے جاتا ہے جہاں گگن مدہوشی کی حالت میں تھا اور وہ لڑکی اس کا خون پینے کو اس پر جھکی ہوئی تھی۔ تب وہاں اچانک شکنتلا نمودار ہوتی ہے اور کالی دیوی کا جاپ پڑھ کر اس چڑیل کو آگ لگا کر ہلاک کر دیتی ہے۔ گگن کو ہوش آتا ہے تو وہ اسے سب بتا کر گھر واپس جانے کا کہتی ہے۔ پیرا کروٹڈیا اور اس کے چیلا شیش ناگ کو اپنے بس میں کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ بڑی تپسیا میں مصروف تھے۔ کوٹھاری دلاور کو ساتھ لے کر قبرستان پہنچتا ہے اور کدال سے ایک قبر کی مٹی ہٹاتا ہے۔ قبر سے جواں سالہ عورت کی لاش نکلتی ہے۔ دلاور اس کے بال کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے۔ وہاں سے کوٹھاری اسے ایک مکان کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے اور دلاور سے کہتا ہے کہ اس مکان میں میاں بیوی اور ان کی ایک جواں سال بیٹی ہے، بوڑھے کو باہر بلا کر میں ابھی قتل کرتا ہوں، جبکہ لڑکی کو تو ہی لائے گا میرا ہاتھ لگانا منع ہے۔ اس کے بعد دلاور دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اندر سے ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکلتا ہے، کوٹھاری اس پر حملہ کر دیتا ہے اور اسے گردن سے دبوچ لیتا ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر دلاور مکان میں گھس جاتا ہے۔ جہاں ایک کمرے میں نوجوان دوشیزہ موجود تھی اور دروازے کی آواز سے نیند سے بیدار ہو گئی تھی۔ وہ دلاور کو دیکھ کر خوف زدہ ہو کر چلانے لگتی ہے۔ دلاور اس لڑکی کو بے ہوش کر کے باہر کوٹھاری کے پاس لے آتا ہے، کوٹھاری اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہے، اور دلاور کے ساتھ اپنی شکتی کے ذریعے ایک بنجر اور بیابان علاقے میں پہنچ جاتا ہے۔ اور اس دوشیزہ کو ایک چتا پر لٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتا ہے۔ لڑکی ہوش میں آ کر رونے گڑگڑانے لگتی ہے۔

دلاور کو اس پر ترس آ جاتا ہے اور وہ کوٹھاری پر حملہ کر دیتا ہے۔ کوٹھاری غصے میں آ کر اسے ہاتھ پاؤں ہلانے کی طاقت سے محروم کر دیتا ہے اور پھر اپنے جنتر منتر میں مشغول ہو جاتا ہے، تب ایک نیلا شعلہ آسمان سے زمین کی طرف آتا ہے جس کے ساتھ دھواں ساتھا، وہ دھواں جو کہ خسکران جن تھا، آہستہ آہستہ بوتل میں داخل ہو جاتا ہے۔ کوٹھاری ڈھکن لگا کر بوتل کا منہ بند کر دیتا ہے اور خوشی میں ناچنا شروع کر دیتا ہے اور دلاور سے کہتا ہے کہ کوٹھاری آج بہت بڑی شکتی بن گیا ہے، ایک جن اس کے قابو میں آ گیا ہے جو اس کے سارے کام کرے گا۔ کوٹھاری اس سارے عمل کے بعد سامان سمیٹ کر اٹھنے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے کہ راجہ ہری داس کے سپاہی اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ راجہ ہری داس عیاش ہونے کے باوجود ایک رحم دل اور رعایا کا خیال رکھنے والا حکمران تھا۔ اس نے جادوگر اور جادوگرنیوں کے خلاف سخت قانون بنایا ہوا تھا جس کی وجہ سے پوری راجدھانی میں جادو ٹونے کرنے والا نہیں تھا۔ کوٹھاری کئی بار اس جرم میں گرفتار ہوا تھا لیکن وہ ہر بار فرار ہو جاتا۔ اس بار اسے گرفتار کر کے ہری داس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور سزا کے طور پر اس کے ہونٹ سی دیے گئے تھے۔ ہری داس کو کوٹھاری کے تھیلے سے برآمد ہونے والا سامان دکھایا جا رہا تھا جس میں ایک شیشے کی بوتل بھی تھی جس میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ راجہ اس بوتل کو کھولنے کا حکم دیتا ہے اور چند ہی لمحوں میں میدان میں خسکران جن موجود تھا جو بوتل میں بند تھا۔ تمام لوگ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ خسکران کوٹھاری کو آزاد کر دیتا ہے اور وہ اسے پوری ریاست کو آگ لگا دینے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر گگن شکنتلا کے متعلق سوچتا ہے کہ شکنتلا کو کیسے اس چڑیل کا پتا چلا اور کیسے اسے ختم کر دیا۔ شکنتلا گگن سے رات کو گاؤں سے باہر بیری کے درختوں کے پاس ملنے کے لیے کہتی ہے۔ شکنتلا کو خون کی پیاس بے تاب کرتی ہے، لیکن گگن کے گھر والوں کے احسانات کی وجہ سے وہ گگن کا خون پینا مناسب نہیں سمجھتی۔ وہ رات کے وقت سانپ کے روپ میں ایک گھر میں داخل ہو جاتی ہے اور ایک عورت کے خون سے اپنی پیاس بجھاتی ہے۔ ان خونی وارداتوں سے گاؤں میں کہرام مچ جاتا

ہے۔ پنچایت میں فیصلہ کیا جاتا ہے کہ گاؤں میں نئے آنے والوں کو علاقہ بدر کر دیا جائے اور وہ لوگ گاؤں کے مکھیا گگن کے پتا سے شکنتلا کو بھی علاقے سے باہر نکالنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

شکنتلا صحن میں ٹہل رہی تھی۔ صحن کے آگے مندر کی اندرونی عمارت تھی۔ چھوٹے بڑے دروازوں پر سانپوں کی شبیہہ نمایاں ہیں۔ بڑے دروازے سے اندر شکنتلا داخل ہوتی ہے۔ بے شمار یاتری ناگ دیوتا کے گرد پوجا پاٹ کرتے نظر آئے۔ اچانک ناگ دیوتا بت کے عقبی دروازے سے ایک پالکی برآمد ہوتی ہے جس پر لکشمن داس براجمان تھا۔ جس کا ناگ مندر بلکہ ناگ بھون میں سکہ چلتا تھا۔ شکنتلا نے دیکھا کہ کامنی اور ایک لڑکے کو زنجیروں میں جکڑ کر ناگ دیوتا کے مجسمے کے عقب سے گھسیٹ کر لایا گیا۔

راجکماری پریہ کو ریاست دھرم پور راجہ کی شادی میں شرکت کا موقع آیا۔ راجہ کا محل دیکھ کر پریہ نے اس سے بڑھ کر خوبصورت محل تعمیر کرنے کا سوچا اور اس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے اپنی رعایا پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ کر ہر دم کام پر لگا کر آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔

شکنتلا ناگ دیوتا کے پیروکاروں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ میں ناگن دیوی ہوں اور دیوتا کے حکم سے تمہارے پاس آئی ہوں۔ شکنتلا لکشمن داس کا مکروہ چہرہ یاتریوں کے آگے پیش کرتی ہے جس سے عوام میں غم وغصے کی لہر دوڑ جاتی ہے پھر شکنتلا کامنی کو مندر کی مہان پجارن بنا دیتی ہے۔

حسکران اور دلاور گہری نیند میں تھے کہ سائیں بابا مرچو کی آمد ہوتی ہے اور وہ دلاور کو آیاتِ قرآنی پڑھنے کی ترغیب دے جاتے ہیں۔ دلاور اُن کے کہنے کے مطابق عمل کرتا ہے۔ تھوڑی دیر میں دیکھا ابلیس کو پوجنے والی قوم کے سردار کی بیٹی کو شیر نے گھیر لیا۔ دلاور نے شیر کو ڈھیر کر کے تبریشیا قبیلے کے سردار کی بیٹی کو بچالیا۔

پریہ شکنتلا کی ذلت سے عذاب کا شکار تھی اور شکنتلا سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے شاہی پروہت سیتارام سے ملاقات کرتی ہے۔ جو اسے شکنتلا کی قید سے رہائی کے عوض شادی کی پیشکش کرتا ہے جو کہ پریہ نے مصلحت جان کر قبول کر لی۔

شکنتلا کو جب پریہ کے فرار ہونے کا پتا چلا تو وہ سامری کے ساتھ پریہ کے تعاقب میں نکلتی ہے۔ سامری اور شکنتلا ایک ہیبت ناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ بستی ہاراکاری کے اسی میدان کی زمین پھاڑ کر نکلنا شروع ہوئے جہاں وحشی دلاور کو سر کاٹنے کے لیے اس جگہ لے جانے کے لیے کھینچ رہے تھے۔ جہاں دوسرے پانچ قیدیوں کے سر کاٹے جا چکے تھے۔

دلاور چٹان کی اوٹ میں بیٹھے بیٹھے اونگنے لگا اور نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ پھر بابا سائیں مرچو نیند سے اسے جگاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کوٹھاری مر چکا ہے۔ اور تم آزاد ہو اور تم باوضو رہا کرو نماز پڑھا کرو شکنتلا جب ہوش میں آئی تو اپنے آپ کو ریت کے اندر دھنسے پایا صرف گردن باہر تھی۔ تبریشیا نے اپنے عمل سے اسے زمین سے نکالا۔ دلاور اور شکنتلا کو ایک کوٹھری میں قید کر دیا جاتا ہے۔ دلاور اور شکنتلا کو سانپ بنتے دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ اتفاق سے شکنتلا اور دلاور بحری جہاز کے سفر میں پھر سے ساتھ موجود ہیں۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے)

اس کے بعد شکنتلا نے وحشیوں کو کچھ ہدایت کرنا شروع کر دیں اور انہیں تاکید کی کہ سفید فاموں کو ابھی جولیانا کے قتل کا پتا نہ چلے اور جو بھی سفید فام نظر آئے اسے فوراً قتل کر دو۔ جس پر وحشیوں نے اسے بتایا کہ سفید فاموں سے جھگڑا ہو تو وہ پانی اور خوراک بند کر دیں گے۔ اس پر شکنتلا نے کہا۔

''یہ میری ذمہ داری ہے۔ تم بستی کے باقی تمام جوانوں کو مسلح کر کے صبح ہونے کے قریب یہاں آجاؤ۔ میں صبح ہونے سے پہلے خوراک اور پانی کا مسئلہ حل کر دوں گی۔'' پھر شکنتلا نے صرف ان دو وحشیوں کو روک دیا جو دن بھر اسے سیر کراتے رہے تھے۔ اور باقیوں کو وہاں سے روانہ کر دیا اور اس کے بعد وہ جولیانا کی چارپائی پر بیٹھ گئی اور وحشیوں کو حکم دیا کہ وہ دو سفید فاموں کو وہاں سامنے ایک چھوٹے درخت کے ساتھ باندھ دیں۔

جب وہ اس کام سے فارغ ہو گئے تو آ کر شکنتلا کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ شکنتلا نے مسکرا کر جولیانا کی لاش کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

''تم بھی صبح سے بھوکے ہو اس کو کھا لو!'' وہ دونوں کسی قدر حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کبھی شکنتلا اور کبھی جولیانا کی لاش کی طرف دیکھنے لگے۔ جولیانا کا خوف ابھی تک ان کے ذہنوں سے نہ نکلا تھا۔ لیکن شکنتلا

نے انہیں یقین دلایا کہ وہ مر چکی ہے۔ اور صبح تک سفید فاموں کی جگہ جزیرے پر خود ان کا قبضہ ہوگا۔ لہٰذا وہ دونوں لاش کے پاس بیٹھ گئے اور پھر چھریاں نکال کر پسندیدہ جگہوں سے اس کا گوشت کاٹ کاٹ کر مزے مزے سے کھانے لگے۔ دلاور بھی شکنتلا کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔

''دلاور!'' شکنتلا نے اک ادا سے اسے کہنی کا ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

''ہوں'' دلاور ہنکارا۔

''اب کیا کیا جائے؟''

''حبشیوں سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں ہم دونوں رات گہری ہونے کے بعد سفید فاموں کی رہائشی جگہ پہنچ جائیں گے اور کوشش کریں گے رات ہی رات زیادہ سے زیادہ سفید فاموں کو ہلاک کر دیں تاکہ ان کی تعداد کم ہو جائے اور وہ کمزور پڑ جائیں۔ پھر جب علی الصبح جنگلیوں کی کمک پہنچے گی تو ان پر براہِ راست حملہ کر دیں گے۔''

''اور پانی کے چشمے کا کیا بنے گا؟'' شکنتلا بولی۔ ''اگر ہم اس پر قبضہ نہ کر سکے تو صبح یہ لوگ پانی بند کر دیں گے۔ اس گرمی میں اگر دو دن بھی پانی کے بغیر گزرے تو مصیبت آ جائے گی اور ان وحشیوں کی ساری اکڑفوں نکل جائے گی۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم اِن دونوں کو لے کر پانی کے چشمے کی طرف چلے جاؤ اور میں سانپ بن کر سفید فاموں کے علاقے میں جاتی ہوں۔ اپنا اپنا کام کر کے اسی جگہ آ جائیں گے۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن معاہدہ یاد ہے نا؟''

''کون سا معاہدہ......؟'' شکنتلا حیرانی سے بولی۔

''وہی کہ حالات جیسے بھی ہوں، ہم دونوں اچھے دوست رہیں گے۔ لہٰذا میں چاہوں گا اس جزیرے سے نکلتے ہی تم مجھے میرے گھر، میری بیوی کے پاس چھوڑ دوگی اور خود واپس چلی جاؤ۔''

''یہ بات سن کر شکنتلا کی آنکھوں میں تذبذب کے آثار نظر آنے لگے۔ پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''ہاں...... ہاں...... ٹھیک ہے۔'' اتنی دیر میں وحشی پیٹ بھر چکے تھے۔ جولیانا کی جگہ جگہ نچی ہوئی لاش بہت ہیبت ناک لگ رہی تھی۔

شکنتلا نے وحشیوں کو حکم دیا کہ باقی ماندہ لاش صدر دروازے پر موجود پہرے داروں کے حوالے کر دی جائے۔ اور انہیں تمام تر صورت حال بتا دی جائے۔'' پھر خود ہی بولی۔ ''میرا خیال ہے تمہارے جو ساتھی یہاں سے گئے ہیں انہوں نے سب کو بتا دیا ہوگا۔'' ایک جنگلی گیا اور پہرے پر متعین آٹھ دس جنگلیوں کو اندر لے کر آ گیا۔ شکنتلا نے ان سب کو جولیانا کی لاش سے دعوت اڑانے کا اشارہ کیا تو سرخ سپید مرغوب غذا دیکھ کر سب اس پر پل پڑے۔ فارغ ہوئے تو شکنتلا نے انہیں ساری صورت حال سمجھائی۔ افریقیوں نے انہیں بتایا کہ پانی کے چشمے پر آٹھ دس سفید فام اور تقریباً اتنے ہی افریقی ہوتے ہیں۔ سفید فام سارا کام افریقیوں سے لیتے ہیں اور خود سارا دن بیٹھے گپیں ہانکتے رہتے ہیں۔ لیکن وہاں متعین سیاہ فام حد سے زیادہ ان سفید فام آقاؤں کے فرنبردار ہوتے ہیں لہٰذا بغیر جنگ کے قبضہ نہ ملے گا۔

''پھر ایسا کرتے ہیں۔'' دلاور نے شکنتلا سے کہا۔ ''میں مزید دس بارہ افریقی ساتھ لے جاتا ہوں۔ یہ سب بھالوں اور تیر کمان سے مسلح ہوں گے۔ امید ہے، اتنی طاقت کافی ہوگی۔''

یوں تقریباً پچاس افراد کا دستہ تیار ہو گیا، جس کی قیادت دلاور نے سنبھالی۔ وہ ان کی زبان سے ناآشنا تھا اس لیے راستے میں وہ ان سے باتیں کرتا رہا۔

☆......☆......☆

پانی کا چشمہ جنگل کے بیچوں بیچ ایک نشیبی جگہ پر واقع تھا۔ وہاں سفید فاموں نے سیاہ فام مزدوروں کی مدد سے بہت سے درخت کاٹ کر چشمے کے اردگرد خاصی زمین صاف کر لی تھی اور وہاں مٹی اور پتھروں سے دائرے کی شکل میں بند

باندھ کر پانی کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع کرلیا تھا۔ انہوں نے بند کے اردگرد تاریں بھی لگا رکھی تھیں۔ اندر جانے کے لیے باڑ میں ایک جگہ دروازہ بھی بنایا گیا تھا جس پر عموماً دو تین افریقی اور ایک مسلح سفید فام شخص چار پائی بچھائے بیٹھے رہتے۔ لیکن جن دنوں افریقیوں کا پانی بند کردیا جاتا، اس وقت یہاں کڑا پہرا ہوتا تھا اور سفید فاموں کی تعداد بڑھادی جاتی تھی ان دنوں کچھ محافظ خاردار تار کے گرد بھی ہر وقت پہرے میں گھومتے رہتے تھے۔ بند باندھنے سے جو چھوٹی سی جھیل بنی تھی اس کے اندر سے ایک نالی کی صورت میں پانی باہر نکلتا اور خاردار تاروں سے کافی دور جا کر ایک حوض میں گرتا تھا۔ وہاں سے ایک مقامی کالی آبادی ضرورت کے مطابق پینے کے لیے پانی لے جاتی تھی۔ جب بھی جھگڑے، بغاوت یا سزا کے طور پر جولیانا کے حکم سے کالوں کو پانی کی فراہمی بند کردی جاتی تو اس سخت گرم جزیرے کے باسی پیاس سے مرنا شروع ہوجاتے، تب مجبور کالے جولیانا کے آگے غیر مشروط طور پر گھٹنے ٹیک دیتے اور جولیانا ان سے من مانی شرائط منوا لیتی۔ کیوں کہ اسے معلوم تھا اس جزیرے سے جہاں ایک طرف پہاڑ اور اس کی عقب میں کھولتی دلدل اور تین اطراف سمندر کا کھارا پانی ہے، کالے حبشی بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ اس کے پاس ایک اور حربہ بھی تھا۔ پھلدار درخت بھی زیادہ تر پانی کے چشمے کے حدود کے اندر تھے۔ باقی جزیرے میں موجود پھل دار درخت کسی نہ کسی بہانے جولیانا کٹوا دیتی تاکہ کھانے پینے کے سلسلے میں بھی جزیرے پر قلت رہے۔ یوں تقریباً ایک ہزار جنگلیوں پر سو کے قریب سفید فام حکومت کررہے تھے اور وہ ان کی غلامی کرنے پر مجبور تھے۔ سیاہ فاموں کو تو چھوٹی کشتی رکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی جبکہ سفید فاموں کی بڑی کشتیاں تھیں۔ ان کی کشتیاں اور بحری قزاقی کے لیے چھوٹے جہاز بھی ایک خاص جگہ لنگر انداز ہوتے جس کے اردگرد خاصا علاقہ خاردار تار لگا کر اسے عام افریقیوں کے لیے ممنوعہ علاقہ قرار دے دیا گیا تھا۔ وہاں صرف وہ حبشی آجاسکتے تھے جو براہِ راست سفید فاموں کے غلام تھے۔ سفید فام اپنی رہائش خاردار تاروں کے اندر محفوظ ایک کالونی میں رکھتے تھے۔ یوں پورے جزیرے پر عملاً سفید فام حاکم اور سیاہ فام غلام تھے۔

ہفتے میں دو دن پانی بند کردیا جاتا تاکہ ذخیرے میں کمی نہ ہو۔ اس کے علاوہ بھی جولیانا کبھی کبھار اپنی مرضی سے پانی کی فراہمی کئی کئی دنوں تک بند کردیتی اور جب کافی دن گزر جاتے تو پھر حفاظتی دستے کے ساتھ افریقیوں کی بستی کا دورہ کرنے کے لیے چلی جاتی اور اپنی مرضی کے چند خوبصورت صحت مند نوجوان مرد لینے کی شرط پر پانی دینے کا وعدہ کرتی۔ اور پھر ان حبشیوں کو غلامی کی کڑی تربیت دینے کے بعد بحری جہاز پر سوار کرا کر مہذب ملکوں میں فروخت کروادیتی۔ یوں جزیرے کی آبادی زیادہ نہ بڑھ سکتی تھی اور کالے مسلسل کم ہوتے رہے!

☆......☆......☆

دلاور کی قیادت میں جنگلیوں کا دستہ گھپ اندھیرے میں پانی کے چشمے کی حدود میں پہنچ چکا تھا۔ رات کے سناٹے میں جانوروں کی آوازوں سے جنگل گونج رہا تھا۔ یوں چلنے والوں کی آہٹیں، ان کی آواز میں دبی رہیں۔ تمام جنگلی دلاور کی ہدایت کے مطابق پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ جلد ہی وہ پانی کے بند کے پاس پہنچ گئے۔ داخلے کی جگہ کے باہر ایک جھونپڑی بنی تھی۔ جس کے باہر آگ کا الاؤ روشن تھا۔ اس کے پاس ہی دو حبشی اونگھ رہے تھے۔ ان کی کمانیں زمین پر پڑی تھیں شاید یہاں جولیانا کی موت کی خبر نہیں پہنچی تھی۔ ورنہ یہ لوگ ہوشیار ہوتے۔ دلاور نے اشاروں سے ہدایت جاری کرنا شروع کردیں۔ اندھیرے میں ان کی آنکھیں اب بھی کام کررہی تھیں۔ دلاور نے موقع دیکھتے ہی سب کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے پچیس افراد دستے میں شامل پندرہ سولہ وحشی پہرے پر موجود دونوں کالوں پر ٹوٹ پڑے۔ شور شرابہ سن کر جھونپڑی کا کپڑا ہلا اور ایک سفید فام آدمی نے باہر جھانکا۔ دلاور نے جو پاس ہی کھڑا تھا۔ فوراً اس کی گردن ناپ لی اور اسے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ کئی جنگلیوں نے اسے پاؤں کی ٹھوکروں پر لے لیا۔ اسی اثناء میں پانچ سات حملہ آور جھونپڑی میں داخل ہوگئے اور پھر اندر سوئے ہوئے ایک سیاہ فام اور ایک سفید فام کو مارتے پیٹتے باہر لے آئے۔

دلاور کے حکم پر جھٹ پٹ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے۔ ویسے بھی شدید ضربوں سے وہ اُدھ موئے ہوچکے

تھے۔ ایک آدمی تیر کمان پر چڑھا کر ان کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا گیا اور دلاور باقی ساتھیوں سمیت پانی کے ذخیرے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر پہنچ کر دلاور نے دیکھا تقریباً تین کنال جگہ پر بند باندھ کر پانی روکا گیا ہے۔ کنارے پر اسے ایک خیمہ سا نظر آیا جس کے اندر سے چراغ کی روشنی چھن چھن کر اندر باہر آ رہی تھی۔ دلاور نے اپنے ساتھیوں کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ جنگلیوں نے جیسے ہی قدم بڑھائے خیمے کے اندر سے روشنی گل ہو گئی اور ساتھ ہی ساتھ سنسناتے ہوئے تیروں کی بوچھاڑ نکلی...... دلاور کی چھٹی حس روشنی بجھتے ہی بیدار ہو گئی تھی۔ وہ زمین پر گر کر ایک طرف لڑھکنے لگا۔ لیکن جھونپڑی سے نکلنے والے دو تین تیر نشانے پر بیٹھ گئے۔ دو حبشی چیختے ہوئے زمین پر گر گئے، باقی بکھر گئے۔ اسی دوران تیروں کی دوسری بوچھاڑ نکلی لیکن اب حملہ آور ہوشیار تھے اس لیے نشانے خطا گئے۔

دلاور لڑھکتا ہوا خیمے کے پچھلی جانب چلا گیا۔ ایک جگہ سے خیمہ پھٹا ہوا نظر آیا۔ اس نے اس سوراخ سے آنکھ لگا کر جھانکا تو تقریباً چھ سات آدمیوں کے ہیولے دکھائی دیے۔ اس نے بے آواز اپنی کمان سیدھی کی اور اس پر تیر چڑھا کر ایک سوراخ سے ایک آدمی کا نشانہ تاک کر تیر چھوڑ دیا۔ ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی اور خیمے میں بھگدڑ مچ گئی۔ دلاور نے فوراً اپنی جگہ بدل لی۔ اتنی دیر میں سامنے سے حملہ آوروں نے بھی تیروں کی بوچھاڑ کر کے دو آدمیوں کو ناکارہ کر دیا۔ چند لمحے بعد دلاور نے اپنی کمان آہستگی سے دوبارہ سیدھی کی اور کھلے سوراخ کے سامنے ہوا۔ اسی وقت اندر سے ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور دلاور کے ہاتھ کو معمولی سا زخمی کر ڈالا۔ کمان دلاور کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ وہاں سے ہٹا اور دوسرا راستہ تلاش کرنے لگا۔ جس میں جلد ہی اسے کامیابی ہوئی۔ یہ سوراخ خیمے کے دائیں پہلو میں تھا اور پہلے سے بڑا تھا۔

دلاور نے کمان اس کے سامنے کی اور پھر آہستگی سے اندر جھانکا تو اس کی جانب کوئی متوجہ نہ تھا ویسے بھی اس نے دیکھا اندر آدھے سے زیادہ آدمی زخمی ہو چکے تھے اور وہ صرف تین آدمی جن میں دو سیاہ فام اور ایک سفید فام شخص تھا۔ مقابلے پر ڈٹے ہوئے تھے جس جگہ دلاور کھڑا تھا اس جگہ کسی کا دھیان نہ تھا۔ دلاور نے ایک آدمی کا نشانہ لیا اور ایک تیر داغ دیا۔ وہ شخص چیختا ہوا زمین بوس ہو گیا دلاور وہاں سے ہٹ گیا اور سامنے کی طرف آیا جہاں جنگلی تاک تاک کر خیمے کے اندر موجود لوگوں پر تیر چلا رہے تھے۔ دلاور نے ان میں سے دو کو پچھلے سوراخوں سے ہوشیار رہتے ہوئے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں خیمے کے اندر موجود تمام افراد چھلنی جسموں کے ساتھ گرفتار ہو گئے۔ دلاور نے سب کے ہاتھ باندھ کر جولیانا کے ٹھکانے کی طرف کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ جبکہ پچیس مسلح سیاہ فاموں کو چشمے کی حفاظت پر مامور کر دیا گیا۔

☆......☆......☆

شکنتلا نے دلاور کے جانے کے بعد دیکھا کہ شام کا دھندلکا ابھی باقی ہے اور رات گہری ہونے میں کافی دیر ہے۔ اس لیے وہ بڑی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ صرف ایک حبشی کو اس نے روک لیا تھا باقی سب دلاور کے ساتھ چلے گئے تھے۔ تمام سانپ شکنتلا کی چارپائی کے سامنے کنڈلی مار کر مؤدب بیٹھ گئے۔ شکنتلا کچھ دیر ان سے باتیں کرتی رہی۔ سانپ اپنی فریادیں پیش کر رہے تھے اور مسائل بیان کر رہے تھے۔ شکنتلا ہمدردی سے انہیں سنتی رہی اور ان کی دادرسی کرتی رہی۔ اس نے ان کی برادریوں کے بارے میں معلومات بھی حاصل کیں۔ پھر اس نے انہیں یقین دلایا کہ وہ وہاں کے باسیوں کو سانپوں کا احترام اور عزت کرنا سکھا کر ہی وہاں سے جائے گی۔ پھر اس نے سانپوں کو رخصت کر دیا تمام سانپ ادب سے جھکے اور پھر رینگتے ہوئے تیزی سے بکھر گئے۔ یہ سارا عمل شکنتلا کے پاس کھڑا حبشی گہری نظروں سے دیکھتا رہا...... سانپوں کے جاتے ہی وہ سجدے میں گر گیا اور اپنی زبان میں شکنتلا کو دیوی دیوی کہنے لگا...... شکنتلا نے اسے کھڑے ہونے کا حکم دیا اور پھر اسے لے کر سفید فاموں کی تلاش میں چل دی۔

سیاہ فام اس کی رہنمائی کر رہا تھا...... شکنتلا اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی...... ایک آدھ کوس دور آنے کے بعد اسے چند مکانوں پر مشتمل بستی دکھائی دی۔ کھڑکیوں سے چراغوں کی ٹمٹماتی روشنیاں اندھیرے میں ستاروں کی مانند درخشاں تھیں۔ اکادکا پہرے دار ابھی کہیں اونگھ رہے تھے۔ شکنتلا ایک جگہ رک گئی اور حبشی محافظ کو ہدایت دینے لگی اور پھر

وہ ایک گھر کی طرف چل پڑی جبکہ سیاہ فام حبشی ایک گھنے درخت پر چڑھ کر چھپ گیا۔
شکنتلا نے ایک طرف چھپ کر سانپ کا روپ اختیار کر لیا اور ایک گھر میں داخل ہوگئی دروازے سے داخل ہوتے ہی شکنتلا نے اپنے آپ کو ایک چھوٹے سے باغیچے میں پایا، جس میں جا بجا کیاریاں اور پھول تھے۔ یہ ایک بالکل چھوٹا سا دو کمروں پر مشتمل مکان تھا جو اس جزیرے پر ایک حد تک خوبصورت تھا۔ باغیچے کے سامنے ہی ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ چابی کے خلا سے اندر جھانکی تو دو مردوں کو ایک ہی بستر پر سوتے پایا۔ آہستگی سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور خوبصورت سی نیلی آنکھوں والی ایک لڑکی کا روپ دھار کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ دروازہ نہ کھلا تو پھر کھٹکھٹایا تو چند لمحے بعد ایک سفید فام جھلاتے ہوئے انداز میں باہر جھانکا۔ اس کے چہرے پر جھلملاہٹ نمایاں تھیں۔ جو شکنتلا کو دیکھتے ہی ختم ہوگئی۔
''میں اندر آ سکتی ہوں۔'' شکنتلا شائستگی سے بولی۔ وہ تو متحیر ہوگیا کہ اس جزیرے پر اس لڑکی کا کیا کام ہے۔ لیکن شکنتلا نے اسے مزید سوچنے کا موقع ہی نہ دیا اور بولی۔ ''نوجوان...... مجھے اس وقت تم جیسے مرد ہی کی تلاش تھی۔'' اس کی بات سن کر سفید فام مزید حیرت زدہ ہوا لیکن شکنتلا کے گداز سراپے نے اسے ہوش و خرد سے بیگانہ کرنا شروع کر دیا۔ خوشبودار سانسوں سے وہ پاگل ہو کر پگھلنے لگا۔ اسی اثناء میں دوسرے کی آنکھ بھی کھل گئی۔ یہ اس کے لیے ناقابل یقین منظر تھا۔ سیراب ہونے کے بعد وہ دونوں اوندھے منہ گر گئے اور گہری نیند سو گئے۔ تو شکنتلا آہستگی سے ناگن بنی اور دونوں کو ڈس کر بے ہوش کیا اور پھر ان کا خون پینے لگی۔ اچھی طرح خونی پیاس بجھا کر، خونی غسل کے بعد تازہ دم ہوگئی اور اب اس نے کھیل ختم کرنے کا فیصلہ شروع کر لیا اور سانپ کے روپ میں ہر گھر میں گھسنے لگی۔ سوتے ہوئے افراد کو ڈستی اور اگلے ہی لمحے اگلے گھر میں گھس جاتی۔ اس طرح وہ سحری تک ساٹھ ستر سفید فاموں کو ٹھکانے لگا چکی تھی۔ اب وہ بستی کے سب سے بڑے خوبصورت گھر کی طرف چل پڑی جو غالباً سفید فام حکمرانوں کا گھر تھا۔ ناگن کے روپ میں محفوظ راستوں پر رینگتی شکنتلا کو نکاسی آب کے راستے گھر میں داخل ہوتے ہی شور شرابہ سنائی دیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو عجیب منظر دیکھا کہ دس پندرہ سفید فام صرف لنگوٹ کسے شراب کے نشے میں دھت پڑے ہیں ایک طرف تین سیاہ فام حبشی بیٹھے ساز ینہ بجا رہے تھے۔ ایک اپنے سامنے دو لمبوترے طبلے رکھے انہیں پیٹ رہا ہے۔ ایک نے کھلے منہ والا باجا ہونٹوں سے لگا رکھا تھا۔ تیسرا ہارمونیم سے ملتا جلتا عجیب سی شکل کا چوکور ساز پاں پاں کر کے بجا رہا تھا۔ جبکہ تین جوان سال عورتیں چیتھڑے نما لباسوں میں الٹے سیدھے ہاتھ مار کر بھونڈے قسم کا رقص کر رہی تھیں۔ شکنتلا پہچان گئی کہ یہ وہی عورتیں ہیں جو کشتی میں بھی دلاور اور شکنتلا کے ساتھ تھیں۔ ان کا تعلق کسی ہندوستانی ریاست کے غریب اور شریف گھرانے سے تھا۔ آنسوؤں سے تر عورتوں کے چہرے اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ ان کو زبردستی نچایا جا رہا ہے۔ سفید فام بار بار ان کو کھینچ کر اپنے اوپر گرا لیتے، بھنبھوڑتے اور بے رحمانہ انداز میں قہقہے لگاتے، شراب کی بوتلیں ان کے منہ اور جسموں پر گرا رہے تھے۔ ایک عجیب طوفان بدتمیزی برپا تھا۔ مجبور عورتیں...... یہ ایسا سماں تھا کہ جیسے ''رضیہ غنڈوں میں گھر گئی ہو۔'' شکنتلا نے محسوس کیا کہ وقت دھیرے دھیرے گزر رہا ہے۔ وہ جس جگہ روشن دان میں موجود تھی وہاں گہرا اندھیرا تھا۔ لہٰذا شکنتلا سب کی نظروں سے روپوش تھی۔ مگر پھر بھی وہ اپنی جان کو براہ راست بھی خطرے میں نہ ڈالتی تھی۔ وہ چپکے سے روشن دان سے نکل کر واپس نکلی۔ اور دروازے کے پاس آ کر انسانی روپ دھار گئی اور باہر سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور خود پھر روشندان پہ پہنچ کر اندر جھانکنے لگی۔ سفید فام پوری طرح خرمستیوں میں مشغول تھے۔ مجبور عورتیں معافی کی طلبگار تھیں۔ مگر ابلیسی پیروکار اپنے آقا کی خوشنودی کے لیے ہر حد عبور کرنے کی قسم کھائے بیٹھے تھے اور عورتوں کی عزتیں تار تار ہونے لگیں۔ گرو ہی عصمت دری کا نظارہ شکنتلا کے سامنے آ گیا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی بڑھنے لگیں لیکن اس نے خود پر قابو رکھا اور چپکی بیٹھی رہی۔
رات کے آخری پہر تک عورتیں بے ہوش ہو چکی تھیں جبکہ گورے گہری نیند کے مزے لوٹنے لگے تو شکنتلا حرکت میں آئی...... وہ ان کو ہلاک نہ کرنا چاہتی تھی لہٰذا اس نے سب کو باری باری ڈس کر اتنا زہر ان کے جسموں میں داخل کر دیا کہ وہ بے ہوش ہو جائیں۔ عورتوں کو بھی اس نے بے ہوش کر دیا۔ اب یہ لوگ دن چڑھنے سے قبل آنکھ نہیں کھول سکتے

چلو بھر پانی

قومی اسمبلی کا جب بھی اجلاس ہوتا ہے تو ساری دنیا کی نظریں اس پر مرکوز ہو جاتی ہیں، بڑے تو بڑے چھوٹے بھی قومی نمائندوں کے آدابِ نشست و برخاست، اندازِ گفتگو، طرزِ تخاطب اور لب و لہجے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ بات بلاچون و چرا تسلیم کر لینی چاہیے کہ غیر محسوس طور پر قومی اسمبلی کی کارروائی ہماری روحوں میں حلول کر جاتی ہے اور معاشرہ ہر سطح پر وہی رنگ اختیار کر جاتا ہے جو قومی اسمبلی کا رنگ ہوتا ہے۔

کیا یہ شرم کی بات نہیں کہ قومی اسمبلی کے ریکارڈ میں جہاں اور بہت کچھ درج ہو گیا، وہاں ''الو کے پٹھے'' اور ''نازیبا گالیاں'' بھی آ گئیں۔ ان کلمات پر کسی نے داد دی ہو یا نہیں کم از کم میرے محلے کے لونڈوں نے خوب تالیاں بجائیں اور شور مچایا۔

''بھئی! مزہ آ گیا...... بڑا مزہ آیا۔''

مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ اس وقت میرے پاس چلو بھر پانی بھی نہیں تھا۔

(سہام مرزا کی کتاب ''جاگتے رہنا'' سے عمار رشید کراچی کا انتخاب)

تھے۔ ایک عام سانپ بیک وقت اتنے انسانوں کو نہیں ڈس سکتا لیکن یہ ناگن دیوی تھی۔ جس کے اختیارات اور زہر لا محدود تھے۔ اب شکنتلا باہر نکل آئی اور انسانی روپ میں چلنے لگی تو کہیں آس پاس سے ہی دو پہرے دار نکل کر اچانک سامنے آ گئے۔ یہ دونوں کالے تھے۔ شکنتلا نے انہیں مقامی زبان میں ساری بات بتائی لیکن وہ وحشی خر دماغ تھے۔ انہوں نے اس کی بات ان سنی کر دی۔ اور اسے پکڑ کر اندر واپس لے جانے لگے۔ اسی اثناء میں شکنتلا کا محافظ سامنے آ گیا۔ اور وہ سیاہ فاموں کو گوروں کے خاتمے اور کالوں کی بحالی آزادی کی نوید سمجھانے لگا۔ خاصی تکرار کے بعد کالوں نے شکنتلا کے ساتھ اندر جا کر گوروں کو آنکھوں سے بے ہوش دیکھنے کے بعد ان کی بات کا اعتبار کر لیا۔ یوں شکنتلا ان دونوں کو گوروں کے پہرے پر چھوڑ کر محافظ کے ساتھ بڑی چارپائی والی جگہ پر آ گئی جہاں دلاور اور قبیلے کے تمام وحشی پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ اس وقت صبح ہو رہی تھی۔ پرندے چہچہا رہے تھے۔

مقامی افریقی دلاور اور شکنتلا کے شکر گزار نظر آ رہے تھے۔ جنہوں نے انہیں گوروں سے رہائی دلائی تھی۔ شکنتلا نے ایک دستہ گوروں کی بستی کی طرف روانہ کیا کہ بے ہوش جب ہوش میں آئیں تو انہیں رسیوں سے جکڑ کر یہاں لے آئیں۔ اس کے علاوہ ایک دستہ گوروں کی لاشیں اکٹھی کرنے کے لیے بھی بھیجا تاکہ افریقیوں میں انسانی گوشت تقسیم ہو سکے۔

دوپہر تک تمام کارروائی مکمل ہو گئی۔ اور تمام لاشیں میدان میں آڑی ترچھی پڑی تھیں۔ ہوش میں آئے ہوئے سفید فاموں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر میدان میں کھڑا کر دیا گیا۔ ان کے چہرے موت سے زرد ہو چکے تھے۔ رات والی بدمستی شکنتلا کو ان کے چہرے پر کہیں نظر نہ آ رہی تھی۔ سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ شکنتلا اور دلاور بڑی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ تمام وحشی قبیلے جن میں اب عورتیں اور بچے شامل ہو چکے تھے ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے تھے۔ دلاور چونکہ ان کی زبان نہ سمجھتا تھا لہٰذا شکنتلا ہی ان سے تمام گفتگو کرتی۔ شکنتلا کے استفسار پر ان دونوں محافظوں کو جو کل صبح شکنتلا کے ساتھ تھے۔ سرداری کے لیے امیدوار نامزد کیا گیا اور ان کی آپس میں جنگ کروا دی تاکہ سردار کا فیصلہ ہو سکے۔ ان میں سے ایک کا نام گوبو اور دوسرے کا نام سبایا تھا۔ مقابلہ گوبو نے جیت لیا۔ لہٰذا وہ سردار بنا دیا گیا۔ اور سبایا کو اس کا نائب...... یوں یہ قبیلہ پھر سے خودمختیار ہو گیا۔ اب شکنتلا نے تمام لاشیں افریقیوں کو کھانے کے لیے دے دیں تو وہ سب آدم خور وحشی لاشوں پر ٹوٹ پڑے، جس سے بھگدڑ مچ گئی شکنتلا کے لیے یہ منظر بڑا دلچسپ تھا۔ اس بھگدڑ میں اپنے ہی قبیلے کے قدموں تلے

آ کر کئی وحشی مارے گئے۔ وہ لاشیں بھی شکنتلا نے کھانے کو دے دیں۔ یوں سہ پہر تک لاشوں کا صفایا ہو چکا تھا۔ اب صرف زندہ سفید فام یا قیدی رہ گئے تھے۔ جو غلام بنانے کے لیے قبیلے پر اغواء کر کے لائے گئے تھے اتنے میں خبر آ گئی کہ بحری قزاقوں کا جہاز مزید مغوی لے کر ساحل پر لنگر انداز ہو چکا ہے۔ شکنتلا نے سب وحشیوں کو مسلح ہو کر ان کے پنجروں کے آس پاس چھپ جانے کو کہا۔ جہاں بحری قزاق اغوا شدہ مسافروں کو لا کر رکھتے تھے۔

شام تک تمام بحری قزاق بھی پابہ زنجیر ہو چکے تھے۔ غلام بنا کر لائے جانے والے اور پہلے سے بھی موجود قیدیوں کی تعداد بھی سو کے قریب تھی۔ انہیں آزاد کر دینے کا فیصلہ دلاور نے کیا جس کی شکنتلا نہ چاہنے کے باوجود مخالفت نہ کر سکی۔ دلاور نے انہیں گوروں کی بستی میں فی الحال رہنے کو کہا کہ جب ہم جزیرے سے جائیں گے تو آپ لوگ ہمارے ساتھ اسی بحری جہاز میں جائیں گے۔

جہاز کے ملاحوں اور کپتان شمبالو کو قید کر دیا گیا کہ جہاز تو انہوں نے ہی مہذب دنیا تک لے جانا ہے۔ انہیں جان بخشی کی یہی شرط بتائی گئی تھی جس پر انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ بھی جولیانا اور اس کے ساتھیوں سے عاجز تھے۔

شکنتلا اور دلاور نے افسروں والے اس گھر میں رہائش کا فیصلہ کیا جہاں رات کو شکنتلا نے عورتوں کی عزتیں تار تار ہوتی دیکھی تھیں۔ سفید فام قیدیوں کو سزائے موت دوسری صبح دینے کا متفقہ فیصلہ ہو گیا۔ یوں دلاور اور شکنتلا کی آمد جزیرے کے اصل باشندوں کے لیے آزادی کی نوید بن گئی۔

☆......☆......☆

شکنتلا بستر پر لیٹی کھلی آنکھوں سے چھت کی کڑیاں گن رہی تھی۔ اس کی زندگی کتنی ہنگامہ خیز تھی کبھی وہ اختیارات اور شکتیوں کی بلندیوں پر ہوتی تو کبھی جگہ جگہ ذلیل و خوار ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ بھی اپنی ریاست تابانہ سے ہزاروں کوس دور افریقیوں کے ایک جنگل میں پڑی تھی۔ درمیان میں سمندر ہی سمندر تھا اور پانی کے پہلا سفر کا تجربہ ہی بھیانک ثابت ہوا تھا۔ جس سے اس کے دل و دماغ پر پانی کا خوف چھا چکا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پانی کا یہ سفر دوبارہ کرنا پڑے گا کیوں کہ بقول سامری پانی میں آپ کا جادو کسی دوسرے پر اثر نہیں کرتا لیکن پھر ایک خیال اچانک اس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا کہ اگر جادو کسی پر اثر نہیں کرتا تو پریہ اور سیتا رام کا اڑن کھٹولہ کیسے پانی پر پرواز کرتا...... وہ بھی تو ...... بنگال کی طرف بھاگ رہے تھے اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر۔ یہ سوچتے ہی شکنتلا کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ سامری کی بات بھی درست تھی اور وہ اس کا عملی تجربہ بھی دیکھ چکی تھی لیکن جادو پانی میں دوسروں پر اثر نہیں کرتا تھا۔ اپنے فائدے کے لیے شاید کرتا ہے۔

اس نے آزمائش کا فیصلہ کر لیا۔ دلاور اس کے سامنے ہی دوسرے بستر پر بڑی بے فکری کی نیند سویا پڑا تھا۔ اس کی بے فکری اور دلیری سے کبھی کبھی شکنتلا چڑ جاتی۔

اب شکنتلا نے دل ہی دل میں کوئی منتر پڑھ کر سوچا کہ میں ساحل سمندر پر پہنچ جاؤں۔ اچانک جھپاکا ہوا اور پھر شکنتلا کی خوشی سے چیخ نکل گئی جب اس نے اپنے آپ کو پانی کی موجوں کے پاس کھڑے پایا۔ دیو ہیکل موجیں آ آ کر اپنا سر ساحلی چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ آسمان بالکل صاف اور ستارے درخشاں تھے۔ آسمان کے سینے پر چاند تیر رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا مسحور کن تھی۔ شکنتلا جھوم گئی اور واپس کمرے میں پہنچ گئی اور پھر سانپ کے روپ میں باہر نکل گئی۔ گوروں کی بستی میں اغوا شدہ مسافر گرمی کی وجہ سے کھلی جگہوں پر سو رہے تھے۔ شکنتلا نے ایک شخص کی طرف دیکھ کر منتر پڑھا اور اسے آگ لگا دینے کا سوچا۔ چند لمحے گزر گئے مگر کچھ نہ ہوا کئی بار اس نے ایسا کر کے دیکھا مگر ندارد۔

اب اس نے خود کو ہاتھی بنانے کا سوچا تو پل بھر میں ہاتھی کا روپ اختیار کر گئی۔ وہ واپس انسانی شکل میں آ گئی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ اس کا سحر دوسروں پر تو اثر نہیں کر سکتا مگر وہ اسے اپنے کام میں لا سکتی ہے۔ اپنے کام مطلب اپنی حفاظت تو کر ہی سکتی ہے۔ اس کے لیے یہی کافی تھا۔ وہ آ کر بستر پر لیٹ گئی اور دلاور کو غور سے دیکھنے لگی۔ گورا چٹا، صحت مند، گھنے کالے بال، بازوؤں کی کی پھڑکتی مچھلیاں، نکلتا ہوا قد، صاف شفاف رنگ، چمکتی آنکھیں...... یہ پہلا شخص تھا جو آج

تک اس کے قابو میں نہ آیا تھا۔ اور نہ ہی اس سے ڈرتا تھا۔ وہ اسے قابو کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ حالانکہ کشتی میں بھی اس سے وعدہ اور سوگند کھا چکی تھی۔ لیکن شکنتلا کی سرشت میں وفا نہ تھی۔ مطلب کے وقت وہ پاؤں پڑ جاتی اور مطلب نکل جاتا تو گلے پڑ جاتی۔ پاسداری اس کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ اس کا ذہن پٹری سے اترنے لگا۔ دلاور کا سر جھکانے کے لیے وہ تانے بانے بننے لگی اور پھر شاید کسی نتیجے پر پہنچ گئی اور مسکراتے ہوئے بالوں کو جھٹک کر ایک طرف کروٹ لے کر آنکھیں موند لیں۔

☆......☆......☆

اگلی صبح شکنتلا نے بوسا کا قبیلے کے باسیوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں کرنے کے لیے تمام قبیلے کو اکٹھا کیا اور پھر سفید فام قیدیوں کو لا کر اکٹھا کیا گیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا قد بڑھنا شروع ہو گیا۔ اس کے بالوں سے کالا رنگ ٹپکنے لگا۔ دانت ہاتھ بھر کے ہو کر، منہ سے باہر نکل آئے اس کا قد درختوں سے اونچا ہونے لگا۔ اس کی شکل پر پھٹکار برسنے لگی۔ یہ منظر دیکھ کر بوسا کا قبیلے کے افراد پھر اس کے سامنے سجدے میں گر گئے کیا عورتیں، کیا بچے، کیا مرد ڈر کے مارے چیخیں مارنے لگے تو اچانک پھر شکنتلا نے خوبصورت انسانی روپ اختیار کر لیا۔ تمام وحشی جھکے ہوئے تھے۔ اس کے بعد شکنتلا نے یکے بعد دیگرے انہیں ہاتھی، شیر اور کئی روپ اختیار کر کے دکھائے تاکہ پوری طرح ان کے ذہن قابو میں آ جائیں اور یہی ہوا...... وحشیوں کے ذہنوں میں دہشت بیٹھ گئی کہ یہ کوئی اوتار دیوی ہے۔

اب شکنتلا نے ایک سیاہ فام کو آگے لا کر اپنے سامنے لانے کا حکم دیا تو فوراً عمل کیا گیا۔ اب شکنتلا نے خنجر مانگا۔ خنجر ہاتھ میں لیتے ہی شکنتلا نے سفید فام کی گردن پر رکھ لیا۔ اور قبیلے کی طرف دیکھ کر بولی "سفید فاموں کا خون تم پر ناگ دیوتا کی رحمتیں لائے گا۔ آج کے بعد کوئی سفید چمڑی والا تمہاری سرزمین پر قدم نہیں رکھے گا۔ تمہیں چاہیے کہ وقت ضائع کیے بغیر اس کا گلا کاٹ کر اس کے خون سے اپنی دھرتی کی پیاس بجھاؤ۔ ایک رات بھی انہیں زندہ نہ رہنے دینا۔ اس طرح کبھی گورے تمہیں اپنا غلام نہیں بنا سکیں گے۔" یہ کہہ کر شکنتلا نے تیز خنجر سفید فام کے گلے پر پھیرنا شروع کر دیا۔ جس سے وہ تڑپ اٹھا اور چلانے لگا۔ لیکن اس کی شہ رگ میں تھوڑا سا شگاف پڑ چکا تھا لہٰذا خون بہہ نکلا جب سفید فام دیوانہ وار ایک طرف بھاگ نکلا۔ شکنتلا نے وحشیوں کو حکم دیا کہ اس کو پکڑ کر موج اڑائیں۔ تو کئی وحشی دیوانہ وار اس کے پیچھے لپکے اور اس پر پل پڑے۔ چھینا جھپٹی میں سفید فام کی تکہ بوٹی کر ڈالی اور چند ہی ساعتوں بعد وہاں سفید فام کی بچی ہوئی استخوانی ہڈیاں پڑی تھیں گوشت اور خون نہ تھا۔ دوسرے سفید فام یہ منظر دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے اور شکنتلا کی طرف دیکھ کر زار و قطار رونے لگے لیکن شکنتلا رات کو ان کی خرمستیاں اور بدمستیاں دیکھ چکی تھی۔

اب شکنتلا دوسرے سفید فام کے پاس گئی وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ شکنتلا خنجر کی نوک اس کے منہ پر مارنے لگی کبھی گردن پر وہ بلبلا کر بھاگا تو شکنتلا کے اشارے پر پکڑ کر پھر اسے شکنتلا کے سامنے لا کھڑا کر دیا گیا۔ شکنتلا پھر خنجر اس کے منہ پر مارنے لگی اور پھر اچانک ہی زور سے خنجر اس کی گردن پر مارا تو سفید فام زمین پر گر گیا تو شکنتلا اس کے اوپر ہی گر گئی اور خنجر پھینک کر اپنا منہ اس کی گردن پر رکھ دیا۔ سفید فام بری طرح تڑپتے ہوئے اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے دیوانہ وار مزاحمت کرنے لگا۔ لیکن شکنتلا کی گرفت سے نکلنا اس کے بس میں نہ تھا اور پھر وحشیوں کے سامنے ہی شکنتلا سفید فام کا خون پینے لگی۔ وحشی قبیلہ اس کو اپنا ہم صفت پا کر خوشی سے نعرے لگانے لگا۔ سیر حاصل خون پینے کے بعد شکنتلا اٹھی۔ یہ منظر دیکھ کر کئی وحشی بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔

☆......☆......☆

جزیرے پر تقریباً شکنتلا کی عملداری قائم تھی۔ دلاور محسوس کرنے لگا کہ شکنتلا کا رویہ اس کے ساتھ دوستانہ سے زیادہ حاکمانہ ہونے لگا ہے۔ کچھ دن گزر گئے شکنتلا کو اپنی سرشت کے مطابق شغل ہاتھ آ چکے تھے۔ سفید فاموں کے قبضے سے چھڑائے گئے غلاموں میں سے ایک نہ ایک روزانہ شکنتلا اپنے لیے حاضر کرواتی، نفسانی خواہشات کی تکمیل کے بعد اس کا خون پیتی اور پھر نچڑی ہوئی لاش آدم خوروں کو دے دیتی۔ جس سے وہ مزید خوش ہو جاتے۔ دن کو شکنتلا اپنے روایتی

رنگ روپ میں جزیرے کی سیر ہاتھی پر بیٹھ کر کرتی۔ دلاور دبے لفظوں کئی مرتبہ اسے قبیح فعلوں سے منع کر چکا تھا لیکن طاقت کے نشے میں شکنتلا آنکھیں ماتھے پر رکھ لینے کی روایت سے باز نہ آئی۔ وہ تو کتے کی دُم تھی، جو بارہ سال نلکی میں رہنے کے بعد بھی ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔ آخر کار تنگ آ کر ایک دن دلاور نے شکنتلا کے دراز ہاتھ روکنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

اس وقت دونوں رات کو حویلی میں اکیلے تھے۔ کمرہ سمندر کے زاویے پر تھا۔ خنک ہوا کمرے کے ماحول کو خوشگوار بنائے ہوئے تھی۔ دلاور کونے میں پیال کے بستر پر دراز جبکہ شکنتلا ایک کرسی پر بیٹھی اپنی سوچوں میں گم تھی۔ کھڑکی سے چودھویں کے چاند کی چاندنی چھن چھن کرتی کمرے کے اندر تک رسائی حاصل کر رہی تھی۔

''شکنتلا میرا خیال ہے اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔''

''آں...... ہاں......'' دلاور کی بات سن کر شکنتلا قدرے چونکی اور پھر اک ادا سے بال جھٹک کر مسکرانے لگی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر دھیرے سے چلتے ہوئے دلاور کے قریب آ گئی اور پھر دھپ سے اس کے پاس بیٹھ کر دلاور کے ساتھ کمر کی ٹیک لگالی۔ دلاور سنبھل گیا۔

''جیون بہت مختصر ہے جان! اس کے ہر لمحے سے مزہ نچوڑ کر نکال لینا چاہیے۔'' شکنتلا دلاور کے پیال کے بستر پر قدرے نزدیک دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''اپنے اختیارات کے ترکش کے تمام تیر استعمال کر کے انسان کو خالی ہاتھ نہیں ہونا چاہیے شکنتلا۔''

''لیکن میں تو انسان نہیں ہوں۔'' شکنتلا مسکرائی۔

''پھر تو تمہیں اور بھی محتاط ہونا چاہیے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ جبکہ تم سانپ ہو، جو تیسرے درجے کی مخلوق ہے۔''

''دلاور......'' شکنتلا خفگی سے بولی۔ ''سانپوں کو تیسرے درجے کی مخلوق کہہ کر تم نے میری توہین کی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میری تم سے دوستی ہے۔''

''بات توہین کی نہیں حق اور سچ کی ہے۔ انسان بہر حال ہر جانور سے بہتر مخلوق ہے۔''

''دلاور......'' شکنتلا غصے سے اٹھ کھڑی ہوگئی۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں پر اپنی نسل کے خلاف میں ایک لفظ سننا پسند نہیں کرتی۔''

''سنو شکنتلا۔'' دلاور بھی کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں سنجیدگی کے بادل تیرنے لگے۔ ''جب تمہارے اختیارات سلب ہوتے ہیں اور جب تم مصیبت میں ہوتی ہو تو رونے اور منت سماجت پر اتر آتی ہو۔ لیکن جیسے ہی تمہارے حالات بہتری اختیار کرتے ہیں غرور کا پردہ تمہاری عقل پر پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کو منافقت کہتے ہیں۔''

دلاور کا جارحانہ لہجہ دیکھ کر شکنتلا کو حیرت تو ہوئی تھی لیکن وہ اس کے لہجے اور بلا کے پُر اعتماد انداز سے کبھی کبھی دل میں خوفزدہ بھی ہوتی تھی کہ کیا اس کے پاس کوئی ایسی خفیہ طاقت ہے جس کے بل پر یہ اتراتا ہے۔ لیکن اپنی فطرت کے عین مطابق اب جب شکنتلا کو پتا تھا کہ اس جزیرے پر عملاً اس کی حکمرانی ہے اور وہ خود جب چاہے یہاں سے جا سکتی ہے جبکہ دلاور بظاہر خالی ہاتھ ہے۔ وہ دلاور کی جارحانہ گفتگو ہضم نہ کر سکی۔

''آخری بار میری بات سنو دلاور! شکنتلا ایک مضبوط طاقت کا نام ہے۔ تم جیسے انسان آئیں گے، مر جائیں گے۔ لیکن شکنتلا اپنی جوانی...... اپنے حسن اور طاقت سمیت زندہ رہے گی لہٰذا میرے ساتھ کوئی بھی ادنیٰ بات کرنے سے پہلے سوچ لیا کرو کہ کسی وقت میں کمزور ضرور پڑ جاتی ہوں لیکن تم سے بہر حال برتر ہوں۔''

''وقت بند مٹھی کی ریت کی مانند پھسل جاتا ہے شکنتلا۔ پتا اس وقت چلتا ہے جب مٹھی خالی ہوتی ہے اور ایک بات یاد رکھنا۔ میں پکا مسلمان ہوں۔ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ تمہارا حسن اور تمہاری جوانی آج تک مجھے زیر نہ کر سکی تو آئندہ کے لیے بھی کسی بھی خوش فہمی کو ذہن سے کھرچ دینا اور ایک بات کان کھول کر سن لو۔ آج کے بعد اس جزیرے پر جب تک ہم ہیں۔ تم نہ تو بے حیائی کا کھیل کھیلو گی اور نہ ہی کسی بے گناہ کا خون پیو گی۔''

''دلاور اپنی اوقات میں رہ......'' شکنتلا کی کھوپڑی گھوم چکی تھی۔ ''شکنتلا کی شکتیوں کے بارے میں غلط فہمی دور کر لے۔ یہ نہ ہو کہ پورن ماشی کی یہ خوشگوار رات میں تیرے ہی خون سے مزید خوشگوار بنا لوں۔''

''یہ تمہاری بھول ہے سانپ زادی۔'' یہ کہتے ہوئے دلاور نے کمرے کی دیوار پر لٹکتی چمکدار پھل والی تلوار اتار کر سونت لی۔ تو شکنتلا بھی چونکی ہو گئی اور اس کے ہونٹ تیزی سے ہلنے لگے۔ ادھر دلاور بھی درود شریف، آیت الکرسی اور پھر درود شریف پڑھ کر اپنے آپ پر پھونکنے لگا۔ اس عمل سے اس کا دل اطمینان کی آماجگاہ بن گیا۔ ادھر شکنتلا کو پتا تھا کہ اس کا جادو صرف اپنے فائدے کے لیے تو ہے۔ لیکن فی الحال کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ لہٰذا اس نے چڑیل کے روپ میں جسمانی طاقت بڑھا کر دلاور پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ منتر کے بعد اس کے جسم کی ہیبت تبدیل ہونے لگی۔ آنکھوں سے وحشت اور ہونٹوں سے غلاظت ٹپکنے لگی۔ ناخن بڑھنے لگے۔ خوبصورت سلجھی زلفیں خود بخود حرکت کرتے ہوئے الجھنے لگیں۔ اور ان میں سے بدبودار محلول گرنے لگا۔ قد بڑھنے لگا۔ دلاور بھی اس کا طریقہ شاید سمجھ چکا تھا اس نے فوراً پھر آیت الکرسی پڑھ کر شکنتلا پر پھونکا اور ساتھ ہی تلوار سرعت سے گھما کر شکنتلا کو دے ماری تو شکنتلا کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور آنکھیں خوف سے پھٹنے لگیں۔ کیوں کہ زندگی میں پہلی بار اسے زخم آیا تھا۔ تلوار اس کے شانے پر لگی تھی جہاں سے خون رسنے لگا تھا اور دلاور کی پھونک کے بعد اسے جسم میں کچھ جلن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ دلاور نے اس کی بوکھلاہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسرا وار کیا اور اب کے تلوار چڑیل نما شکنتلا کے ران پر لگی۔ تو شکنتلا چیخ مار کر باہر کو بھاگی۔ دلاور اس کے پیچھے لپکا۔

☆......☆......☆

شکنتلا سمجھ گئی کہ اس کا جادو براہِ راست دلاور کو نقصان نہیں پہنچا سکتا جبکہ خوفناک روپ سے دلاور ڈرتا نہیں۔ دلاور کا زندہ رہنا اب شکنتلا کے لیے موت تھا۔ لہٰذا اس نے ایک خطرناک چال چلی وہ دلاور کو اپنے پیچھے لگا کر پہاڑ پر لے جانا چاہتی تھی جس کے دوسری طرف دلدل تھی۔ جس کے بارے میں دلاور لاعلم تھا۔ لہٰذا آخری طریقہ شکنتلا کے پاس یہی رہ گیا تھا کہ دلاور کو لاعلمی سے پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر دوسری طرف دھکا دے دے تاکہ اس کے بعد کھل کھیلے۔ وہ تاریک راستے پر بھاگ رہی تھی۔ دلاور کے بھاگتے قدم کی چاپ بھی اسے سنائی دے رہی تھی۔ دلاور کا خوف شکنتلا کے دل پر نقش ہو چکا تھا۔ اسے پتا تھا کہ دلاور سر پر پہنچ گیا تو کسی صورت نہیں چھوڑے گا۔ لہٰذا اس نے اپنا اور دلاور کا درمیانی فاصلہ بڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔ شکنتلا چونکہ اس وقت چڑیل کے روپ میں تھی لہٰذا قد کے حساب سے اس کی ٹانگیں بھی لمبی تھیں جس کی وجہ سے دلاور کی نسبت شکنتلا کی رفتار زیادہ تھی۔ لہٰذا فاصلہ بڑھنے لگا۔

دلاور ہاتھ میں تلوار تھامے پورے جوش سے اندھیرے راستوں پر بھاگ رہا تھا۔ قد آور پودے، بے ہنگم اُگی گھاس اس کی تیز رفتاری میں رکاوٹ تھی۔ جا بجا درخت اور درختوں کی الجھی شاخیں اور شکنتلا چڑیل کی برق رفتاری اسے تیزی سے شکنتلا سے دور کر رہی تھی۔ چڑیل کے روپ میں بھاگتی شکنتلا اسے لمبے قدم کی وجہ سے اب بھی دکھائی دے رہی تھی۔ دلاور پورے ولولے سے اس کے تعاقب میں تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اب چڑھائی شروع ہو گئی ہے۔ پورے چاند کی پیلی روشنی میں اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی پہاڑ شروع ہو رہا ہے۔ اور شکنتلا دور سے چیختی چلاتی اس سرعت سے پہاڑ پر چڑھتی دکھائی دے رہی ہے۔ اور دلاور تلوار سونتے اس کے پیچھے تھا۔ اس دوران اچانک چاند بادلوں کے پیچھے چھپ گیا۔ گھپ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اسی لمحے شکنتلا کی نظر پہاڑ کی چوٹی پر پڑی تو اسے وہی دو چمکتی آشنا سی انگارہ آنکھیں دکھائی دیں۔ جو پہلی بار بحری جہاز پر اور اس کے بعد اس جزیرے پر دیکھ چکی تھی۔ شکنتلا ٹھٹھک کر رک گئی۔ چند ساعتیں گزر گئیں کہ چاند پھر بادل سے بھر گیا۔ روشنی پھیل گئی۔ شکنتلا نے چوٹی پر غور سے دیکھا تو اب کچھ نہ تھا۔ یہ کون ہے جو مسلسل میرے تعاقب میں ہے؟ کہیں کسی بڑی مصیبت کا آغاز تو نہیں؟

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک اسے اپنی ٹانگ پر شدید تکلیف کا احساس ابھرا۔ وہ چونکی، پلٹی تو دلاور کو سر پر پایا۔ جو تلوار سے دوسرا وار کرنا ہی چاہتا تھا۔ چڑیل شکنتلا نے یہ دیکھ کر فلک شگاف چیخ مار دی۔ وہ جان چکی تھی کہ چڑیل

کے روپ سے دلاور خوفزدہ نہیں ہوا۔ وہ سرعت سے بھاگی اور قلانچیں بھرتی ہوئی چوٹی پر جا پہنچی۔ اس نے کھیل ختم کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ کیوں کہ دلاور پہاڑ کے دوسری طرف موت سے بے خبر تھا۔ اب شکنتلا نے کھل کر مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور پلک جھپکنے میں ایک شیر کے روپ میں ڈھل گئی۔ ایک لمحے میں شیر پا کر دلاور بھی ٹھٹھک اٹھا اور غیر ارادی طور پر چند قدم پیچھے ہٹا تو اس کے پیروں سے ٹکرا کر چند پتھر چوٹی سے پھسل کر چھپکلی جانور کرے تو دلاور چونکا اور پیچھے ہٹ کر دیکھا...... تو دھک سے رہ گیا۔ جب اس نے عقب میں دیکھا تو پیچھے سے کھائی اور کھائی سے نیچے گرما گرم بھاپ نظر آرہی تھی۔ وہ فوراً ایک بڑا پتھر کا سہارا لے کر سنبھلا اور ذرا بہتر جگہ پر آ گیا۔ شکنتلا اسی دوران اس پر حملہ کرنا چاہتی تھی لیکن اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں اپنی ہی جسامت میں سنبھل نہ سکی تو آگے صرف موت ہے۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے سانپ کے ہلکے پھلکے وجود میں بدلہ لینے کی ٹھانی...... تاخیر کی گنجائش نہ تھی۔ فوراً ... پیشتر وہ ایک شیش ناگن کا روپ اختیار کرتے ہوئے دلاور کی طرف بڑھی۔ وہ فیصلہ کرچکی تھی کہ اب کسی بھی قسم کی گنجائش اور رعایت کا وقت نہیں ہے۔ دلاور کی زندگی خود شکنتلا کے لیے موت ثابت ہوسکتی ہے۔ دلاور کا مرجانا ضروری تھا۔ اس نے پہلے ہی حملے میں بھرپور زہر دلاور کے وجود میں گھولنے کا ارادہ کیا اور چھوٹے چھوٹے پتھروں کے درمیان چھپ گئی۔

دلاور پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے شکنتلا کو تلاش کرنے لگا جو سانپ کے روپ آ کر روپوش ہوچکی تھی۔ دلاور کا رخ جونہی دوسری طرف ہوا شکنتلا جست لگا کر اڑتی ہوئی دلاور کے شانوں کی طرف لپکی عین اسی لمحے دلاور کے پاؤں تلے چھوٹے چھوٹے پتھر پھسلے توازن برقرار رکھنے کو وہ آگے کو جھکا تو اس کے دونوں ہاتھ عین سامنے آ کر زمین پر ٹکے اسی لمحے شکنتلا حملہ آور ہوچکی تھی۔ لیکن دلاور کے جھکنے کی بنا پر وہ اپنے ہی زور میں اڑتی ہوئی اس کے اوپر سے ہوکر اس کے عین سامنے دھپ سے آ گری۔

اسی لمحے دلاور کے ذہن میں بجلی کوندی اس نے بایاں پاؤں پھرتی سے ناگن کے سر پر رکھ دیا لیکن پاؤں سر پر پڑنے کی بجائے درمیان میں پڑ گیا۔ شکنتلا نے حرکت کرنے کی کوشش کی لیکن دلاور کے بھاری بوٹ والا پاؤں اسے مسلنے کے انداز میں کچلنے لگا۔ شکنتلا کے حواس اس کا ساتھ چھوڑنے لگ۔ وہ ادھ موئی ہوگئی۔ دلاور کو پتا تھا کہ ذرا سی غفلت سے شکنتلا بچ نکلے گی۔ جس کا مطلب دلاور کی موت ہے۔ وہ شکنتلا کی خصلت سے بخوبی واقف تھا۔ اچانک دلاور کے ذہن میں چھپا کا ہوا اور دلاور نے سرعت کے ساتھ زخمی ناگن کی دم بائیں ہاتھ سے اور سر کے قریب دایاں ہاتھ رکھ کر اسے ہاتھوں میں اٹھا کر سر بلند کیا۔ اور دونوں ہاتھ مخالف سمت میں کھینچنے لگا۔ شکنتلا جو نڈھال سی نیم مدہوش تھی، دلاور کی اس حرکت سے بری طرح مچلنے لگی۔ اور اپنے جسم کو سکیڑنے کی کوشش کرنے لگی لیکن دلاور شاید کوئی رعایت دینے کو تیار نہ تھا۔ وہ ناگن پر گرفت مضبوط تر رکھ کر ہاتھوں کو مختلف سمتوں میں کھینچنے لگا۔ شکنتلا کا وجود ربڑ کی طرح کھنچنے لگا۔ اور پھر چیخ جیسی معمولی آواز ابھری اور سانپ کے دو ٹکڑے ہوکر دلاور کے ہاتھوں میں جھولنے اور تڑپنے لگا۔ دلاور نے ''اللہ اکبر'' کا نعرہ مستانہ بلند کیا اس کا رواں رواں خوشی سے لبریز ہو چکا تھا۔ اس نے چوٹی سے نیچے دیکھا تو اسے تا حد نظر گرم گرم بھاپ اڑتی اور بڑ بڑ بڑ کرتی دلدل دکھائی دی۔ تو اس نے ذہن میں ابھرا تو اچھا شکنتلا اسے گھیر کر یہاں لائی تھی تا کہ دلاور کو اسی دلدل میں پھینک سکے لیکن موت اور زیست کے فیصلے تو آسمانوں پر لکھے جاتے ہیں۔ دلاور نے سانپ کے دونوں ٹکڑے گھما کر زور سے نیچے پھینک دیے اور دیکھنے لگا۔ شکنتلا دو ٹکڑوں میں بٹی تیزی سے نیچے جانے لگی۔ نیچے جہاں ابلتی بھاپ چھوڑتی خونی دلدل میں موت اس کی منتظر تھی۔ دلاور کی نظریں بدستور نیچے جاتی ناگن کے تعاقب میں تھیں۔ اور بالا آخر ناگن کا وجود بھاپ کے دھوئیں میں چھپ گیا۔ عین اسی لمحے دلاور کو پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دی اور وہ سمجھ گیا کہ وقت سحر آن پہنچا ہے۔ وہ پہاڑ کی چوٹی پر ہی تیمم کرکے اذان دینے لگا۔

اللہ اکبر...... اللہ اکبر......

اور اس طرح زمین سے شکنتلا نامی بُری ناگن اور فتنہ ساماں داستان کا انجام ہوگیا۔ (اختتام)

☆......☆......☆......☆

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا دقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعا سے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

C II-88 فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

✉ مہرو ناز فلک۔سیالکوٹ

محترم باجی! السلام وعلیکم امید ہے کہ آپ خیرو عافیت سے ہوں گے۔اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی صحت مند زندگی عطا فرمائے۔آمین۔ بابا جی میرا مسئلہ یہ ہے کہ تقریباً پچھلے تین سالوں سے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی میری چارپائی کو ہلا رہا ہوں۔تین ماہ میں تقریباً ایک سے دو مرتبہ ایسا ہوتا ہے۔ایسا سحری کے وقت یا پھر صبح سے چھ کے آٹھ کے دوران ہوتا ہے۔کبھی کبھار لگاتار چند دن بھی ایسا ہوتا ہے۔پہلے پہل تو میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ کوئی چارپائی ہلا رہا ہے مگر بعد میں احساس ہو گیا کہ کوئی میرے وجود کو ہلا رہا ہوتا ہے۔جس کا بوجھ محسوس کوتی ہوں۔اس دوران نہ آنکھ کھول پاتی ہوں نہ بول پاتی ہوں۔کوشش بہت کرتی ہوں ہلنے کی، بولنے کی مگر نہیں کر پاتی۔ان لمحوں میں پورا جسم مفلوج ہو جاتا ہے۔حتیٰ کہ آنکھ بھی نہیں کھول پاتی۔کبھی کبھار اس دوران خواب سا آتا ہے کہ میں امی کو سب کچھ بتا رہی ہوں۔اس کیفیت سے نکلنے کے بعد مجھے سب کچھ حقیقت ہی محسوس ہوتا ہے۔مگر بعد میں پتا لگتا ہے کہ میں اس دوران خواب میں تھی۔ ہوائی مخلوق اسی وقت حملہ آور ہوتی ہے جب اور باقی سب بھی سو رہے ہوں۔ ورنہ نہیں۔میں سو رہی ہوں یا غنودگی میں ہوں جاگتے وقت ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ جب کوئی اور بھی کمرے میں جاگ رہا ہو تب بھی ایسا نہیں ہوتا۔ میں خوف سے نیند کے لیے آنکھیں بند نہیں کرتی۔ بابا جی پلیز مجھے اس کی وجہ لازمی بتائیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟اس کی اصل وجہ کیا ہے؟ کیا کسی نے کچھ کروایا ہے؟ اور بابا جی اس کا آسان حل بھی بتائیے۔جس سے جلد از جلد شفا ہو۔کوئی اللہ کا اسم بھی بتائیں،جس سے میرا ڈر کم ہو۔اور اکثر بخار اور کمزوری کی شکایت بھی رہتی ہے۔ پلیز اپریل کے شمارے میں جواب دیجیے۔

☆ بیٹی مہرو! اللہ تم پر رحم فرمائے۔اور تکلیف دہ صورتحال سے نجات جلد از جلد دلائے۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ جلد از جلد مجھ سے تعویذ منگوا لو کیوں کہ آثار مجھے اچھے محسوس نہیں ہو رہے ہیں۔تعویذ کے لیے تفصیل درکار ہو گی لہٰذا سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے اپنا مسئلہ دوبارہ نوٹ کروا دو۔اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

✉ عینی مقام نامعلوم

محترم بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری منگنی میرے پھوپھو زاد سے ہوئی ہے لیکن پھوپھو اور ان کے گھر والے خوش نہیں ہیں۔ یہ منگنی ہماری پسند کی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا نکاح جلد از جلد ہو جائے تا کہ ہمارا رشتہ مضبوط ہو جائے مہربانی ہو گی۔

☆ عینی بیٹی! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔مناسب ہو گا تعویذ منگوا کر اپنے پاس رکھو۔ معاملات میں جلد بازی مت کرنا نقصان ہو گا۔

☆ حنا حیدر آباد

بیٹی حنا! وظیفہ نماز کی پابندی کے ساتھ جاری رکھو۔ کوشش کرو کہ ہر وقت باوضو رہو۔انشاء اللہ ضرور کرم ہو گا۔

✉ ثناء۔کبیر والا

السلام و علیکم! پیارے بابا جی امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔میرا نام ثناء ہے۔ ہماری فیملی کا

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: C II-88۔فرسٹ فلور۔خیابانِ جامی کمرشل۔ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔فیز-7،کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 021-35893121

تعلق جنجوعہ سے ہے اور جس سے میں شادی کرنا چاہتی ہوں ان کی فیملی قریشی ہے۔ اس کے گھر والے ہماری شادی کے لیے مان گئے ہیں لیکن میرے ابو اور بھائی نہیں مان رہے۔ آپ دعا کریں یا کوئی تعویذ دیں کہ ہماری شادی ہو جائے۔ آپ جو کہو گے انعام دوں گی مجھے گھر والے ڈائجسٹ نہیں پڑھنے دیتے۔ چوری چھپے پڑھتی ہوں۔ آپ سے ایک امید کر رہی ہوں، اپریل میں مجھے جواب لازمی دینا۔ میں کسی طرح اپریل کا شمارہ لے لوں گی۔ پلیز بابا نظر انداز نہ کرنا میں بہت مجبور ہوں۔

☆ بیٹی ثناء! اللہ تمہیں عقل دے اور تمہارے گھر والوں کو سمجھ کہ اس معاملے کو بخیر و خوبی تکمیل تک پہنچائیں۔ بیٹی تمہیں تعویذ کے بجائے اچھے مشورے کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ اپنے معاملات اللہ کے سپرد کر دو اور اپنے والدین پر مکمل بھروسہ کرو۔ وہ تمہارے لیے بہت اچھا فیصلہ کریں گے۔ جذبات میں آ کر کوئی غلط قدم مت اٹھانا۔ نماز کی پابندی رکھو۔ درود شریف بہت پڑھو اور جتنا ممکن ہو پہلے کلمے کا ورد کیا کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

✉ شائستہ کنول۔ ملتان

بیٹی شائستہ! اللہ تمہارے سارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور جو ورد دیا گیا ہے بہت پڑھو۔ میں تمہارے لیے خصوصی دعا کا اہتمام کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

✉ امرین۔ کراچی

السلام علیکم بابا جی! میں نے پہلے بھی آپ سے اپنی کیفیت پر بات کی تھی، آپ نے مجھے تعویذ ارسال کیا اور تعویذ پاس رکھنے کے بعد آپ سے دوبارہ اپنی کیفیت کا ذکر کیا ہے۔ آپ کے تعاون اور اللہ پاک کے کرم سے اب طبیعت کافی بہتر رہتی ہے میں نے آپ کا تجویز کردہ وظیفہ بھی جاری رکھا ہوا ہے۔ بابا جی اب طبیعت تو بہتر ہے پر چہرے سے رونق ختم ہوتی جا رہی ہے۔ بابا جی میری طبیعت اور ذہنی پریشانی کی ایک وجہ کا ذکر آپ سے کر رہی ہوں۔ برائے کرم مجھے اس کا کوئی تسکین بخش حل تجویز کریں۔ بابا جی میں نے آپ سے پہلے بھی ذکر کیا تھا۔ بابر میرے سینئر ہیں۔ ہم ایک ہی ادارے میں کام کرتے ہیں۔ بابا جی ہم دونوں کے درمیان تعلقات بہت اچھے تھے اور ہم دونوں نے ایک دوسرے سے پسندیدگی کا اظہار بھی کیا تھا۔ وہ بھی کافی خوش تھے اور میں بھی۔ ہم اپنی زندگی کے آگے فیصلوں کے بہت قریب تھے چونکہ ہم مختلف پوسٹس پر کام کرتے تھے تو ادارے کے حق میں لیے گئے فیصلوں میں اکثر ہماری رائے کا اختلاف ہوتا پر کبھی ہمارے ذاتی تعلق پر اس کا اثر نہیں ہونے دیتے تھے۔ پھر ایک دن ہمارے ادارے میں ان کے والد کے کزن کی بیٹی (وردہ شوکت علی) آئی اور اس کے بعد بابر مجھ سے چڑنے لگے اور اس لڑکی پر بہت سا پیسا اڑانے لگے بابا جی وہ جب تک میرے ساتھ آفس میں رہتے ہیں تو ٹھیک رہتے ہیں پر جب اس کے پاس سے آتے ہیں تو وہ ہر وقت غصہ کرتے ہیں وہ ہمیشہ مجھے باور کراتے ہیں کہ وہ صرف اسے کزن کے طور پر گھماتے پھراتے ہیں پر اب وہ ہماری زندگی اور رشتہ کو آگے بڑھانے کی بات ہی نہیں کرتے۔ بابا جی میں ان لوگوں کو ساتھ دیکھ دیکھ کر ذہنی پریشانی کا شکار ہوتی جا رہی ہوں برائے کرم آپ وظیفہ یا تعویذ تجویز کریں کہ بابر پھر سے میری طرف مائل ہو جائے اور اللہ پاک سے میرے لیے دعا کریں کہ وہ ہم سفر کی شکل میں بابر کا ساتھ مجھے نصیب فرمائے۔

☆ بیٹی امرین! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تم صرف اپنے اوپر توجہ دو۔ اپنی صحت کا خیال رکھو۔ نماز پابندی سے ادا کیا کرو اور لاحول ولا قوۃ کا ورد کیا کرو۔ میں تمہیں معاملات میں مکمل خاموشی کی نصیحت کروں گا۔ اس شخص سے کسی قسم کا بھی رابطہ مت رکھو۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اکیس روز بعد حالات سے آگاہ کرو۔

✉ عائشہ۔ حیدرآباد

محترم بابا السلام علیکم! میں اور ایک لڑکا ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے اور وہ لڑکا مجھ سے اور میں اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں والدہ تایا اور بہنوئی نہیں مان رہے میں نے اور اس لڑکے نے دعائیں پڑھیں کہ

والدہ تایا اور بہنوئی مان جائیں مگر اب تک کچھ ایسا نہیں ہوا بابا وغیرہ سے رابطے کیے مگر کسی نے لڑکے کو کہا تم پر سفلی ہے کرایا، میرا پوچھا تو میرے بارے میں بات کرنے سے منع کر دیا تو کسی نے کہا مجھ پہ اور لڑکے پہ وار کیے جا رہے ہیں تو کسی نے کہا یہ وار لڑکی کی والدہ کر رہی ہیں کہ لڑکے کی ماں نہ مانے فیملی نہ مانے۔ لڑکے کے کاروبار میں بھی بندش کروائی ہے۔ استخارے میں بھی آیا کہ لڑکی کی والدہ سے بچو یہ بھی کہا کہ لڑکی کی والدہ کئی جگہوں پر جاتی ہے باباؤں سے وار کروانے کے لیے رب سے بڑھ کر کچھ نہیں میری والدہ مسئلہ بننے نہیں دے رہی منہ پر کہہ رہی ہیں کہ لڑکے کی والدہ رشتہ مانگے تو میں تیری شادی اس لڑکے سے کر دوں گی مگر پیٹھ پیچھے وار کرواتی ہیں آپ ایسا عمل بتائیں کہ لڑکے کی فیملی تمام لوگ ہنسی خوشی میری شادی اس لڑکے سے کر دیں اور میں اس لڑکے کے ساتھ اور وہ لڑکا میرے ساتھ خوش رہے۔

☆ بیٹی اللہ تمہارے حق میں فیصلہ کرے نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تمہارا نام نہیں شائع کر رہا ہوں بیٹی ساری صورتحال میں یہی نصیحت کروں گا کہ مجھ سے تعویذ منگوالو۔ طریقہ کار سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کر لو جب معاملات اس قدر پیچیدہ ہو جاتے ہیں تب تعویذ کا ہی مشورہ دیتا ہوں۔

☆ بیٹی ثناء! تمہارا خط پڑھ کر دکھ ہوا تمہارا قصور نہیں پھر بھی سزا کاٹ رہے ہو شوہر کے لیے اچھا وکیل کرو اگر وہ رہا بھی کرا پایا تو کم از کم فیصلہ تو ہوگا وقت تو گزرے گا۔ تمہارے بچے بہت چھوٹے ہیں تم نماز کی پابندی کی کوشش کرو اور استغفر اللہ ربی بہت پڑھا کرو میں بھی خصوصی دعا کا اہتمام کروں گا۔ حالات سے آگاہ رکھنا۔

☒ خیرن۔ حیدرآباد

☆ بیٹی خیرن! نماز کی پابندی کے ساتھ وظیفہ مزید ایک ماہ کرو۔ معاملات میں بالکل خاموشی رکھو۔ والدہ سے کہو کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کیا کریں۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

☒ امیرن۔ حیدرآباد

☆ بیٹی امیرن! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابند ہو بہت اچھی بات ہے۔ بیٹی! یقین رکھو تمہارا اللہ پر اس قدر یقین ہی تمہیں کامیابی عطا فرمائے گا۔

□ عظمت۔ کراچی

☆ بیٹی عظمت! سورۃ الکھف کی آیت نمبر 107، 108 اور 109 ہر نماز کے بعد 21 بار پڑھو۔ اول و آخر دُرود شریف پھر حاجت بیان کرو۔ انسان ایک حد تک کوشش کر سکتا ہے اس کے بعد معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا چاہیے۔ تم بھی اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو ضرور کرم ہوگا۔ مدت 41 دن ہے۔

□ صابرہ۔ کھاریاں

☆ بیٹی صابرہ! اللہ تمہاری والدہ کو مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ اللہ سے دُعا کرو کہ وہ تمہاری والدہ کو صحت عطا فرمائے۔ نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ شاہدہ۔ مقام نامعلوم

☆ بیٹی شاہدہ! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ خط واضح لکھا کرو اور ایک وقت میں دو مسائل سے زیادہ مت لکھا کرو مجھے جواب دینے میں دقت ہوتی ہے۔ بہر حال تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ معاملات میں خاموشی رکھو۔ ایک چپ ہزار مسائل کا حل ہے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور نمازِ عشاء کے بعد سورۃ آلِ عمران آیت 66، 1100-1100 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ ارم شاہ۔ ہالا، سندھ

o محترم بابا جی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم پانچ بہنیں ہیں اور پانچوں شادی کے لائق ہیں۔ ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہماری پھپھو جن کی عمر تقریباً 35 سال ہے وہ بھی ابھی غیر شادی شدہ ہیں اور ہمارے والد صاحب کا کہنا ہے کہ جب تک پھپھو کی شادی نہیں ہوجاتی، وہ ہماری بھی نہیں کریں گے۔ پھپھو کے رشتے بہت آئے مگر بات نہیں بنی جس میں سو فیصد ہمارے گھر والوں کا ہی ہاتھ ہے۔ ہمارے گھر والے تھوڑے سست

واقع ہوئے ہیں۔ نہ شادی کرتے ہیں اور نہ کہیں بات ٹھہراتے ہیں۔ میری والدہ بھی پریشان ہیں' ہم بھی پریشان ہیں۔ آپ کا دیا ہوا وظیفہ بہنوں نے کیا تھا مگر اس کے کرنے سے والد صاحب بیمار ہوگئے پھر بڑی بہنیں جنہوں نے وظیفہ کیا' وہ بھی بیمار ہوگئیں۔ ہم اور بھی وظائف پڑھتے رہتے ہیں مگر بات نہیں بنتی۔ آپ برائے مہربانی کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ گھر والے ہمارے بارے میں سوچیں اور جلدازجلد رشتے طے کرکے شادی کردیں۔

☆بیٹی ارم! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! وظیفہ کلامِ الٰہی ہے' اس کے کرنے سے کوئی بیمار نہیں ہوتا۔ یہ بات ذہن سے نکال دو۔ بعض اسمائے جلالی ٹکراتے ضرور ہیں اسی لیے تاکید ہے کہ ہر وظیفے کے پہلے اور آخر میں دُرود شریف کا وِرد ضرور کرو۔ اللہ کو یاد کرنے والا ہمیشہ کامیابی کی طرح ہی بڑھتا ہے۔ ہاں' یہ ضرور ہے کہ ہر کام اپنے مقرر کردہ وقت پر ہی ہوتا ہے جو اللہ نے طے کیا ہے اور انسان بے شک بہت بے صبرا ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور بکثرت یَا اَوّلُ کا وِرد کرو۔ والدہ سے کہو' حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور کریں۔ مجھے 41 روز بعد مطلع کرو۔

□ عائشہ۔ سکھر

☆بیٹی عائشہ! اللہ تمہیں مکمل شفاء عطا فرمائے۔ اپنی کیفیت سے پریشان مت ہو بلکہ اس صورتِ حال سے باہر نکلنے کی کوشش کرو۔ نماز کی پابندی کی کوشش کرو۔ ہر وقت باوضو رہو۔ جس قدر ممکن ہو یَا اللہ کا وِرد کیا کرو۔ اپنی والدہ سے کہو' تمہارے اوپر سے صدقہ خیرات ضرور نکالیں' ضرور کرم ہوگا۔

□ علی تنولی۔ گوادر

○ پیارے باباجی! السلامُ علیکم! عرض ہے کہ میں نے جماعت دہم کا امتحان دیا ہے۔ میں ایک لڑکی سے پیار کرتا ہوں' وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو جیون ساتھی بنانا چاہتے ہیں۔ ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ سیکنڈ ایئر کے بعد شاہینہ سے منگنی کرلوں اور وہ بھی یہی چاہتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ باباجی! آپ پلیز' ہم دونوں کے لیے ایک ایسا تعویذ بنا کے دیں کہ ہماری شادی کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ہمارے خاندان مان جائیں اور ہماری شادی ہوجائے۔ پلیز باباجی! ہمارے لیے کوئی تعویذ بنا کر دیں کہ ہماری مشکل حل ہوجائے اور ہماری شادی ضرور ہو۔

☆بیٹے علی! میں ہمیشہ یہی کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو اس قابل رکھو کہ لڑکی کے والدین خوش ہوکر اپنی بیٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیں۔ لڑکی کی عزت بہت نازک ہوتی ہے' اس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔ کسی کو پسند کرنا جرم نہیں مگر حدود میں رہنا لازمی ہے۔ بیٹے! تم دونوں نماز کی پابندی کرو اور ہر نماز کے بعد 99 بار یَا کَلِیمُ کا وِرد کرو اوّل و آخر دُرود شریف پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ طلعت۔ جہلم

☆بیٹی طلعت! بچے معصوم ہوتے ہیں' وہ سختی سے کبھی کوئی بات نہیں سمجھتے۔ تم اس کو محبت اور نرمی سے سمجھاؤ۔ کوشش کرو کہ مانگنے کی نوبت نہ آئے۔ گھر میں اس کے لیے بسکٹ وغیرہ رکھا کرو جہاں سے وہ خود اٹھا لیا کرے۔ بچوں کو سکھانا پڑتا ہے پھر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ پیار سے' محبت سے' اپنی مرضی سے اولاد کی پرورش کرو۔ بچے پر اَلحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر ضرور دَم کیا کرو ہر نماز کے بعد۔

□ روشی۔ گھوٹکی

☆بیٹی روشی! نماز کی پابندی رکھو' یہی ہر مسئلے کا حل ہے۔ روزانہ دن میں دو بار آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر زور زور سے اَلحمد شریف 7 بار پڑھا کرو۔ اس دوران اپنی آنکھیں اپنے چہرے پر مرکوز رکھو۔ یہ عمل گھر کے ایسے حصے میں کرو جہاں سے آسمان تمہارے سامنے ہو یعنی آئینے سے نظریں اٹھاؤ تو اوپر آسمان نظر آئے۔ یہ عمل بلاناغہ 3 ماہ کرو۔ فرق خود محسوس کروگی۔

□ فوزیہ بدر۔ کراچی

○ محترم باباجی! السلامُ علیکم! میں شبانہ بنتِ جمیلہ۔ باباجی! آپ نے جو 7-7 تسبیحات صبح وشام پڑھنے کے لیے بتائی ہیں۔ رَبَّنَا هَب لَنا فجر اور عشاء۔ وہ وظیفہ 21

دن کا پورا ہو گیا ہے اور کافی فرق ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ میں یہ وظیفہ دوبارہ شروع کروں یا تھوڑا وقفہ دوں یا پھر آپ مجھے کوئی اور عمل بتائیں جو دشمن کے لیے ہو۔ میں دشمن کے شر سے بہت پریشان ہوں اور وظیفہ مکمل ہونے پر میں شکرانے کے نفل پڑھ لیتی ہوں اور مسجد کے گلّے میں کچھ پیسے رکھ دیتی ہوں۔ بابا جی! آپ نے ڈائجسٹ میں ہر نماز کے بعد جو سورۃ فاتحہ، چاروں قل، سورۃ البقرہ کا پہلا اور آخری رُکوع کسی کو بتایا تھا اور اس کی عام اجازت دی تھی، وہ بھی میں ہر نماز کے بعد پڑھتی ہوں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری بیٹی نورالسحر، اس کے ابھی نویں جماعت کے امتحان ہوئے ہیں۔ آپ دُعا کیجیے گا اور آپ کوئی دُعا بتائیں کہ جب تک اس کا رزلٹ نہیں آتا، وہ یہ پڑھتی رہے اور آپ اِس دُعا یا عمل کی عام اجازت دے دیجیے گا تا کہ جن جن بچوں کے امتحان ہوئے ہیں، وہ بھی پڑھ سکیں اور اِس عمل سے فیض یاب ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ سب بچوں کو کامیابی عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہان میں خوش رکھے۔

☆ بیٹی فوزیہ! اللہ تمہاری حاجات قبول فرمائے۔ وظیفہ ابھی مزید ایک ماہ جاری رکھو۔ بیٹی سے کہو یاسمیعُ کا بکثرت وِرد کرے اور اِس وِرد کی اُن تمام بچوں کو اور اُن کے والدین کو اجازت ہے جو امتحانات میں حصہ لے رہی ہیں۔

□ ریاض علی قنبرانی۔ سجاول

○ محترم باباجی! السلام علیکم! آپ ہزاروں لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں، یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کو اِس کا اَجرِ عظیم عطا کرے گا۔ پیارے بابا جی! میں بھی آج کل مسائل میں گھرا ہوا ہوں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ چار ماہ پہلے میری شادی ہوئی ہے۔ شادی کے بعد سے میری طبیعت نہیں سنبھل رہی۔ میں کراچی کی ایک گارمنٹ فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔ بابا جی! کچھ عرصہ پہلے مجھے ٹی بی کی بیماری ہو گئی تھی۔ میں نے نو مہینے تک دوائی کا کورس کیا لیکن بابا جی! مجھے لگتا ہے کہ میری بیماری ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر سے دوائی لیتا ہوں تو کچھ عرصے تک ٹھیک رہتا ہوں لیکن پھر دوبارہ تکلیف شروع ہو جاتی ہے۔ سینے کی دونوں طرف درد رہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرے سینے میں کافی زخم ہیں۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ میرے معدے میں زخم ہے لیکن مجھے پورے سینے میں تکلیف ہوتی ہے۔ نوکری پر جاتا ہوں تو دوبارہ طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور واپس گاؤں آ جاتا ہوں۔ بابا جی! بس بہت پریشان ہوں، کیا کروں؟ ایسا لگتا ہے کہ میں دمے کا مریض ہو گیا ہوں۔ کوئی کام کرتا ہوں یا سیڑھیاں چڑھتا ہوں تو سانس پھول جاتی ہے۔ زیادہ وزن بھی نہیں اٹھا سکتا ہوں۔ بابا جی! ایسا لگتا ہے کہ میں مستقل مریض بن گیا ہوں۔ امّاں اور بھائی مجھے نوکری پر جانے نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ تم گھر میں رہو، تمہارا بوجھ ہم اٹھائیں گے، تمہیں خرچہ ہم دیں گے لیکن میں چاہتا ہوں کہ میں نوکری پر جاؤں۔ میرے بھائی کب تک میرا بوجھ اٹھائیں گے؟ آخر ایک دن تنگ آ جائیں گے۔ بابا جی! میں اکیلا ہوتا تو گھر پر رہ لیتا لیکن میری بیوی بھی ہے، اُس کا بھی تو خرچہ ہے۔ پیارے بابا جی! میں بہت پریشان ہوں کہ کیا کروں؟ ایک طرف بیماری اور دوسری طرف بے روزگاری میں پھنس کر رہ گیا ہوں۔ محترم بابا جی! میرے مسئلے کا کوئی حل تجویز کیجیے۔

☆ بیٹے ریاض! اللہ تمہیں مکمل شفا دے۔ سب سے پہلے تو نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھا کرو۔ کوشش کرو کہ ہر وقت باوضو رہو۔ تمہیں کام ضرور کرنا چاہیے کیونکہ تمہاری بیوی صرف تمہاری ہی ذمے داری ہے پھر مالی مسائل رشتوں میں بھی دراڑ ڈال دیتے ہیں مگر اِن سب سے پہلے ایک بار خوب لگن سے اپنی صحت پر توجہ دو۔ والدہ سے کہو، نہار منہ ادرک کی قاشیں 6-7 توے پر نمک ڈال کر ہلکی سے سینک لیں اور وہ قاشیں بسم اللہ پڑھ کر کھالو۔ رات میں مرغی کی یخنی ایک پیالی ضرور پیو۔ پابندی سے یہ عمل ایک ماہ کرو۔ انشاء اللہ، تم خود اپنے اندر مثبت تبدیلی محسوس کرو گے۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع ضرور کرو۔

□ نگہت بتول۔ چتوکی

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ کچھ عرصے پہلے میری شادی میرے والدین نے اپنی پسند کے لڑکے سے کر دی تھی جبکہ اس شادی میں میری مرضی شامل نہ تھی مگر میں نے اپنے والدین کی عزت رکھتے

ہوئے اس لڑکے سے شادی کی مگر شادی کے کچھ عرصے بعد مجھے طلاق ہوگئی۔ بابا جی! طلاق کے بعد میں بالکل ٹوٹ گئی تھی۔ اِسی دوران میرے محلے کے ایک لڑکے نے مجھے جانے کب پسند کرلیا اور میرے بارے میں ساری معلومات کرنے کے بعد اپنے والدین کو میرے گھر بھیجنا چاہا۔ اس کے والدین کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ لڑکا میرے بارے میں سب جانتا ہے اور مجھے دل سے اپنانا چاہتا ہے۔ بابا جی! پہلے جو والدین راضی تھے نہ جانے انہیں اچانک کیا ہوگیا اب وہ میرے گھر رشتہ لانے پر راضی نہیں ہوتے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ ایک طلاق یافتہ کا ہمارے معاشرے میں کیا مقام ہے آپ جانتے ہی ہوں گے۔ میری عمر زیادہ نہیں ہے مگر پھر بھی اول تو رشتے آتے بہت مشکل سے ہیں اور جو آتے ہیں وہ قابلِ قبول نہیں ہوتے۔ میں اور وہ لڑکا ایک اچھی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بابا جی! وہ لڑکا ہر طرح سے قابل ہے اور مجھ سے سچا بھی ہے۔ بابا جی! میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس کے پڑھنے سے میری بات یہیں بن جائے اور اس کے گھر والے محبت اور دِل سے میرا رشتہ لے آئیں اور اُن کے رشتہ لانے پر میرے گھر والے قبول کرلیں۔ میں پانچ وقت کی نمازی ہوں۔ (الحمدُللہ!) میرے اس مسئلے کا حل بتادیں آپ کا بہت بہت احسان ہوگا۔ آپ سے درخواست ہے کہ میرے خط کا جواب جولائی کے شمارے میں دے دیں۔ بابا جی! میں اسی لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ آپ میری مدد کریں۔ آپ سے ایک بیٹی کی درخواست ہے۔ اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معافی چاہتی ہوں۔

☆ بیٹی نگہت! اللہ تمہاری مشکلیں حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! جلد بازی مت کرو۔ معاملات بڑوں کے سپرد کردو۔ ضروری نہیں کہ ہر بار والدین سے غلط فیصلہ ہو۔ جو شخص تم سے مخلص ہوگا وہ عزت کے ساتھ تمہیں اپنے گھر لے جائے گا۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح پڑھو یَاحَیُّ یَاقَیُّومُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ اول وآخر دُرود شریف 7-7 بار پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ حجاب۔ ملتان

o قابلِ احترام بابا جی! میں خیریت سے ہوں اور اللہ تعالیٰ سے آپ کی خیریت نیک چاہتی ہوں۔ میں آپ کو پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں۔ خدا کے لیئے مجھے مایوس نہ کریں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو دو سال کا عرصہ ہو چکا ہے اور میں ابھی تک اولاد جیسی نعمت سے محروم ہوں۔ خدا کے فضل سے میں پانچ وقت نماز کی پابند ہوں اور ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق میں اور میرے شوہر بالکل ٹھیک ہیں۔ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیر ہے۔ آپ مجھے کوئی وظیفہ پڑھنے کے لیے دیں اور کوئی تعویذ بھی ارسال کریں۔ میں آپ کی بہت مشکور رہوں گی اور ساری زندگی دُعاؤں میں ہمیشہ آپ کو یاد رکھوں گی۔

☆ بیٹی حجاب! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ بیٹی! تعویذ میں تیار کردوں گا مگر اس سلسلے میں تمہیں بذریعہٗ جوابی لفافہ مجھ سے رابطہ کرنا ہوگا۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

□ نزہت۔ ہڑپہ سٹی

☆ بیٹی نزہت! استخارہ کسی کے حق میں نہیں۔ تم نماز کی پابندی رکھو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 11-11 بار سورۃ التوبہ پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ سعدیہ۔ اسلام آباد

o السلامُ علیکم! میرا نام سعدیہ ہے۔ میں آپ کو یہ خط ضلع میانوالی سے لکھ رہی ہوں۔ میری عرض یہ ہے کہ میں بہت پریشان ہوں تنگ آکر آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میری بات یہ ہے کہ میری شادی چچا کے بیٹے سے ہوئی ہے لیکن میں اپنے ماں باپ کے گھر ہوں۔ میرے شوہر کا میرے ساتھ پیار نہیں ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ آپ کوئی اس کا مجھے حل بتائیں آپ کی مہربانی ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں نے تین دفعہ میٹرک کا امتحان دیا لیکن فیل ہوگئی ہوں۔ اب میں پھر سے پڑھ رہی ہوں۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میں پاس ہوجاؤں اور مجھے اسکول ٹیچر بننے کا بہت شوق ہے۔ آپ میرے لیے دُعا کریں میرا شوہر بھی میرا بن جائے۔

آپ مجھے خط کے ذریعے جواب دیں۔ جوابی لفافہ بھیج رہی ہوں۔

☆بیٹی سعدیہ! کوشش کرو کہ ہر وقت پاک صاف رہو۔ اِس کے علاوہ چلتے پھرتے بہ کثرت پڑھو رَبِّ زِدنِی عِلماً۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ سمیعہ۔ کینیڈا

o باباجی! میں آپ کی بہت بدنصیب بیٹی ہوں۔ والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی' شوہر ایک نمبر کا شرابی نکلا' مار پیٹ' گالم گلوچ معمول ہے۔ باباجی! میں کس منہ سے اپنے ماں باپ کو یہ سب بتاؤں؟ اسی لیے 7 سال سے پاکستان نہیں گئی ہوں۔ شادی کو 11 سال ہوگئے ہیں۔ ایک بیٹا ہے مگر میں نے ایک دن بھی سکون کا نہیں گزارا۔ میں وظیفہ نہیں کرسکتی۔ مجھے تعویذ اِرسال کردیں تاکہ میری زندگی میں بھی کچھ سکون آجائے۔

☆بیٹی سمیعہ! جو ہوا سو ہوا۔ میری نصیحت مانو اور پہلی فرصت میں پاکستان آکر اپنے والدین سے معافی مانگو۔ ماں باپ کا دِل بہت بڑا ہوتا ہے۔ وہ اولاد کو دکھ سے بچانے کے لیے ہی بعض اوقات سختی کرتے ہیں۔ نماز پابندی سے پڑھو۔ بہت توبہ استغفار کیا کرو۔ جب والدین معاف کردیں گے تو اللہ بھی معاف کردے گا اور تمہاری زندگی ضرور سہل ہوجائے گی۔

□ قیصر۔ دادو

o باباجی! میں بہت پریشان ہوں۔ میری پریشانی کی وجہ میرا بیٹا ہے جو بے انتہا زبان دراز اور اکھڑ ہے۔ گھر میں بہنوں کو بہت تنگ کرتا ہے۔ میں کچھ کہوں تو چیزیں توڑنے لگتا ہے۔ باپ سے ایک منٹ نہیں بنتی۔ اس اکتوبر کو 17 سال کا ہوجائے گا۔ پڑھائی میں بھی بہت کمزور ہے۔ باباجی' یہ میرا ایک ہی لڑکا ہے۔ بے انتہا کوشش کے باوجود بھی ذرہ برابر تمیز اور نرمی اس میں نہیں آئی ہے۔ اکثر میری اور میرے شوہر کی اس کی وجہ سے لڑائی ہوجاتی ہے۔ آپ استخارہ کرکے دیکھیں' اس پر کوئی اثر تو نہیں ہے؟

☆بیٹی قیصر......! اصل میں پہلے ہم بچوں کے لیے بے تحاشہ لاڈ اٹھاتے ہیں پھر جب وہ نافرمان ہوجاتے ہیں تو پریشان رہتے ہیں۔ تم نے بیٹے کو ہر معاملے میں فوقیت دے کر بے حد ضدی بنادیا ہے۔ وہ اَب اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتا۔ ابھی یہ رویہ تم لوگوں کو تکلیف دے رہا ہے' آنے والے دنوں میں یہی رویہ اس کے اپنے لیے پریشان کن ہوگا۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ اس جنونی کیفیت کے لیے تعویذ منگوالو۔ وظیفہ تعویذ کے ہمراہ دوں گا۔

□ فاطمہ۔ کراچی

☆بیٹی فاطمہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ تعویذ تم نے بالکل درست طریقے سے رکھا ہے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ بکثرت وِرد کرو۔ انشاء اللہ' جلد کرم ہوگا۔

☆ ث۔ ر۔ لاہور

بیٹی! استخارہ حق میں ہے مگر کوئی بھی رسم آنے سے پہلے مکمل معلومات کرواؤ اور حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور نکالو۔

□ عاقب۔ کوئٹہ

o پیارے باباجی! السلامُ علیکم! آپ جیسے اچھے لوگوں کا سایہ اللہ پاک ہمارے سروں پر بہت دیر تک قائم رکھے۔ باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں پڑھائی میں بہت کمزور ہوں۔ مجھے کوئی آسان وظیفہ دیں کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکوں۔ پیارے بابا! میرے لیے دُعا کرنا۔

☆ بیٹے عاقب......! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح رَبِّ زِدنِی عِلماً کی پڑھو اور دُعا کرو۔ نہار منہ چھ سات بادام ضرور کھایا کرو۔ مدت 41 روز ہے۔

□ ماجد۔ نواب شاہ

o باباجی! السلامُ علیکم! میرا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے' وہ یہ کہ میری بس ایک بیٹی کے سوا کوئی اولاد نہیں۔ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں اور یہ خط میں کسی دوسرے سے لکھوا رہا ہوں جب سنا کہ آپ ''سچی کہانیاں'' میں لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں تو سوچا' میں بھی اپنا مسئلہ آپ کو بتا دوں۔ میری شادی کو بہت عرصہ ہوچکا ہے۔ آپ ہم پر احسان کرکے تعویذ دیں کہ بیٹا ہوجائے اور ہمیں یہ بھی بتائیں کہ آپ سے تعویذ کیسے حاصل کریں؟ ہمیں تو

آپ کا ایڈریس بھی معلوم نہیں۔ بس آپ اپنے کرم سے ہمیں کوئی آسان وظیفہ بتائیں اور ایک تعویذ بھی دیں کہ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں آپ کو ہمیشہ دُعائیں دیتا رہوں گا۔

☆ بیٹے ماجد......! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔ ان سے بے زاری کا اظہار کبھی مت کرنا۔ تم مجھے جوابی لفافے پر واضح پتا لکھ کر خط اِرسال کر دو تا کہ میں تمہیں تعویذ لینے کا طریقہ بتا سکوں۔ خط میں اپنا نام مع والدہ اور بیوی کا بھی مکمل نام لکھنا۔

□ فرزانہ۔ اسلام آباد۔

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور زندگی دے۔ بابا جی! آپ جس طرح دُکھی انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں، اس کا اجر تو آپ کو اللہ تعالیٰ ہی دے گا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پتے میں پتھری ہے۔ ہومیو پیتھک علاج کروا رہی ہوں۔ میں آپریشن نہیں کروانا چاہتی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ آپ کوئی ایسا وِرد یا وظیفہ دیں جس کو پڑھنے سے بغیر آپریشن کے پتھری ریزہ ریزہ ہو کر پتے سے نکل جائے۔ وظیفہ وغیرہ کتنے دن پڑھنا ہے اور کتنی مرتبہ، سارا تفصیل سے لکھ دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ بابا جی! میری ایک کزن کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ وہ بھی آپریشن کروانا نہیں چاہتی۔ اُس کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتا دیں کہ بغیر آپریشن کے پتے سے پتھری نکل جائے۔ ساری عمر آپ کو دُعائیں دیں گے۔

☆ بیٹی فرزانہ! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ تم فضول میں خوف زدہ ہو۔ فی زمانہ سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔ پتے کا آپریشن تو الٹراریز کے ذریعے بھی ہو جاتا ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہ کثرت پڑھو۔ دن میں جس وقت سہولت ہو، ہزار بار یَاشَافِیُ پڑھ کر پانی کی بڑی بوتل پر دَم کرو اور پھر یہ پانی دن بھر پیتی رہو۔ دن بھر میں کم از کم دس گلاس پانی پینا ضروری ہے۔ یہ عمل 14 دن کرو پھر مجھے حالات سے مطلع کرو۔ اپنی کزن سے کہو وہ بھی یہی عمل کرے۔ انشاء اللہ آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

□ شکیل۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! ہم نے آپ کا بہت نام سنا ہے۔ بابا جی! جس طرح آپ انسانیت کی خدمت کرتے ہیں، اس کا اجر اللہ آپ کو دونوں جہاں میں دے۔ بابا جی! ہم بھی آج ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ وہ مسئلہ میرے کزن کا ہے۔ بابا جی! کچھ عرصے پہلے اُس نے کاروبار شروع کیا جو بہت اچھا چل رہا تھا مگر اَب بالکل نہیں چل رہا۔ وہ بہت پریشان ہے کیونکہ اُس کا سارا سرمایہ اِس کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ بابا جی! آپ ہمیں ایسا وظیفہ دیں جس کے کرنے سے کاروبار بہت ترقی کرے۔ ہم آپ کو تمام عمر دُعائیں دیں گے۔ آپ نے اس سلسلے میں ایک بہن ساجدہ کو جو وظیفہ دیا تھا، میں وہ وظیفہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ وظیفہ کرنے کی بھی اجازت دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی، شکریہ۔ اللہ حافظ! اگر کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف فرمائیں۔

☆ بیٹے شکیل......! وظیفے کی اجازت ہے، بس خیال رہے کہ کوئی نماز قضا نہ ہو۔ وظیفہ مکمل ہونے پر کچھ رقم ضرور خیرات کر دینا۔

□ عرشی۔ جمرودٹی۔

○ بابا جی! آداب! بابا جی! میں اپنے دیور کی شادی اپنی بہن سے کرنا چاہتی ہوں۔ استخارہ کر کے بتائیں کہ یہ رشتہ ان دونوں کے حق میں کیسا رہے گا؟ اُن کی اَزدواجی زندگی کیسی گزرے گی اور اُن کی شادی کا میری زندگی پر کوئی منفی اَثر تو نہیں پڑے گا؟

☆ بیٹی عرشی! استخارہ حق میں ہے۔ تمہاری زندگی پر کوئی منفی اَثر نہیں پڑے گا۔ ویسے تو عالم الغیب اللہ تعالیٰ ہے لیکن اس سے ہمیشہ بہتری کی اُمید رکھنا چاہیے۔ جب تک تم یہ نہیں سوچو گی کہ تم نے اپنی بہن پر احسان کیا ہے اور اُسے احسان کا بدلہ دینا چاہیے۔ کسی سے کوئی اُمید مت رکھنا۔ سب خیر رہے گی۔

□ ثمرہ۔ حیدر آباد۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! سدا خوش رہیں! میرا مسئلہ یہ ہے کہ تقریباً ایک سال پہلے میری شادی ہوئی تھی لیکن شوہر پتا نہیں کس مزاج کا ہے کہ میں اُسے سمجھ نہیں سکی۔ میں تو اُس سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہوں اور وہ مجھ

میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتا' نہ ہی خود سے کوئی بات کرتا ہے۔ میں بات کروں تو جواب دے گا ورنہ نہیں۔ جیب خرچ کے نام پر ایک پیسا نہیں دیتا۔ میری ضرورت میری امی پوری کرتی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ شوہر بھی مجھ سے محبت کرے' میری ہر بات مانے اور میرے بغیر ایک منٹ نہ رہے۔ اَب میں پانچ مہینے سے اپنے میکے میں ہوں لیکن وہ فون تک نہیں کرتا۔ ملنا تو بہت دور کی بات ہے' بہن طعنے دیتی ہے کہ پتا نہیں' کب اپنے گھر جائے گی؟ بابا جی! میں بہت بےزار ہوں' خودکشی حرام نہ ہوتی تو اَب تک کرچکی ہوتی۔ پیارے بابا جی! کوئی ایسا عمل بتائیں کہ شوہر میرے بغیر رہ نہ سکے اور اپنی غلطی تسلیم کرکے مجھے لے جائے۔

☆ بیٹی ثمرہ......! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 3 تسبیح سورۃ النّاس کی پڑھ کر اپنے اوپر دَم کرلیا کرو۔ شوہر سے ضرورت کے تحت بات کرو مگر اپنے فرائض خوش اُسلوبی سے پورے کرو۔ تمہیں خود اپنے سُسرال چلے جانا چاہیے۔ اپنے شوہر کو بلوالو اور اپنے گھر چلی جاؤ۔ ساتھ رہوگی' خیال کروگی تو سب ٹھیک ہوجائے گا ورنہ شوہر کو تمہارے بغیر رہنے کی عادت ہوجائے گی۔ بیٹی......! سمجھداری سے چلو' گھر بنانا بہت مشکل ہے اور ٹوٹنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

□ فوزیہ۔ کراچی۔

○ بابا جان! میرا مسئلہ حل کردیں' میں آپ کی بہت شکرگزار رہوں گی۔ میری شادی کو 8 سال ہوچکے ہیں اور اَب تک اولاد سے محروم ہوں۔ لوگوں کے رویے اَب مجھے بہت دکھ دیتے ہیں۔ آپ نے میری نند کو تعویذ دیا تھا' اُن کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی۔ اَب پھر انہوں نے آپ سے تعویذ منگوایا ہے۔ بابا جی! پلیز' مجھے بھی تعویذ تیار کردیں تاکہ میری بھی اولاد ہوسکے۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔ مجھے طریقۂ کار سب پتا ہے مگر میری نند نے کہا کہ آپ ہر ایک کو تعویذ نہیں دیتے لہٰذا پہلے اجازت لے لو۔ بابا جی! میں بھی آپ کی بیٹی ہوں' میری بھی مشکل حل کردیں تاکہ میں اپنے سُسرال میں خوش وخرم رہ سکوں۔

☆ بیٹی فوزیہ......! اللہ سے مدد مانگو' وہ ضرور تمہاری دُعا قبول فرمائے گا۔ میں تعویذ تیار کردوں گا' بس خیال رکھنا' تعویذ استعمال کرنے کا بھی خاص طریقہ ہے۔ اِس پر عمل لازمی ہے۔ انشاءاللہ' کلام الٰہی کی برکت سے ضرور کرم ہوگا۔ خط میں اپنے مکمل کوائف اِرسال کرنا۔

□ ماہم۔ کھاریاں۔

○ بابا جی! میں بہت بدنصیب عورت ہوں۔ پہلی شادی بھی اپنی مرضی سے کی اور ایک بچے کے بعد طلاق ہوگئی۔ گھر میں بھائی بھابی کا رویہ بہت خراب تھا اِس لیے میں نے دوبارہ اپنی مرضی سے دوسری شادی کرلی۔ میرے دوسرے شوہر کے پہلے سے دو بچے تھے۔ وہ خاصے دولت مند ہیں اور اُن کی پہلی بیوی اُن کی کزن بھی ہیں۔ شروع میں تو سب ٹھیک رہا لیکن اَب اُن کا رویہ مجھ سے بہت خراب ہورہا ہے۔ میرے بیٹے کو تو بالکل بھی برداشت نہیں کرتے۔ میرے دو بچے اُن سے بھی ہیں' اُن کو بھی وہ پیار نہیں ملتا جو اُن کا حق ہے۔ ساری توجہ پہلی اولاد کی طرف ہے۔ میں کچھ بولتی ہوں تو لڑنے لگتے ہیں' بہت برا بھلا کہتے ہیں۔ بابا جی! میں بہت غریب گھر سے ہوں' پلٹ کر واپس بھی نہیں جاسکتی۔ اَب تو تین بچوں کا ساتھ ہے۔ بابا جی! ایسا چاہتی ہوں' میرے شوہر ہم لوگوں سے محبت کریں اور کم از کم ایک گھر ہی میرے نام کر دیں۔ ان کی تو بہت جایداد ہے' مجھے کم از کم ایک آسرا ہی ہوجائے۔ بابا جی! آپ نے بہت سے لوگوں کے مسائل حل کیے ہیں' میرا مسئلہ بھی حل کردیں' میں اور میرے بچے بھی آپ کو دُعائیں دیں گے۔

☆ بیٹی ماہم! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بعض اوقات انسان ایک کے بعد ایک غلطیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ بہرحال جو ہوا' سو ہوا' اَب تم نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۂ یٰسین پڑھو اور دُعا کرو۔ خیال رہے' جہاں جہاں لفظ "مُبین" آئے' وہاں رک کر 7 بار سورۂ فاتحہ پڑھو پھر دُعا کرو۔ بقیہ معاملات میں خاموشی رکھو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔ مجھے 41 دن بعد مطلع کرو۔

□ ذیشان احمد۔ کوٹری۔

o بابا جی! میں اکثر آپ سے رابطے میں رہتا ہوں۔ مسئلہ وہی ہے میری بیوی کی نافرمانی! اَب تو دو بچے بھی ہو چکے ہیں مگر وہ کسی طور بھی نباہ کرنے کو تیار نہیں۔ آپ مجھے جیسے سمجھاتے رہے، میں ویسے ہی چلتا رہا، ہر ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی مگر بے فائدہ۔ وہ اَب بھی اپنی ضد پر قائم ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا اور بچے بھی تم ہی رکھو۔ بابا جی! اَب بتائیں، میں ان حالات میں کیا کروں؟ گھر والوں کے سامنے بہت شرمندگی ہوتی ہے اور اَب تو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ جن بچوں کی خاطر یہ سب برداشت کر رہا ہوں، وہی اِن حالات میں بہت سہمے ہوئے رہتے ہیں۔ اُن کے چہرے پیلے ہیں اور بچوں والی کوئی شرارت اُن میں نہیں۔ بابا جی! میں نے ہمیشہ آپ سے مدد چاہی، آپ نے جیسے کہا، ویسے ہی کیا، اَب بتائیے، کیا کروں کہ اَب تو میرے اعصاب بھی جواب دے رہے ہیں۔

☆ بیٹے ذیشان! تم نے اپنی جانب سے مکمل کوشش کر لی، اَب مناسب یہی ہے کہ اپنی بیوی کو فارغ کردو۔ زندگی ایک بار ہی ملتی ہے، اس کو تباہ مت کرو، پُرسکون ذہن کے ساتھ بچوں کی تربیت کرو۔ دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں جو کسی کی اولاد کو اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہتے ہیں۔ تم نے ہر طرح سمجھا کر دیکھ لیا، نرمی سے بھی اور سختی سے بھی لہٰذا اَب تم پر کوئی اخلاقی بوجھ نہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ دو لوگ اکثر ساتھ نہیں چل پاتے تو عزت سے الگ ہو جانا ہی بہتر ہے۔ اُس کا حق مہر اَدا کردو۔ جو زیور اُس کو دے چکے ہو، واپس مت لو۔ عزت کے ساتھ معاملے کو نمٹا دو، بس اَب یہی بہتر ہے۔ یَاقَہَّارُ کا بہت وِرد کیا کرو۔ اللہ تم پر اپنا کرم ضرور فرمائے گا۔

□ آمنہ۔ کراچی۔

☆ بیٹی آمنہ! تمہارا مسئلہ قابلِ اشاعت نہیں۔ بہ کثرت توبہ استغفار پڑھو اور بہتر ہوگا، مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ کلام الٰہی کی موجودگی میں شیطان قریب نہیں آتا۔

صائمہ۔ حیدرآباد۔

☆ بیٹی صائمہ! میں تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ اس سے پہلے کہ تمہاری بہن ڈپریشن کا شکار ہو، مجھ سے اس کے لیے تعویذ منگوا لو۔ اس طرح کے مسائل انسان کو زندگی سے بھی دور لے جاتے ہیں۔ ☆☆☆

ہائیڈ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

فرمانِ الٰہی

جو کوئی اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو (اسے معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آنے والا ہے اور اللہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے۔ جو شخص بھی اللہ کی راہ میں کوشش (اور محنت) کرے گا' اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا۔ بے شک اللہ دنیا جہان والوں سے بے نیاز ہے اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک اعمال کریں گے' ہم ان کے گناہ ان سے دور کردیں گے اور انہیں ان کے اعمال کا زیادہ اچھا بدلہ دیں گے۔ (العنکبوت: ۵تا۷)

نیکی اور گناہ کی تعریف

حضرت نواس بن سمعان الانصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور گناہ کے متعلق دریافت کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بھلائی (نیکی) حسنِ اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جس کی کھٹک تمہارے دل میں رہے اور دوسرے لوگوں کا' اس کے بارے میں جاننا تمہیں ناگوار ہو۔''
(صحیح مسلم شریف: باب تفسیر البر والاثم)

انمول موتی

شیخ سعدیؒ کو ان کے والد نے بچپن میں انگوٹھی خرید کر دی۔ شیخ سعدیؒ کہیں کھیل رہے تھے کہ ایک اچکے نے مٹھائی کا لالچ دے کر انگوٹھی اتار لی۔ باپ نے سنا تو کہا۔

''بیٹا! اتنی قیمتی انگوٹھی ایک دھیلے کی مٹھائی کی خاطر کھودی۔ خیر' اب جو ہوا' سو ہوا مگر میری بات یاد رکھو جس طرح میں نے تمہیں انگوٹھی دی' اسی طرح اللہ نے تمہیں ایک موتی دیا ہے جس کا نام انسانیت ہے دنیا کی چھوٹی چھوٹی لذتیں مٹھائی کی طرح ہیں جو شیطان اس اچکے کی مانند تمہارے واسطے لیے پھرتا ہے تا کہ وہ موتی تم سے چھین لے مگر خبردار یہ انمول موتی مت گنوانا۔''

مرسلہ: عاشر عتیق، کراچی

وقت

وقت ایک اہم شے ہے۔ یہ گزرتا رہتا ہے اور ہر موڑ پر انسان کو ایک نیا تحفہ بخشتا ہے۔ وقت نے کبھی انسان کو شاہی تخت پر بٹھایا تو کبھی تخت الٹ دیا۔ کبھی گھر آباد کیے تو کبھی ویران کردیے۔ کبھی موسم گل کے تازہ پھول راہ میں بچھا دیے تو کبھی پت جھڑ کی بکھری پتیاں نصیب میں لکھ دیں۔

یہ وقت ہی ہے، جس نے کبھی خوابوں کی پیاری تعبیریں دیں تو کبھی ادھورے خواب بخش دیے۔ کبھی آرزوؤں کی مکمل منزل دی تو کبھی نامعلوم راستوں کی مسافت لکھ دی...... اور یہ وقت ہی ہے، جس نے کبھی لبوں پر حسین مسکراہٹ بکھیر دی تو کبھی بھیگی پلکیں انسان کا مقدر بنادیں۔

مرسلہ: احسن عمرانی، سجاول

ماضی کے حکمران

سلطان صلاح الدین ایوبی نے فلسطین، شام، اردن، لبنان، مصر پر حکومت کی، بیت المقدس فتح کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی ذاتی جائیداد کا حساب کیا گیا تو ایک گھوڑا، ایک تلوار، ایک زرّہ، ایک دینار اور 36 درہم کے سوا کچھ پاس نہ تھا۔
سلطان شدید خواہش کے باوجود ذاتی سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے حج نہ کرسکا۔

مرسلہ: سرور شان۔ ملتان

موتی مالا

آنسوؤں کو بہہ جانے دو، یہ غموں کو مایوسیوں میں تبدیل ہونے سے روکتے ہیں۔
خوشی صرف ہنسنے ہنسانے اور قہقہے لگانے کا نام نہیں، بلکہ رگ و پے میں طمانیت بس جانے کا نام ہے۔
غصہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسروں کا انتقام اپنے آپ سے لیتے ہیں۔
زندگی...... دوستی، خوشبو اور اُجالے کا نام ہے۔

کاوش: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

ماہرانہ رائے

بین الاقوامی ٹورنامنٹ کے سلسلے میں اسکواش کا ایک میچ ہو رہا تھا۔ اناؤنسر کہہ رہا تھا۔
''ناظرین باوجود پانچ منٹ گزرنے کے دونوں کھلاڑی ابھی تک کوئی پوائنٹ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ آئیے اس کی وجہ ہم اپنے ماہر سے پوچھتے ہیں۔''
''صاحب! اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میچ اب تک شروع ہی نہیں ہوا۔ دونوں کھلاڑی پریکٹس کررہے ہیں۔'' ماہر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

مرسلہ: رضیہ طاہر۔ گوجرانوالہ

روشن حرف

☆ کبھی آپ دوسروں کے لیے دل سے دعا مانگ کر دیکھیں، آپ کو کبھی اپنے لیے مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔
☆ لفظوں کے دانت نہیں ہوتے لیکن یہ کاٹ لیتے ہیں اور اگر یہ کاٹ لیں تو پھر ان کے زخم زندگی بھر نہیں بھرتے۔
☆ صبر ایسی سواری ہے جو اپنے سوار کو کبھی گرنے نہیں دیتی، نہ اپنے قدموں سے اور نہ کسی کی نظروں سے۔
☆ جب کسی انسان کے آگے روشنی ہوتی ہے تو اس کا سایہ پیچھے آتا ہے اور روشنی پیچھے ہوتی ہے تو اس کا سایہ آگے آتا ہے۔ دین روشنی ہے اور دُنیا سایہ۔ دین کو آگے رکھو گے تو دُنیا خود پیچھے آئے گی اور دین کو پیچھے رکھو گے تو دُنیا آپ سے آگے بھاگے گی۔

مرسلہ: رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

احتیاط

امریکی فوج کا ایک نیا کمانڈر کیمپ کی واٹر سپلائی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے متعلقہ سارجنٹ سے پوچھا۔
''پانی کو آلودگی اور جراثیم سے محفوظ کے لیے آپ کیا کرتے ہیں؟''
''جناب!'' سارجنٹ نے جواب دیا۔ ''ہم سب سے پہلے پانی خوب اُبال لیتے ہیں۔''
''بہت خوب۔'' کمانڈر نے تعریفی انداز میں کہا۔
''پھر ہم اس پانی کو نتھار لیتے ہیں۔'' سارجنٹ نے مزید تفصیل بتائی۔
کمانڈر نے مزید اطمینان کے اظہار میں گردن ہلائی۔
''مگر پھر بھی۔'' سارجنٹ نے بالآخر کہا۔ ''ہم سب احتیاطاً اس پانی کے بجائے بیئر ہی پیتے ہیں۔''

مرسلہ: ندا، فضہ۔ کراچی

ہم

شکر کرو کہ زمین کی زباں نہیں ہے
ورنہ جو ظلم اس پر ہو رہا ہے
دامن پر اس کے جتنا لہو گرا ہے
وہ ہم سے اس کا حساب چاہتی
سنہرے نرم سینے پر اس کے

لہلہاتے سبز کھیتوں سے
بہتے شفاف دریاؤں سے
ہم نے آب ودانہ کیا ہے حاصل
سینے پر اس کے رکھ کر سر اپنا
اَن گنت راتوں کی گہری نیند لی ہے
عوض اس کے ہم نے اسے دیا ہی کیا ہے
سوچو اگر اس کی زبان ہوتی
یہ ہم سے کتنے سوال کرتی
ہوتی آنکھیں تو کتنا روتی
یہ تو ایسی ماں ہے ہر گھڑی جو
اپنے بچوں کے پیروں کو چومتی ہے
اور ہم بجائے اس کے گل کھلاتے
سینے پر اس کے کانٹے بو رہے ہیں
بجائے اس کے ماتھے اس کے
سر بلندی کا کوئی جھومر سجائیں
ماتھے پر اس کے کالک لگا رہے ہیں

شاعر: محمد تقی

مرحلہ در مرحلہ

ایک شاہی دعوت کے موقع پر بادشاہ سلامت نے اپنے وزیروں اور مصاحبوں سے سوال کیا۔

''ہر چند کہ ہم نے ٹیکسوں میں اضافہ کر دیا ہے، مگر اس کے باوجود سرکاری خزانے کی آمدنی میں اضافہ نہیں ہوتا، آخر اس کا سبب کیا ہے؟''

ایک وزیر نے دست بستہ عرض کیا۔ ''جہاں پناہ! جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟''

بادشاہ نے فرمایا۔ ''کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟''

تب وزیر نے برف کا بڑا سا ایک ڈلا اٹھایا اور تجویز پیش کی کہ دعوت میں جتنے لوگ موجود ہیں، ان کے ہاتھوں سے گزرتے ہوئے یہ ڈلا بادشاہ سلامت تک پہنچے۔

اس طرح جب ڈلا ہاتھوں سے گزرتا ہوا بادشاہ سلامت کی خدمت میں پہنچا تو وہ مٹر کے دانے کے برابر رہ گیا تھا۔

مرسلہ: ثمرہ شعیب بٹ۔ گوندلانوالہ

کیوی فروٹ

100 گرام کیوی فروٹ میں **49** کیلوریز ہوتی ہیں اور اوسطاً ایک کیوی فروٹ تقریباً **80** گرام وزنی ہوتا ہے جس میں حراروں کی تعداد **39** ہو سکتی ہے۔ کیوی فروٹ وٹامن **C** کے حصول کا بہترین ذریعہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں وٹامن **E** اور پوٹاشیم کی بھی قابلِ ذکر مقدار ہوتی ہے، تاہم دیگر پھلوں کی نسبت ریشے یا فائبر کم ہوتے ہیں۔ حل پذیر ریشے کی مقدار مناسب ہوتی ہے۔

مرسلہ: نبیل اسلم۔ سیالکوٹ

Third World

ہم صدیوں سے
بند کمرے میں
اِک سہانی صبح کا
انتظار کرتے ہیں
روز روز جیتے ہیں
روز روز مرتے ہیں

شاعر: عامر شیخ

کیا فائدہ......!

دولت مندوں کے پاس چندہ لینے والے کثرت سے آتے رہتے ہیں لیکن انہیں ان سے جان چھڑانے کے طریقے بھی خوب آتے ہیں۔ ایک سیٹھ صاحب کے پاس علاقے کے کچھ لوگ مکینوں کے لیے نئی میت گاڑی خریدنے کے سلسلے میں چندہ لینے پہنچے۔

''بھئی میں تو معذرت چاہوں گا...... نئی میت گاڑی کے لیے تو میں چندہ نہیں دے سکتا۔'' انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''علاقے میں پہلے سے جو میت گاڑی موجود ہے، پچاس سال پہلے میں نے اس کے لیے چندہ دیا تھا...... اور آج تک مجھے اس گاڑی سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع نہیں ملا...... تو

پھر میں نئی گاڑی کے لیے چندہ کیوں دوں؟''

مرسلہ: زین فاطمہ۔ فیصل آباد

جاپان

اے صاحبو! جاپان تو جدید ہے لیکن جاپانی اتنے جدید نہیں ہیں۔ ان کا طرزِ زندگی وہی ہے جو پہلے تھا۔ سلام و طعام اور نشست و برخاست میں سرگشتۂ خمار رسوم و قیود ہیں۔ یہ نہ سمجھیے کہ چوغے پہنے پھرتے ہیں یا ساری عورتیں سر پر جوڑے بنا کر پیچھے سے گدّی باندھے پنکھا کرتی نظر آتی ہیں۔ کام کاج کا سارا لباس مغربی ہے کہ آسانی اسی میں ہے، تاہم آپس میں سلام سر جھکا کر ہی کرتے ہیں، خواہ سڑک پر ٹریفک ہی چل رہا ہو اور لوگوں کا راستہ بھی رُکتا ہو۔ اس کے لیے فاصلے کا بھی التزام ہے۔ (مصافحے کا دستور نہیں) اور یہ آداب بھی مقرر ہیں کہ کس درجے کے آدمی کے آگے کتنا جھکنا چاہیے، تھوڑا جھکنا یا کمر کو دُہرا کرنا لازمی ہے۔

تحفے کا لین دین بھی ان کی طبعی عادات و رسوم میں ہے۔ جس کو تحفہ دیا جائے، اس کے لیے لازم ہے کہ اس سے دو پیسے زیادہ کا تحفہ لائے اور جوابی تحفے کی قیمت قدرے زیادہ ہونی چاہیے۔ اگر دونوں فریقوں میں پے در پے تحفوں کا تبادلہ ہوتا ہے تو جان لیجیے کہ تھوڑے دنوں میں یا تو دونوں دیوالیہ ہو جائیں گے یا سمجھ دار ہوئے تو کوئی بات نکال کر ترکِ تعلق کر لیں گے۔

ابنِ انشاء کے سفرنامے ''ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں'' سے اقتباس۔ شریف الدین جیلانی۔ ٹنڈو الہ یار کا انتخاب۔

دوست

☆ دوست ایک ایسا درخت ہے، جس کا سایہ تھکن دور کر دیتا ہے۔

☆ ایسا باغ ہے، جس میں ہمیشہ بہار رہتی ہے۔

☆ آسمان کا چاند، گلشن کا پھول، بہاروں کی رونق اور خوشبو کا جزیرہ ہے۔

☆ چین اور سکھ کا نام ہے۔

☆ اس پاکیزہ رشتے کی قدر ہمیشہ دل میں رہتی ہے۔

مرسلہ: زرمینہ شکیل کیانی۔ لیہ

قابلِ دید

ایک سیاست دان اپنی کار کی چابی کار کے اندر بھول گیا اور کار کا دروازہ مقفل ہو گیا۔ اس نے بہت کوشش کی مگر دروازہ کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر اس نے تار کے ذریعے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ اسی دوران ایک سپاہی وہاں آ گیا اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیاست دان کو کار چور سمجھ کر اس کی پھینٹی لگانی شروع کر دی۔

سیاست دان بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ اس نے بھی بقدر ہمت ترکی بہ ترکی جواب دیا اور کہا۔ ''ارے کمبخت! میں مشہور سیاست دان فلاں فلاں ہوں اور یہ کار میری ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے سپاہی کو ثبوت بھی پیش کر دیا۔

سپاہی بڑا شرمندہ ہوا اور معذرت کے بعد کہنے لگا۔ ''جناب عالی! کیا آپ اپنا آٹوگراف مجھے دے سکتے ہیں۔''

''میں اتنی بڑی شخصیت بھی نہیں ہوں کہ لوگوں کو آٹوگراف دینے لگوں۔'' سیاست دان نے دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''جناب! آپ اس دھرتی پر بسنے والے پہلے اور آخری سیاست دان ہیں، جو ''بند تالا'' کھولنا نہیں جانتے۔'' سپاہی نے کہا۔

مرسلہ: سہیل رضا خواجہ۔ جلال پور پیر والا

☆......☆



قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں

نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

روبینہ شاہین......کراچی

لکھا ہوا کردار کہانی میں ہی چلتا پھرتا ہے
کبھی ہے دوری کبھی ملن ہے جیتے جاؤ، سوچو مت

زیبا رئیس......ملتان

دنیا کی نگاہوں سے بچا کر تجھے رکھا
ہاتھوں کی لکیروں میں چھپا کر تجھے رکھا
لفظوں کی قطاروں نے ترے نقش تراشے
قرطاس کے سینے پہ سجا کر تجھے رکھا

حیات خان......بونیر

تمہارے شہر کی گلیوں، میں سیل رنگ بخیر
تمہارے نقش و قدم پھول، پھول کھلتے رہیں
وہ رہگزر جہاں تم لمحہ بھر ٹھہرے چلو
وہاں یہ ابر جھکیں، آسمان ملتے رہیں

وفا مہر......شیخوپورہ

سرے ادھڑ گئے ہیں شام و صبح کے
وہ میرے دو جہاں ساتھ لے گیا

فریحہ یوسف......خانیوال

بچھڑنے کی اذیت سہہ چکی ہوں
کوئی غم اس سے بڑھ کر مانگتی ہوں

صالحہ......کوٹری

کتابوں میں نہیں لیکن ہمارا تجربہ ہے
کہ سیدھی راہ سے کوئی بھی منزل تک نہیں پہنچا

زری گل......ہزارہ

جو بھی جیون پاس تھا میرے، تجھ کو تکتے بیت گیا
میں تھی اور تھی گھر کی چوکھٹ، نیند مجھے کب ائی تھی؟
غیروں کا شکوہ کیا کرتی، کہتی دل کی بات کیسے
ساری عمر تھی خود سے کھٹ پھٹ، نیند مجھے کب آئی تھی؟

ظفر ظہور......کراچی

بہت شدید تھے یا رب! میرے وجود کے زخم
مجھے صلیب پہ دو پل سلا دیا ہوتا

عادل صدیقی عادل......کراچی

بے سبب مسکرا رہا ہے چاند
کوئی سازش چھپا رہا ہے چاند
جانے کس کی گلی سے نکلا ہے؟
جھینپا جھینپا سا آ رہا ہے چاند

عاشر عتیق......کراچی

بنا رہا تھا میں پرندہ ایک کاغذ پر
کہ خود بھی اڑنے لگا اس کے پر بناتے ہوئے

طیبہ عبید......لاہور

تو کسی کا ہو چکا ہے، کیسے دعا مانگوں گا میں؟
بیٹھا رہتا ہوں تذبذب میں وضو کرتا ہوا

پاکیزہ خان......لالہ موسی

دریا الٹ کے دیکھنا مہنگا پڑا مجھے
کچھ تہہ نشین مزار مرے ساتھ چل پڑے۔

کنول عمران خان۔کراچی

ہم نہ ہوں گے تو کہو کون منائے گا تمہیں
یہ بری بات ہے ہر بات پہ روٹھا نہ کرو

منشی محمد عزیز مئے۔لڈن ضلع وہاڑی

بے حجابا ہو اگر حسن تو وہ بات کہاں
چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی

ارم خان۔ڈی جی خان

کون کرتا ہے وفا اتنی، تیری سوچ کی انتہاء جتنی
یہ سب باتیں ہیں کتابوں کی، ان میں ہوتی ہے حقیقت بھلا کتنی

فرح انیس۔کراچی

یہ جنوں نہیں تو کیا ہے
کانچ کی دیواروں کو پتھر سے توڑنا

یحیل میتلو۔کراچی

کام سے فارغ ہوتی ہوں خیالوں میں تم آجاتے ہو
چپکے چپکے کانوں میں جانے کیا کیا کہہ جاتے ہو

شازیہ گل۔مانسہرہ

یہ جو مفتیان کرام کا نیا مشغلہ ہے تو کس لیے
یہ جو تیرے میرے شہید کی نئی کربلا ہے تو کس لیے
ابھی کربلا یحسین ہی تھی لغات دہر میں معتبر
نئی جنتری کے نمود کی یہ جو ابتداء ہے تو کس لیے

لیلیٰ مروہ اقبال۔سیالکوٹ

اے خواب کی کشتی تو رواں دواں کیوں ہے؟
میرے حوصلوں کی قدر کر کبھی تو کنارے لگ

سدرہ انور علی۔جھنگ صدر

چمن کا رنگ و بو تو نے سراسر خزاں بدلا
نہ ہم نے شاخ گل بدلی نہ ہم نے آشیاں بدلا

ظفر اللہ رند۔بلوچستان کوئٹہ

خوش فہمیوں کے سلسلے اتنے دراز ہیں
ہر اینٹ سوچتی ہے کہ دیوار مجھ سے ہے

علی حسنین تابش۔چشتیاں

اس کو بھی دکھ ہے تعلق ٹوٹ جانے کا
وہ جا تو رہا ہے مگر ہاتھ ملتا جاتا ہے

شاہد رفیق سہو۔کبیر والا

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

حاذق ندیم۔کراچی

طلسم دل، طلسم جاں، طلسم ذات باقی ہے
ابھی شاید محبت کی کوئی سوغات باقی ہے
جسے کہنے کی خواہش ہے، جسے کہنے سے ڈرتا ہوں
ابھی وہ بات کہنی ہے ابھی وہ بات باقی ہے

فہد نور خان۔کوئٹہ

رتوں کا قاعدہ ہے، وقت پر یہ آتی جاتی ہیں
ہمارے شہر میں کیوں رک گیا فریاد کا موسم
نہ کوئی غم خزاں کا ہے نہ خواہش ہے بہاروں کی
ہمارے ساتھ ہے امجد کسی کی یاد کا موسم

نبیل احمد۔لاہور

جو بات کبھی نہ کہنا تھی، وہ بات منہ سے نکل گئی
جو لفظ تجھ سے کہنا تھے، وہ دل کے گوشے میں رہ گئے
خواب خواب تھی زندگی، خواب خواب تھی ہر خوشی میرے
خواب مٹی کے گھر تھے جو پہلی بارش میں بہہ گئے

کوپن برائے

تیر نیم کش

اپریل 2015ء

میرا پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

نام:

پتا: